اِمام ابُوحَنِیفہ رحمہ اللہ کی حکیمانہ زندگی پر
ایک اِنقلابی دستاویز

فقیہِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام ابُو حنیفہ رحمہ اللہ کا خاندانی پس منظر
شکست ایران کے بعد سیاسی نیرنگیاں
مذہب کے نام پر نئی فرقہ بندیاں

خان آصف

دلوں کے فاصلے کم کرنے والی ایک ایسی کتاب
جس کا مطالعہ ہر مسلمان پر قرض ہے

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکیمانہ زندگی پر ایک انقلابی دستاویز

فقیہ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خاندانی پس منظر
شکست ایران کے بعد سیاسی نیرنگیاں
مذہب کے نام پر نئی فرقہ بندیاں

خان آصف

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958

بااہتمام: محمد علی قریشی

خوب سے خوب تر کتابیں
جدت اور معیار کے ساتھ

باراول 2012ء

مطبع .... نیر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ .... کلاسکس گرافکس

قیمت .... 500 روپے

ابتدا

آغازِ کار اپنے اللہ کے نام سے

جو لاشریک بھی ہے، ماورائے تشکیک بھی
گداگروں کو تختِ وکلاہ دینے والا
بے سفینوں کو قلزمِ آفات میں راہ دینے والا
شاہوں کو قریہ بہ قریہ، در بہ در پھرانے والا
کشکول برداروں کے سروں پر تاج زرنگار سجانے والا
زمانۂ فراق میں قلبِ آدمؑ کا اضطراب گواہ
شبستانِ احساس میں ابراھیمؑ کا خواب گواہ
مجلسِ جلال میں نگاہِ کلیمؑ گواہ، شعلہ و برقِ طور گواہ
منزلِ صبر میں ایوبؑ کے زخم و ناسور گواہ
جس کی رحمت پر یعقوبؑ کی چشمِ خونبار گواہ
جس کی دستگیری پر یوسفؑ کا پیرہن تار تار گواہ
جس کی کارسازی پر موجہ آبِ نیل گواہ
جس کے جبروت پر مدفن اصحابِ فیل گواہ
جس کے کمالِ تخلیق پر ذاتِ خیر الانامؐ گواہ
جس کی وحدانیت پر مرکز درود و سلام گواہ
میں کیا اور میری گواہی کیا؟
وہ خود اپنی دلیل ہے تنہا

انتہا

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور

ہر ایک فلسفۂ پیچ و تاب جھوٹا ہے
ترے بغیر خرد کا نصاب جھوٹا ہے

جو تیرا ذہن نہ سوچے وہ فکر فاسد ہے
جو تیری آنکھ نہ دیکھے وہ خواب جھوٹا ہے

مزاجِ قیصر و کسریٰ، لباسِ مزدوری
ترے سوا یہاں ہر انقلاب جھوٹا ہے

جو تیری آمد و تعظیم پہ گواہی نہ دے
خدا گواہ وہ اہلِ کتاب جھوٹا ہے

امامؒ کی بارگاہ میں

زہر پی کر انسانیت کو آب حیات دینے والا
زخم کھا کر تہذیب آدم کو مرہم نجات دینے والا
حلقہ یاراں میں صبا سخن ، شبنم گفتار
دربار خلافت میں آہن لب ، شعلہ ریز وشرربار
کوچہ وہم و گماں میں علامت یقیں
شہر سود و زیاں میں روایت حق کا امیں
زندان شب میں پیغام آزادی سحر
تلاش علم میں کہکشاں اس کی رہ گزر
ہوش و خرد کا نقیب ، روشنی کا زندہ سفیر
صدیاں زیر کمند زمانے اس کے اسیر

صاحب طرز ادیب خان آصف کی بہترین تصانیف

- اللہ کے ولی
- اللہ کے سفیر
- دِلوں کے مسیحا
- سفیرانِ حرم
- شمشیر کا قرض
- شعلوں کا کفن
- فاتح اعظم صلاح الدین ایوبی

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور فون: 042-37652546, 37668958

کیاتم اس شخص سے اس چیز پر جھگڑتے ہو جسے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔(النجم:12)
بے شک! محمد مصطفےٰ ﷺ نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھی ہیں۔(النجم:18)

"اہل دنیاتم دیکھتے نہیں کہ علم کس طرح ابتر ہو رہا تھا پھر اس شخص (ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ) نے اسے ترتیب دیا جو اس قبر میں سو رہا ہے۔"

(عربی کے مشہور شاعر ابوجعفر نے امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا مزار دیکھ کر برجستہ یہ شعر پڑھا)

یہ کتاب کیا ہے؟

- یہ کتاب ان مردان شجاع کی سرگزشت ہے، جنہوں نے کسی مادی اقتدار، جبر، تشدد اور حرص و ہوس کو سجدہ نہیں کیا۔
- دلوں کی کثافت اور ذہنوں کا غبار دھونے والی کتاب۔
- یہ کتاب اخلاق عالیہ کی وکیل بھی ہے اور بلند کرداری کی نقیب بھی۔
- جو لوگ بڑی طاقتوں کے خوف سے لرزہ براندام رہتے ہیں، یہ کتاب انہیں استقامت بخشے گی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ دہشت کے حصار سے نکل کر آزاد فضاؤں میں آسودگی کی سانس لے سکیں گے۔
- اور جو لوگ امدادی غذائیں کھاتے کھاتے بھکاری بن گئے ہیں، یہ کتاب انہیں فقر و قناعت کی تعلیم دے گی اور غیروں کے سامنے ان کے دست سوال کو دراز ہونے سے روک دے گی۔
- اور جو لوگ مادی (سائنسی) ترقی کے خواہاں ہیں انہیں یہ کتاب غور و فکر، تدبر اور محنت شاقہ کا سبق دے گی کہ علم، تدبر اور عمل، اول و آخر مومن کی میراث ہیں۔

حرفِ خوں گشتہ

صاحبانِ دل! آپ پر اللہ کی سلامتی ہو!

قیامِ پاکستان ہمارے سیاسی شعور کا امتحان تھا' جس میں ہمیں تاریخی کامیابی حاصل ہوئی مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ ہم بہت جلد اپنی تاریخ کو فراموش کر بیٹھے...... کیا ثقافت' کیا صحافت اور کیا ادب' ہم نے زمانے کے دوش بہ دوش چلتے ہوئے بڑے سنگین تجربے کیے۔ باہر سے آنے والی جدید ہواؤں میں ایسا نشہ تھا کہ ہمارے قدم غیر متوازن ہو گئے اور پھر ہم اپنی راہ گزر ہی بھول گئے۔ آج شوقِ سفر تو زندہ ہے' مگر اس طرح کہ ہمیں نہ منزل معلوم ہے اور نہ اپنے انجام کی خبر...... اب ہمارا ایک ہی کام ہے کہ ہم آئے دن نئی نئی اصلاحات درآمد کرتے رہتے ہیں۔ کبھی شعر و ادب اور سیاسیات کے نام پر...... کبھی سائنسی ترقی اور معاشیات کے نام پر۔ یہ سب مادہ پرستی کے ہتھیار ہیں جو بنی نوعِ انسان پر چند افراد کی برتری قائم رکھنے کے لئے ایجاد کیے گئے ہیں۔ ہم عالم اسباب میں مادے کی حیثیت سے انکار نہیں کرتے' مگر مادی ترقی بھی کچھ آفاقی اصولوں کی محتاج ہے۔ جستجو' دیانت' کشادہ دلی' روشن خیالی اور مسلسل عمل' ایسے اجزائے ترکیبی ہیں کہ جن کے بغیر روحانی تو کجا' مادی عمارت بھی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

ہماری بنیادی محرومی یہ ہے کہ ہم "تیراکی" کے مسلمہ قانون کو تسلیم نہیں کرتے' لیکن سمندر کی گہرائی ناپنا چاہتے ہیں۔ پھر جب ہماری بے خبری کے باعث سرکش لہریں ہمیں ڈبو دیتی ہیں تو ہم اپنے اسلاف کو الزام تراشی کا ہدف بنا لیتے ہیں کہ وہ جدید دنیا کے تقاضوں سے ناآشنا تھے' ان کی کم نظری نے ہمیں بے رحم پانی کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا...... پھر جب ذہن تاریک ہو جاتے ہیں اور زبان درازیاں حد سے گزر جاتی ہیں تو پھر اس قسم کا شور سنائی دینے لگتا ہے کہ...... دورِ جدید میں اسلامی نظریۂ حیات ناقابلِ عمل ہے...... دراصل یہ ان تھکے ہوئے انسانوں کی چیخیں ہیں' جنہیں بچپن میں طاقت اور غذا سے محروم رکھا گیا...... اور جب یہ معرکۂ حیات میں دوسری قوموں کے سامنے صف آراء ہوئے تو ان کے اعصاب اس قابل ہی نہیں تھے کہ صبر و استقامت کا کوئی ثبوت فراہم کر سکیں۔

کاغذ کے بدن تھے' مسائل کی دھوپ میں جل گئے...... موم کے دماغ تھے کشمکش کی آنچ سے پگھل گئے......

"حرص و ہوس" کے مکتب میں غلامی کا نصاب پڑھا تھا' آزمائش کا وقت آیا تو سجدہ کر لیا یا بھیک کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔ صدیوں سے ہمارا یہی مزاج ہے کہ ہم "ایفائے عہد" اور "جاں فشانی" سے جی چراتے رہے ہیں۔ اب سہل پسندی اور بے وفائی کا یہ زہر ہمارے جسم میں اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتے......

ملتِ اسلامیہ میں ہر طرف ایک حشر برپا ہے۔ پریشان نسلیں آسمان کی طرف منہ اٹھائے مسلسل چیخ رہی ہیں......

"روس عظیم ہے...... امریکہ و یورپ عظیم تر ہیں...... اے خدا! ہم کدھر جائیں؟ تو نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔"

یہی وہ سوال ہے' جو کم و بیش دو سو سال سے ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ مسلم دانشور اپنے اپنے زاویہ نظر کے مطابق اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں' مگر یہ منتشر کارواں کسی "امیر" کے جواب سے مطمئن نہیں ہوتا...... دراصل فلسفے اور سائنس میں اس سوال کا جواب موجود ہی نہیں۔ پھر یہ تحقیق کس طرح بار آور ثابت ہوتی؟ مادیت کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ وہ عیش کوشی کی انتہا کو چھونے کے بعد یک بیک فنا ہو جاتی ہے۔ "برطانیہ عظیم" کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس کی حدودِ مملکت میں سورج غروب نہ ہونے کا محاورہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے لیے تو دلچسپی کا سبب ہو سکتا ہے' لیکن حقائق

کی دنیا میں اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

آج ''آقائے فرنگ'' کا اپنا مکان سورج کی دھندلی سی کرن کے لیے ترس رہا ہے...... کوئی ایک نظر تو دیکھے کہ یہ کیسی بے سروسامانی ہے؟ ''سائنس اور مادے'' کے خدا اپنے ہی پجاریوں کی ٹھوکروں سے ریزہ ریزہ ہو گئے...... وہ ہامان وشداد ہوں...... یا فرعون ونمرودٗ شہر سدوم (قوم لوط علیہ السلام) کے نمائندے ہوں یا عاد وثمود کی بستیاں...... جابران روم ہوں یا شاہان فارس...... چنگیز و ہلاکو ہوں یا زار و ہٹلر...... یہ سب کے سب مادیت کے شعلہ بیان وکیل تھے جو تمام تر قانون دانی کے ساتھ وقت کی عدالت میں اپنا مقدمہ ہار گئے۔

عروج وزوال کائنات کا فطری مزاج ہے۔ ''طاقت'' کو ایک دن ''ناطاقتی'' کا لباس پہننا ہی پڑتا ہے۔ روس امریکہ ویورپ کی برتری بھی ایک عارضی سانحہ ہے۔ ان کے مادی جبروت سے خوف زدہ ہو کر اپنے موروثی عقائد کو ترک کر دینا یا اپنے اسلاف کی روش کو جھٹلا دینا بدترین کم ہمتی اور شرم ناک بزدلی کی دلیل ہے۔

سائنس کی تحقیر کرنا اسلامی نظریات کے منافی ہے۔ ہمارے جو علماء سائنس پر طعنہ زنی کرتے ہیں ان کے ذہن ماؤف ہو گئے ہیں...... اور آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے۔ قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے والا ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ خدا نے آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں کو سجدہ گزاری کے حکم کے بعد واضح طور پر ارشاد فرمایا تھا۔

''ہم نے آدم علیہ السلام کو اشیاء کا علم بخشا ہے۔''

اب اگر نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں تو مسلمانوں کو حیرت کیوں ہے؟ یہی اللہ کی مرضی تھی اور تخلیق آدم علیہ السلام کے بعد سے آج تک یہی آوازِ غیب کائنات کی بسیط فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ ''**علم الانسان مالم یعلم**'' (ہم نے انسان کو ان چیزوں کا علم سکھایا جنہیں وہ نہیں جانتا تھا)

سائنس ''علم اشیاء'' ہی کا دوسرا نام ہے مگر چند اشیاء کے ادراک کی بنیاد پر خدا سے برگشتہ ہو جانا یقیناً جہل عظیم ہے...... جہل انسان کو سرکشی پر آمادہ کرتا ہے اور پھر یہی سرکشی بنی نوع آدم کو منکرین کی صفوں میں لے جا کر ہلاک کر ڈالتی ہے۔ اسلام صرف دشت عرب کے رہنے والوں کے لیے باغات نہروں خیموں اور حوروں کا مژدہ لے کر نہیں آیا تھا...... وہ خالق کائنات کا پسندیدہ طرزِ حیات ہے جو ''خیر وشر'' کی مکمل نشاندہی کرنے کے بعد نسل انسانی کو اُخروی عذاب سے بچانا چاہتا ہے۔ خالق کائنات کون ہے؟ اس کی وضاحت کوئی فلسفی نہیں کر سکتا کہ وہ خود ہی تمام عمر اپنے افکار سے الجھتا رہتا ہے اور پھر چند سال بعد دوسرے آنے والے اس کے خیالات کو کسی دیوانے کا ہذیان کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

خالق کائنات کا پسندیدہ نظام کیا ہے؟ اس کی تشریح سقراط بھی نہیں کر سکا کہ وہ خود یونانی معاشرت کی ایک انتہائی شرمناک رسم کا اسیر تھا۔

آئن سٹائن اپنے ''نظریہ اضافیت'' سے سائنس کی دنیا میں ہنگامہ تو برپا کر گیا مگر اس کے پاس نسل آدم علیہ السلام کے لیے ''نجات اور عافیت'' کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اب اسے کیا کہا جائے کہ آئن سٹائن کا ہر شاگرد اور پیروکار اپنے دماغ میں ''آفات ومصائب'' کا ایک جہنم لئے گھوم رہا ہے۔ اہل سائنس کتنے ہی بلند بانگ دعوے کریں مگر ان کی فطرت کا خمیر تخریب کی ''مٹی'' سے اٹھا ہے...... ابتداء میں تعمیر کا جو دھندلا سا عکس نظر آیا تھا اب ڈھونڈیئے تو اس کا کہیں بھی پتہ نہیں۔ علم کے نام پر ایجادات کا سلسلہ جاری ہے لیکن روحانیت کے بغیر ہر ایجاد کا راستہ تباہی کے غار

کی طرف مڑ جاتا ہے۔ آج امن و آشتی کا کوئی پیغام ہے تو منافقت کے نام پر...... دوستی کی کوئی بات ہے تو مصلحت کے پردے میں...... اور تہذیب و تمدن کا کوئی دعویٰ ہے تو سود خور تجارت کی آڑ میں، کیا یہی انسانیت کی معراج ہے؟ اہل نظر غور کریں......

طاغوتی طاقتوں کے ہاتھ پر بیعت کر کے، گناہوں کی مملکت میں داخل ہو جانا دنیا کا سب سے آسان فعل ہے۔ شاید اسی جدید نظریے کے تحت اکثر لوگ آسمان سے خفا ہو کر زمین کی بندگی قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں......

جب کوئی خلانورد زمین سے کچھ فاصلے پر "بے دست و پائی" کی حالت میں چکرانے کے بعد یہ اعلان کرتا ہے کہ اس سفر میں اس نے کسی خدا یا فرشتے کو نہیں دیکھا تو کرہ ارض پر بسنے والوں کے عقائد کی عمارت لرزتے لرزتے منہدم ہو جاتی...... یا پھر اس میں شکوک و شبہات کے گہرے شگاف پڑ جاتے ہیں۔ اگر ہم منطق اور سائنس کے آفاقی اصولوں کے تحت خلانوردوں کے اعلان کا تجزیہ کریں تو بڑے مضحکہ خیز نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ خدا اور فرشتوں کے نظر نہ آنے کا دعویٰ اس بچے کے ہیجان انگیز شور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، جو کسی "نہر" میں قدم رکھنے کے بعد اچانک چیخنے لگے کہ "یہاں سمندر کا کوئی وجود نہیں۔"

سائنس کی ترقی تو اللہ تعالیٰ کی بے مثال خلاقی کا ایک حقیر سا اعتراف ہے۔ جدید آلات نے ابھی صرف اتنی ہی خبر دی ہے کہ اس خلا میں بے شمار نظام شمسی موجود ہیں...... چاند کے گرداب میں کچھ دیر تک کسی تنکے کی طرح چکرانے یا مریخ و زہرہ کی چند تصاویر حاصل کرنے کو "تسخیر" نہیں کہتے...... لفظ تسخیر کے ساتھ یہ بڑا جاہلانہ مذاق ہے۔

دعویٰ اسے کہتے ہیں کہ "قدیم" کو فنا کر کے "جدید" کو زیادہ دلکش و معیاری بنا دیا جائے۔ "خدا اور فرشتوں" کے وجود کی نفی کرنے والے یہ اعلان کیوں نہیں کرتے کہ ہم نے کرۂ خاکی پر بسنے والوں کے لئے نئی زمین قائم کر دی اور نیا آسمان تراش دیا...... نئے "شمس و قمر" اور نئے "سیار و ثوابت" پیدا کر دیئے...... فرسودہ نظام فلکی و ارضی کو نیست و نابود کر کے اس کے مساوی نیا نظام جاری کر دیا...... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی تک ایک "نئی چیونٹی" کی تخلیق کا دعویٰ بھی نہیں کیا گیا...... اور یہ ممکن بھی نہیں کہ مخلوق بہر حال مخلوق ہوتی ہے...... چند فلاحی پہلوؤں سے قطع نظر ہمارے نزدیک موجودہ سائنس تباہ کار قوتوں کے نئے ذخائر کا نام ہے...... اگر ہم کشادہ دماغی کے ساتھ تاریخ ارض کا مطالعہ کریں تو یہ راز فاش ہو جائے گا کہ ماضی بعید میں بھی مادہ پرست قومیں طاقت کے "غیر معمولی وسائل" پر قابض تھیں مگر ناگہاں ایک آتشیں "چنگھاڑ" نے انہیں بجھا کر رکھ دیا اور پھر تمام اسلحہ خانے ان سپر پاورز کا مدفن بن کر رہ گئے۔

کیا دبدبۂ نادرؒ کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرق مئے ناب آخر

اگر انسان اپنے ذہن میں آباد بت خانوں کو مسمار کرنے کے بعد غیر جانبداری سے غور کرے تو صرف ایک ہی تاریخی حقیقت باقی رہ جاتی ہے، کہ مادہ پرستی کا نظام کوئی نیا نظام نہیں ہے۔ ہر دور میں اس کی شکلیں بدلتی رہی ہیں۔ موجودہ انسان نے مادے کی صورت گری کے لیے اسے سائنس کا نام دے دیا ہے۔ ہر نئی ایجاد اور تخلیق پر چونک جانا انسانی فطرت ہے۔ آج چونکہ عقل کی گردش تیز تر ہے، اس لیے ہر روز مختلف ایجادات سامنے آتی رہتی ہیں اور انسان کی حیرت میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہی حیرت بنی نوع آدم کو مادیت کے آگے سجدہ ریز

ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

اسی طرح نفس کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر ''اشیائے ظاہری'' کے لات ومنات کو پوجنا بھی کوئی نیا طریقہ نہیں ہے۔ زمین پر پہلی انسانی آبادی سے لے کر آج تک یہاں ''فانی جسم کے پجاریوں'' کی اتنی بڑی تعداد گزری ہے کہ ان کے ''شماریاتی خدوخال'' کو جدید ترین ''کمپیوٹر'' بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اللہ نے ایسے پجاریوں کے چند قبائل کا ذکر قرآن حکیم میں بھی کیا ہے اور نسل انسانی پر آخری احسان کرتے ہوئے اپنے خزانہ غیب سے یہ خبر بھی بخش دی ہے کہ ''جسموں کے پجاری'' اس وقت تک زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے رہیں گے جب تک آسمان کی طنابیں نہ کاٹ دی جائیں اور زمین کو دھنکی ہوئی ''روئی'' کی طرح نہ اڑا دیا جائے...... پھر کھلے الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا۔

''خبردار! زمین پر ان کافروں کی چندروزہ چلت پھرت سے کسی فریب میں نہ پڑ جانا۔''

مگر آج مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ منکرین کی چلت پھرت (مادی عروج) سے بڑے فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ شاید اسی فریب خوردگی کے عبرتناک مناظر دیکھ کر علامہ اقبال چیخ اٹھے تھے ۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزہ خونریز ہے ساقی

اور پھر اسی گریہ وزاری کے دوران علامہ اقبال نے یہ بھی سوال کیا تھا

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد ﷺ
اس دور میں اب تیرا مسلمان کدھر جائے

اور اسی سوال نے مجھے بھی مجبور کیا کہ میں ''اکابرین اسلام'' کی سیرت کو نئے انداز سے لکھوں۔ شکم کے عجیب عجیب مطالبوں اور آسائشوں کے حصول کی منصوبہ بندیوں نے آج کے مسلمان کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے کے لیے اپنے قیمتی اوقات میں سے چند لمحے بھی پس انداز کر سکے اور اگر کبھی کچھ بندگان خدا کشاکش نفس سے گھبرا کر اپنے ماضی کی طرف دیکھتے بھی ہیں تو انہیں مذہبی کتابوں میں ''اختلافات اور تنازعات'' کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ پھر انہیں ایک یہ شکایت بھی ہے کہ قدیم کتابوں کا انداز تحریر بہت زیادہ مشکل ہے۔ عربی زبان سے ناآشنا مسلمانوں کے لیے ان تحریروں کا سمجھنا تو درکنار' صحیح طور پر پڑھنا بھی تقریباً ناممکن ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ برصغیر کے مسلم حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں ''عربی زبان'' کی طرف سے جو طرز تغافل اختیار کیا تھا' اس کے کیسے خوف ناک نتائج برآمد ہوئے۔ مرکز سے کٹنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ''امت واحدہ'' میں سیکڑوں فرقے' ہزاروں تہذیبیں اور لاکھوں ثقافتیں پیدا ہو گئیں...... یہاں تک کہ بے شمار لوگ مذہب ہی سے کٹ کر رہ گئے...... اور یہ تکلیف دہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے...... خدا ہی جانتا ہے کہ لوگ کب تک کارواں سے بچھڑتے رہیں گے...... اور امیر کارواں کب تک جدائی کے اس منظر کو برداشت کرتا رہے گا۔

فلم' ٹیلی ویژن اور جدید ادب کی ہنگامہ خیزیوں نے خصوصاً تاریخ کو اور مذہبی کتابوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آج ہر شے نے ''ڈرامے'' اور ''افسانے'' کا لباس پہن لیا ہے۔ نتیجتاً ایک عام انسان کی گھریلو زندگی بھی ''اداکاری'' کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ ابلاغ اور تشہیر کے ایسے ایسے انداز اختیار کیے گئے ہیں کہ ''ادب اور سادگی'' کی زبان سمجھنے والے کسی سنسان گوشے میں پڑے ہوئے انقلاب زمانہ کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔

ادھر نسل جدید کا یہ حال ہے کہ وہ مذہب کے ارکان میں بھی گلیمر کا کوئی پہلو تلاش کرتی نظر آتی ہے اور اسلاف کی زندگی کے واقعات میں بھی اسے کسی "سنسنی خیز ایڈونچر" کی جستجو رہتی ہے۔ گویا موجودہ زندگی "گلیمر اور ایڈونچر" کے محور پر رقص کر رہی ہے۔

شاید اسی جدید فلسفے کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ادیبوں کی ایک جماعت نے تاریخ اسلام کو بھی اپنے قلم کی تجربہ گاہ بنا ڈالا۔ تصوف کے عنوان سے بزرگانِ دین کی سیرت اس طرح بیان کی گئی کہ "محیر العقول واقعات" ہی کسی مردِ خدا کی پہچان ٹھہرے...... "پراسراریت" ان کی علامتِ ذات بن گئی اور چونکا دینے والے قصے ان کی ولایت پر گواہی دینے لگے۔ پھر افسانوی طرزِ بیان کے دلدادہ ان طلسمی تحریروں کے یہاں تک عادی ہو گئے کہ ان کی آنکھیں کسی عقلی تحریر پر ٹھہرنے سے گریز کرنے لگیں۔ ایسے نازک لمحات میں

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا

جب مجھ بے علم اور گناہ گار انسان نے اس موضوع پر مشہور تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا تو شدت خوف سے لرز کر رہ گیا۔ ان سنجیدہ مذہبی تحریروں میں بھی بعض مقامات پر وہ ہنگامہ آرائی کی گئی ہے کہ جنہیں پڑھ کر ایک سادہ دل مسلمان بڑے عجیب کرب کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں بھی کئی ماہ تک حیران و پریشان پھرتا رہا۔ کیا لکھوں اور کیسے لکھوں؟ جدید نسل کا مزاج بدل گیا اور وہ "دیو مالائی" قصوں کی عادی ہو چکی ہے۔ پھر کیا مجھے بھی قارئین کی صفوں میں "تاریخ کا جادوگر" بننے کے لیے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ یا امام مالک رحمتہ اللہ علیہ یا امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ یا امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کو معاذ اللہ ہندو جوگی' عیسائی راہب کے لباس میں پیش کرنا ہوگا یا پھر کسی ایک مسلک کی تبلیغ کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ کو تنگ نظری و تعصب کا کفن پہنانا پڑے گا...... بڑا مشکل مقام تھا...... میں نے گھبرا کر انکار کر دیا' لیکن دوستوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ انہیں خوش گمانی کی حد تک میری صلاحیتوں پر اعتبار تھا۔ اسی دوران میرے ایک اور دوست نے کہا۔ "تم نہیں لکھو گے تو دوسرے لکھیں گے...... یہاں تک کہ چند سالوں میں بے سروپا روایتوں کا ایک ذخیرہ جمع ہو جائے گا...... پھر یہی غیر ذمہ دارانہ تحریریں عوام میں سند قرار پائیں گی اور تمہاری خاموشی بالآخر ایک دن گناہ بن جائے گا۔"

سچ تو یہ ہے کہ میں اس وقت بے روزگار تھا۔ اپنی ضرورتوں سے تنگ آ کر میں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر ایک مختصر سا مضمون تحریر کر دیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس طرح میری پذیرائی کریں گے۔ چند حلقوں کی طرف سے بے بنیاد اعتراضات بھی وارد ہوئے' مگر مجھے کوئی شکایت نہیں کہ الزام تراشی دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب میرے دن کسی کی بندہ پروری کے سہارے گزر رہے تھے۔ میری راتیں "سوز و ساز رومی رحمتہ اللہ علیہ اور پیچ و تاب رازی رحمتہ اللہ علیہ کا شکار تھیں...... اور میں ایک دریدہ لباس بھکاری کی طرح اِن شاہانِ عالم کے دروازے پر کھڑا تھا جو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے...... جب میں نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ کرم پر دستِ سوال دراز کیا تو "حنفی" قرار پایا۔

پھر امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے حضور دامنِ طلب پھیلایا تو "مالکی" ٹھہرا۔

پھر جب امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے در پر اپنا کاسہ شکستہ رکھا تو "شافعی" کہلایا۔

اور آخر میں امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کے قدموں پر جھکا تو لوگوں نے "حنبلی" کہہ کر پکارا...... بس یہی میرا اسباب سفر ہے اور یہی توشہ آخرت ہے' جسے اپنے سینے پر سجا کر ایک دن قبر میں چلا جاؤں گا۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ پر تفصیلی مضمون شائع ہونے کے بعد اکثر لوگوں نے مطالبہ کیا کہ میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر بھی ایک ایسا ہی تحقیقی مقالہ تحریر کروں۔ نتیجتاً میں نے اس مشکل ترین کام کا آغاز کیا۔ پھر اچانک والدہ محترمہ کی شدید بیماری اور دیگر تھکا دینے والے مسائل نے اس سلسلے کو منقطع کر دیا۔ قلم کا مزدور ہوں میرے الفاظ ناپ اور تول کے بعد فروخت ہوتے ہیں۔ اگر کسی ماہ بیمار پڑ جاؤں یا ذہن شل ہو جائے تو معاشی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس لیے اڑھائی سال تک تاریخی کہانیاں لکھیں اور دست سوال کو پیرہن کی جیب میں چھپائے رکھا۔

اس دوران کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ زندگی پہلے سے زیادہ بے اعتبار نظر آنے لگی۔ پھر سینہ سوزاں میں اس آرزو نے بڑی شدت سے کروٹ لی کہ کاش یہ اوراق پریشاں کتابی شکل اختیار کر لیں لہٰذا پھر سے ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی۔

یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ایک دور کے بارے میں کتاب ہے...... اور یہ دور امام کی شاگردی کا دور ہے۔ اگرچہ یہ تحقیق بھی تشنہ ہے لیکن اردو زبان میں پہلی بار حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اساتذہ کا تفصیلی تعارف مجموعی طور پر شائع ہو رہا ہے۔

یہ آخری سطریں تحریر کرتے وقت مجھے کچھ اور غم گسار بھی یاد آ رہے ہیں۔ احباب کے تعاون کا کہاں تک ذکر کروں؟ بس دل کے دفتر ہی میں ان کا حساب محفوظ ہے۔

اور کچھ ذاتی سے جذبوں کا اظہار...... کچھ یاران سینہ فگار جو اپنی کسی مجبوری کے سبب مجھ تک نہ پہنچ سکے خدا انہیں مسائل کے زنداں سے رہائی دے...... اور مصلحت و سیاست کے جن بندوں نے مجھے راستے میں چھوڑ دیا میں ان کے لیے وہی دعا کرتا ہوں جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا وظیفہ خاص تھا۔

"اے اللہ! ہمارے دلوں کو ان کے لیے کشادہ کر دے جن کے دل ہماری طرف سے تنگ ہو چکے ہیں۔"

اور آخر میں ان اعتراضات کا جواب' جو میرے مضامین کی اشاعت کے دوران کیے جاتے رہے۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ تاریخوں میں جو واقعہ چند سطروں پر مشتمل ہوتا ہے' میں اسے دس صفحات میں تحریر کرتا ہوں۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ دنیا کا ہر واقعہ اپنے ساتھ ایک منظر نامہ بھی رکھتا ہے غم اور خوشی میں انسانی چہرے پر کچھ کیفیات بھی ابھرتی ہیں اور میں ان ہی کیفیات کو لفظوں کا لباس پہناتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری کم نگاہی ان کیفیات کا صحیح مشاہدہ نہ کر سکے' مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے ایک ناکام ہی سہی کوشش ضرور کی ہے۔ مہینوں اس پہلو پر غور کرتا رہا ہوں کہ ایک امام کسی خلیفہ کے دربار میں کس طرح داخل ہوگا۔ اس کی رفتار کا کیا انداز ہوگا اور اس کے باوقار قدم کس طرح اٹھیں گے؟ اگر ایک محدث کسی صدمے سے دوچار ہوگا تو اس کی آنکھیں کس طرح نم ہوں گی۔ ایک فقیہہ مسکرائے گا تو اس کے ہونٹ کس قدر کشادہ ہوں گے اور ان کا زاویہ کیا ہوگا؟ لوگ اس حقیقت کا ادراک کیوں نہیں کرتے کہ میں افسانوی عہد میں پیدا ہوا ہوں اور اب ہر بات علامتی کہانیوں کے انداز میں کہی جا رہی ہے۔ میں نے بھی ذاتی طور پر اپنے مضامین کے لیے کچھ علامات تراشی ہیں۔ میں تشبیہات و استعارات کے ذریعے اہل نظر کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں کہ اس طرح بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ میرے مضامین کوئی داستان یا افسانہ نہیں' یہ واقعہ نگاری اور انشائیے کے

درمیان کا ایک نیا راستہ ہے۔ اس مشکل ترین موضوع کو عوام تک پہنچانے کے لیے میرے نزدیک کوئی دوسرا موثر طریقہ نہیں تھا۔ اگر کسی کے دامن خیال میں کوئی دوسری ترکیب ہے تو اسے بروئے کار لائے کہ ہمارا مقصد تو ان مردان جلیل کی صفات کا ابلاغ ہے۔

مگر یہ طے ہو چکا ہے کہ اب عوامی سطح پر ابلاغ روایتی انداز میں نہیں ہوگا۔ دلوں کی زمین اتنی سنگلاخ ہو چکی ہے کہ تیشہ کوہ کن سے بھی زیادہ کسی خارا شگاف آلے کی ضرورت ہے۔

کچھ قارئین کو شکایت ہے کہ میں واقعات سے زیادہ اپنے جذبات رقم کرتا ہوں...... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب دوسرے اہل قلم' بادشاہوں' سیاسی رہنماؤں' شاعروں اور فن کاروں کی تعریف وستائش میں زمین وآسمان کے فاصلے مٹا دیتے ہیں تو انہیں معتبر اور محترم قرار دیا جاتا ہے' مگر جب میں اپنے کسی امام کی شان میں کوئی محتاط قصیدہ پڑھتا ہوں تو لوگوں سے میرے جذبے برداشت نہیں ہوتے۔ خدا ہی جانے کہ یہ کیسی سخن نوازی ہے اور کیسی ادب پرستی ہے۔

کچھ قارئین کا یہ مطالبہ ہے کہ حدیث' تفسیر اور فقہ کی الگ زبان ہوتی ہے' مجھے بھی احتیاط کرنی چاہیے۔ میرے ان کرم فرماؤں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ اس مضمون کا تفسیر وحدیث وقرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو "حنفیہ" کے امام کا "سوانحی خاکہ" ہے' جسے جوشِ عقیدت کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ ایسی عقیدت' جس میں دوسرے فرقوں کی دل آزاری حرام ہے۔ "تفسیر وحدیث" بیان کرنا تو کجا' میں تو اس کے سمجھنے کا بھی اہل نہیں...... اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو میں نے اس موضوع کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کیا ہے وہ میرا بہترین سرمایہ تھے۔ کیسے بتاؤں کے ہر ماہ جتنے صفحات شائع ہوتے تھے ان سے زیادہ صفحات یہ سوچ کر ضائع کر دیتا تھا کہ وہ میرے امام کے شایان شان نہیں تھے۔ پھر بھی اگر مضمون تشنہ رہ جائے تو خدا مجھے معاف کرے کہ چند حرفوں کا جاننے والا عاجز بھی ہے اور بے اختیار بھی......

اور کچھ قارئین کا مطالبہ کہ مضمون میں معتبر کتابوں کے حوالے پیش کیے جائیں' بڑا عجیب مطالبہ ہے۔ اب یہ راز کیسے سمجھاؤں کہ موجودہ دنیا میں حرف اعتبار کیا ہے اور معتبر کسے کہتے ہیں؟ انجیل مقدس بدل دی گئی۔ توریت وزبور کے ساتھ بھی زمین والوں نے یہی سلوک کیا...... انتہا یہ کہ رسالت مآب ﷺ کی احادیث مقدسہ میں بھی کچھ انسانوں نے اپنے تراشیدہ اقوال شامل کر دیئے اور قیامت یہ ہے کہ ایسے ناقابل معافی گناہ کا ارتکاب کرنے والے اپنے ناموں سے مسلمان نظر آتے تھے۔ بیرون ملک سے ایک صاحب نے تو اپنے خط میں یہاں تک تحریر کر دیا تھا کہ "خان آصف" مخصوص نظریات کا حامل ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنی تحریروں کی صداقت پر مستند کتابوں کی شہادت پیش کرے۔ یہ سوال پہلے بھی مختلف زاویوں سے کیا گیا تھا' مگر میں خاموش رہا۔ میرے نزدیک حوالے تو وہ پیش کرتے ہیں جو اپنے خدا سے نہیں ڈرتے' کتابوں سے سند تو وہ لاتے ہیں جو اپنی "مسند علم" کو روشن رکھنے کے لئے "قرآن وحدیث" کے الفاظ کو بھی نئے نئے مفہوم پہنا دیتے ہیں...... تحریف کا یہ عمل صدیوں سے جاری ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو سربلند رکھنے کے لیے آیت الٰہی اور قول رسول ﷺ ہی پیش کرتا ہے' مگر اس طرح کہ انسانی مجمع میں اس کی ذات محترم ٹھہرے۔ میں تاریخی کتابوں کے نام شمار کرانے سے گریزاں نہیں ہوں کہ یہ بہت آسان کام ہے اور میں "کتابی حوالے" طلب کرنے والے افراد سے بدگمانی بھی نہیں رکھتا' مگر کہیں وہ میری تحقیق پر تو شک نہیں کر

رہے؟ آج یہ خیال اتنی شدت سے ابھرا ہے کہ میں اپنے دل میں ناقابل اظہار درد محسوس کر رہا ہوں۔ اگر کچھ قارئین کو میری کاوشوں پر شبہ ہے تو میں صفائی پیش کر کے ان سے اپنی بے گناہی کی سند نہیں مانگوں گا۔ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی ایک شخص نے برسر محفل یہی کہا تھا کہ حدیث رسول ﷺ کچھ اور ہے آپ کا قول کچھ اور...... یہ سن کر امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ جسم پر ایسی لرزش طاری ہوگئی تھی کہ حاضرین مجلس کو جاں سے گزر جانے کا گمان ہونے لگا تھا...... پھر حالت اضطرار ختم ہو جانے پر حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

''اگر میں قول رسول ﷺ پر اپنے کلام کو ترجیح دینے لگوں تو پھر کون زمین مجھے پناہ دے گی اور کون آسمان مجھے اپنے زیر سایہ رکھے گا۔''

بے شک! میری حیثیت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے قدموں سے لپٹے ہوئے غبار کے برابر بھی نہیں مگر خدا کی قسم! میں بھی یہی کہوں گا؟ اگر میرا ذہن ائمہ کرام کے سلسلے میں نئے واقعات تراشتا ہے تو پھر اس زمین کے کس گوشے میں میری پناہ ہوگی اور میں مملکت خدا کی حدود سے نکل کر کہاں جاؤں گا؟

اور کچھ قارئین کے خطوط میں اس حقیقت کا اظہار کہ میرے مضامین پڑھ کر ان کے دامن آنسوؤں سے تر ہو جاتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں کیا عرض کروں؟ کبھی ان لوگوں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انہیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ مصنف کی آنکھوں کے گوشے بھی شدت درد سے بھیگ گئے ہوں گے اور اس کا دامن بھی سوز غم سے جل گیا ہوگا...... اشکوں کی یہ دولت اتنی آسانی سے تقسیم نہیں کی جاتی...... پہلے دل کا خون ہوتا ہے' نہاں خانوں میں گلابی غبار اٹھتا ہے پھر یہ بادل آنکھوں سے برستے ہیں۔

کچھ اور تنگ نظر حضرات کے خطوط جو اپنے خول سے باہر نہیں نکلتے......تعصب کی کمیں گاہوں میں بیٹھ کر میری تحریروں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسے عجیب واقعات رقم کیے جا رہے ہیں۔

کاش وہ بھی میری طرح کشادہ دل ہوتے کہ میں مسلک کے اعتبار سے حنفی ہوں مگر مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ بھی میرے امام' ادریس بن شافعی رحمتہ اللہ علیہ بھی میرا پیشوا...... احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ بھی میرے رہنما اور جعفر صادق رحمتہ اللہ علیہ بھی میرے محبوب...... علم و دانائی تو مومن کی میراث ازلی ہے...... وہ کہیں بھی ہو اس پر ہم سب کا حق ہے۔ جب تک نگاہ بلند اور دل کشادہ نہ ہوں اس وقت تک کسی امام کی ذات جلیل کا عرفان نہیں ہوسکتا۔

دو گھڑی ہوش میں آنے کا گناہ گار

(خان آصف)

شہر کوفہ

یہ کوفے کی اندھیری رات میں روشنی کے ایک سفیر کا واقعہ ہے۔ وہ کوفہ جسے ہماری کم علمی نے ایک ایسا شہر بنا دیا ہے کہ اس کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہنوں میں شدید انتشار برپا ہو جاتا ہے اور دلوں میں اذیت و کرب کی تند و تیز لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ پھر ہماری سماعتوں میں اہل کوفہ کے وہ الفاظ گونجنے لگتے ہیں' جو رسالت مآب ﷺ کے محبوب نواسے حضرت امام حسینؓ سے کہے گئے تھے۔ اس شہر کے رہنے والوں نے بڑے سنگین لمحات میں شہید کربلا سے کہا تھا۔

"حسینؓ! ہمارے دل تمہارے ساتھ ہیں مگر تلواریں یزید کے ساتھ۔"

تاریخ میں ان الفاظ کی بازگشت اس وقت سنائی دیتی ہے جب حضرت امام حسینؓ اہل کوفہ کی دعوت پر دیار حرم سے نکل کر تپتے ہوئے صحرا میں کسی عسکری قوت کے بغیر تنہا کھڑے تھے اور اس تاریخی شہر کے باشندوں کو ان کا عہد یاد دلا رہے تھے۔ پھر امامؓ اور ان کے جاں نثار اپنے خون میں نہا گئے' مگر وہ عہد پورا نہ ہو سکا جس کا اظہار ہزاروں خطوط کے ذریعے کیا گیا تھا۔

اہل کوفہ کے دلوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے' مگر وہ اپنے اس عہد میں سچے ثابت ہوئے کہ ان کی تلواریں یزید کے ساتھ تھیں۔ پھر تہذیب انسانی کا یہ خوں رنگ اور المناک واقعہ تاریخ کے صفحات پر اس طرح رقم ہو گیا کہ آج بھی سرزمین کوفہ عام مسلمانوں کی نظر میں ایک خطہ معتوب کی حیثیت رکھتی ہے اور شاید قیامت تک کے لئے عراق کا یہ مشہور شہر پیاس، مظلومیت، محرومی اور بدعہدی کی نہ مٹنے والی علامت بن کر رہ گیا ہے۔ ہندوستان کے ایک ذہین شاعر پروفیسر ذکا صدیقی کے بقول ؎

دشتِ الفت بھی نہیں کوفے سے کم
ہر حسینِ دل یہاں پیاسا رہا

بے شک! اس سرزمین پر دجلہ و فرات کے کنارے کچھ لوگ پیاسے رہ گئے' مگر اسی مقام سے علم و معرفت کے وہ چشمے بھی پھوٹے کہ جن سے آج تک ایک مخلوق خدا سیراب ہو رہی ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہاں کے کچھ لوگوں نے حضرت امام حسینؓ سے بدعہدی کی' لیکن بعد میں آنے والوں نے خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ اس

طرح عہد نبھائے کہ ان کی جانیں تک وقت کی نیلام گاہ میں فروخت ہوگئیں۔



کوفے کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ اسے حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں آباد کیا۔ بصرے کے بعد عراق کے جس شہر نے زیادہ شہرت اور تاریخی حیثیت حاصل کی' وہ کوفہ تھا۔ جب مدائن وغیرہ فتح ہو چکے تو رسالت مآب ﷺ کے ماموں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے امیر المومنین حضرت عمر ابن الخطابؓ کو ایک خط تحریر کیا۔

''یہاں کی موسمی فضا سے عرب بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے چہروں کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔''

حضرت عمرؓ نے جواباً تحریر فرمایا۔'' اہل عرب کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آسکتی۔ تمہیں ایسا مقام تلاش کرنا چاہئے جو بری اور بحری دونوں حیثیتیں رکھتا ہو۔''

اس حکم کے پیش نظر حضرت سلمانؓ اور حضرت حذیفہؓ نے کوفے کی زمین کا انتخاب کیا۔ یہاں کی زمین ریتیلی اور کنکریلی تھی۔ اسی وجہ سے اس کا نام کوفہ رکھا گیا۔ اسلام سے پہلے عراق کے فرمانروا نعمان بن منذر کا دارالحکومت یہی مقام تھا۔ اس دور کی مشہور عمارتیں ''خورنق'' اور ''سدیر'' اسی کے آس پاس تعمیر کی گئی تھیں۔ دریائے فرات سے قریب ہونے کے باعث یہاں کا منظر بہت خوش نما اور دلفریب تھا۔ اہل عرب اس مقام کو ''محبوب کا رخسار'' کہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مختلف قسم کے عمدہ پھولوں کا ایک طویل و عریض چمن زار تھا۔

17 ہجری میں شہر کوفہ کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق کوفے میں چالیس ہزار خاندانوں کی آبادکاری کے لئے مکانات تعمیر کئے گئے۔ شاہراہیں چالیس ہاتھ سے بیس ہاتھ تک چوڑی رکھی گئی تھیں اور گلیاں اس قدر کشادہ تھیں کہ ان کی چوڑائی ستر ہاتھ تھی۔ جامع مسجد کی عمارت ایک بلند چبوترے پر تعمیر کی گئی تھی' جس کے صحن میں بیک وقت چالیس ہزار آدمی آسکتے تھے۔ چاروں طرف دور دور تک زمین کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔ پہلے ساری عمارتیں گھاس اور پھونس سے تیار کی گئی تھیں' مگر جب آگ لگنے کا واقعہ پیش آیا تو حضرت عمرؓ نے اجازت دیدی کہ اینٹ اور گارے کی مدد سے عمارتیں بنائی جائیں۔ جامع مسجد کے آگے ایک وسیع سائبان تعمیر کیا گیا تھا' جس کی لمبائی دوسو ہاتھ تھی۔ اس سائبان کی تعمیر کے لئے جو ستون لائے گئے تھے ان کا تعلق ایرانی حکمران نوشیرواں کی کسی عمارت سے تھا۔

مفتوحہ علاقہ ہونے کے باعث اس عمارت کا کوئی وارث نہیں تھا' لیکن حضرت عمرؓ نے اسلامی عدل و انصاف کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرنے کے لئے مجوسی (آتش پرست) رعایا کو تمام ستونوں کی قیمت ادا کی اور بعد میں انہیں استعمال کرنے کا حکم دیا۔ جامع مسجد کی حدود سے دوسو ہاتھوں کے فاصلے پر ایوان حکومت تیار کیا گیا جس میں ''بیت المال'' بھی شامل تھا۔

ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ'' بیت المال'' میں چوری ہوگئی۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کو اس ناگوار واقعے کی اطلاع ملی تو آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو تحریر کیا کہ'' ایوان حکومت'' کو مسجد سے ملا دیا جائے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے امیر المومنین کی ہدایت کے مطابق پارسی معمار'' روزبہ'' کو طلب کیا۔ وہ ایک بے مثال ماہر تعمیر تھا۔ اس نے پوری دلکشی اور موزونیت کے ساتھ'' ایوان حکومت'' کے'' بیت المال'' کو مسجد سے ملا دیا۔ یہ ایک کارنامہ تھا

جس کا صلہ دینے کے لئے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ''روزبہ'' اور اس کے ساتھی کاریگروں کو خلیفہ وقت کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ تاریخ کے اوراق اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ گواہ ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس غیر مسلم معمار کی بہت زیادہ عزت افزائی کی اور حکم جاری فرما دیا کہ ''روزبہ'' کی زندگی تک اسے مقررہ وظیفہ ملتا رہے۔

شہر کوفہ نے فاروقی خلافت کے زمانے ہی میں اس قدر عظمت وشان حاصل کر لی تھی کہ حضرت عمرؓ اسے ''راس الاسلام (اسلام کا سر) کہا کرتے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوفہ اپنے ابتدائی دور ہی میں عرب کی طاقت کا مرکز بن گیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کی آبادی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ مگر یہ خصوصیت ہر عہد میں برقرار رہی کہ یہاں آباد ہونے والے عام طور پر عربوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

مشہور محدث وکیع بن الجراح رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ''میں نے امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اہل کوفہ کو جو خط لکھا تھا اس کا سرنامہ اس طرح تھا۔

''اہل اسلام کے سربراہوں کے نام۔''

قبیلہ بنی عامر کے ایک محترم بزرگ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو خط تحریر فرمایا اس میں اہل کوفہ کا ذکر اس طرح کیا گیا تھا۔

''اللہ کا نیزہ...... ایمان کا خزانہ اور عرب کا سر...... اپنی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے اور شہروں کو تہذیب و تمدن سے آراستہ کرنے والے......''

ایک دوسرے موقع پر شمر بن عطیہ، امام شعبیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا۔

''عراق میں ایمان کا خزانہ ہے۔ اللہ کی تلوار ہے اور اس کا بھالا ہے، جہاں چاہتا ہے رکھ دیتا ہے (اس کے جلال و جبروت) کی قسم! اللہ ضرور ضرور کوفے والوں کی مدد کرے گا۔ زمین کے مشارق و مغارب میں۔ جیسا کہ اس نے کنکریوں سے مدد کی تھی۔''

حضرت سالمؒ حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

''کوفہ، اسلام اور مسلمانوں کا قبہ (گنبد) ہے۔''

ایک اور روایت کے مطابق حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ ''جس جوش اور جذبے کے ساتھ محمد مصطفیٰ ﷺ کے زمانے میں مدینے کی حفاظت کی جاتی تھی، اسی جوش اور جذبے کے ساتھ کوفے کی مدافعت کی جاتی ہے۔ جو شخص بھی اسے خراب و ویران کرنا چاہے گا اللہ اسے ہلاک و برباد کرے گا۔''

شہر کوفہ کے بارے میں سلمہ بن کہیلؓ کی یہ روایت بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ ابی صادقؓ نے فرمایا۔

''میں اس بات کو تم سے بہتر جانتا ہوں کہ سب سے پہلے دجال کس شہر کے رہنے والوں کا دروازہ کھٹکھٹائے گا؟''

مخاطبین کی جماعت نے سوال کیا۔ ''وہ کون لوگ ہیں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''تم لوگوں کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔''

امام شعبیؒ کی روایت ہے کہ قرظہ ابن کعب انصاریؓ نے کہا۔ ''ہم لوگوں نے کوفہ جانے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر فاروقؓ بہت گرم جوشی اور اصرار کے ساتھ ہمیں الوداع کہنے کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے غسل اور وضو کیا اور

دوبار فرمایا۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ میں تمہیں رخصت کرنے کے لئے تمہارے ساتھ ساتھ کیوں چل رہا ہوں؟"

ہم لوگوں نے عرض کیا۔ "ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں۔ اسی لئے آپ ہمارے ہمراہ چل رہے ہیں۔"

حضرت عمرؓ نے جواباً فرمایا۔ "یقیناً ایسا ہی ہے مگر اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ تم ایسے لوگوں کی طرف جا رہے ہو جو تلاوت قرآن کرتے رہتے ہیں اور اس طرح گنگناتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں۔ تم احادیث کے ذریعے انہیں اس کام سے نہ روک دینا کہ وہ احادیث کے ذکر میں مشغول ہو کر کتاب الٰہی کو مجبوری کی حالت میں (بالائے طاق) رکھ دیں۔ جاؤ دین کی حفاظت و اشاعت کا کام سرانجام دو۔ میں اس کام میں تمہارا شریک ہوں۔"

سلمہ بن کہیلؒ کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے ایک مکتوب میں اس تاریخ ساز شہر کے باشندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے کوفے والو! تم عرب کا سر اور اس کا تاج ہو اور تم میرے تیر ہو جسے اِدھر اُدھر پھینکا جاتا ہے۔ میں نے تم لوگوں کی طرف اللہ کے ایک بندے کو عامل بنا کر بھیجا ہے اور اسے اپنے نفس پر ترجیح دی ہے۔"

حارثہ بن مضربؒ کہتے ہیں کہ میں نے وہ حکم نامہ پڑھا تھا جو حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میں نے تم پر عمار بن یاسرؓ کو امیر اور عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم وزیر بنا کر بھیجا ہے۔ ابن مسعودؓ کو بیت المال کی افسری بھی دی گئی ہے۔ یہ دونوں حضور اکرم ﷺ کے ان ذی وقار اصحاب میں سے ہیں، جو معرکہ بدر میں شریک تھے۔ اس لئے ان کے احکام کو دل سے سننا اور اطاعت کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے تمہارے لئے عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنی ذات پر ترجیح دی ہے۔"

یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی جانفشانیوں کا نتیجہ تھا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعد کوفے کو تیسرے دارالعلوم کا شرف حاصل ہوا۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفہ تشریف لائے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علمی کارناموں کو ملاحظہ فرمایا تو آپ نے بہت زیادہ حیرت و مسرت کا اظہار کیا۔ حضرت ابن مسعودؓ کے حلقۂ درس میں بیک وقت چار چار ہزار طلبا کا ہجوم رہتا تھا۔ جب کوفے کی علمی حیثیت میں اس قدر اضافہ ہو گیا تو بڑے بڑے صحابہؓ بھی یہاں تشریف لاتے رہے۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ اصحاب رسول ﷺ کی اس جماعت میں بدری صحابہؓ بھی شامل تھے۔ معتبر تاریخی حوالوں سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کچھ صحابہ کرامؓ نے بھی اس شہر کو اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا تھا۔

یہودی الاصل مسلمان بزرگ صحابی حضرت کعب احبارؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ "اسرائیلیات" کے ماہر تھے اور کئی پر اسرار علوم پر آپ کو دسترس حاصل تھی۔ ان علوم میں "جفر" اور "نجوم" کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت کعب احبارؓ کے متعلق یہ روایت بھی مشہور ہے کہ آپ نے کئی روز پہلے حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی پیش گوئی کر دی تھی۔ انہی کعب احبارؓ کے نام سے یہ واقعہ بھی منسوب ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے آپ سے مختلف طبقات زمین کی صفات کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

جواباً کعب بن احبارؓ نے فرمایا۔ "حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا اور پھر جو چیز جسے چاہی عطا کر دی۔ عقل

نے اہل عراق (کوفہ) کو پسند کیا اور علم نے کہا میں اس شہر کے ساتھ ہوں۔"

اس روایت سے قطع نظریہ گوشہ زمین علمی اعتبار سے اس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں فقہ اور کوفہ لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ مشہور و مستند تاریخ "طبقات ابن سعد" میں ایک ہزار سے زیادہ فقہائے کوفہ کا تذکرہ موجود ہے۔ اہل دانش کی اس جماعت کثیر میں ڈیڑھ سو کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی بھی روشن نظر آتے ہیں۔

ایک عجیب خواب

اسی کوفے کی وہ تاریک رات تھی جب ایک آسودہ حال شخص بستر پر دراز تھا اور شدید اضطراب کے عالم میں اپنے خالق کو پکار رہا تھا۔ دینے والے نے اسے دنیا کی ہر نعمت بخشی تھی، مگر پھر بھی وہ ناقابل بیان کرب میں مبتلا تھا۔

"اے رب جلیل میری رہنمائی فرما کہ اب میں کدھر جاؤں؟ مجھے نہیں معلوم کہ میرے قدم منزل کی جانب اٹھ رہے ہیں یا میں ہوش و خرد کے غبار میں گم ہو گیا ہوں؟ بے شک! تو نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا اور پھر اسے ان چیزوں کا علم بخشا، جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔ عقل بھی تیری بارگاہ کرم کی عطا ہے اور خبر بھی تیرے در تقسیم کی بھیک ہے۔ تو علیم بھی ہے، خبیر بھی ہے۔ اپنی آگہی کے لامحدود خزانوں میں سے چند لفظوں کے دینار چند حرفوں کے درہم مجھ گدائے بے نوا کے بوسیدہ دامن میں بھی ڈال دے۔ تیرے ہی پاس ارض و سماء کی کنجیاں ہیں، مجھ پر بھی عرفان ذات اور فہم و ادراک کے دروازے کھول دے۔ اے کائنات کے ذرے ذرے کا علم رکھنے والے! تو بہتر جانتا ہے کہ اگر تیرا کرم ایک لمحے کے لئے بھی مجھ پر سایہ فگن نہ ہو تو میں ہلاک ہو جاؤں۔ تیرے سایہ رحمت سے نکل کر میرا وجود و عدم سب برابر ہے۔ میں تو پہچانا ہی تیرے رحم و کرم کے حوالے سے جاتا ہوں۔ اے بے حساب دینے والے! مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹا کہ تیرے سوا میرا کون ہے؟" مانگنے والا اس طرح مانگ رہا تھا کہ سوز دروں سے اس کا سینہ جل رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ یہ گریہ نیم شبی بہت دیر تک جاری رہا اور پھر مانگنے والا گہری نیند سو گیا۔

ایسے جانگداز لمحوں میں نیند کہاں آتی ہے، مگر قدرت چاہتی تھی کہ وہ خواب کی دنیا میں چلا جائے۔ بالآخر اس کے اعصاب پر نیند مسلط کر دی گئی۔ پھر اسی نیند کے عالم میں وہ بے قرار و مضطرب انسان اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلا کوفے کی گلیاں اور شاہراہیں عبور کیں۔ اب وہ ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا۔ کئی شہر آئے اور گزر گئے مگر اس کے بے چین قدم کسی مقام پر نہ ٹھہرے۔ وہ منزل خواب کا مسافر تھا۔ سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ عراق کی حدود بھی ختم ہو گئیں مگر منزل ابھی بہت دور تھی۔ پھر وہ حجاز مقدس میں داخل ہوا۔ ارض پاک کا ایک ایک ذرہ سجدہ طلب تھا۔ اس کا سر نیاز خم ہو گیا اور وہ دست بستہ حالت میں آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر رات بھر جاگنے والی آنکھوں کے سامنے گنبد خضرا کا منظر جانفزا طلوع ہوا۔ مسافر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ غلام آقا کے حصار ادب میں آ پہنچا تھا۔ جلال قدسی کے اثر سے آنکھوں کی بینائی زائل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے آنکھیں زمیں بوس ہو گئیں۔ جسم پر لرزہ طاری تھا اور قوت رفتار سلب ہوتی جا رہی تھی، لیکن وہ تشنہ لب، علم و آگہی کے سمندر سے اتنا قریب پہنچ کر ناکام و نامراد واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سوچا اگر زم زم رسالت ﷺ سے مکمل سیرابی اس کے مقدر میں نہ ہو تو پھر چند قطرے ہی حلق سے اتر

جائیں اور اگر قسمت یہاں تک بھی یاوری نہ کرے تو پھر کم سے کم زبان ولب ہی اس لذت لازوال سے آشنا ہو جائیں۔ خوشبوئے نبوت ﷺ سے پیرہن معطر نہ ہو تو خاک مدینہ سے سرشار ہو کر گزرنے والی صبا اس کے دامن ہی کو چھولے۔ بس یہ اعزاز ہی اس کی سربلندی کے لئے کافی ہوگا۔ یہ سعادت بھی کسے ملتی ہے؟ اسی وارفتگی شوق نے مسافر کو مزید آگے بڑھنے کی توانائی بخشی۔ اب وہ سرور کونین ﷺ کے قدموں میں کھڑا تھا۔ یہ کیسی حضوری تھی کہ جہاں جبرئیل امین علیہ السلام بھی ایک خاص فاصلے کے ساتھ باادب کھڑے رہتے تھے۔ وہاں کوفے کے ایک باشندے کو اس قدر قربت کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

مسافر اس حضوری پر نازاں تھا کہ اچانک دست غیب نے اسے ایک تیشہ فراہم کر دیا اور پھر وہ آداب غلامی کو فراموش کر کے اپنے آقا کی قبر کھودنے لگا۔ کون جانے کہ مسافر اس وقت کس کیفیت سے دوچار تھا۔ بس تاریخ میں تو اتنا رقم ہے کہ وہ کوفے کا باشندہ مرقد رسول ﷺ پر تیشہ زنی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تمام مٹی صاف ہو گئی اور سرور کائنات ﷺ کا جسم اطہر روشن نظر آنے لگا۔ مسافر کے ہاتھوں سے تیشہ چھوٹ گیا اور آنکھیں بجھ کر رہ گئیں ۔

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

اگرچہ مسافر خود بھی اہل نظر تھا' لیکن کس آنکھ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ پیکر رسالت ﷺ کی ضیاباریوں کو برداشت کر سکے۔ خاک کے سینے سے جب نبوت ﷺ کا وہ مہر منیر طلوع ہوا تو مسافر کی بصارت بھی ختم ہو گئی۔ اب گردوپیش کی تمام اشیاء اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ مسافر کا ذہن جاگ رہا تھا' مگر بینائی معدوم تھی اور نگاہوں کے سامنے کئی حجابات حائل ہو چکے تھے۔ اب اس کے دل و جاں پر ایسا لرزہ طاری تھا جیسے قیامت نازل ہو چکی ہو اور زمین کو ایک ناقابل فہم طاقت کے ساتھ ہلایا جا رہا ہو۔ اس جنبش ارض کے سامنے دنیا کے تمام زلزلے ہیچ تھے۔

خوف و دہشت سے مسافر کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا بدن پسینے سے تر تھا۔ وہ لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے اطراف پر نظر ڈالی۔ نہ وہ منظر تھا نہ مسافر' نہ آنکھ تھی' نہ وہ منزل۔ خود اس شخص کا اپنا مکان تھا' بستر تھا اور شہر کوفہ تھا۔

دیار مدینہ' قبر رسول ﷺ' دست غلام' تیشہ زنی' بے ادبی کی انتہا' گستاخی اور سرکشی کا عروج' یہ سب کچھ کیا تھا؟ وہ شخص کانپ اٹھا' جس مرقد اطہر ﷺ پر فرشتے شب و روز درود و سلام پیش کرتے ہیں' میں نے اس طرح اس کی بے حرمتی کی؟ وہ مٹی جس پر عرش اعلیٰ سے براہ راست رحمت باری نازل ہوتی ہے' میں نے اسے اپنے ہاتھ سے منتشر کر دیا۔ یہ کیسا جرم ہے؟ سنگین' ناقابل معافی جرم۔"

سوچنے والا سوچ رہا تھا۔" وہ تو محض ایک خواب پریشاں تھا۔" عقل نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"اگر خواب تھا تو اس کا زاویہ تبدیل بھی ہو سکتا تھا۔ اس شخص نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "خواب میں رسم غلامی بھی ادا کی جا سکتی تھی۔ حضور آقا، درود و سلام بھی پیش کیا جا سکتا تھا۔ پھر یہ تیشہ زنی کیوں تھی؟ کیا میری فطرت میں سرکشی شامل ہو گئی ہے؟ کیا میں صرف اپنی زبان سے رسالت ﷺ کی تصدیق کرتا ہوں؟ اور جب روح کی گواہی کا وقت آتا ہے تو وہ باغیانہ روش اختیار کر لیتی ہے؟ کیا یہ میری عقل کی صحیح عکاسی ہے؟ کیا میرے

زبان و دل میں اس قدر نمایاں تضاد موجود ہے؟ کیا معاذ اللہ! میں ہلاک ہو گیا؟ کیا یہ میری حقیقی شخصیت ہے جو عالم خواب میں بیدار ہوئی؟ اے میری عمر گریزاں! یہی ہے ان لوگوں کا صلہ جو اپنے عہد پورے نہیں کرتے۔'' اتنا کہہ کر وہ شخص رونے لگا۔ یہ گریہ وزاری اتنی شدید تھی کہ پڑوسیوں کی آنکھ کھل گئی پھر سننے والوں کو اس کی شدت گریہ پر شور ماتم کا گماں ہونے لگا۔

وہ بڑے آہنی اعصاب کا انسان تھا۔ والد گرامی کے انتقال پر بھی اس نے صرف آنسو بہائے تھے۔ جنازے میں شریک سیکڑوں افراد میں کسی ایک نے بھی اس کے ہونٹوں کو آمادہ فغاں نہیں دیکھا تھا۔ قبر میں اتارے جانے کے وقت بھی وہ ساکت و خاموش تھا۔ جب اس کے شفیق و مہربان باپ کے جسم کو تہہ خاک رکھ دیا گیا اور یہ عزیز ترین ہستی اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی، تب بھی اس نے بے اختیار ہو کر اپنا گریبان چاک نہیں کیا' فریاد کی کوئی لے بلند نہیں ہوئی، کوئی حرف شکایت لبوں تک نہ پہنچا۔ بس آنکھیں اشک بار ہوئیں اور پھر اس نے اپنے والد گرامی کو بڑے باوقار انداز میں الوداع کہا۔ دست قدرت نے اپنے آفاقی اصول کے تحت اس کے سینے پر داغ یتیمی سجا دیا۔ ایسی کرب ناک فضا میں بھی اس نے غیر اسلامی رسموں کی تقلید نہیں کی۔ وہ رویا مگر اہل ایمان کی طرح۔ اس نے اشک ریزی کی مگر ایک صاحب ظرف کی طرح۔ پڑوسیوں کی نگاہوں میں ماضی کے وہ تمام مناظر ابھر آئے' جب وہ شخص اپنی نوجوانی میں اس قدر جذباتی حادثے سے گزرنے کے باوجود ثابت قدم رہا' پھر اچانک اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ کیسا صدمہ تھا جس سے نڈھال ہو کر اس کے تاب و تواں رخصت ہو چکے تھے اور اس کی قوت برداشت اس حد تک زائل ہو گئی تھی کہ شور و فغاں گھر کی دیواروں سے بلند ہو کر پڑوسیوں کی سماعتوں پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

ابھی اس شخص کی گریہ وزاری کا تسلسل برقرار تھا کہ قریب کی مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔

''اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جیسے ہی یہ کلمہ سرمدی فضاؤں میں گونجا، رونے والے کی ہچکیاں بند ہو گئیں مگر آنکھوں سے آنسو بدستور بہتے رہے۔ پھر اس کے قدم خانہ خدا کی طرف اٹھنے لگے۔ نماز پڑھنے والوں کی جماعت قائم ہوئی کچھ دیر بعد اہل ایمان رسم بندگی ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے' مگر وہ شخص ایک گوشے میں تنہا بیٹھا رہا۔

ایک بار پھر رات کا خواب اس کے ذہن کی سطح پر ابھرنے لگا۔ خیالات کی رو منتشر ہوئی تو وہ کوفے کی حدود سے نکل کر مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ خواب کا ایک ایک نقش تصورات میں مجسم ہوتا رہا۔

''تیشہ۔ آرام گاہ رسالت ﷺ۔ پیکر نور''

وہ خوف و دہشت سے لرز کر رہ گیا۔ اب سجدہ ہی تنہا مقام عافیت تھا۔ اس نے پیشانی زمین پر رکھ دی اور نہایت پرسوز لہجے میں اپنے رب کی کبریائی بیان کرنے لگا۔ پھر گداز قلب یہاں تک بڑھا کہ لفظ پگھلنے لگے۔ آخر زبان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

کئی دن تک وہ ایسی ہی حالت کرب سے دوچار رہا۔ کس سے اپنا غم بیان کرتا؟ اس کا تو غم ہی ساری دنیا سے نرالا تھا۔ کیا کسی سے یہ کہتا کہ میں نے عالم خواب میں سرور کونین ﷺ کے مزار اقدس پر تیشہ زنی کی ہے؟ اپنے اس گستاخانہ طرز عمل کو وہ کس طرح زبان پر لاتا؟ کیا یہ بے ادبی کی انتہا نہ تھی؟ پھر وہ خود اپنے اس تصور پر لرزہ براندام رہتا تھا کہ یہ خواب اس نے کیوں دیکھا؟ قبر رسول ﷺ کو کھودنا کہیں انسانی فطرت کی سرکشی کی علامت تو نہیں؟ کہیں

وہ کسی بڑی گمراہی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے کہ خدا نے اسے خواب کے ذریعے تنبیہ کی ہے؟ اس کے منتشر دماغ میں بے شمار خیالات ابھرتے رہے۔ وہ مسلسل ان خیالات میں الجھتا رہا یہاں تک کہ اس کے دنوں کا چین غارت ہو گیا اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ایک اضطراب مسلسل تھا جس نے اس کے اعصاب کو شکستہ کر کے رکھ دیا تھا۔

جب یہ جانگداز کرب حد سے گزرا تو وہ شخص اپنے ایک عالم و فاضل دوست سے رازدارانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ "میرے دل پر ایک بارگراں ہے جو میری روح تک کو پگھلائے دے رہا ہے۔" اس نے اپنی اذیت ناک کشمکش کا ذکر کیا، مگر خواب کی تفصیلات ہونٹوں تک نہ آنے دیں۔

"تم تو خود فن تعبیر سے واقف ہو" دوست حیرت زدہ ہو کر بول رہا تھا۔ "تم نے اکثر لوگوں کے خوابوں کی تعبیرات بیان کی ہیں اور وہ درست بھی ثابت ہوئی ہیں۔ پھر اپنی ذات کے بارے میں یہ تذبذب، یہ کشمکش کیوں؟ خود ہی خواب کی نوعیت کا اندازہ کرو اور مطمئن ہو جاؤ۔ تمہیں کسی ماہر تعبیر سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" دوست نے بڑی غیر جانبداری کے ساتھ مشورہ دیا جو حقیقتاً درست تھا۔

خواب دیکھنے والے شخص کی عالمانہ حیثیت اہل کوفہ پر روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ سارا شہر خود اس کے روبرو اپنے الجھے ہوئے مسائل پیش کرتا تھا اور وہ انہیں اس طرح حل کر دیا کرتا تھا کہ لوگ مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ مگر آج اسی شخص کو ایک ذاتی خواب نے عاجز کر دیا تھا۔ "اگر اس خواب کی تعبیر اتنی ہی آسان ہوتی تو میں اپنے رب کے حضور مسلسل کئی راتوں تک گریہ وزاری کیوں کرتا؟ روئے زمین پر شاید ہی کسی شخص نے ایسا عجیب خواب دیکھا ہو گا؟ میں اپنے تمام تر علم کے باوجود اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ خدا میری بے چارگی پر رحم فرمائے کہ اب اس کی دستگیری کے بغیر ہدایت ممکن نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ خواب ایک راز ہے، ایک تنبیہ ہے، ایک اشارہ ہے۔"

"اگر آپ کے دل پر یہ راز منکشف نہیں ہو سکتا تو پھر امام محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے رجوع کیجئے۔" دوست نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا نام سن کر اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ افسوس اب امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کہاں؟ وہ تو دس سال پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر وہ ہم لوگوں کے درمیان موجود ہوتے تو میرے اضطراب کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ میں امام رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بے جھجک اپنا خواب بیان کر دیتا۔ صد حیف! کہ ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی طرح اب کوئی دوسرا انسان دور دور تک نظر نہیں آتا۔"

دوست خاموش ہو گیا اور اپنی اس بے خبری پر اظہار ندامت کرنے لگا کہ امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال کو دس سال ہو گئے اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ مجلس علم سے کیسا باکمال اٹھ کر چلا گیا۔

وقت گزرتا رہا اور گردش روز و شب کے ساتھ اس شخص کی بے قراریاں بھی بڑھتی رہیں۔ پھر ایک دن کسی نے ایک ایسے بزرگ کے متعلق خبر دی جو کوفے میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کہنے والے نے کہا کہ وہ بزرگ دنیا کے ہنگاموں سے دور رضائے الٰہی میں گم رہتے ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ تعبیر خواب کا علم بھی رکھتے ہوں۔ سننے والے نے سنا اور پھر اس کے مضطرب قدم ایک ایسے مرد حق پرست کی طرف اٹھنے لگے جسے کسی امیر وقت کی پروا تھی اور نہ کسی خلیفہ نما سلطان کا خوف۔

گوشہ نشین بزرگ نے آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں کی بات تھی۔ نگاہ معرفت کے سامنے کئی زمانے آئے اور گزر گئے۔ خواب بیان کیا گیا۔ بزرگ کی نظریں مسلسل اس شخص کے چہرے کی نگراں تھیں۔

"ایک غلام اس بے ادبی کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے آقا کی خواب گاہ جلال پر تیشہ زن ہو۔ کیا غلام کے لئے یہ ہلاکت کی خبر نہیں ہے؟" کہنے والے کا لہجہ رقت آمیز تھا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔" بزرگ کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم تھا اور اس کی نظریں مستقل اس شخص کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ "یہ بڑا شرف ہے بڑی خبر ہے۔"

خواب بیان کرنے والا حیرت زدہ تھا، بے شمار اذیت ناک لمحے گزرنے کے بعد یہ پہلی ساعت آئی تھی جس میں سلامتی کا پیغام پوشیدہ تھا۔

"تم حیران کیوں ہو؟" بزرگ نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

"میرے لئے تو غلامی ہی کا شرف کافی ہے۔" اس شخص نے عاجزی سے کہا۔ "آپ کس شرف کی خبر دے رہے ہیں؟"

"ہم سب اسی ذات اقدس کے غلام ہیں، مگر کچھ غلام شاہانہ انداز رکھتے ہیں تم وہی غلام ہو جسے آقا کی بارگاہ سے شہنشاہیت کا اعزاز ملنے والا ہے۔ عنقریب تم مخلوق خدا کے دماغوں پر، دلوں پر اور روحوں پر حکومت کرو گے۔ تمہیں ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا، جسے نہ کوئی چھین سکے گا، نہ اتار سکے گا اور نہ اس پر موسمی انقلاب اثر انداز ہوں گے۔ اس کی آب و تاب صدیوں پر محیط ہو گی۔ آنے والے قیامت تک اس کی رخشندگی دیکھیں گے۔ زمان و مکاں اس وقت تک اسے دھندلا نہ کر سکیں گے، جب تک سورج اپنی روشنی سے محروم نہ ہو جائے، آسمانوں کی طنابیں نہ کھینچ دی جائیں اور زمین موت سے شکست کھا کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔"

"کیا میں عجمی، ایرانی النسل، ایک عام انسان؟" اس شخص کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"کیسا عرب کیسا عجم؟ قادر مطلق کا فیصلہ! جبار و متکبر کا حکم! وہ مالک ارض و سما، وہ بے نیاز جسے چاہے عطا کرے۔ معاذ اللہ کون ہے اس کی مرضی میں رخنہ اندازی کرنے والا؟ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔" بزرگ کا جوش گفتار قابل دید تھا۔ "میرے قریب آؤ۔" نہ یہ کوئی حکم تھا، نہ کوئی التجا، ایک مختصر سا کلمہ تھا جو ان کی زبان سے عجیب انداز میں ادا ہوا تھا۔

خواب بیان کرنے والا یہاں تک آگے بڑھا کہ جسمانی فاصلے بہت کم رہ گئے۔ پھر وہ بزرگ خم ہوئے اور اپنے ہونٹ مخاطب کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ "روز ازل لوح محفوظ پر یہی رقم کیا گیا تھا۔"

اس کے بعد ان آنکھوں کو بوسے دینے لگے جو خواب میں رسالت مآب ﷺ کے دیدار سے شرف یاب ہوئی تھیں۔ "ہاں یہ وہی آنکھ ہے۔ خدا کی قسم وہی آنکھ ہے۔"

پھر بزرگ اپنے مخاطب کے سر پر دونوں ہاتھ پھیرنے لگے۔ "بے شک تم وہی شخص ہو جو کتاب و سنت کے علم کو زندہ کرے گا۔ یہی اس خواب کی تعبیر ہے۔ خدا تمہیں کارزار حیات میں استقامت بخشے۔" یہ کہتے کہتے بزرگ رونے لگے اور پھر وہ شخص بھی اشکبار ہو گیا جس نے یہ مقدس و عظیم خواب دیکھا تھا۔

حافظ ابوالمحاسن نے اس خواب کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ان بزرگ نے تعبیر بیان کرتے ہوئے اس شخص

کے ذریعے مردہ علم کے زندہ ہونے کی بشارت دی تھی۔

بعض مؤرخین نے اس خواب کی تفصیلات دوسرے انداز میں پیش کی ہیں' مگر ان سب کا مفہوم ایک ہے کہ مردہ علم دوبارہ زندہ ہو جائے گا اور قدرت یہ منصب جلیل کوفے کے ایک باشندے کو عطا کرے گی۔

تاریخ عالم پر نقش دوام ثبت کرنے والا کوفے کا وہ باشندہ کون تھا؟

نصف شب کے سناٹوں میں اپنے خالق کے حضور خم رہنے والے' کفر و باطل کی تاریکیوں میں ایمان و راستی کے اجالے' روئے زمین پر اپنے وقت کے سب سے زیادہ دانشمند' عابدوں اور زاہدوں کی جماعت میں سربلند' پرہیزگاروں کے پرہیزگار' اہل دل کا صبر و قرار' مسافر مدینہ و نجف' راہ خدا میں سربکف، شعلہ بجاں' قرآن بدست' یہ تھے مرد حق پرست' حضرت نعمان بن ثابت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ۔

جب آتش کدے بجھ گئے

ایران کا آتش کدہ جو صدیوں سے روشن تھا طلوع اسلام کے بعد 14 ہجری میں بجھ گیا۔ آگ کے پجاری کہا کرتے تھے کہ یہ شعلے کبھی سرد نہیں ہوں گے اور انہیں بجھانے والی مخلوق آج تک پیدا نہیں کی گئی۔ مگر جب ایمان کی تیز ہوائیں فاران کی چوٹیوں سے اتر کر ایران کے میدانوں میں داخل ہوئیں تو پھر سب کچھ خس و خاشاک کی مانند اڑنے لگا۔ نوشیروان کی نادر و قیمتی یادگاریں ایک ذرہ خاک سے بھی حقیر ٹھہریں اور ایوان کسریٰ کے مینار زمین بوس ہو گئے۔ شاہان مغرور کے نسب نامے ورق ورق ہو کر بکھر گئے۔ ان کے کاسہ سر ٹھوکروں سے پامال ہونے لگے' ہڈیاں چیخ کر ٹوٹنے لگیں اور پھر مٹی کی ہم رنگ ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ان کی آخری نشانیاں تلاش کرنے والا بھی کوئی باقی نہ بچا۔ اتنی قدیم اور طاقتور سلطنت کی بساط یوں الٹی کہ مرثیہ خواں تک نہ رہے۔ ماتم گساروں کو بھی قانونِ مکافات عمل نے کھا لیا۔ موت کا خونی دہن اپنے پورے طول و عرض کے ساتھ کھلا ہوا تھا اور عیش پرست ایران کی فضاؤں میں بہت دن تک یہ ہولناک صدا گونجتی رہی۔

"ہے کوئی اور...... ہے کوئی اور"

پھر نقیب وقت نے جواباً کہا۔ "کوئی نہیں کوئی نہیں۔ سوائے اللہ کے۔" یہ آواز سنتے ہی مسلمانوں کے امیر لشکر حضرت سعد بن وقاصؓ کی شمشیر اپنی نیام میں چلی گئی اور نہ جانے کتنی راتوں سے عالم کرب میں جاگنے والے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو قرار آ گیا۔

خدا نے مسلمانوں سے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ ایرانی آتش کدے کو بجھا دیا گیا۔ اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے باوجود آگ ایک بے حقیقت شے ہے۔ پانی کی چند بوندیں جسے راکھ کر دیں' وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ آج یہ بات اہل ایران کی سمجھ میں آ گئی تھی اور وہ قطار در قطار حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ پھر بھی بے شمار دلوں میں نفاق تھا اور وہ بجھے ہوئے شعلوں کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے اپنی شکستہ زندگی کو حادثات کی شاہراہ پر کھینچ رہے تھے۔ اگر اہل ایمان چاہتے تو ان کے جسموں کو سروں کے بوجھ سے ہلکا کر سکتے تھے' لیکن اسلام میں جبر و اکراہ کی گنجائش نہیں۔ وہ امان طلب کرنے والوں پر ایک مہربان کی طرح سایہ فگن ہو جاتا ہے اور فاتح ہونے کے بعد بھی انہیں ان کے عقائد پر چھوڑ دیتا ہے۔ ایرانیوں کے ساتھ بھی اسلام نے اپنی رواداری اور اعلیٰ ظرفی کی اس روایت کو زندہ رکھا تھا۔

مفتوحہ علاقے کے لوگ مکمل آزاد تھے اور انہیں مطلق العنان حکمرانی کے سوا دنیا کی ہر آسائش حاصل تھی۔ پھر جن کے لئے ہدایت لکھ دی گئی تھی وہ ہدایت پا گئے۔

ان ہی ہدایت یافتہ افراد میں ایک شخص زوطی بھی تھے۔ زوطی پر کوئی تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ وہ بھی اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح خدا کی زمین پر آزادانہ چلتے تھے مگر دل میں ہر وقت ایک خلش سی رہتی تھی۔ آخر اسی خلش نے انہیں آتش پرستوں کے حصار سے باہر کھینچ لیا۔ اب وہ دل سے اسلام کی صداقتوں کا اقرار کرنے لگے تھے۔ پھر یہ اقرار زبان تک آ گیا۔ زوطی اپنے آباؤ اجداد کے عقائد کی نفی کر رہے تھے۔ صحرائے عرب اور سرزمین ایران میں مادی اعتبار سے کوئی تقابل نہیں تھا۔ رسول عربی ﷺ کا پیغام لانے والے جلتی ہوئی ریت میں سانس لیتے تھے' سادہ لباس پہنتے اور معمولی غذا استعمال کرتے تھے۔ جدید اقتصادی نظریات کے لحاظ سے اہل عرب پس ماندہ تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر اتنے امیر تھے کہ انہیں ساری دنیا بھکاری نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس ایرانی باشندے بے پناہ وسائل کے مالک تھے اور خود کو ترقی یافتہ قوموں میں سرفہرست شمار کرتے تھے۔ ان کے غرور و تکبر کا حال یہ تھا کہ انہیں اپنے علاوہ کسی خطہ ارض پر کوئی انسان ہی نظر نہیں آتا تھا۔

اہل ایران کے نسلی تعصب کی انتہا یہ تھی کہ سیکڑوں سال گزر جانے کے بعد جب مشہور فارسی شاعر فردوسی نے "شاہنامہ ایران" تصنیف کیا تو اس کے قلم سے تحقیر و نفرت کا زہر ٹپکنے لگا۔ دربار میں عرب سفیروں کی آمد پر ایرانی شہنشاہ یزدگرد نے انہیں اس طرح مخاطب کیا۔ "اے سوسمار (چھپکلی سے مشابہ جانور) کا گوشت کھانے والے۔ اور اے اونٹ کا دودھ پینے والو!"

نسلی برتری کے اس انداز میں زوطی کا خاندان بھی اسیر تھا۔ ایک دن جب زوطی نے قرابت داروں کو اپنے فکری اور روحانی انقلاب سے آگاہ کیا تو آتش پرستوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کرہ ارض پر قیامت نازل ہو گئی ہے۔ خونی رشتوں نے انہیں بڑے غضب ناک لہجے میں پکارا۔

"اے عظیم نوشیرواں کے بے عقل وارث! تو نے صحرائے عرب کے ان لوگوں کا عقیدہ اختیار کر لیا جنہیں انسانی تہذیب و تمدن چھو کر بھی نہیں گزرے۔ یہ کیسا خلل دماغ ہے کہ تو نے شاہان فارس کے جاہ و جلال کو وحشت اثر ریگزاروں کے حوالے کر دیا۔ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو اپنے نامور بزرگوں کی آوازیں کیوں نہیں سنتا؟ کیا مسلمان ساحروں نے تیری سماعت پر قفل لگا دیئے؟"

(بعض عقیدت مندوں نے زوطی کا سلسلہ نسب ایرانی شہنشاہ نوشیروان تک پہنچا دیا ہے' اسی لئے نوشیروان کا نام لے کر ان پر طعنہ زنی کی گئی تھی۔)

"ہاں' میں دشت عرب کے قلب سے ابھرنے والا وہ نغمہ سن رہا ہوں جس کی سماعت سے سلاطین وقت محروم رہے۔ آج میں اپنے مورث اعلیٰ کی بدنصیبی پر ماتم کر رہا ہوں کہ وہ اس کلمہ لازوال کو سنے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔" زوطی اہل خاندان کے روبرو نہایت بے باکی سے بول رہے تھے۔ "مسلمانوں کے خدا کے سامنے ہمارا خدا بجھ گیا۔ بے شک! عرب سے آنے والوں کا خدا عظیم بھی ہے اور لائق پرستش بھی۔"

"اسلام کا یہ سیلاب عارضی ہے۔" عزیزوں نے لہجہ بدل کر زوطی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "گردش وقت نے ہمارے آتش کدے بجھا دیئے مگر وہ آگ دلوں میں ہمیشہ بھڑکتی رہے گی۔ تم زبان سے کچھ بھی کہو' کوئی بھی اقرار کرو

لیکن اپنے دل کو اسی آگ سے روشن رکھو۔ آگ ہی یزداں کی ذات ہے' آگ ہی اس کے بندوں کی نجات ہے۔"
ذہنوں کی کجی اب بھی قائم تھی اور دلوں کی ٹیڑھ اب بھی برقرار تھی۔

زوطی نے اپنے ماضی کی طرف لوٹنے سے انکار کر دیا۔ پھر ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا' جو رسموں سے بغاوت کرنے والوں کے لئے جائز سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تمام اہل خاندان نے زوطی سے معاشرتی روابط منقطع کر لئے۔ ترک تعلق کرنے والوں میں زوطی کے ماں باپ بھی شامل تھے۔ سب سے زیادہ قریبی رشتے نامعتبر ٹھہرے تھے۔ مگر شریک حیات نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کیا اور زوطی کی خاطر ہر شے سے منہ موڑ لیا۔ پھر ان پر اقتصادی پابندیاں عائد کی گئیں۔ زوطی کچھ عرصے تک افلاس کی آزمائش سے گزرے۔ ممکن ہے فاقہ کشی کی بھی نوبت آ گئی ہو' مگر وہ اپنے نئے عقائد کی پرورش کے لئے سارے دکھ جھیلتے رہے۔ بعض تاریخی روایات سے پتا چلتا ہے کہ جب زوطی کو غربت بھی متزلزل نہ کر سکی تو ان پر تشدد کے حربے استعمال کئے گئے بالآخر سرزمین ایران ایک نومسلم پر تنگ ہو گئی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب زوطی اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ بیوی کو ہمراہ لیا اور بام و در پر حسرت کی نظر کرتے ہوئے نہایت رقت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

"اے زمین! تیرے رشتے کیسے ناقابل اعتبار ہیں کہ آج میں رخصت ہو رہا ہوں' مگر مجھے روکنے والا کوئی نہیں۔ تیری پناہ کتنی بے اثر ہے کہ میں زیر فلک بے اماں کھڑا ہوں اور میرے سر پر کوئی سائبان نہیں۔ اے ارض فارس! میں تیری بے رحمی کا کیا معیار قائم کروں کہ تو اپنے فرزندوں کے لئے تنگ ہو گئی۔ صحرائے عرب سے آنے والوں نے ہمیں گھر سے بے گھر نہیں کیا۔ خود مکانوں نے اپنے مکینوں سے آشنائی کے تمام حوالے جھٹلا دیئے۔ الفراق! اے میرے اب وجد کی بے نشان قبرو! الوداع! اے آگ کے پرستارو! میں ان لوگوں کی طرف جا رہا ہوں جو کسی مردہ اور بے حقیقت شے کی عبادت نہیں کرتے۔ جن کے حوصلے بلند اور سینے کشادہ ہیں۔ جو عورت کو متاع کوچہ و بازار نہیں سمجھتے' جو دشمنوں پر بھی ابر کرم کی مانند برستے ہیں' جو تہذیب کے مقتل میں سلامتی کا پیغام لے کر آئے۔ جو عافیت کے نقیب اور روشنی کے سفیر ہیں۔ رخصت اے زندانِ شب! میں ضمیر کے انہی اجالوں کی طرف جا رہا ہوں۔"

پھر زوطی ایران کی حدود سے نکل گئے۔ اب ان کے قدم سرزمین عراق کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ راستے میں کن حادثات سے دوچار ہوئے' کتابوں میں یہ تفصیلات درج نہیں۔ پھر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا یہ سفر سخت دشوار گزار ہو گا۔ بہر حال زوطی کسی نہ کسی طرح کوفہ پہنچ گئے۔ غالباً یہ 63 ہجری کا واقعہ ہے۔ اس وقت امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ اپنے جسم پر شہادت کا پیرہن سجا کر بزم دوست چلے گئے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نہایت پرآشوب حالات میں اہل اسلام کی خدمت کا بار گراں اٹھا لیا تھا۔

جس شہر کی بنیاد حضرت عمر فاروقؓ نے رکھی تھی' وہ حضرت علیؓ کے عہد میں دارالخلافہ قرار پایا تھا۔ زوطی کچھ دن تک اپنے معاشی حالات درست کرنے کے سلسلے میں سرگرداں رہے۔ عام مسلمانوں نے ایک ایسے شخص کے لئے اپنی آغوش محبت وا کر دی جس نے قبول اسلام کی راہ میں بڑی اذیتیں برداشت کی تھیں۔ تاریخوں سے اس حقیقت کی نشاندہی تو نہیں ہوتی کہ زوطی کس طرح دربار خلافت میں پہنچے' مگر اس صورت حال پر تمام مؤرخین متفق ہیں کہ زوطی کو امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالبؓ کی بارگاہ میں رسائی حاصل تھی۔ زوطی صاحب علم و فضل نہیں تھے کہ حضرت علیؓ

ان کے کمالات سے متاثر ہو کر انہیں دربار میں طلب کرتے۔ زوطی ایران کی کوئی بڑی سیاسی شخصیت بھی نہیں تھے کہ کوفے میں داخل ہونے کے بعد اسلامی مملکت کا سربراہ ان کا خیر مقدم کرتا اور پھر یہ ملاقات قریبی رسم و راہ کی شکل اختیار کر لیتی۔ ظاہری اعتبار سے زوطی ایک ستم رسیدہ شخص تھے جنہیں ایمان لانے کے جرم میں اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ حالات کے اس پس منظر میں ایک ہی امکان نظر آتا ہے کہ زوطی نے کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علیؓ سے ملاقات کی درخواست کی ہوگی۔ پھر گفتگو کے دوران زوطی کی زبان پر ان جانگداز لمحوں کا بھی ذکر آیا ہوگا جن سے وہ اپنے ملک میں دوچار ہو چکے تھے۔ نتیجتاً حضرت علیؓ جیسے رقیق القلب انسان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ زوطی کی تالیف قلب نہ کرتے اور پھر مذہب اسلام کی اسی تواضع نے ایک شکستہ نو مسلم کو فاتح خیبر کی قربت کا شرف بخشا۔ اس واقعے کی کوئی دوسری توجیہ بھی پیش کی جا سکتی ہے' مگر اتفاق سے اس ذیل میں تمام معتبر تاریخیں خاموش ہیں۔

تہمت غلامی

زوطی کے کوفہ پہنچنے کی ایک اور روایت بھی بیان کی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں زوطی کو کابل (افغانستان) سے گرفتار کر کے کوفہ لایا گیا تھا۔ اس روایت پر اعتبار کرنے والے مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ جب مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو کابل بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ ایک معرکے میں اہل کابل کو شکست ہوئی اور بہت سے لوگوں کو طوق و سلاسل پہنا دیئے گئے۔ اسیروں کی اسی جماعت میں زوطی بھی شامل تھے۔ پھر قبیلہ بنی تیم کی ایک مالدار خاتون نے انہیں خرید لیا اور اس طرح آزاد خاندان کے ایک فرد پر غلامی سایہ فگن ہوگئی۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ زوطی نے کچھ عرصہ تک غلامی کے حصار میں زندگی بسر کی۔ یہ زمانہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ آخر ایک دن اس عورت نے زوطی کو آزاد کر دیا۔ بعض تاریخوں میں غلامی کی یہ روایت تو پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہے' مگر کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ زوطی اس قدر جلد کیوں آزاد کر دیئے گئے؟

اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر حضرت علیؓ کے دربار میں زوطی کی رسائی مشکوک ہو جاتی ہے۔ ایک عام حیثیت کا غلام نہایت مختصر وقت میں خلیفہ وقت کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا اور یہ بات تمام معتبر کتابوں سے ثابت ہے کہ زوطی اکثر امیر المومنین حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک اس تعلق کی بس ایک ہی بنیاد ہو سکتی ہے کہ زوطی اسلام کی خاطر مصائب برداشت کرتے ہوئے کوفے پہنچے ہوں اور حضرت علیؓ نے اس جذبہ ایثار کی قدر شناسی کے طور پر انہیں اپنے حضور میں رسائی کا منفرد اعزاز بخشا ہو۔

غلامی کی یہ روایت ایک اور اعتبار سے بھی مجہول ہے کہ اس سے زوطی کی شریک حیات کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ بیوی کی موجودگی اس لئے ضروری ہے کہ اس پر نسل انسانی کے فروغ کا دارومدار ہے اور نسل زوطی کی تحقیق اس لئے لازم ہے کہ اسی بیوی کے بطن سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے والد محترم حضرت ثابت رحمتہ اللہ علیہ پیدا ہوئے تھے اور قدرت نے اس بچے کی پیدائش کے لئے کوفے ہی کو منتخب کیا تھا۔ اگر کچھ لوگوں کی نظر میں یہ دلائل بے وزن ہیں تو پھر انہیں زوطی کی خرید و فروخت اور زمانہ اسیری کے ساتھ یہ ثبوت بھی پیش کرنا ہوگا کہ قبیلہ بنی تیم کے حلقہ غلامی سے نکلنے کے بعد زوطی نے کس مقامی عورت سے شادی کی تھی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ درج نہیں تو پھر یقین آ جاتا ہے کہ زوطی نے اپنی بیوی کے ہمراہ ایران سے عراق کی جانب ہجرت کی تھی۔

غلامی کا الزام محض ایک افسانہ ہے جو تعصب و حسد کی بنیاد پر صرف اس لئے تخلیق کیا گیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا نسب نامہ داغدار ہو جائے۔

کوئی کچھ بھی کہے' مگر زوطی کو یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت علیؓ ان پر بڑے مہربان تھے۔ خود زوطی کا بھی یہ حال تھا کہ وہ خلیفہ راشد سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اپنے اس جذبے کا اظہار کرنے کے لئے ایک بار نوروز کے موقع پر فالودہ لے کر حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ''نوروز'' آتش پرستوں کی عید کا دن ہے۔ مسلمان ہونے کے باوجود شاید زوطی اپنے ماضی کی یادوں کو فراموش نہیں کر سکے تھے اس لئے ''نوروز'' آیا تو بے اختیار مسرت کے احساس سے مجبور ہو کر حضرت علیؓ کو نذر پیش کی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہیں اسلام قبول کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ نتیجتاً غیر شعوری طور پر عہد رفتہ کا یہ گم شدہ نقش دوبارہ ابھر آیا تھا۔

حضرت علیؓ، زوطی کی اس لغزش کو محسوس کر چکے تھے' مگر آپ نے اسلامی رواداری کی عظیم الشان روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہ نذر قبول کر لی اور ساتھ ہی اس کی طرف بھی واضح اشارہ کر دیا کہ دین ابراہیمؑ میں غیر مذہبی رسموں کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس موقع پر حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے زوطی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی زبان مبارک سے تاریخی جملہ ادا فرمایا تھا۔ ''ہمارے یہاں ہر روز نوروز ہے۔''

تمام معتبر اور مستند تذکرہ نویسوں نے ''نوروز'' سے متعلق اس واقعے کا ذکر کیا ہے کہ زوطی نے حضرت علیؓ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرنے کیلئے امیر المومنین کو یہ نذر پیش کی تھی۔ حالات کی اس روشنی میں یہ بات آسانی سے ثابت ہوتی ہے کہ زوطی فارسی النسل تھے۔ افغانی الاصل یا غلام ہونا آپ پر محض ایک تہمت ہے۔

بالفرض اگر ہم زوطی کو افغان تسلیم کر لیں تو پھر ''نوروز'' کے تہوار کی کیا حیثیت باقی رہ جائے گی؟ یہ رسم تو خالص آتش پرستوں کی رسم ہے' جو صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی پورے زور و شور سے جاری ہے۔ کیا امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نسب نامے پر تحقیق کرنے والے یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ افغانوں میں ''نوروز'' نام کی کوئی معاشرتی یا مذہبی رسم کبھی موجود رہی ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ نسل افغان سے زوطی کا کوئی رشتہ استوار کیا جا سکے۔

اس ذیل میں مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی یہ روایت بھی قابل غور ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فارسی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔ مولانا شبلی اپنی مشہور تصنیف سیرت نعمان میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

''زوطی کی غلامی کا قصہ بھی غلط ہے کہ وہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے۔ زوطی کے باپ دادا کے نام فارسی زبان کے ہیں۔ خود امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ خاندانی حیثیت سے فارسی زبان جانتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کابل کی زبان فارسی نہیں تھی۔''



ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا نسب نامہ

یہاں ایک اور تحقیق کا ذکر بھی ضروری ہے' جسے ''سائنسی تحقیق'' کہہ کر نمایاں کیا گیا ہے۔ واضح الفاظ میں کہا جا

رہا ہے کہ موجودہ عہد انسان کی ذہنی اور جسمانی پرواز کا روشن ترین دور ہے۔ آج اہل مغرب جو کچھ کہتے ہیں وہی حرف آخر ہے۔ اسی دعوے کو بنیاد بنا کر دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر کارل شیٹلو نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ اس مقالے کی تفصیلات کا تو ہمیں علم نہیں، مگر اشارتاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ اہل مغرب بھی مسلمانوں کے امام جلیل سے بے خبر نہیں ہیں۔

واقعہ اس طرح ہے کہ 9 جنوری 1984ء کو اردو زبان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں ایک مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی۔

''پشاور کالج کے ڈاکٹر ابوالفضل بخت راوان نے دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر کارل شیٹلو کے مقالے کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ حنفی مسلک کے بانی حضرت امام حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نسلاً افغانی تھے۔ ان کے دادا کو شہر کابل کی فتح کے موقع پر گرفتار کر کے کوفہ لے جایا گیا تھا جہاں وہ مستقل طور پر آباد ہو گئے۔''

ہم نے اس خبر کی ظاہری ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے بلکہ قارئین کی معلومات کے لئے حرف بہ حرف نقل کر دیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ڈاکٹر کارل شیٹلو کو حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ پر مقالہ تحریر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ممکن ہے وہ کسی خاص مصلحت کے تحت افغان قوم کو یہ خوشخبری دینا چاہتے ہوں کہ اس جانباز نسل نے آج سے تقریباً تیرہ سو پچیس سال پہلے ایک ایسا صاحب نظر انسان بھی پیدا کیا تھا جس کی منطق اور فراستِ عقل کے سامنے ساری دنیا عاجز تھی اور جس کی وسعتِ علم کا وہ لوگ بھی اعتراف کرتے تھے جو اپنی ذات میں خود ایک درس گاہ تھے اور جنہیں چشم بصیرت میں بڑا درجہ اعتبار حاصل تھا۔

مقالہ نویسی سے کارل شیٹلو کی دوسری مصلحت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جدید سائنسی دنیا کا ایک ممتاز فرد ہے۔ آج جس طرح عام انسانوں کے اعصاب پر خواہ مخواہ سائنس مسلط ہے اس کی روشنی میں کارل شیٹلو کو یقین ہے کہ نئی تحقیق معتبر ٹھہرے گی اور صدیوں سے متعین کردہ خطوط پر سوچنے والے ذہنوں میں ایک انقلاب آ جائے گا۔ جب تاریخی لحاظ سے کابل میں حضرت ابوحنیفہؒ کے دادا کی گرفتاری ثابت ہو جائے گی تو پھر اس خاندان کی غلامی کا افسانہ بھی حقیقت میں تبدیل ہو جائے گا۔ ہم اعداد و شمار کے آئینے میں تو یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے اندیشے کس حد تک درست ثابت ہوئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ڈاکٹر ابوالفضل جیسے عالم و فاضل انسان بھی ڈاکٹر کارل شیٹلو کے نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہیں بھی کسی نہ کسی عنوان اس نئی تحقیق کو معتبر کہنا پڑا۔ یہ ایک تاثر تھا جو پاکستانی اسکالر کے ذہن پر مرتب ہوا اور پھر اسی تاثر نے بے شمار اہل وطن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ روزنامہ جنگ کراچی نے اس خبر کو شائع کرتے ہوئے یہ سرخی چسپاں کی تھی۔

''حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ افغان تھے۔''

اس خبر کی ہمہ گیری سے کون انکار کر سکتا ہے؟ جن حضرات کو تحقیق کی فرصت نہیں وہ ڈاکٹر ابوالفضل کا اعتراف پڑھ کر مطمئن ہو جائیں گے اور انہیں براہ راست ڈاکٹر کارل شیٹلو کا احسان مند ہونا پڑے گا کہ اس نے غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی ایک خاص مسئلے میں حنفی مسلک کے ماننے والوں کی رہنمائی کی۔

ہم ڈاکٹر شیٹلو کی نیت کا حال نہیں جانتے کہ آخر اس نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلے میں یہ زحمت کیوں گوارا کی؟ شیٹلو نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دادا کی کابل سے گرفتاری کے جس واقعے

کو اپنے مقالے کی بنیاد بنا کر ایک حیرت انگیز تحقیق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمارے نزدیک کوئی چونکا دینے والی بات نہیں۔ ہم ضرورتاً ماضی میں زیادہ دور تک سفر نہیں کرتے۔ صرف مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی عظیم الشان تصنیف ''سیرت نعمان'' کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی سیرت وسوانح پر ایک مستند کتاب ہے اور خود حضرت مولانا شبلی بھی برصغیر کے تاریخ نویسوں میں ایک منفرد وممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے ''سیرت نعمان'' کی آخری سطریں 15 دسمبر 1892ء کو علی گڑھ میں تحریر کی تھیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ شبلی کی تصنیف کو عالم وجود میں آئے ہوئے تقریباً ایک صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مولانا نے بھی ''سیرت نعمان'' میں حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے دادا زوطی کی کابل سے گرفتاری کے واقعے کا ذکر کیا ہے اور پھر مختلف دلائل سے اس روایت کو مجہول ثابت کر دیا ہے۔ مولانا شبلی زبردست فارسی داں تھے۔ اس لئے آپ نے جہاں دیگر دلائل پیش کئے ہیں وہاں امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا نسب نامہ بیان کرتے ہوئے یہ فطری دلیل بھی پیش کی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے تمام بزرگوں کے نام خالصتاً فارسی تھے۔ اگر امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ افغان ہوتے تو اہالیان خاندان کے ناموں اور دیگر معاشرتی رسموں سے کہیں نہ کہیں افغانیت کی جھلک ضرور ملتی۔ اگر ہم زمانے کی تقدیم وتاخیر کو موضوع بنائیں تو پھر یہ عجیب وغریب پہلو سامنے آئے گا کہ جب مولانا شبلی نعمانی ''سیرت نعمان'' تصنیف کر رہے تھے اس وقت ڈاکٹر کارل شیٹلز اور ڈاکٹر ابوالفضل بخت راوان پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

اس طرح جب 1892ء میں ''کابل'' کا تفصیلی ذکر موجود ہے تو 1984ء کی تحقیق کو حیرت انگیز کیسے کہا جا سکتا ہے؟ ایک مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی روایت پر کیا منحصر ہے' امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مخالفین تو کم وبیش تیرہ سو سال سے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ کسی طرح ''کابل اور غلامی'' کے الفاظ کو حقیقت کا مفہوم پہنا دیا جائے۔ مختصر یہ کہ دور جدید میں کارل شیٹلز کی تحقیق کو کوئی بھی درجہ حاصل ہو مگر ہمارے نزدیک یہ موضوع ہرگز نیا نہیں۔ صدیوں پہلے بے شمار کتابوں میں اس قسم کے وسوسوں اور اندیشوں کو ظاہر کیا گیا ہے اب اگر کوئی شخص برقی آلات اپنے کانوں کو لگا کر اور ایٹمی تجربات کے تمغے اپنے سینے پر سجا کر یہ بات کہتا ہے کہ ''ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ افغان تھے اور آپ کے دادا نے غلامانہ زندگی بسر کی تھی تو ہم جیسے کم علم بھی اس دعوے کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

ایک اور دعویٰ

گزشتہ دنوں میری نظر سے ایک کتاب ''تذکرہ'' ''گزری' جو پٹھان قوم کی معتبر تاریخ ہے اور جسے مصنف' خان روشن خان نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مصنف کو بعض مؤرخین سے شکایت ہے کہ انہوں نے افغان مشائخ کے نسب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کئے ہیں' اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مصنف نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نسلاً افغان تھے مگر مؤرخین کی غیر ذمہ دارانہ روش نے انہیں ''فارسی الاصل'' بنا کر پیش کیا۔

اس ذیل میں ''تذکرہ'' کے مصنف نے سید سلیمان ندوی کی تحریر سے یہ اقتباس پیش کیا ہے۔

''امام صاحب کے جد اعلیٰ زوطی بن ماہ' بمقام ''انبار'' کابل کے علاقے میں شاہ کابل کی لڑائی کے دوران گرفتار ہوئے۔ ''بنی تیم'' کے قبیلے کے ہاتھ آئے اور وہ ان کو کوفہ لے گئے اور وہیں ان کا مسکن رہا۔ اسی مقام پر ان کا بیٹا

ثابت تولد ہوا اور ان سے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ عجمی ہیں اور کابل کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"عجمی" کا اطلاق ہر غیر عرب پر ہوتا ہے' چاہے وہ افریقی ہو یا ایرانی' ہندوستانی ہو یا افغانی۔ "تذکرہ" کے مصنف نے سید سلیمان ندوی کے ان الفاظ کو اپنے دعوے کی بنیاد بنایا ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مورث اعلیٰ کابل کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کابل میں رہائش پذیر ہونے والا ہر شخص نسلاً پٹھان نہیں ہو سکتا' نسل کا تعلق علاقے سے نہیں ہوتا۔ اس لئے مصنف کا یہ دعویٰ ضعیف اور بے دلیل ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نسلاً افغان تھے۔

مصنف نے مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف "سیرت نعمان" سے یہ مختصر اقتباس نقل کرتے ہوئے اپنے دعوے میں مزید رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔

"نعمان نام' ابوحنیفہ کنیت' امام اعظم لقب' شجرہ نسب یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ۔ یہ امر جیسا کہ ناموں کی ترتیب سے ظاہر ہے' مسلم ہے کہ امام صاحب عجمی النسل تھے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کس نسل سے تھے اور عرب میں کیونکر آئے؟"

تذکرہ کے مصنف نے اختلاف کے لفظ سے ہی نتیجہ اخذ کر لیا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نسل افغان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ایک نامکمل عبارت ہے۔ ہم مولانا شبلی نعمانی کی تحقیق کا مزید حصہ پیش کرتے ہیں جس سے قارئین کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نسبی اعتبار سے کس قوم کے نمائندے تھے؟

مؤرخ خطیب بغدادی نے امام رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ "میں اسمٰعیل ابن حماد ابن نعمان ابن ثابت ابن نعمان ابن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ نسل فارس سے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے۔ ہمارے دادا ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ 80 ہجری میں پیدا ہوئے۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کے حق میں دعائے خیر کی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں رہی۔" اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے امام صاحب کے دادا کا نام نعمان بتایا اور پردادا کا نام مرزبان۔ حالانکہ عام طور پر "زوطی اور ماہ" مشہور ہے۔ غالباً جب زوطی ایمان لائے تو ان کا نام نعمان سے بدل دیا گیا۔ اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ نے سلسلہ نسب کے بیان میں زوطی کا وہی اسلامی نام لیا اور حمیت اسلامی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ زوطی کے باپ کا اصلی نام کچھ اور ہوگا "ماہ اور مرزبان" لقب ہوں گے۔ کیونکہ اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ کی ایک روایت سے اس قدر اور بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ فارس میں رئیس شہر کو "مرزبان" کہتے ہیں۔ اس لئے نہایت قرین قیاس ہے کہ "ماہ اور مرزبان" لقب ہیں نہ کہ نام۔ حافظ ابوالحاسن نے قیاس لگایا ہے کہ "ماہ اور مرزبان" ہم معنی الفاظ ہوں گے۔ انہوں نے قیاساً کہا کیونکہ وہ فارسی زبان نہیں جانتے تھے لیکن میں یقیناً کہتا ہوں کہ درحقیقت "ماہ اور مرزبان" کے ایک ہی معنی ہیں "ماہ" دراصل وہی "مہہ" ہے جس کے معنی بزرگ اور سردار کے ہیں۔

"تذکرہ" کے مصنف نے مولانا شبلی کی اس تحقیق سے انحراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "زوطی کا فارسی الاصل ہونا اس لئے غلط ہے کہ جس جگہ یہ گرفتار ہوئے وہ علاقہ پارسیوں کا مقبوضہ علاقہ تھا اور آخری وقت میں شاہ ایران یزد

گرد بھاگ کر یہیں مقیم ہوا اور اسی جگہ قتل کیا گیا۔"

افغان قوم میں غلزئی قبیلہ ایک بڑا قبیلہ ہے جس کی ذیلی شاخ ماہی خیل (ماھلہ) ہے۔ قندھار سے ساٹھ ستر میل شمال کی طرف "قلات کے غلزئی" میں اب بھی ماہی خیل (ماھلہ) قبیلہ آباد ہے...... اور یہی ماہی (ماھلہ) امام کا مورث اعلیٰ ہے۔

(فاضل مصنف نے پہلے "ماہ" کو "ماہی" بنا دیا۔ پھر اسے "ماھلہ" کا نام دے کر غلزئی قبیلے کی ذیلی شاخ "ماھلہ" کا نام دے دیا اور پھر مطمئن ہو گئے کہ لفظوں کے اس پیچ وخم سے تحقیق کے تمام تقاضے پورے ہو جائیں گے۔)

موصوف آگے چل کر اس طرح رقم طراز ہیں۔

"ہما یا ماہ (ماھلہ) جو زوطی کا والد تھا، وہ بھی اصل میں "ماہی" ہے اور افغان قوم اسی کو "مہی" کہتی ہے لیکن آج کل اسے "ماھلہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ افغان قوم کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ لوگ کسی شخص کے اصلی نام کو بگاڑ دیتے ہیں۔ مثلاً ضابطے خان سے زوطے (زوطی) اور ثابت خان سے ثابتے وغیرہ، اس لئے یہ نام بھی افغانوں ہی کے ہیں۔"

فاضل مصنف نے بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو افغان ثابت کرنے کے لئے کیا کیا اصول تراشے ہیں۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مورث اعلیٰ کا نام "ماہ" تھا مصنف نے "ماہ" کو "ہما" میں اس لئے تبدیل کیا کہ یہ شخص ایک افغان سردار تھا۔ مصنف نے "ہما" کا شجرہ نسب اس طرح تحریر کیا ہے۔ "ہما بن ترکی بن سہاک بن ابراہیم غلزئی"...... مصنف نے یہ نکتہ تحریر نہیں کیا کہ "ہما" کثرت استعمال سے بگڑتے بگڑتے "ماہ" بن گیا۔ اگر مصنف چاہتے تو بطور سند یہ دلیل پیش کر سکتے تھے کہ ہما میں بھی وہی تین حرف (ہ م ا) ہیں جو ماہ میں ہیں، شاید طوالت کی وجہ سے انہوں نے یوں وضاحت نہیں کی ورنہ جہاں تک ان کی تحقیق کا تعلق ہے تو وہ واضح طور پر "ہما" کو "ماہ" لکھ چکے ہیں تاکہ اس طرح "ماہ" کا سلسلہ نسب ابراہیم غلزئی تک پہنچانے میں انہیں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ فاضل مصنف نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلے میں پٹھان قوم کی اس مشہور عادت کا بھی سہارا لیا ہے کہ یہ لوگ اصلی نام کو بگاڑ دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے دادا کا نام زوطی تھا (بعض مؤرخین نے "زوطے" بھی تحریر کیا ہے) مصنف کے بقول "زوطی" دراصل "ضابطہ خان" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ میں ناچیز خود بھی روھیلہ افغان ہوں اس لئے اپنی قوم کی اس رسم سے واقف ہوں کہ یہ لوگ اکثر ناموں کو بگاڑ دیا کرتے تھے، مگر اس قدر بھی نہیں کہ ضابطہ خان بگڑتے بگڑتے "زوطی" ہو جائے اور "ثابت خان" "ثابتے" کی شکل اختیار کر لے۔ کسی بھی مؤرخ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے والد ثابت کا نام "ثابتے" تحریر نہیں کیا۔ اگر کوئی ایک ثبوت بھی فراہم ہو جاتا تو ہم تسلیم کر لیتے کہ ثابت خان بگڑتے بگڑتے "ثابتے" ہو گیا ہوگا۔)

آگے چل کر فاضل مصنف تحریر کرتے ہیں۔

"امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی سیرت و کردار کے تجزیئے سے بھی ان کا افغان ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اس بات کو سب مانتے ہیں کہ ان میں حد درجے کی مضبوطی اور شجاعت تھی اور اسی وجہ سے ان کو اپنی زندگی میں کافی زحمت اٹھانی پڑی۔ یہ صفت صرف افغان قوم ہی میں پائی جاتی ہے۔ ان کے کردار نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے محسوس کیا

کہ یہ ضرور افغان نسل سے ہو سکتے ہیں۔ اسی بناء پر میں نے ان کے نسب کی تحقیق بڑی جاں فشانی اور محنت سے کی۔

"تذکرہ" کے مصنف کا یہ دعویٰ بھی بڑا عجیب دعویٰ ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ جس شجاعت اور مضبوطی کے حامل تھے وہ صفات صرف افغان قوم ہی میں پائی جاتی ہیں۔ اگر مصنف نے اقوام عالم کی فطرت کا گہرا مشاہدہ کیا ہوگا تو ان پر یہ راز فاش ہو گیا ہوگا کہ شجاعت' حوصلہ مندی اور استقامت کسی ایک قوم کی میراث نہیں۔ میں نے تو اس قوم میں بھی بڑے "بے جگر" لوگ دیکھے ہیں جس قوم کی تاریخ بزدلی اور نامردی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بے شک! دنیا کی ہر قوم ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے' مگر ہم اس مزاج کو ایک "آفاقی اصول" کے طور پر پیش نہیں کر سکتے۔ اسی طرح حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی غیر معمولی شجاعت و استقامت کے باعث انہیں بھی افغان ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

میں خود بھی "احمد زئی" قبیلے کا ایک پٹھان ہوں اور پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات تحریر کر رہا ہوں کہ "نسل افاغنہ" ایک سریع الاشتعال نسل ہے اور کسی نہ کسی زاویئے سے پوری قوم میں ایک مخصوص جوش پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نہایت "متحمل مزاج" اور "حلیم الطبع" انسان تھے۔ میں نہیں جانتا کہ فاضل مصنف حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ کی اس تاریخ ساز صفت کو کس قوم اور قبیلے سے وابستہ کریں گے؟ انصار تو ایک ڈری' سہمی اور پس ماندہ قوم کے نمائندے تھے مگر جب ان کے سروں پر رسالت مآب ﷺ کی رحمت سایہ فگن ہوئی تو وہ اپنی حکمراں قوم قریش سے نہ صرف نبرد آزما ہوئے بلکہ اپنے طاقتور حریفوں کی صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اس روحانی انقلاب کی روشنی میں ہم کسی فرد کی شجاعت و استقامت کو کسی قوم کی فطری صلاحیت سے منسوب نہیں کر سکتے۔ اسلام کے حصار میں داخل ہونے کے بعد انسانی نفسیات یکسر بدل جاتی ہے۔ محتاج اپنے ذہن و قلب کی کشادگی کے سبب "غنی" ہو جاتے ہیں اور صدیوں سے خوف و ہراس کے سائے میں زیست بسر کرنے والے راتوں رات "مردان شجاع" کی فہرست میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ مشہور صحابی رسول ﷺ حضرت بلالؓ اور جلیل القدر تابعی حضرت سعید ابن جبیر رحمتہ اللہ علیہ رسم دنیا کے مطابق غلام تھے مگر ان دونوں حضرات نے اسلام کے راستے میں جس شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا ہے' شاید پہاڑ بھی اسے برداشت کرتے ہوئے پگھل جائے۔ اس لئے یہ کہنا عبث ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے افغان ہونے کی وجہ سے مثالی شجاعت و استقامت کا مظاہرہ کیا' وہ امام رحمتہ اللہ علیہ کا اسلامی عقیدہ تھا جس نے کارزار حیات میں ان کے قدموں کو آہنی اور سنگی ستونوں سے بھی زیادہ مضبوط بنا دیا تھا۔

"تذکرہ" کے مصنف نے ایک مقام پر یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "افغان قوم نے حتی الوسع اپنی نسل کو چھپائے رکھا۔ خدا جانے اس میں کیا مصلحت تھی؟ یہی وجہ ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنا شجرہ ظاہر نہیں کیا۔"

ہمیں مصنف کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ نسل افغان تو ہمیشہ اپنے شجرہ نسب کو بطور فخر پیش کرتی رہی ہے اور یہ رسم زمانہ قدیم سے آج تک جاری ہے۔ واضح رہے کہ پورے زور و شور کے ساتھ اپنا نسب نامہ بیان کرنا بھی پٹھان قوم کی ایک مخصوص عادت ہے۔ اپنے شجرہ نسب کے بارے میں امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی خاموشی کسی مصلحت کے تحت ہرگز نہیں تھی۔ آپ مسلمانوں کی اکثریت کے امام ہونے والے تھے اس لئے خدا نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نفس میں ابتداء ہی سے وہ قوت پیدا کر دی تھی جس سے قومی تفاخر کی نفی ہوتی تھی۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ "بتان رنگ و نسل" کو مسمار کرنے والے تھے پھر آپ کس طرح یہ اعلان کرتے کہ "میں فلاں قوم اور فلاں قبیلے سے

تعلق رکھتا ہوں۔" یہ اعلان منصب امامت کیخلاف ہے۔ اس لئے امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے ذاتی نسب نامے کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔

یہ بحث بہت طویل ہے مگر ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے اتنا ہی عرض کریں گے کہ بعض لوگوں کو اس بات سے اشتباہ ہوا کہ زوطی کابل میں گرفتار ہوئے تھے اور پھر اسی کو بنیاد بنا کر دعویٰ کیا گیا کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نسلاً افغان تھے۔ زوطی کا کابل میں گرفتار ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ ان کا نسب نامہ بھی پٹھانوں سے ملتا ہے' مصنف کے بقول شاہ ایران یزدگرد بھی اسی جگہ قتل ہوا جہاں زوطی کو زنجیریں پہنائی گئی تھیں' پھر یزدگرد کے بارے میں یہ دعویٰ کیوں نہیں کیا گیا کہ وہ بھی افغان تھا۔ اس ذیل میں یہ تاویل پیش کی جا سکتی ہے کہ شاہ ایران فرار ہو کر اس مقام تک پہنچا تھا۔

پھر ہم اس حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کر لیتے کہ اہل فارس شکست سے دوچار ہونے کے بعد شدید انتشار کا شکار ہو گئے تھے جسے جدھر بھی راہ فرار نظر آتی تھی وہ اسی طرح آنکھیں بند کر کے چلا جاتا تھا۔ اس ہنگامے میں زوطی بھی فرار ہو کر کابل پہنچ گئے ہوں اور پھر انہیں گرفتار کر لیا گیا ہو۔ یہ ایک نہایت قوی امکان ہے۔ اگر ہمارے مؤرخ اس امکان پر غور کرتے تو انہیں زوطی کے نسب نامے پر تحقیق کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔

شبلی نعمانی اور دیگر مؤرخین نے زوطی کی گرفتاری اور کابل کے حوالے کو غلط قرار دیا ہے۔ مولانا کے بقول۔

"زوطی اول اول جب عرب میں آئے ہوں گے تو برسوں تک ان کی حالت بیگانگی کی حالت رہی ہو گی۔ لوگوں کو ان کے حالات کے ساتھ چنداں اعتنا نہ ہو گا تو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے ہوں گے۔ معاشرے کی ضرورت نے زوطی کو مجبور کیا ہو گا کہ وہاں کے رہنے والوں سے دوستانہ تعلق پیدا کریں۔ یہ طریقہ عرب میں عام طور پر جاری تھا اور اس قسم کے تعلق کو "ولاء" کہتے تھے جس کا مشتق "مولیٰ" ہے مولیٰ غلام کو بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح لفظی مشارکت سے بعضوں نے زوطی کو غلام سمجھ لیا اور رفتہ رفتہ یہ خیال روایت کی شکل پکڑ کر کسی قدر عام ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ (امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے) کو الزام رفع کرنا پڑا کہ واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آیا۔ اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ نہایت ثقہ اور معزز شخص تھے اس وجہ سے دقیقہ سنج مؤرخوں نے ان ہی کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ قاضی ضمیری نے' جو بڑے پائے کے مصنف ہیں' صاف تصریح کی ہے کہ زوطی قبیلہ "بنی تیم" کے حلیف تھے۔"

اس کے بعد مولانا شبلی نے کتاب کے حاشیے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "علامہ نووی نے "تہذیب الاسماء واللغات" میں تحریر کیا ہے کہ "مولیٰ" کا لفظ زیادہ تر حلیف ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔"



غلامی کا نیا مفہوم

الزام تراشی کی یہ مہم بہت قدیم ہے۔ اتنی قدیم کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں کچھ لوگوں نے آپ کو "غلام زادہ" کہنا شروع کر دیا تھا' مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ لوگوں کے تصور سے بھی زیادہ اعلیٰ ظرف تھے۔ اس لئے آپ نے کبھی اپنی سماعت کو ان تہمت طراز و بے وقعت آوازوں سے متاثر نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر جب امام

رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا تو الزام تراشنے والوں کے لہجے نے مزید شدت اختیار کر لی۔ بہت دن تک حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی غلامی کے مفروضے مختلف مجالس میں بیان کئے جاتے رہے۔ حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادے حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے عظیم و جلیل باپ کی رسم کو یہاں تک نبھایا کہ کسی موقع پر لب کشائی نہیں کی۔ مخالفین نے الفاظ بدل کر امام کے معزز ترین خاندان کو ہدف تنقید بنایا' مگر حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ اسی طرح خاموش رہے' جیسے حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہونٹوں پر سکوت طاری رہتا تھا۔ یہ کسی کمزوری کی دلیل نہیں تھی کہ آپ غلامی کا عیب چھپانے کے لئے مصلحت سے کام لے رہے تھے' یہ مہر سکوت اس فقیہ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی تربیت کا نتیجہ تھی جو اس آیت قرآنی کا حقیقی مفہوم جانتا تھا اور زمین پر اس آسمانی فیصلے کا عملی نمونہ پیش کر رہا تھا۔

''خدا کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ بھی اسی محترم ہستی کی روش کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور مجلس درس سے قبر تک کسی مقام پر' کسی موڑ پر' کسی لمحے آپ نے اہل دنیا سے اس الزام تراشی کی شکایت نہیں کی۔ یہ حماد رحمتہ اللہ علیہ کے صبر کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ بھی لوگوں کی دل آزاریوں پر اسی طرح صبر کیا کرتے تھے۔

یہاں تک کہ جب حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے تو مخالفین اور بھی سرکش ہو گئے۔ ان کی زبانیں پہلے ہی شائستگی سے نا آشنا تھیں' اب مزید بے لگام ہو کر دائرہ تہذیب سے نکل گئیں۔ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے دونوں پوتوں اسمٰعیل بن حماد رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت عمر بن حماد رحمتہ اللہ علیہ نے کچھ عرصے تک اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس توہین آمیز سلوک کا کوئی زبانی جواب نہیں دیا۔ کبھی کبھی انسانی جذبات شدت سے مجروح ہو جاتے تو صرف چہروں پر کرب کے آثار ابھرتے' مگر ہونٹ اسی باوقار خاموشی سے آراستہ رہتے' جو اس خاندان جلیل کی مشہور روایت تھی۔ پھر وہ سنگین لمحات بھی آ گئے جب مخالفین نے اس مسلسل سکوت کو سند اور دلیل کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ بڑی بے حسی اور بے رحمی کے ساتھ کہا گیا۔

''اگر غلامی کی تاریکی اس خاندان سے وابستہ نہ ہوتی تو ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے دفاع میں کچھ نہ کچھ ضرور بولتے۔ ان کی خاموشی حقیقت کا ثبوت تھی۔ اس لئے چپ چاپ دنیا سے گزر گئے۔''

پھر حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی کو اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا۔

''اگر ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی گردن میں غلامی کا طوق نہ ہوتا تو حماد رحمتہ اللہ علیہ برسر مجلس اپنی آزادی کا اعلان کرتے۔ ان کا سکوت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ زوطی بازار عرب میں فروخت کئے گئے۔''

مخالفین کے لہجے میں بڑی جارحیت تھی۔ آخر اسمٰعیل بن حماد رحمتہ اللہ علیہ خاموش نہ رہ سکے۔ آپ عجز و انکسار کا پیکر تھے لیکن آواز میں وہی جلال تھا جو مردان آزاد کا شیوہ ہے۔ اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے الزام تراشوں کی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''لوگو! تم نے ایک ایسی چیز کو شرف کی بنیاد ٹھہرایا جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ کوئی آقا ہو یا غلام' آخر میں سب کا سلسلہ نسب آدم علیہ السلام سے مل جاتا ہے۔ اگر وقت کی گردش نے کسی کے سر پر تاج رکھ دیا تو وہ محترم کس طرح ہو گیا اور کسی نے عالم جبر میں زنجیر پہن لی تو وہ حقیر و ذلیل کیوں قرار پایا؟ افسوس! تم نے اسلام کے

قائم کردہ معیار کو قومیت کے غبار میں گم کر دیا۔ تم فضیلت کا وہ پیمانہ کیوں مقرر کرتے ہو جس کا رسالت مآب ﷺ نے کہیں حکم نہیں فرمایا۔" حضرت اسمٰعیل بن حماد رحمۃ اللہ علیہ اتمام حجت کے طور پر مخالفین کا ظرف آزمانا چاہتے تھے اس لئے اسلام کے آفاقی اصول کا سہارا لے کر اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

کوئی نہیں جانتا کہ حضرت اسماعیل بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ انکشاف سن کر مخالفین پر کیا گزری؟ وہ لوگ صاحبان علم وتقویٰ کی دل آزاریوں سے باز آ گئے یا تہمت والزام تراشی کی نئی فصل بوتے رہے۔ پھر بھی اتنا ضرور ہوا کہ بعد میں آنے والے روشن خیال اور کشادہ دل مؤرخین نے اس روایت کو قبول کر لیا اور بے اختیار ان کے قلم سے یہ الفاظ صفحہ قرطاس پر منتقل ہو گئے۔

"اسمٰعیل بن حماد رحمۃ اللہ علیہ نے سچ کہا ان کا بیان کردہ نسب نامہ چشم تحقیق میں معتبر ہے۔"

بالفرض اگر ہم حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی غلامانہ حیثیت کو مان بھی لیں تو اس سے حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان جلالت میں کیا کمی واقع ہوتی ہے؟ علامہ اقبال کے بقول ؎

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

مگر ان کے ذہن تنگ تھے' دلوں کی کشادگی فنا ہو چکی تھی اور ضمیر نزع کی کیفیت سے دوچار تھے۔ انکسار کے جواب میں وہی سرکشی اختیار کی گئی۔ "ہم اسلام کے قائم کردہ معیار ذات سے خوب واقف ہیں۔ تم صرف اپنا نسب نامہ بیان کرو۔" مخالفین کی زبانیں اس شخص کے سامنے شرر فشاں تھیں جو اپنی سرشت میں اول وآخر شبنم تھا۔

حضرت اسمٰعیل بن حماد رحمۃ اللہ علیہ مجبور کر دیئے گئے۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے اللہ کی کبریائی بیان کی پھر سرور کونین ﷺ کی رسالت وعظمت پر رقت آمیز لہجے میں گواہی دی اور سب سے آخر میں اپنا نسب نامہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگو! جب تم نے ظاہری آزادی وغلام کو عزت وتحقیر کا پیمانہ بنا ہی دیا تو پھر سنو! ہمارے بزرگوں کی گردنوں میں نہ کسی کے طوق کا بار گراں تھا اور نہ پیروں میں کسی زنجیر کا زخم۔ ہم سب کے سب اپنے خدا کے کرم سے آزاد پیدا ہوئے تھے۔ ہماری طرف دیکھو' میں اسمٰعیل بن حماد بن نعمان (ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) بن ثابت بن نعمان (زوطی) بن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ نسل فارس سے تعلق رکھتے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے۔ ہمارے دادا حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ 80ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے پردادا حضرت ثابت رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ امیر المومنین نے ہمارے خاندان کے حق میں دعائے خیر کی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت علیؓ کی وہ دعا خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں قبول ہوئی اور ہم لوگ بے پناہ رحمتوں سے نوازے گئے۔" (واضح رہے کہ بعض مؤرخین نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ قبول اسلام کے بعد زوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا نام نعمان رکھ لیا تھا۔ حضرت اسمٰعیل بن حماد رحمۃ اللہ علیہ نے نسب نامہ بیان کرتے وقت وہی اسلامی نام ظاہر کیا اور حالت کفر کے مشہور نام پر پردہ ڈال دیا۔)

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی انداز کے شہنشاہ تھے کہ طبل وعلم کے بغیر آپ نے اپنی حکومت کا اعلان کیا اور کروڑوں انسانوں نے علم وعرفان کی اس عظیم الشان سلطنت کو کسی حجت کے بغیر تسلیم کر لیا۔ یہ قدرت کا کیا

عجیب راز ہے کہ ماضی میں کئی غلام خاندانوں کے افراد نے علم کی دنیا پر غلبہ حاصل کیا اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ناقابل تسخیر ٹھہرے۔

ہم اس ذیل میں ایک ایسا تاریخی واقعہ بیان کرتے ہیں جو درحقیقت آقائیت اور غلامی کا ایک منفرد معیار ہے اور جسے اس زمین پر سب سے پہلے اسلام نے روشناس کرایا۔ کوفے کے مشہور قاضی حضرت ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ نے اس واقعے کو بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

''ایک روز خلیفہ منصور کے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ نے جو کوفے کا حاکم بھی تھا مجھ سے دریافت کیا۔ ''ابی لیلیٰ! مجھے بتاؤ کہ فقہائے عراق کون تھے؟''

میں عیسیٰ کی فطرت سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا اس کے عقائد نہایت سخت تھے اور مذہبی جنون اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ پھر بھی اس سوال کا جواب مجھ پر قرض تھا اس لئے میں نے صاف صاف کہا۔ ''حسن بن ابی حسن رحمتہ اللہ علیہ۔''

''اس کے علاوہ دوسرا فقیہ کون تھا؟'' عیسیٰ نے مجھ سے وضاحت طلب کی۔

''محمد بن سیرین۔ رحمتہ اللہ علیہ۔'' میں نے جواباً کہا۔

''ان دونوں کی خاندانی حیثیت کیا تھی؟'' عیسیٰ نے اچانک ایک نیا سوال کر ڈالا۔

''وہ دونوں نسلی اعتبار سے غلام تھے۔'' میں نے حسن بن حسن رحمتہ اللہ علیہ اور محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ بھی بتاؤ کہ فقہائے مکہ کون تھے؟'' حاکم کوفہ کے سوالات کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

''عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ' مجاہد رحمتہ اللہ علیہ' سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ اور سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ ۔ میں نے مشہور فقہائے مکہ کے نام بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ چاروں کون تھے؟'' عیسیٰ بن موسیٰ نے پوچھا۔

''میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔'' میں نے معذرت کے انداز میں کہا۔

''مجھے فقیہان مکہ کی قومیت کے بارے میں بتاؤ؟'' اس بار حاکم کوفہ کے لہجے میں ہلکی سے تلخی شامل تھی۔

''یہ چاروں بھی غلام کا درجہ رکھتے تھے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ اگرچہ میں عیسیٰ کی نیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکا تھا تاہم اتنا سمجھ چکا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت مجھ سے سوالات کر رہا ہے۔

پھر اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے یہ بھی بتاؤ کہ فقہائے مدینہ کون تھے؟'' یہ کہتے کہتے حاکم کوفہ کے ماتھے پر ناگواری کی کچھ لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

''زید بن اسلم رحمتہ اللہ علیہ اور نافع رحمتہ اللہ علیہ کا شمار مدینے کے اکابر فقہا میں ہوتا ہے۔'' میں نے حقیقت کا اظہار تو کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی عیسیٰ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''ان دونوں کا عرب کے کن قبائل سے تعلق ہے؟'' حاکم کوفہ کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا تھا۔

اب مجھے صاف محسوس ہونے لگا تھا کہ آخر وہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کیوں کر رہا ہے؟ تاہم میں حقیقت بیانی کے لئے مجبور تھا۔ ''ان دونوں کا اہل عرب سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔''

''پھر یہ دونوں کون تھے؟'' عیسیٰ کی پیشانی پر ابھرنے والی شکنوں کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

''اتفاق سے یہ بھی غلام تھے۔'' میں نے زید بن اسلم رحمتہ اللہ علیہ اور نافع رحمتہ اللہ علیہ کی خاندانی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جیسے ہی میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے حاکم کوفہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

''اہل قبا میں سب سے بڑا فقیہ کون تھا؟'' عیسیٰ کسی مقام پر ٹھہرنے والا نہیں تھا۔ اس کی زبان پر مستقل ایک ہی قسم کے سوالات تھے۔

''وہاں کے سب سے بڑے فقیہ ربیعہ رائی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ میں نے بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

''یہ کون شخص تھا؟ اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟'' عیسیٰ کی آواز معمول سے زیادہ بلند تھی اور اس سے کسی قدر غصے کا رنگ جھلک رہا تھا۔

''ربیعہ رائی ایک غلام خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔'' میں اس بار بھی حقیقت کی پردہ پوشی نہ کر سکا۔

اب حاکم کوفہ کی ظاہری حالت کسی غضب ناک شخص سے مشابہ تھی۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ ''اور تم مجھے یہ بھی بتاؤ کہ فقیہ یمن کون تھے۔'' اب عیسیٰ کے لہجے کا تحکم اس حد تک پہنچ گیا تھا جیسے وہ قاضی کوفہ سے نہیں اپنے کسی غلام سے مخاطب ہو۔

''طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ''۔ میں نے فضا کی ناسازگاری کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

''طاؤس کون تھا؟'' ایک مرد بزرگ کے بارے میں عیسیٰ کا طرز کلام گستاخانہ تھا۔

''وہ بھی غلام تھے۔'' میں نے طاؤس کی قومیت بیان کرتے ہوئے کہا۔

عیسیٰ کے آہنی اعصاب جواب دے چکے تھے وہ اپنی نشست سے اٹھا اور میرے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں پھر غصے سے کانپتے ہوئے کہنے لگا۔

''اور یہ بھی بتاؤ کہ فقہائے خراسان کون تھے؟''

''عطا بن عبداللہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ'' کہنے کو میں نے کہہ دیا تھا لیکن اب میرے دل پر ہلکا ہلکا خوف طاری ہونے لگا تھا۔ عیسیٰ کے تیور کسی اور ہی جذبے کی غمازی کر رہے تھے۔

''یہ عطا خراسانی کون تھا؟'' حاکم کوفہ کے لہجے سے بے ادبی نمایاں تھی۔

''ان کے خاندان کی گردن میں بھی طوق غلامی موجود تھا۔'' میں نے اپنے جذبات کا حقیقی رنگ نمایاں کرنا چاہتا تھا' مگر ایسا نہ کر سکا۔ پھر عیسیٰ نے مجھ سے پوچھا۔ ''فقیہ شام کون تھے؟'' اب حاکم کوفہ کا جسم بھی لرزنے لگا تھا۔

''مکحول کے سوا کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے جواب دیا' مگر عیسیٰ کی یہ حالت دیکھ کر میری آواز میں بھی ارتعاش پیدا ہو چلا تھا۔

''مکحول کون تھا؟ کیا وہ بھی غلام زادہ تھا؟ حاکم کوفہ کی وحشت کا یہ حال تھا کہ وہ میری لب کشائی سے پہلے ہی بول اٹھا تھا۔ اسے یقین کی حد تک اس بات کی توقع تھی کہ اب جس شخص کے بارے میں بھی سوال کرے گا وہ نسلاً غلام ہی ٹھہرے گا۔

''ہاں مکحول رحمتہ اللہ علیہ بھی ابن غلام تھے۔'' اب مجھے خود بھی اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے عیسیٰ کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ظاہری غصہ ختم ہو چکا تھا' لیکن چہرہ بتدریج مسخ ہوتا جا رہا

تھا۔شاید یہ احساس کمتری تھا کہ جس کے اثر سے حاکم کوفہ کے چہرے پر نامرادی کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔

پھر عیسیٰ نے بڑے شکستہ لہجے میں پوچھا۔ "فقہائے کوفہ کون تھے؟" یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر ایسی سیاہی پھیل گئی جسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا۔ خدا کی قسم! اگر میں حاکم کوفہ سے ڈر نہ گیا ہوتا تو کہتا کہ حکم بن عتبہ رحمتہ اللہ علیہ اور حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ (یہ دونوں بھی غلام تھے) مگر مجھے عیسیٰ کی باتوں میں فتنہ وشر کی بو محسوس ہو رہی تھی اس لئے میں نے پہلی بار مصلحت سے کام لیتے ہوئے اپنا لہجہ بدل دیا۔" کوفے میں ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ اور شعبی رحمتہ اللہ علیہ بڑے فقیہ تھے"۔

"کیا وہ دونوں بھی غلام تھے؟" یہ کہتے کہتے عیسیٰ کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ اگر وہاں کوئی تیسرا شخص ہوتا تو اپنی آنکھوں سے یہ عجیب منظر دیکھتا کہ خلافت عباسیہ کا یہ معزز ترین رکن کس طرح بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ مسند علم پر غلاموں کی جلوہ آرائی عیسیٰ کے اقتدار کی نفی کر رہی تھی۔

"نہیں وہ غلام نہیں تھے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ اب میرے اعصاب پر عیسیٰ کا خوف مسلط نہیں رہا تھا۔

"پھر وہ کون تھے؟" اچانک حاکم کوفہ پر جوش نظر آنے لگا۔

"ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ اور امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کا تعلق نسل عرب سے تھا۔" میں نے عیسیٰ کو خوش کرنے کے لئے کہا۔ بے شک یہ دونوں فقیہ عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے لیکن اگر میں اظہار رائے میں آزاد ہوتا تو یقیناً حکم بن عتبہ رحمتہ اللہ علیہ اور حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کے نام لیتا جو بلاتردید بڑے فقیہ تھے۔

میرا جواب سنتے ہی عیسیٰ بن موسیٰ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور اب حاکم کوفہ نہایت مسرور و مطمئن نظر آ رہا تھا۔



اسی انداز کا ایک اور واقعہ بنوامیہ کے دور حکومت میں پیش آیا تھا۔ اس وقت ہشام بن عبد الملک سلطنت اسلامیہ کا طاقتور حکمراں تھا۔ اس کے مزاج سے سخت گیری نمایاں تھی اور بیشتر مؤرخین کی رائے میں ہشام ایک سفاک فطرت کا مالک تھا۔ اسی جابر حکمراں نے ایک بار مشہور فقیہ حضرت عطا بن عبداللہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور پوچھا۔

"کیا تمہیں مختلف شہروں کے علماء کا کچھ حال معلوم ہے؟" ہشام کی آواز ابتدا ہی میں پر شور محسوس ہو رہی تھی۔

"جی ہاں۔ میں اہل علم کی جماعت سے اچھی طرح باخبر ہوں۔" عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے ہشام کے پُر جلال لہجے سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"تمہارے نزدیک مدینہ رسول ﷺ کے فقیہ کون ہیں؟" ہشام نے دریافت کیا۔

"حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ، عبداللہ بن عمرؓ کے غلام۔" عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"فقہائے مکہ کون ہیں؟" ہشام بن عبد الملک نے دوسرا سوال کیا۔

"عطا بن ابی رباح۔" عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے باوقار لہجے میں فرمایا۔ ہشام محسوس کرنے لگا تھا کہ جب بھی عطا رحمتہ اللہ علیہ کی زبان پر فقہائے اسلام کا نام آتا ہے تو ان کے چہرے سے عقیدت و احترام کے جذبات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

''عطا ابن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نسلاً عربی ہے یا غلام؟'' ہشام نے فقیہ مکہ کے بارے میں وضاحت طلب کی۔

''وہ اپنے نسب نامے کے اعتبار سے غلام ہیں۔'' عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے بے جھجک ہو کر فرمایا۔

''اہل یمن کے فقیہ کون ہیں؟'' ہشام بن عبدالملک نے تیسرا سوال کیا۔

''طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ۔'' عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔

''وہ عرب ہے یا غلام؟'' اب ہشام بن عبدالملک کے لہجے سے تشویش ظاہر ہونے لگی تھی۔

''خاندانی اعتبار سے طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ بھی غلام زادے ہیں۔'' حضرت عطا بن عبداللہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے بڑے ادب سے طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کا نام لیا۔

''اہل یمامہ کے فقیہ کون ہیں؟'' ہشام بن عبدالملک کے سوالات کا سلسلہ وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا اور حضرت عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی یہ بات محسوس ہونے لگی تھی کہ آپ کسی خاص امتحان سے دو چار ہیں۔ ''یحییٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ۔ عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے حکومت واقتدار کے رعب وجلال سے بے نیاز ہو کر جواب دیا۔

''یحییٰ کون ہے؟ اہل عرب سے ہے یا غلام خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟'' ہشام بن عبدالملک نے بھی ظاہری طور پر اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اس کے لہجے کی تلخی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''یحییٰ بن کثیر بھی غلام ہیں۔'' عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مرد فقیہ کا نام اس طرح لیا کہ جیسے آپ کی زبان پر کسی شہنشاہ وقت کا نام آ گیا ہو۔

ہشام بن عبدالملک مایوسی کا شکار ہوتا جا رہا تھا' مگر پھر بھی اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔ ''اہل شام کے فقیہ کون ہیں؟''

''مکحول رحمتہ اللہ علیہ اور وہ بھی غلام ہیں۔'' عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے ہشام کے دوسرے سوال سے پہلے ہی جواب دے دیا۔

ہشام کے چہرے کی افسردگی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ بات چیت کے دوران اچانک نمایاں ہونے والی تلخی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ نہایت شکستہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''اہل جزیرہ کے فقیہ کون ہیں اور ان کا نسب نامہ کیا ہے؟''

''میمون بن مہران رحمتہ اللہ علیہ اور وہ بھی غلام خاندان سے نسبی رشتہ رکھتے ہیں۔'' عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے انکشاف کیا۔

فقہائے خراسان کے نام بتاؤ اور ان کا سلسلہ نسب بھی بیان کرو۔'' ہشام بن عبدالملک کے لہجے کا طمطراق فنا ہو چکا تھا اور اس کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

''ضحاک بن مزاحم رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے خاک خراسان روشن وتابناک ہے مگر اس اتفاق کو کیا کہا جائے کہ نسلاً وہ بھی ابن غلام ہیں۔''

حضرت عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے خلیفہ وقت کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

ہشام بن عبدالملک کے چہرے کی یہ حالت ہو گئی تھی جیسے کھلے اور صاف آسمان پر سیاہ گہرے بادل چھا جائیں' لیکن اس کے باوجود اس کے استفسارات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ''فقہائے بصرہ کون ہیں؟'' ہشام کی آواز اس طرح

ابھری جیسے وہ بہت دور سے کسی کو مخاطب کر رہا ہو اس سے پہلے کہ عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ لب کشائی کرتے وہ خود ہی کہنے لگا۔ "وہ لوگ بھی غلام ہوں گے۔" ہشام کی مایوسی ناقابل بیان تھی۔

"امیر المومنین کا اندازہ درست ہے۔" عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی خلیفہ کی شکستگی پر ترس آنے لگا تھا۔

"فقہائے بصرہ حسن رحمتہ اللہ علیہ اور ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے لباسوں میں بھی پیوند غلامی نمایاں ہے"۔

اعلیٰ نسبی کا بت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ علم و فضل کے میدان میں غلام زادوں کی برتری ثابت ہو گئی تھی۔ نتیجتاً وہ لوگ حیران و پریشان کھڑے تھے جنہیں اپنے نسب ناموں پر ناز تھا اور جو خود کو شاہان وقت کی اولاد تصور کرتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک شدت اضطراب میں اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور آواز لرز رہی تھی۔ "اہل کوفہ میں عالم فقہ کون ہے؟"

عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے کسی تکلف یا جھجک کے بغیر کہا۔ "ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ۔"

"یہ بھی غلام ہیں؟" ہشام بن عبدالملک حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔

"نہیں۔ ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کا تعلق نسل عرب سے ہے۔" عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

جیسے ہی آپ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے' ہشام بن عبدالملک اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بہت دیر تک خلیفہ وقت کی یہی کیفیت رہی، پھر اس کے چہرے کا گم شدہ سرخ رنگ لوٹ آیا۔ ہشام نے آنکھیں کھولیں اور عطا خراسانی رحمتہ اللہ علیہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری جان نکل جائے گی' مگر تمہاری زبان پر کسی عربی کا نام نہیں آئے گا۔"

ان دونوں واقعات سے ایک عام انسان بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ حدیث و فقہ میں غلاموں کو کیا درجہ حاصل ہے پھر بھی کوئی کج ذہن حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان کو غلامی سے آلودہ کرنا چاہتا ہے تو معاذ اللہ! یہ کوئی داغ معصیت نہیں کہ حنفی مسلک کے ماننے والے شرمسار ہو جائیں۔ اگر وہ غلام تھے تو ان کے طوق و سلاسل کا ذکر نہ کرو۔ یہ دیکھو کہ اعلیٰ نسب منصور فنا ہو گیا' اس کی عظیم الشان سلطنت اجل کی خوراک بن گئی مگر خاندان ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شاہی بھی قائم ہے اور مملکت بھی۔ ایسی شاہی کہ عقیدت مندوں کی گردنوں کے خم بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ایسی مملکت کہ جس کے طول و عرض میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ جب غلامی اس قدر قابل احترام شے ہے تو شہنشاہیت کس کام کی۔

اس کا مقصد ہرگز نہیں کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کس غلام خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تو بحث برائے بحث ہے۔ جب لوگ دلائل کی بات کرتے ہیں تو انہیں فراخدلی کے ساتھ ہمارے دلائل بھی سننے چاہئیں۔ جب تاریخ کے حوالے پیش کئے جاتے ہیں تو انہیں اس بات کا لحاظ رہنا چاہئے کہ دوسروں نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔

غلام کے اس مفروضے سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہم دوبارہ زوطی رحمتہ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تمام معتبر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ زوطی رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی بارگاہ جلیل میں رسائی حاصل تھی۔ وقت آہستہ روی کے ساتھ گزرتا رہا۔ پھر ایک دن خدا نے زوطی رحمتہ اللہ علیہ کو اولاد کی دولت سے سرفراز کیا۔ یہ اندازاً 38ھ کا زمانہ تھا۔ زوطی رحمتہ اللہ علیہ نے بیٹے کا نام ثابت رحمتہ اللہ علیہ رکھا۔ جب وہ ڈیڑھ دو سال کے ہوئے تو زوطی رحمتہ اللہ علیہ اپنے خاندان کی اس نشانی کو لے کر حضرت علیؓ کے روبرو حاضر ہوئے اور نہایت

عقیدت مندانہ لہجے میں عرض کرنے لگے۔

''امیر المومنین! یہ میرا کم سن وارث ہے۔ خاندان رسالت ﷺ کا غلام' آپ کی دعاؤں کا محتاج۔''

حضرت علیؓ زوطی رحمتہ اللہ علیہ کے جذبات سے بہت متاثر ہوئے' پھر آپ نے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھا۔ ایک دلکش نقش ونگار رکھنے والا معصوم بچہ جو اپنے بزرگوں کی غریب الوطنی کے درد سے ناآشنا تھا۔ حضرت علیؓ کی مہربان نگاہیں کچھ دیر تک ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر مرکوز رہیں۔ یہ بڑی سعادت تھی۔ وہ آنکھیں بہت قریب سے نبوت کا رخ تابناک دیکھ چکی تھیں، اب ان آنکھوں میں ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے لئے شفقت وکرم کا عکس لازوال تھا۔ بظاہر یہ عارضی لمحات تھے۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ انہی لمحات نے علم وکردار کی ایک ایسی تاریخ مرتب کی جسے روز وشب کا کثیف غبار بھی آج تک دھندلا نہ کرسکا۔ حضرت علیؓ نے زوطی رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس بچے کو میرے قریب لاؤ۔'' فرمان امیر سن کر زوطی رحمتہ اللہ علیہ کھڑے ہوئے اور ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو ''باب العلم'' کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت علیؓ کا دست کرم دراز ہوا اور پھر چند ساعتوں کے لئے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے سر پر سایہ فگن ہو گیا۔ اس وقت حضرت علیؓ کی زبان مبارک پر یہ دعائیہ کلمات تھے۔

''اے اللہ! یہ تیرا ہی کرم تھا کہ گم کردہ راہ انسانوں نے ہدایت پائی۔ وہ تیری ہی دستگیری تھی کہ تو نے زوطی کو آتش پرستوں کے ہجوم سے نکالا' ایمان کے دشوار گزار راستے میں اس کے ناتواں قدموں کو استقامت بخشی، زوطی تیرے بندے علی ابن ابی طالبؓ سے حسن ظن رکھتا ہے اور علی ابن ابی طالبؓ کو تیری رحمت بے کنار پر یقین ہے کہ تو اپنے در کے گداؤں کو خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹائے گا۔ اے ازل وابد کے خالق! نسل زوطی کو دونوں جہان میں سرخرو فرما۔''

پھر زوطی رحمتہ اللہ علیہ اپنے بیٹے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو لے کر گھر چلے آئے۔ اس کے بعد تاریخ میں کسی ملاقات کا ذکر نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ 40ھ میں حضرت علیؓ ابن ابی طالب شہید کر دیئے گئے۔ ابن ملجم کے سفاک خنجر نے ملت اسلامیہ کی شہ رگ کاٹ دی۔ یہ ایک ایسا نقصان عظیم تھا کہ جس کی تلافی ممکن ہی نہیں تھی۔ حضرت علیؓ کی شہادت پر مشہور جانباز صحابی حضرت ضرارؓ نے فرمایا۔

''آج علم بے اماں اور انصاف یتیم ہو گیا۔'' حضرت ضرارؓ نے یہ الفاظ حضرت امیر معاویہؓ کے دربار میں بہ آواز بلند ادا کئے تھے اور جنہیں سن کر امیر معاویہؓ اس قدر روئے تھے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی اور پھر خاندان بنو امیہ کے پہلے خلیفہ نے حضرت علیؓ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''خدا کی قسم! ابوالحسنؓ ایسے ہی تھے۔''



شہادت علیؓ کے بعد

اس موقع پر تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔ ویسے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کی خبر سن کر زوطی رحمتہ اللہ علیہ بہت روئے ہوں گے اور انہیں اشکبار ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس غریب الوطنی کے عالم میں حضرت علیؓ کے سوا ان کا غم گسار کون تھا؟ قیام کوفہ کے دوران وہ پہچانے ہی اس بات سے جاتے تھے کہ جناب امیرؓ نے انہیں کئی بار

شرف ملاقات بخشا تھا۔ جب حضرت علیؓ دنیا سے رخصت ہو گئے تو فارس کا یہ مختصر سا جلاوطن خاندان بے نشان ہو کر رہ گیا۔ مؤرخین یہاں تک تو زوطی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کا پتا دیتے ہیں' مگر اس کے بعد ان کی شخصیت پر گہری دھند چھا جاتی ہے۔

زوطی رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند ثابت رحمتہ اللہ علیہ' حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت تقریباً دو سال کے تھے۔ جب زوطی رحمتہ اللہ علیہ گمنام ہوئے تو ثابت رحمتہ اللہ علیہ بھی انقلابات کے غبار میں گم ہو گئے۔ کسی معتبر تاریخ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا بچپن کس طرح گزارا؟ بس اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسم دنیا کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کی ہو گی اور پھر کاروبار حیات میں مشغول ہو گئے ہوں گے۔ بعد میں کچھ مؤرخین کی روایتوں سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ زوطی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے فرزند کو تجارت کی طرف مائل کیا۔ اس پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کے دو بڑے فائدے نمایاں تھے۔ ایک تو تجارت کے ذریعے انسان کی آزادی برقرار رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک تاجر کے معاشی حالات' ملازم کے مقابلے میں کہیں بہتر ہو جاتے ہیں۔ زوطی نے اسی مصلحت کے پیش نظر ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے لئے تجارت کو منتخب کیا تھا۔ کچھ مؤرخین نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ زوطی آبائی طور پر ماضی میں ایران کے تاجر تھے۔ اس لئے اس شعبے میں مہارت ہونا لازمی بات تھی۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زوطی نے بیٹے کو تجارت کا سبق دیا۔ یہ سبق اس لئے بھی ضروری تھا کہ اگر زوطی کے اقتصادی حالات درست نہ ہوتے تو نئی مملکت' نئے شہر اور نئے نظام میں تنگ دستی کا اندیشہ تھا اور افلاس حد سے بڑھ جائے تو بیک وقت کئی طرح کی تباہیوں کے کئی دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہی وہ عوامل و اسباب تھے کہ جن کے زیر اثر زوطی نے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم بھی جاری رکھی اور تاجرانہ رموز و نکات بھی سکھاتے رہے۔

بالآخر زوطی رحمتہ اللہ علیہ کا منصوبہ کامیاب ہو گیا اور ثابت رحمتہ اللہ علیہ ریشم کے بڑے تاجر کی حیثیت سے کوفے میں نمایاں نظر آنے لگے۔ تقریباً اڑتیس سال کی عمر میں ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی شادی ہوئی۔ اس امر کی بھی تحقیق نہ ہو سکی کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی شریک حیات کس قبیلے سے تھیں۔ یہاں بھی قیاس ہی سے کام لیا جا سکتا ہے کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے اہل فارس کے کسی آزاد خاندان کی لڑکی ہی سے شادی کی ہو گی۔



فقیہ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش

یہ 80ھ کا زمانہ تھا۔ اس وقت خلیفہ عبدالملک بن مروان کی حکومت تھی اور خاندان بنو امیہ کی بلند اقبالی در و دیوار سے ظاہر ہو رہی تھی۔ تاریخ اور ماہ کا تو پتا نہیں چلتا مگر وہ 80ھ ہی کا ایک روشن اور تابناک دن تھا۔ جب ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی ایک کنیز نے انہیں ولادت فرزند کی خوشخبری سنائی۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ یہ خبر سنتے ہی سجدہ ریز ہو گئے۔

"خداوند ذوالجلال! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہم خانماں بربادوں کو اپنی رحمت کا سائبان دیا۔ ہم تہی دست تھے' تو نے اپنی نعمتوں کے انبار سے ہمارے گھروں کو بھر دیا۔ پھر تو نے ہماری نسلوں کو بے نشان ہونے سے بچا لیا۔ اگر تیری بارگاہ کرم سے یہ فرزند عطا نہ ہوتا تو نسل زوطی منقطع ہو چکی ہوتی۔ یہ تیرا احسان عظیم ہے کہ تو نے مجھے ظاہری سکون بھی بخشا اور اطمینان قلب بھی۔ ہمارے گناہوں کے سبب اپنے کرم سے ہمیں محروم نہ فرما۔ اس زمین پر تیرے سوا ہمارا

کون ہے؟" جب ثابت رحمتہ اللہ علیہ سجدہ شکر بجالا چکے تو کنیز نے کپڑوں میں لپٹے ہوئے فرزند کو ان کے سامنے پیش کیا۔ نومولود کی آنکھیں بند تھیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا چہرے پر عجیب روشنی تھی۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھیں فرط مسرت سے چمکنے لگیں۔ اولاد نرینہ کی دعائیں تو انبیائے کرام نے بھی کی ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام تو نصف شب کے سناٹے میں ساری دنیا سے چھپ کر محراب کے نیچے اپنے رب کو اس طرح پکارتے تھے۔

"اے رب میرے! مجھے تنہا نہ چھوڑ کہ تو بہتر وارث دینے والا ہے۔"

یہ ایک پیغمبر جلیل کی دعا تھی جس سے نبوت کا وقار جھلکتا ہے۔ مگر ثابت رحمتہ اللہ علیہ تو ایک عام سے سادہ دل مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی نسل کے فروغ کے لئے کیسی کیسی دعائیں نہ کی ہوں گی پھر جب یہ دعا سنی گئی تو وہ جوش محبت سے بے قرار ہو گئے۔ کنیز کو انعام و کرام سے نوازا اور بچے کا نام نعمان رکھا۔

کچھ تاریخ نویسوں نے 61ھ کو نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی ولادت کا سال قرار دیا ہے۔ بعد میں آنے والے محققین نے اس روایت کی صحت سے انکار کر دیا اور اپنے دعوے کے طور پر یہ دلیل پیش کی کہ اگر 61ھ کو نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش کا سال تسلیم کر لیا جائے تو 150ھ میں انتقال کے وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر نوے سال طے پاتی ہے۔ یہ نہایت ضعیفی اور ناتوانی کا دور ہوتا ہے۔ پھر خلیفہ منصور ایک کمر خمیدہ بوڑھے کو منصب قضا کس طرح پیش کر سکتا تھا۔ اس دلیل نے بالآخر ثابت کر دیا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ 80ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے تھے۔

پیدائش کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ کی پیشانی کشادہ و بلند تھی اور چہرہ نہایت روشن تھا۔ علم قیافہ رکھنے والوں نے ثابت رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ بچہ ظاہری علامت سے نہایت ذکی و فہیم نظر آتا ہے۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ اس پیش گوئی سے بہت خوش تھے' مگر انسانی علم اندازوں کی غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا اس لئے آپ دنیاوی علوم کے ماہروں کی قیاس آرائیوں سے دلی طور پر مطمئن نہیں تھے۔

پھر ایک دن ایک نہایت عظیم انسان ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے گھر تشریف لائے۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ انہیں پہچان نہیں سکے۔ مجبوراً معذرت کرنے لگے۔

"تم مجھے کس طرح یاد رکھ سکتے ہو۔" بزرگ نے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو خود دو سال کے تھے جب وہ واقعہ پیش آیا تھا۔"

"کون سا واقعہ؟" ثابت رحمتہ اللہ علیہ شدید حیرت کے عالم میں بزرگ کے نورانی چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"جب تمہارے باپ زوطی رحمتہ اللہ علیہ نے تمہیں امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب رحمتہ اللہ علیہ کے حضور میں پیش کیا تھا اور اس مرد شہیدؓ نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہاری آئندہ نسلوں کے لئے دونوں عالم میں سرخروئی کی دعائیں کی تھیں۔" یہ کہہ کر ان بزرگ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب بچے کو بزرگ کے سامنے لایا گیا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور بے اختیار ہو کر کہنے لگے۔ "خدا اسے ہمیشہ سربلند رکھے گا۔ حضرت علیؓ کی دعائیں بے اثر نہیں ہو سکتیں' وہ مقبول بارگاہ حق تھے۔ خدا ان کی ضرور سنے گا۔" اتنا کہہ کر وہ بزرگ چلے گئے اور ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو یقین سا آ گیا کہ خدا ان کے فرزند کو کرم خاص سے نوازے گا۔

بزرگ کے جانے کے بعد حضرت ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے دوبارہ ملازمہ کو تنہائی میں طلب کیا۔ جب خادمہ

حاضر ہوئی تو ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے اسے حکم دیا کہ وہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو لے کر ان کی خواب گاہ میں آئے۔ خاندان زوطی کے بے زبان وارث کو دوبارہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو لایا گیا۔ باپ کی محبت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ متعلقین تو بس یہ سوچ رہے تھے کہ عام انسانوں کی طرح ثابت رحمتہ اللہ علیہ بھی اولاد نرینہ کی خوشی پا کر بہت زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں' مگر کسے معلوم تھا کہ ثابت اپنے فرزند کے چہرے میں وہ علامت تلاش کر رہے ہیں جس کی طرف کوفے کے ایک خدارسیدہ بزرگ نے اشارہ کیا تھا۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے اضطراب میں یوں بھی شدت آ گئی تھی کہ بزرگ نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے حوالے سے ایک ایسا واقعہ بیان کر دیا تھا جو ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ وہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر حضرت علیؓ کی دعاؤں کے فوری اثرات دیکھنا چاہتے تھے۔ جلد بازی انسانی فطرت ہے۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ بھی اپنی اس عجلت پسندی پر قابو نہیں پا سکے تھے اور انہوں نے دل سے مجبور ہو کر نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو تنہائی میں طلب کر لیا تھا۔

خادمہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو لئے ہوئے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی خلوت گاہ میں کھڑی تھی۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے ایک نظر ملازمہ کی طرف دیکھا اور بے قرار ہو کر اپنی نشست سے اٹھے پھر بے اختیارانہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ دنیا کا ہر باپ اولاد کے سلسلے میں اضطراری عمل کا شکار ہوتا ہے مگر ثابت رحمتہ اللہ علیہ کا اضطراب کچھ اور تھا۔ اہل دنیا اس راز کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ اس قدر بے چین اور مضطرب کیوں ہیں؟ خاندان کا وارث آغوش میں آیا تو قلب کی حرارت کچھ اور بڑھ گئی' جذبے کچھ اور بے قرار ہو گئے۔

ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی صرف دیکھا۔ فرزند کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے ان آنکھوں میں حضرت علیؓ کی دعاؤں کا عکس تلاش کرنا چاہا۔ ایک بزرگ کی پیش گوئی کے آثار ڈھونڈنے کی کوشش کی وہاں معصوم روشنی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو کیا نظر آتا؟ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھ' علیؓ کی آنکھ نہیں تھی کہ زمانے کا جگر چاک کر کے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کا عظیم الشان مستقبل دیکھ لیتی۔ وہ آنکھ تو ایک عام مسلمان کی آنکھ تھی جس کی پتلیاں جوش محبت میں کانپ رہی تھیں۔ آخر شدت جذبات سے مجبور ہو کر ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی روشن و معصوم پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے وہ ہونٹ جن کا دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں۔

ثابت رحمتہ اللہ علیہ بہت دیر تک نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو پیار کرتے رہے۔ پھر نہایت رقت آمیز لہجے میں اس بچے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے جو ان کی باتوں کے مفہوم سے قطعاً نا آشنا تھا۔ "جان ثابت! تو ہی وہ ہے۔ تو وہی ہے جس کی آمد کی خبر حضرت علیؓ نے تیرے دادا زوطی کو دی تھی کاش! میں اپنی آنکھوں سے امیرؓ کے الفاظ کو مجسم ہوتا ہوا دیکھ لوں۔ خدا تجھے ہمیشہ اس صحابی جلیلؓ کی دعاؤں کے حلقہ اثر میں رکھے۔" پھر ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو خادمہ کے سپرد کر دیا اور اپنے تجارتی کاموں میں مشغول ہو گئے۔

امام رحمتہ اللہ علیہ کی پہلی درس گاہ

گردش روز و شب کا عمل جاری رہا۔ شمس و قمر اللہ کے قائم کردہ مستقر کی طرف بڑھتے رہے اور وقت اپنے دائرے میں تیرتا رہا۔ جیسے جیسے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی عمر بڑھتی جا رہی تھی' حضرت ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی محبت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کسی بھی معتبر تاریخ سے اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کے علاوہ ثابت رحمتہ اللہ

علیہ کی کوئی دوسری اولاد بھی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو فقہ حنفی کے ماننے والے یا امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مخالفین اس واقعے کا ذکر ضرور کرتے۔ نتیجتاً یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ اپنے ماں باپ کی تنہا اولاد تھے۔ بچے کی یہ حیثیت فطری طور پر ماں باپ کی نظروں میں اس کی قدر و قیمت بڑھا دیتی ہے۔ نعمان رحمتہ اللہ علیہ اپنے والدین کے اکلوتے فرزند تھے اس لئے زیادہ محبوب بن گئے تھے۔ اگر آپ کے دوسرے بہن بھائی بھی ہوتے تو ماں باپ کی یہ محبت قدرتی طور پر تقسیم ہو جاتی۔ بہر حال خدا کو یہی منظور تھا کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ خاندان ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے تنہا وارث ہوں اور پھر دست قدرت اس انداز میں اس لالہ صحرائی کی حنا بندی کرے کہ سارا عالم سر بگریباں رہ جائے۔

نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی عمر تین سال ہوئی تو ثابت رحمتہ اللہ علیہ اپنے فرزند کو لے کر مشہور امام قاری عاصم رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے (امام عاصم رحمتہ اللہ علیہ کا شمار ان سات بزرگوں میں ہوتا ہے جو قرأت کلام الٰہی میں درجہ کمال رکھتے تھے) حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کے معصوم چہرے پر نگاہ کی اور پھر ثابت رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا۔

"آپ نے کس لئے زحمت کی؟" حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ کا لہجہ نہایت شیریں اور مشفقانہ تھا۔

"آپ کی خدمت عالیہ میں حاضری کا ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ بے خبر لوگ تلاوت قرآن کے آداب سیکھیں۔" ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے مرد بزرگ کے حضور ادب و احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ خدا آپ کو اس حسن ظن کے صلے میں جزائے خیر دے۔" حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ کا انکسار قابل دید تھا۔ "میں اس قابل کہاں کہ اللہ کے کلام کو زبان پر لاؤں اور اس کی صحیح ادائیگی کر سکوں۔ ایک میں ہی کیا' سچ تو یہ ہے کہ اہل زمین پر کوئی بھی اس لائق نہیں کہ قرأت قرآن کا حق ادا کر سکے۔ پھر بھی کوفے میں چند بزرگ موجود ہیں۔ آپ ان سے رجوع کریں۔" حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ کا یہی طریقہ تھا کہ عام لوگوں سے گریز کرتے تھے اور جب تک کوئی طالب علم ان کے قائم کردہ معیار پر پورا نہیں اترتا تھا اس وقت تک نہ کلام الٰہی سکھاتے تھے اور نہ قرأت کی تعلیم دیتے تھے۔

ثابت رحمتہ اللہ علیہ اس مرد بیباک کا جواب سن کر مایوس ہو چلے تھے' مگر پھر بھی حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ کے آستانے کو نہیں چھوڑا۔ شدت جذبات کے ساتھ اپنے دل کا حال بیان کرنے لگے۔ "میں تو یہی سوچ کر آیا تھا کہ میرے بچے پر علم کا یہ دروازہ بند نہیں ہوگا۔"

"بے شمار دروازے کھلے ہیں۔ کسی پر بھی دستک دو۔ تمہارے فرزند کا دامن علم کی دولت سے بھر جائے گا۔" حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازی بدستور تھی۔ "میں تو صحیح راستے کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ تم یہ راز کیوں نہیں سمجھتے کہ میرا علم زیادہ نہیں۔ میں اس بچے کو اپنے سے بہتر لوگوں کی صحبت میں بھیجنا چاہتا ہوں۔" حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ نے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو آزمانے کے لئے دوسرا رخ اختیار کیا تھا۔

"میں کسی دوسرے دروازے کی جانب نہیں دیکھتا۔" ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے ارادے مستقیم تھے۔ "ہاں' مجھے یہ اعتراف ہے کہ میرا بچہ آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کے قابل نہیں' مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس در سے اٹھ کر کہیں اور چلا جاؤں۔" ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی ابتدائی تربیت خصوصاً

آن حکیم کی تعلیم کے لئے کسی دوسرے بزرگ کا انتخاب نہیں کریں گے۔

حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر آپ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ جن میں محبت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں تھا۔ پھر اس عظیم و جلیل قاری کا مہربان ہاتھ بلند ہوا اور خاندان زوطی کے وارث کے سر پر سایہ فگن ہو گیا۔ ''علم جذبہ طلب کو دیکھتا ہے' ایثار و قربانی کی نمود چاہتا ہے۔ مجھے بھی تمہارے دل کی آزمائش درکار تھی۔ نیت کا امتحان مقصود تھا۔ جب تک روح میں یہ سچائیاں بیدار نہ ہوں اس وقت تک حصول علم کا کوئی فائدہ نہیں۔'' حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ علم کے اسرار و رموز ظاہر کر رہے تھے۔ اس کے بعد آپ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یہ فرزند تو اس لائق ہے کہ جدھر سے گزرے گا، درس گاہیں خود اسے پکاریں گی، اساتذہ خود آوازیں دیں گے کہ اے علم کے وارث! ہماری طرف آ! ہمارے حلقوں میں بیٹھ اور اپنی وہ امانت حاصل کر لے جس کا بار گراں برسوں سے ہمارے سروں پر ہے۔''

حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ کے اس اعتراف نے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے یقین کو مزید پختہ کر دیا تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دعائیں رنگ لا کر رہیں گی۔



امام رحمتہ اللہ علیہ کا بچپن

نعمان رحمتہ اللہ علیہ فطرتاً تاریخ آدم کے ذہین ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔ اس لئے آپ نے بہت کم سنی کے عالم میں نہ صرف قرآن حکیم حفظ کر لیا بلکہ آداب قرأت سے بھی بخوبی واقف ہو گئے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی عمر آٹھ اور دس سال کے درمیان ہو گی۔ یہ قیاس آرائی محض اس لئے ہے کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ (حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ) کے بچپن کے حالات پر وقت نے گہرا پردہ ڈال دیا ہے۔ اس زمانے کے واقعات کو مؤرخین نے بیان تو کیا ہے مگر اس طرح کہ سند پیش کرتے وقت کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا ہے۔ اصولاً جب کوئی روایت کسی دعوے کے بغیر پیش کی جاتی ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ خود مؤرخ بھی تذبذب کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے ابتدائی حالات بیان کرتے وقت معتبر اور مشہور تاریخ نویس یا تو خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا پھر اندازہ و قیاس کا سہارا لے کر صرف چند سطریں قلم بند کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اور جہاں تک حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے عقیدت مندوں کا سوال ہے تو یہ جماعت کسی تحقیق کے بغیر نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو روز اول سے ایک عالم و فاضل شخص ثابت کرنے پر بضد ہے۔ انتہا یہ ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ صغیر سنی سے بھی ایسے واقعات منسوب کر دیئے گئے ہیں' جو اپنی اصل کے اعتبار سے محیّر العقول نظر آتے ہیں۔ ہم ان واقعات کی صحت و عدم صحت پر بحث نہیں کریں گے۔ ممکن ہے کہ یہ سارے واقعات حرف بہ حرف درست ہوں مگر ایک ثقہ اور مستند محقق اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اس نے کسی معتبر راوی سے یہ واقعات نہیں سنے۔ ہمارے نزدیک تحقیق کی یہ منزل حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی۔ اگر امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے عقیدت مند چھ سات سال کی عمر میں نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ ادا کراتے ہیں کہ جنہیں سن کر

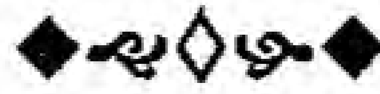
عقل انسانی دنگ رہ جائے تو یہ کوئی غیر حقیقی بات نہیں ہوگی۔ کیوں کہ خالق کائنات ہر طرح اپنی قدرت کی کرشمہ سازی کے مظاہرے پر قادر ہے۔ جس ذات اقدس کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں بول سکتے ہیں اور پوری قوم کے سامنے اپنی مادر گرامی حضرت مریمؑ کی عصمت پر گواہی دے سکتے ہیں تو پھر نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے بچپن کو بھی غیر معمولی ذہانت کے واقعات سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ معاذ اللہ! امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ پیغمبر نہیں تھے مگر جس خدا نے انبیائے کرامؑ کی تخلیق کی تھی، اسی نے نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو بھی پیدا کیا تھا۔ اب اگر کوفے کے اس بچے سے کم سنی کے دور میں کچھ ایسی حیرت انگیز باتیں ظاہر ہوئیں' جنہیں سمجھنے سے بڑے بڑے صاحبان عقل بھی قاصر رہتے تھے' تو پھر اہل دنیا کو حیرت کیوں ہے؟

جب نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے' حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ تیرہ سال کی عمر میں محراب حرم کے نیچے کھڑے ہو کر اعلان کر سکتے ہیں کہ...... "اے عراق والو! اے شام والو! جو کچھ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو' پوچھ لو"...... تو پھر ایسا ہی دعویٰ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس اگر مؤرخین' نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے عہد طفلی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو ان کے اس طرز عمل سے اس بچے کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا جو آگے چل کر مسلمانوں کے بہت بڑے مسلک کی نظر میں امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ ٹھہرا۔ دراصل یہ ایک عجیب بحث ہے جو دو طبقوں کے درمیان صدیوں سے جاری ہے۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے مخالفین معتبر تاریخوں کے حوالے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا ابتدائی زمانہ ایک عام بچے کی حیثیت سے بسر کیا۔ اس ذیل میں عقیدت مندوں کا دعویٰ یہ ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نوعمری میں بھی امام ہی نظر آتے تھے۔ اپنے اس دعوے میں شدت پیدا کرنے کے لئے عقیدت مندوں کے گروہ نے امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی ذات سے ایسے بے شمار واقعات منسوب کر دیئے ہیں جن کا تاریخ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس ذیل میں برصغیر کے مشہور مؤرخ علامہ شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "سیرت نعمان رحمتہ اللہ علیہ" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں ...... "اس مقام پر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مناظرات اور نکتہ آفرینیوں کے متعلق بہت سے بے سروپا افسانے شہرت پکڑ گئے اور طرہ یہ کہ بعض مشہور مصنفوں نے بغیر تحقیق وتنقید کے ان کو اپنی تالیفات میں نقل کر دیا جس سے عوام کو اپنے خیالات کے لئے ایک دستاویز ہاتھ آ گئی۔"

اس سنجیدہ بحث سے قطع نظر' یہ حقیقت ہے کہ کسی مستند تاریخ سے نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے بچپن کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ بس حضرت عاصم رحمتہ اللہ علیہ سے تعلیم قرأت اور درس قرآن کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد صرف قیاسات کے ذریعے ہی باقی سفر طے کیا جا سکتا ہے اگر ہم معتبر مؤرخین کے دلائل کو تسلیم کر لیں تو یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ حفظ قرآن کے بعد نعمان رحمتہ اللہ علیہ کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور آپ اپنے والد گرامی ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی زیر نگرانی تجارتی امور میں مشغول ہو گئے تھے۔ مختلف روایتوں کے مطابق نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی کاروباری مصروفیات کا یہ زمانہ سولہ سترہ سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس دوران نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کا علمی درس گاہوں سے کوئی تعلق نہیں رہا تو صورتحال کو سمجھنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس لئے تجارت میں دلچسپیوں کے ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کا سلسلہ تعلیم کسی نہ کسی عنوان

ری تھا۔ اگر وہ مذہبی علوم حاصل کرنے میں منہمک نہیں تھے تو کم سے کم عربی زبان ضرور سیکھ رہے تھے۔ اس کی یادی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان سے مکمل آگاہی کے بغیر حدیث وفقہ کی روح کو سمجھنا ناممکن تھا۔



امام رحمتہ اللہ علیہ کوچہ تجارت میں

اس امر پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے فرزند نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو تجارتی نشیب و راز سے بخوبی آگاہ کر دیا تھا اور یہ بات بھی نوعمر وارث کے ذہن نشین کرا دی تھی کہ تجارت ہی شخصی آزادی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا تصور تجارت موجودہ تاجروں کے آداب سوداگری سے بہت مختلف تھا۔ اگرچہ ہم ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو صوفیائے کرام کی صف میں شمار نہیں کرتے' لیکن پھر بھی وہ اول و آخر ایک متقی انسان تھے۔ ان کی کامیاب تجارت کا ڈھانچہ معاملات کی صفائی اور دیانت داری کی بنیادوں پر استوار ہوا تھا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک آزاد انسان محسوس کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی والد محترم کی شکل میں ایک ایمان دار شخص کو عملی طور پر متحرک دیکھا تھا۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی ان ہی صفات نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کے معصوم ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے اور یہی وہ اثرات تھے جو مستقبل کے ایک عظیم انسان کے کردار کی تعمیر کر رہے تھے۔

سولہ سال کی عمر تک امام رحمتہ اللہ علیہ کے تعلیمی مشاغل کا کوئی مستند اور تفصیلی تذکرہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس بیشتر کتابوں میں آپ کی تجارتی امور میں دلچسپیوں کا ذکر نظر آتا ہے۔ کچھ مؤرخین نے واضح طور پر یہ بات بھی تحریر کی ہے کہ امام رحمتہ اللہ علیہ نے نوعمری کے باوجود کاروباری اعتبار سے بھی بڑی ذہانت اور دانشمندی کا ثبوت دیا۔ کئی مواقع پر اپنے والد گرامی کو ایسے مشورے دیئے جن سے آپ کی آبائی تجارت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ ہمارے نزدیک کوئی تعجب کی بات نہیں۔

امام رحمتہ اللہ علیہ پیدائشی طور پر دنیا کے ان چند ذہین ترین انسانوں میں سے تھے جن کا عکس تلاش کرتے کرتے صدیاں گزر جاتی ہیں' مگر پھر بھی اس کی مکمل شبیہ سامنے نہیں آتی۔ ذہانت کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اپنی ایک راہ ہے اور یہ رو جدھر سے بھی گزرے گی' گردوپیش کو متاثر کرتی چلی جائے گی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ پر بچپن میں علم کے دروازے بند ہوئے تو ذہانت نے باپ دادا کی تجارت کو نیا رنگ دے دیا۔ کم سنی کے عالم میں بھی والد گرامی کے سامنے ایسے منصوبے پیش کئے' جو بظاہر بے سود نظر آتے تھے مگر مستقبل قریب میں وہ بہت زیادہ بارآور ثابت ہوئے۔ کسی شاعر کا ایک عجیب سا شعر ہے

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

امام رحمتہ اللہ علیہ کی ذہانت بھی آب رواں کی مانند تھی۔ جب درس گاہوں تک نہ پہنچ سکے تو باپ کے حکم پر بازاروں کا رخ کیا اور پھر کوفے کے ایک پندرہ سالہ نوجوان نے ہوش وخرد کی باتوں سے ان جہاں دیدہ بوڑھوں کو عاجز کر دیا جو سودوزیاں کے حساب میں اپنی عمریں تباہ کر چکے تھے۔ امام رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے کے بعد اکثر تاجر کہا

کرتے تھے۔

"ثابت کا یہ نوعمر فرزند تجارت کے مقررہ ہدف سے بہت آگے دیکھتا ہے اور ان باتوں کے بارے میں سوچتا ہے جن کا زمانہ حال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی تیز نظریں بازار کے اندر کے مناظر کو بھی جذب کر لیتی ہیں اور باہر پیش آنے والے واقعات بھی اس کی بصارت کے پردے پر نقش ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت جلد ہم سب پر بازی لے جائے گا۔" امام رحمتہ اللہ علیہ کو تجربہ کار سوداگروں کا یہ خراج تحسین کوئی رسمی کارروائی نہیں تھی۔ انہیں یقیناً ایک ایسے بچے سے سابقہ پڑا تھا جو ان کے تصور سے بھی زیادہ باہوش و باخبر تھا۔ اس دور کے تاجر امام رحمتہ اللہ علیہ کے فیصلوں پر چونک اٹھتے تھے مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ وہ جس بچے کو منڈیوں اور بازاروں میں آتے جاتے دیکھتے ہیں وہ زمین پر اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ایسی نشانی جس کے مکمل ظہور کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ وہ قدرت کے اس راز سے بھی بے خبر تھے کہ جب بہتے ہوئے پانی کے آگے کوئی بند باندھ دیا جاتا ہے تو وہ اپنی شدت کو برقرار رکھنے کے لئے یا تو پتھروں میں شگاف ڈال دیتا ہے یا پھر کوئی دوسرا راستہ تراش لیتا ہے امام رحمتہ اللہ علیہ کی تاجرانہ ذہانت اور کامیاب منصوبہ سازی بھی فطرت کے اسی اصول کے زیر اثر تھی۔

اب یہاں انسانی ذہنوں میں ایک ایسا سوال ابھرتا ہے کہ جس کا جواب حاصل کئے بغیر امام رحمتہ اللہ علیہ کی داستان حیات کا اہم ترین باب نامکمل رہ جاتا ہے۔ حضرت ثابت رحمتہ اللہ علیہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے انہیں اپنی محبتوں اور دعاؤں سے شرف یاب کیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کی اولاد کے حق میں بھی دعائے خیر کی تھی۔ پھر جب امام رحمتہ اللہ علیہ پیدا ہوئے تو ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے برملا کہا کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش حضرت علیؓ کی دعائے خاص کا نتیجہ ہے۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ خلفائے راشدین میں حضرت علی ابن ابی طالبؓ ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ باب العلم ہونے کے سبب یہ نہایت فطری چیز ہے کہ حضرت علیؓ کی دعاؤں کا محور بھی علم ہی ہوگا۔ ہر ذی ہوش انسان بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ جب کوئی اہل علم کسی کو دعا دے گا تو یہ ناممکن ہے کہ وہ "علم و آگہی" کو اپنی دعا میں شامل نہ کرے۔ نتیجتاً جب حضرت علیؓ نے ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد کے لئے خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ دراز کئے تھے تو دیکھنے والوں کو سمجھ لینا چاہئے تھا کہ امیر المومنین کے پیش نظر پہلے علم ہے اور بعد میں دنیا کی دوسری سعادتیں۔

اس حقیقت کے روشن ہو جانے کے بعد ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے لئے لازم تھا کہ وہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو کر امام رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت میں گم ہو جائیں اور اپنے تمام وسائل بیٹے کے حصول علم کے لئے وقف کر دیں مگر تاریخ جو منظر پیش کرتی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ امام رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں تو ثابت رحمتہ اللہ علیہ سرگرم عمل نظر آتے ہیں، لیکن حفظ قرآن کے بعد اچانک یہ سلسلہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے پھر ہم ایک دوسرا منظر دیکھتے ہیں کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ تجارتی منڈیوں اور بازاروں کی بھیڑ میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ان کے دوش بدوش امام رحمتہ اللہ علیہ بھی ہیں اور ریشمی کپڑے کے لین دین پر بات چیت ہو رہی ہے۔ حضرت علیؓ کی دعاؤں کا واضح ردعمل تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ اپنی کاروباری مصروفیات ترک کر کے امام رحمتہ اللہ علیہ کو ایک درس گاہ سے دوسری درس گاہ اور ایک مجلس علم سے دوسری مجلس علم میں لئے پھرتے۔ فرزند کی تعلیم کے لئے اس وقت کے بہترین استادوں کا انتخاب کرتے اور اس راستے میں جو دشواریاں پیش آتیں انہیں اپنے مالی وسائل کے ذریعے یا ذاتی

جدوجہد سے دور کرنے کی کوشش کرتے' مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ اس سلسلے میں زیادہ پرجوش نظر نہیں آتے تھے۔

بظاہر علم کی طرف سے سرد مہری کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ' حضرت علیؓ کی دعاؤں کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکے اور امیر المومنین کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو دنیا کی عام خوش بختیوں سے تعبیر کیا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ' حضرت علیؓ کی دعاؤں کے مفہوم سے بخوبی آگاہ تھے لیکن خاندانی طور پر تاجرانہ رجحان کے باعث حصول علم کو اپنے فرزند کی زندگی کا محور نہ بنا سکے ہم جیسے لوگ اس نازک مسئلے پر رائے زنی کا زیادہ استحقاق نہیں رکھتے۔ پھر بھی آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے ابتدائی زمانے میں نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو اسی راستے پر چلانے کی کوشش کی تھی جو سیدھا "باب العلم" کی طرف جاتا تھا۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ پر یہ الزام غلط ہے کہ آپ خاندانی تاجر ہونے کی وجہ سے دولت کو علم پر ترجیح دیتے تھے۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ نسل زوطی کی یہ نشانی دونوں افق پر طلوع ہو۔ افق علم بھی اس کی زد میں رہے اور افق معاشیات بھی۔ وہ اپنے بیٹے کی زندگی میں توازن چاہتے تھے۔ اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی شدید خواہش کے باوجود نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں یہ عدم توازن کیوں ظاہر ہوا؟

یہ ایک نہایت مشکل سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں اس دور کا مکمل سیاسی جائزہ لینا ہوگا۔ دراصل یہ وہ سیاسی اثرات تھے جن کے سبب روشن درس گاہیں تاریکیوں میں ڈوبنے لگی تھیں اور علم اس قدر لاوارث ہو چکا تھا کہ چند اہل دل کے سوا اس کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔



سیاسی فضا

حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ 80ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ خاندان بنو امیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت خلیفہ عبد الملک بن مروان کو امیر المومنین کی حیثیت حاصل تھی۔ عبد الملک کا دور حکومت 65ھ سے شروع ہو کر 86ھ پر اختتام پذیر ہوا۔ جب فرشتہ اجل نے عبد الملک بن مروان کی سانسیں غصب کیں اس وقت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی عمر چھ سال تھی۔ یہاں اموی خلیفہ کا مکمل کردار زیر بحث نہیں۔ پھر بھی ایک اہم واقعے کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ خلافت کی ذمے داریاں سنبھالتے ہی عبد الملک بن مروان مدینہ منورہ پہنچا تھا اور منبر رسول ﷺ سے اس نے عوام الناس کو اس طرح مخاطب کیا تھا۔

"خدا کی قسم! میں کمزور خلیفہ نہیں ہوں (اشارہ حضرت عثمان غنیؓ کی طرف تھا) اور نہ خاطر و مدارات کرنے والا سخن ساز خلیفہ ہوں (یہ اشارہ حضرت امیر معاویہؓ کی طرف تھا) تم لوگ ہم حکمرانوں سے تو فرمائش کرتے ہو لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ خدا کی قسم! اگر آج کے بعد کسی نے مجھ سے تقویٰ کی فرمائش کی تو میں اسی وقت اس کی گردن اڑا دوں گا۔"

علامہ ابو بکر رحمتہ اللہ علیہ نے عبد الملک بن مروان کی اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہی پہلا منحوس دن اور مسلمانوں کا پہلا بادشاہ تھا جس نے عام مسلمانوں کی زبانیں کاٹ دیں۔"

اسی عبدالملک بن مروان نے برسر عام ظلم کی سرپرستی کی اور حجاج بن یوسف جیسے سنگ دل انسان کو اسلامی معاشرے پر مسلط کیا۔ حجاج عراق کا عامل تھا مگر اس کے ظلم و تشدد سے مملکت اسلامیہ کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں تھا۔ اس کی شمشیر ستم بے نیام ہوئی تو لاکھوں اہل ایمان اپنے خون میں نہا گئے۔ قتل تو بہرحال قتل ہے وہ ایک عام مسلمان کا قتل ہو یا کسی مرد کامل کا، خدا کے یہاں دونوں قابل گرفت ہیں۔ تاہم جب کسی صاحب کردار پر تیغ جفا کھینچی جاتی ہے تو یہ خونیں منظر دیکھنے والے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ بہت ممکن تھا کہ بعد از مرگ حجاج کی رسوائیوں میں کمی واقع ہو جاتی' اگر اس کے نامہ اعمال میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے صحابی کا قتل درج نہ ہوتا۔ خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے حقیقی نواسے' امام المومنین حضرت عائشہؓ کے بھانجے' حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے فرزند کا قتل اتنی آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر حجاج بیک وقت لاکھوں مسلمانوں کو ہلاک کر ڈالتا اور صرف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے نرمی کا سلوک روا رکھتا تو آج اس کے نام سے نفرت کرنے والے اپنے جذبوں کے اظہار میں اس قدر شدت پسند نہ ہوتے۔

اس منظر کی ہولناکی کا کون اندازہ کر سکتا ہے جب حجاج کی منجنیقوں نے حرم کعبہ پر سنگ باری کی۔ بے شک! صحن حرم' عبداللہ بن زبیرؓ کی پناہ گاہ تھا اور جنگی نقطہ نظر سے اہل دنیا پتھروں کی اس بارش کو جائز قرار دے سکتے ہیں مگر حجاج بالآخر مسلمان تھا۔ انتہائی ناگزیر حالات کے باوجود سنگ باری کا فرمان جاری کرتے ہوئے اس کی زبان کو لڑکھڑانا چاہیے تھا اور ہاتھ کو بلند کرتے وقت اس کے جسم پر لرزش طاری ہونی چاہیے تھی۔ ایک مسلمان کے لئے رب کعبہ کا اتنا خوف تو لازمی ہے ورنہ ایمان کے باطل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ حجاج نے اپنے اور اللہ کے درمیان کسی رشتے کو قائم نہیں رکھا۔ ایک عام کلمہ گو بھی جانتا ہے کہ مسلمانوں کے آداب جنگ بھی ساری دنیا سے مختلف ہیں۔ کتنی بھی اذیت ناک جذباتی صورت حال ہو مگر ایک مسلمان فاتح کافر بوڑھوں' بچوں اور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ انتہا یہ ہے کہ مفتوحہ علاقے کے سبزہ زاروں کو بھی نذر آتش نہیں کر سکتا اور پھر حرم کعبہ تو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی تعمیر تھی اور زمین پر اللہ کا پہلا گھر تھا۔ اس طرح حجاج کی بدترین شقاوت قلبی کی تردید کون کر سکتا ہے؟ معاذ اللہ! اگر ہم اس واقعے کی طرف سے چشم پوشی بھی کر لیں تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ آخر میں کم و بیش تنہا رہ گئے تھے، پھر اس مرد جری کو اتنی سفاکی کے ساتھ شہید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا حجاج یہ چاہتا تھا کہ رسالت مآب ﷺ کی محبت کے سائے میں پرورش پانے والا جانباز' عبدالملک بن مروان کی بھیجی ہوئی سونے کی بیڑیاں پہن لیتا یا عامل عراق کے حضور معافی نامہ داخل کر کے عافیت کے سائبان میں داخل ہو جاتا؟ اموی خلیفہ اور حجاج یہی چاہتے تھے مگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے طاقت و اقتدار کی نفی کر دی...... اور جب میدان جنگ میں آپ کا روشن و تابناک چہرہ لہولہان ہو گیا تو حجاج کے سپاہیوں نے ایک بارعب اور پر جلال آواز سنی۔ یہ آواز حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تھی۔ آپ ایک عجیب سے لہجہ و آہنگ میں یہ رجزیہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

''ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو پشت پر زخم کھاتے ہیں اور ایڑیاں ان کے خون سے حنا رنگ ہو جاتی ہیں بلکہ خون ہمارے پنجوں پر گرتا ہے۔''

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ خون کی دھاریں چہرے کو گل رنگ کرتی ہوئیں سینے کی طرف بڑھیں اور آخر میں ابن زبیرؓ کے پائے استقامت کو رنگین کر گئیں۔

حجاج بن یوسف نے حضرت امیر معاویہؓ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے سے اس کی جرأت گفتار کا انتقام لے لیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید کر دیئے گئے اور آپ کا سر کاٹ کر عبدالملک بن مروان کے پاس بھیج دیا گیا۔

حجاج کے سنگدلانہ جذبوں کی پھر بھی تسکین نہیں ہوئی تو ابن زبیرؓ کی مادر گرامی حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے پاس پہنچا اور ان محترم خاتون سے چیخ کر کہنے لگا، جو پیرانہ سالی کے سبب بینائی سے محروم ہو چکی تھیں۔

''تیرے بیٹے نے میرا حکم نہیں مانا' میں نے اس کی دنیا خراب کر دی۔''

یہ سفاکی کا کون سا درجہ تھا' اہل نظر اندازہ کریں۔

اہل دنیا تو یہی کہیں گے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ حجاج بن یوسف نے جو کچھ کیا وہ سیاست و منطق کی نگاہ میں درست تھا' مگر اسی دور میں تاریخ کے صفحات پر ایک اور مرد بیباک کا چہرا ابھرتا ہے۔ وہ عامل خراسان عبداللہ بن خازم تھا۔ خلیفہ عبدالملک نے اسے دولت و اقتدار کی پیش کش کرتے ہوئے ایک خط تحریر کیا تھا؟

''ابن خازم! اگر تم اطاعت قبول کر لو تو میں ہمیشہ تم پر مہربان رہوں گا اور خراسان دس سال تک تمہاری جاگیر میں رہے گا۔''

ابن خازم نے اس وقت صریحاً انکار نہیں کیا تھا مگر وہ دل سے عبدالملک کی بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا اسی دوران حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا سر تن سے جدا کر کے دربار خلافت میں بھیج دیا تھا۔ عبدالملک بن مروان نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے صحابی رسول ﷺ کا سر ابن خازم کے پاس خراسان بھیج دیا (یہ کیسا وحشیانہ کھیل تھا جو اہل اقتدار ایک ایسے شخص کے ساتھ کھیل رہے تھے جس سے اللہ راضی ہو چکا تھا۔)

جیسے ہی ابن خازم نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا خون آلود سر دیکھا' اس پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ پھر اس نے عبدالملک بن مروان کے قاصد سے چیخ کر کہا۔

''خدا کی قسم! اب تو میں کسی حال میں بھی عبدالملک کی اطاعت نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر ابن خازم نے قاصد کو حکم دیا کہ ''عبدالملک کا خط نگل جاؤ۔'' پھر اپنے نفرت و غضب کا مزید اظہار کرنے کے لئے قاصد سے کہنے لگا۔''اگر میری راہ میں آداب سفارت مانع نہ ہوتے تو میں تجھے قتل کرا دیتا۔''

اس کے بعد ابن خازم نے ایک بڑا طشت منگوایا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سر کو غسل دیا' خوشبو لگائی، کفن پہنایا اور اس صحابی جلیل کی نماز جنازہ پڑھی پھر جب ابن خازم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ بہت دیر تک حزن و ملال کی کیفیت طاری رہی۔ بالآخر شدت جذبات میں اعتدال پیدا ہوا تو ابن خازم نے پورے اعزاز کے ساتھ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا سر مبارک ان کے اہل و عیال کے پاس مدینہ منورہ بھیج دیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی سرکشی تھی۔ ناطاقتی کے باوجود ابن خازم نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اگر اہل دل سوچیں تو یہ غیر معمولی جرأت مندانہ اقدام تھا۔ ابن خازم نے وادی مرگ میں محصور ہوتے ہوئے بھی ایک صحابی رسول ﷺ کے احترام کا حق ادا کر دیا تھا۔ جس طرح حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سر کی پوری قیمت وصول کرتے ہوئے اپنے مادی جاہ و حشم میں اضافہ کر لیا تھا، اس طرح ابن خازم بھی صدیق اکبرؓ

کے نواسے کی بے کفن لاش فروخت کر کے اپنے محلات کے مینار کو بلند کر سکتا تھا مگر یہی انسانی فطرت کا فرق ہے۔ حجاج عہد توڑ دینے والا تھا اور ابن خازم اپنی شہ رگ پر تلوار کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے بھی ایفائے عہد کرنے والا تھا۔ یہ اسی عہد کی پاسداری کا نتیجہ تھا کہ انجام کار ابن خازم قتل ہوا اور اس کا سر عبدالملک بن مروان کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبدالملک ہو یا حجاج' حکومت وقت کا کوئی بے ضمیر وفادار ہو یا باغی ابن خازم' بظاہر کسی کے کاندھے پر سر باقی نہیں رہا مگر تاریخ کے صفحات پر سربلندی و پستی کا ایک معیار قائم ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کا المناک واقعہ 73ھ میں پیش آیا۔



حجاج بن یوسف کی چیرہ دستیاں

حجاج کے نزدیک یہ اتنا عظیم الشان تاریخی کارنامہ تھا جس پر وہ آخری سانس تک نازاں رہا۔ پھر جب اسے عراق میں شورش کا گمان ہوا تو وہ کوفے کی طرف بڑھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شکست نے حجاج کے نشہ حکمرانی کو اس قدر تیز کر دیا تھا کہ وہ ایک عامل ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات کو فاتح عالم کے آئینے میں دیکھنے لگا تھا۔ 75ھ میں کبر و غرور کی عجیب رفتار کے ساتھ حجاج کوفے میں داخل ہوا۔ انسانی ہجوم سے ''اللہ اکبر'' کی صدا ابھری۔ نہ جانے وہ کون بندہ خدا تھا جو شدید عالم جبر میں بھی اپنے اللہ کی کبریائی بیان کر رہا تھا۔ یہ ایک نعرہ توحید ہے جو موجودہ سیاہ کاریوں کے دور میں بھی مسلمان بے اختیار بلند کرتا ہے۔ حجاج کے سامنے بھی کسی جاں سوختہ کی یہی وارفتگی ظاہر ہو گئی تھی۔ حجاج اس نغمہ سرمدی کی لے کو برداشت نہ کر سکا اور پھر اس نے اہل کوفہ کو اس طرح مخاطب کیا کہ مذہب و ملت کے تمام روابط کو پامال کر ڈالا۔ حجاج نے نخوت و تکبر کی ساری حدوں کو عبور کرتے ہوئے کہا۔

''اے عراق کے باغی باشندو! اے منافقو اور اے برے اخلاق والو!

میں نے تکبیر کی ایک آواز سنی ہے' مگر یہ وہ تکبیر نہیں ہے جس سے اللہ کے راستے میں ترغیب دلائی جاتی ہو بلکہ اس کا مقصد صرف لوگوں کو خوف زدہ کرنا ہے اور انسانی صفوں میں انتشار پھیلاتا ہے۔ میں نے خوب جان لیا ہے کہ یہ ایک غبار ہے جس کے پردے میں بڑی ہولناک آندھی آنے والی ہے۔ اے بیوقوف لونڈیوں کے بچو! اور اے بیوہ ولاوارث عورتوں کے بیٹو! کیا تم میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنے ضعف و ناتوانی کے باوجود خاموشی سے بیٹھے اور اپنے خون کو مفت نہ بہائے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عنقریب تمہیں ایسی سزا دوں گا جو موجودہ دور کے لئے عذاب اور آئندہ نسلوں کے لئے عبرت ثابت ہو گی۔''

اہل نظر جانتے ہیں کہ ''بے وقوف لونڈیوں کے بچو'' کیسا توہین آمیز طرز تخاطب ہے۔ حجاج اہل کوفہ کی غیرت و حمیت پر دشنام کے تازیانے برسا رہا تھا۔ ایک تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت' دوسرے مجمع عام میں قہر و غضب کا یہ اظہار صرف اس لئے تھا کہ اہل کوفہ دہشت میں مبتلا ہو کر اپنے گھروں میں چھپ جائیں اور ان کے دلوں پر اموی حکومت کی ہیبت طاری ہو جائے۔ یہ ایک جابرانہ سیاسی چال تھی جس کے ذریعے حریفوں اور مخالفوں کو اس قدر ہراساں کرنا تھا کہ پھر ان کے ذہنوں میں کوئی حرف انکار اور روح کی گہرائیوں میں کوئی جذبہ احتجاج زندہ نہ رہے۔ اپنے اس منصوبے کو زیادہ اثر انگیز بنانے کے لئے حجاج مسلسل مخلوق خدا پر ظلم ڈھاتا رہا۔

ایک بار حجاج جمعہ کے دن دوپہر کے وقت مسجد میں پہنچا اور منبر پر چڑھ کر خطبہ دینے لگا۔ خطبے میں کبھی شام والوں کا ذکر کر کے ان کی تعریفیں کرتا اور کبھی عراق والوں کا نام لے کر ان کی تذلیل کرتا۔ یہ خطبہ اس قدر طویل ہوگیا کہ مسجد کے میناروں پر دھوپ کی سرخی کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ تب حجاج نے مؤذن کو حکم دیا۔ اس نے اذان دی اور لوگوں نے جمعہ کی نماز پڑھی۔ پھر اس کے فوراً بعد مؤذن نے عصر کی اذان دی اور حجاج ہی نے عصر کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد مغرب کی اذان ہوئی۔ اس نماز میں بھی حجاج لوگوں کا امام تھا۔

اسی ذیل میں حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ ''حجاج منبر پر چڑھ جاتا اور بکواس شروع کر دیتا۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت جاتا رہتا۔ نہ خدا سے ڈرتا تھا اور نہ مخلوق سے شرماتا تھا۔ بس اس کے اوپر خدا تھا اور نیچے ایک لاکھ سپاہی۔ کوئی اس سے کہنے والا نہ تھا کہ ''اے شخص! نماز کا وقت جا رہا ہے۔''

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حجاج کو اس قدر دیدہ دلیر اور گستاخ بنا دیا تھا کہ اس کی نظر میں کسی شخصیت کا احترام باقی نہیں رہا تھا۔ ایک بار اس نے رسول کریم ﷺ کے مشہور صحابی اور خادم خاص حضرت انسؓ (امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے والد محترم) کی بھرے دربار میں توہین کی اور آپ کی گردن مبارک پر وہ مہر لگا دی جو مجرموں کی گردن پر لگائی جاتی تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابی جلیل کی قرأت اور فتوؤں کا مذاق ان الفاظ میں اڑاتا تھا کہ جنہیں نقل کرنا بھی ہمارے نزدیک گناہ عظیم ہے۔

حجاج کی انہی سفاکیوں کو دیکھ کر ایک بار خلیفہ عبدالمالک بن مروان نے اس سے پوچھا۔ ''حجاج! تیری اپنے بارے میں کیا رائے ہے؟'' جواباً حجاج نے کہا۔ ''امیر المومنین! سچ تو یہ ہے کہ میں سخت کینہ پرور اور حاسد انسان ہوں۔ کسی شخص کو اذیت میں مبتلا دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔''

اس پر عبدالملک نے کہا۔ ''اس طرح تو تیرا رشتہ شیطان سے ملتا ہے۔''

پھر 94ھ میں حجاج نے اپنی روایت ظلم کو برقرار رکھنے کے لئے ایک اور قیامت ڈھائی۔ خلیفہ عبدالمالک کے دور حکومت میں حجاج کے خلاف ابن اشعث نے بغاوت کی تھی۔ اس بغاوت میں مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ نے ابن اشعث کا ساتھ دیا تھا۔ بغاوت ناکام ہونے کے بعد جہاں دوسرے بے شمار لوگ گرفتار ہوئے' وہاں حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ بھی پابند سلاسل کئے گئے۔ اسیران بغاوت میں سے جن افراد نے حجاج سے معاف طلب کی' انہیں رہا کر دیا گیا۔ آخر میں جب حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ کو حجاج کے روبرو لایا گیا تو زنجیر کی جھنکار سے آمریت کا دربار گونج اٹھا۔ خلیفہ عبدالملک کے سفاک عامل نے بہت کوشش کی کہ حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ بھی معافی مانگ کر پروانہ آزادی حاصل کر لیں مگر اس مرد جانباز کی گردن میں کوئی خم نہیں ہوا۔ آپ نے حالت قید میں پہلے سے زیادہ حق گوئی و بیباکی کا مظاہرہ کیا۔ یہاں تک کہ حجاج کو فتح مندی کے باوجود شکست ہوئی اور وہ حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے کا وقار نہ چھین سکا۔ بالآخر حجاج نے جلاد کو اشارہ کیا اور پھر قصر خلافت اس شخص کے خون سے رنگین ہوگیا جو پرچم حریت کی آبرو اور سرفروشوں کے ماتھے کی شکن تھا۔

اہل کوفہ نے ایک اور مرد جلیل کے شہید ہونے کی خبر سنی۔ ستمگروں کے ایوان میں جشن کیف و نشاط منایا گیا اور بے دست و پا عوام نے گوشہ تنہائی میں چھپ کر ان لوگوں کے مرثیے پڑھے جو مخلوق خدا کی بھوک مٹانے کے لئے

سروں کی فصل بو رہے تھے۔ پھر وقت معلوم آ پہنچا۔ ظلم کی مہلت ختم ہوگئی۔ عزرائیل کے لمبے اور نا قابل تسخیر ہاتھوں نے حجاج کی قبائے حیات چاک کر ڈالی۔ مرتے وقت بار بار ایک ہی جملہ دہراتا تھا۔ ''میں ولید (خلیفہ) ہی کی اطاعت پر زندہ رہا۔ اسی کی اطاعت پر مر رہا ہوں اور اسی کی اطاعت پر قیامت میں اٹھوں گا۔''

طبقات ناصری میں منہاج سراج کی روایت کے مطابق سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت کے فوراً بعد حجاج بن یوسف بے خوابی کے اذیت ناک مرض میں مبتلا ہوگیا۔ بہترین طبیبوں نے علاج کیا مگر اسے ایک لمحے کے لئے بھی نیند نہیں آتی تھی۔ یہاں تک کہ چالیس دن بیمار رہ کر 95ھ میں دنیا سے رخصت ہوا۔

خون کے دریا بہے عالم تہہ و بالا ہوئے
اے سکندر کس لئے دو گز زمیں کے واسطے؟

انجام کار۔ حجاج کو بھی صرف دو گز زمین ہی میسر آسکی۔ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار شرفاء کو قتل کیا اور یہ تمام قتل ہونے والے' میدان جنگ سے باہر تہہ تیغ کیے گئے۔

جب امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے استاد حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کو حجاج کے انتقال کی خبر ہوئی تو بے قرار ہو کر سجدے میں چلے گئے اور بہت دیر تک روتے رہے۔ آپ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خوشی کے آنسو تھے اور یہ گریہ وزاری اپنے رب کے حضور اظہار تشکر کے طور پر تھی کہ اس ذات بے نیاز نے اہل زمین کو حجاج کے بہیمانہ تشدد سے نجات بخشی تھی۔

حجاج کے دفن کے بعد مشہور محدث حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیئے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں یہ دعا مانگی۔

''اے خدا! جس طرح تو نے اس شخص کو ختم کیا، اس کے جاری کردہ نظام کو بھی ختم فرما دے۔''

حجاج کی موت سے بہت پہلے خلیفہ عبدالملک بن مروان 86ھ/ء میں مر چکا تھا۔ بعد ازاں اس کا بیٹا ولید بن عبدالملک تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ باپ کی طرح ولید نے بھی حجاج بن یوسف کی سرپرستی کی۔ اس تعاون کی بنیادی وجہ ولید اور حجاج کی فطرتوں میں یکسانیت تھی۔ ظلم' ظلم کا شریک تھا اور تشدد کے دو دھارے ایک ہی رفتار کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ اب اسے اتفاق کہا جائے یا قدرت کا ایک راز کہ وحشت و جفا کاری کے دونوں چشمے خشک ہو گئے۔ 95ھ میں حجاج کا جسد خاکی بے روح ہوگیا اور اس کے ایک سال بعد ہی ولید بن عبدالملک کی سانسوں کا شمار بھی ختم ہوا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ

(سیاست کے ظلمت کدے میں روشنی کے ایک عظیم سفیر کی آمد)

کہنے کو یہ ستم پیشہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر پھر بھی وقت کے گنبد میں ایک ایسے واقعے کی گونج باقی رہ گئی تھی جس کی وضاحت کے لئے ''ہولناک'' اور ''لرزہ خیز'' جیسے الفاظ بھی ناکافی ہیں۔ انسانی ضمیر اس قدر مردہ ہوگیا تھا کہ اموی خلفاء میں سے کسی نے اپنی ایک سیاہ کار کنیز کو مردانہ عبا اور دستار پہنا کر مسجد میں بھیجا۔ یہاں تک کہ مجبور و بے خبر مسلمانوں کو اسی بدمست عورت کی امامت میں نماز ادا کرنی پڑی۔ ان حالات میں فرمانروا طبقے سے زہد و تقویٰ

تو کجا عام انسانی رسموں کی توقع رکھنا بھی محض ایک دیوانگی تھی۔

اسی ظلم اور کج روی کو دیکھ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے برملا کہا تھا۔ "اگر تمام پیغمبروں کی امتیں مل کر اپنے اپنے زمانے کے بدکاروں کو جمع کریں اور ہم صرف حجاج بن یوسف کو مقابلے پر لائیں تو خدا کی قسم ہمارا پلہ بھاری رہے گا۔" جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی صدائے حق پہلی بار بلند ہوئی تھی تو ایوان اقتدار میں لرزہ پڑ گیا تھا۔ خاندان بنوامیہ کے ماتھوں پر بے شمار شکنیں ابھر آئی تھیں۔ اس تبصرے کا عجیب پہلو یہ ہے کہ خود حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ بھی خاندان بنوامیہ کے ممتاز ترین فرد تھے اور حجاج بن یوسف بھی اسی سرخرو قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے قریبی عزیز کے بارے میں اتنی سچائی کے ساتھ اظہار رائے کرنا' تاریخ آدم کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ اختلاف وحسد کی بے شمار تلواروں کے سائے میں صرف حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ ہی یہ بات کہہ سکتے تھے ورنہ اس وقت سکوت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے مردان شجاع کی زبانیں حرف وسخن کو ترس رہی تھیں۔

ایک اور موقع پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے وحشت و بربریت کے اس زمانے کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "ولید بن عبدالملک شام میں' حجاج بن یوسف عراق میں' عثمان حجاز میں' قرہ مصر میں' واللہ ساری دنیا ظلم سے بھر گئی۔"

اس تاریک ترین دور کے انسانی ذہنوں پر یہ اثرات مرتب ہو چکے تھے کہ لوگوں نے روشنی کا تصور کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بس چند اہل درد باقی تھے جو شدید مایوسی کے عالم میں آسمانوں کی طرف منہ اٹھا کر دیکھ رہے تھے اور بڑے دردناک لہجے میں کہا کرتے تھے۔

"اب کوئی نہیں آئے گا۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔ ظلم کے نئے قافلے ہوں گے' نئے میر کارواں ہوں گے۔ مجروح انسانیت کے لئے اب کوئی فلاح نہیں ہوگی' کوئی مرہم اور کوئی مسیحا نہیں ہوگا' آسمانوں سے قہر برسے گا اور اب قہر ہی اس زمین کا مقدر ہے۔"

سیاست کی انہی ہنگامہ آرائیوں نے درس گاہوں کو ویران کر دیا تھا اور اہل علم کے ہونٹوں پر مہر سکوت ثبت کر دی تھی۔ جب حجاج بن یوسف نے حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ کو شہید کیا اس وقت کوفے کے مشہور امام حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ بھی معتوب تھے مگر جب دونوں کے مقدمات پیش ہوئے تو حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی جرأت گفتار کے سبب تہہ تیغ ہونا پڑا اور حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی محض اس لئے محفوظ رہ سکی کہ آپ نے مصلحت وقت کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ حجاج کو مسجد کے منبر پر ناپسندیدہ باتوں کا مرتکب پاتے تھے مگر مصلحتاً خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ یہی وہ مسموم فضا تھی جس نے حدیث وفقہ کے لئے حالات کو انتہائی ناسازگار بنا دیا تھا۔ ایسے سنگین دور میں اگر درسگاہیں مکمل طور پر مسمار ہو جاتیں اور علماء کی جماعت کو قتل کرا دیا جاتا تو یہ کوئی حیرت ناک بات نہ ہوتی۔ وہ موسم ہی خونریزی کا تھا۔ کس سے داد طلب ہوتے اور کون فریاد سنتا؟ بے گناہ مسلمان قطار در قطار آتے' ان کے چہروں پر سیاست کی ملی ہوئی سیاہی ہوتی اور پیروں میں تشدد کی زنجیریں پڑی ہوتیں پھر انہیں جانوروں کی طرح' حکومت وقت کے سجائے ہوئے مقتل میں لے جا کر ذبح کر دیا جاتا۔

نہ مدعی، نہ عدالت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ نشیناں تھا رزق خاک ہوا

ایسے جفا کار وقت میں جب آسمانوں سے خون کی بارش ہو رہی ہو اور زمین سے لہو کے چشمے پھوٹ رہے ہوں، اگر امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ، امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ اور امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ خاموش رہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ تھکے ہوئے جسم اور زرد چہرے رکھنے والے چند علماء آخر کیا کرتے؟ جب کہ بے شمار طاقتور انسانوں نے حجاج کے پائے اقتدار پر بے اختیار سجدہ کر لیا تھا۔ کم سے کم امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ، امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ اور امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے خلیفہ کے دربار میں قصائد پڑھ کر علم کے وقار کو تو نیلام نہیں کیا۔ گھروں پر بھی اس لئے خاموش بیٹھ گئے کہ ان کی سلامتی سے علم کو پناہ حاصل تھی۔ اگر یہ لوگ بھی شہید کر دیئے جاتے تو دنیا سے علم ہی رخصت ہو جاتا۔

یہی وہ نامساعد حالات تھے جن کے زیر اثر رہ کر ثابت رحمتہ اللہ علیہ ذہنی انقلاب سے دوچار ہوئے۔ آپ نے اپنے فرزند نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو قرآن حکیم کی ابتدائی تعلیم دلائی اور پھر آبائی پیشے کے طور پر تجارتی امور کی تربیت دینے لگے۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے ذہنی انقلاب کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ آپ ایک غیر مقامی انسان تھے۔ دیگر عرب قبائل کی طرح ثابت رحمتہ اللہ علیہ کسی بڑے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ آپ کا خاندان کوئی بڑا خاندان تھا کہ جس کی بنیاد پر کوئی اہم فیصلہ کرتے یا عصری سیاست میں حصہ لے کر وقت کے خلاف چلنے کی کوشش کرتے۔ مجبوراً آپ نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کا رخ درس گاہوں کے بجائے بازاروں اور تجارتی منڈیوں کی طرف موڑ دیا۔ تجارت کے انتخاب میں یہ مصلحت بھی پیش نظر تھی کہ اقتصادی حالات کی مضبوطی کے سبب انسان کسی غیر کا دست نگر نہیں رہتا۔ ثابت رحمتہ اللہ علیہ بھی اپنے کم سن بچے کو زمانے کی گرم ہواؤں سے بچانا چاہتے تھے اس لئے نعمان رحمتہ اللہ علیہ کو حدیث وفقہ کے بجائے تجارت کی تعلیم دی اور یہ کام خود ثابت رحمتہ اللہ علیہ سے بہتر کون کر سکتا تھا کہ آپ ریشمی کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ ہی نے علمی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہ لی ہو۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب پوری فضا علم کے شور سے گونج رہی ہو تو وہ لوگ بھی شریک مجلس ہونے لگتے ہیں جن کا فطری رجحان علم کی طرف نہیں ہوتا۔ آئندہ اوراق میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے گی کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ علم ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے، مگر حجاج بن یوسف اور دیگر خلفائے بنو امیہ کی تباہ کاریوں نے وقتی طور پر آپ کے جذبے کو سلا دیا تھا۔ غرض یہی وہ اسباب تھے کہ جن کے گہرے اثرات نے ایک طویل عرصے کے لئے نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

پھر تقریباً سولہ سال کی عمر میں نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے ایک اہم واقعے کا ذکر ملتا ہے۔ خود حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ ہی اس واقعے کے بارے میں فرماتے ہیں؟

''میں 80ھ میں پیدا ہوا اور اپنے والد محترم کے ہمراہ میں نے 96ھ میں حج ادا کیا۔ اس وقت میری عمر سولہ سال تھی۔ جب میں مسجد حرام میں داخل ہوا تو میں نے ایک بڑا حلقہ دیکھا۔ اس وقت میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ یہ حلقہ کن لوگوں کا ہے؟ میرے سوال کے جواب میں والد گرامی نے کہا کہ یہ حلقہ حضرت عبداللہ بن حارثؓ (صحابی) کا ہے۔ میں آگے بڑھا۔ پھر میں نے حضرت عبداللہ بن حارثؓ کو کہتے سنا کہ حضور اکرم ﷺ نے

فرمایا ہے" جس نے دین کا فقہ حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے مقاصد کا ذمہ دار ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچائے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہوگا۔"

اس واقعے سے یہ ثبوت تو فراہم ہو جاتا ہے کہ حضرت نعمان رحمتہ اللہ علیہ بعض صحابہ کرامؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اس طرح آپ کو تابعیت کا شرف عظیم حاصل ہو گیا تھا' مگر اس بات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ آپ باقاعدہ حصول علم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ابھی وہ وقت آیا بھی نہیں تھا کہ لوگوں کے سینے میں طلب علم کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن جاتیں۔ اس وقت خلیفہ ولید بن عبدالملک کو مرے ہوئے ابھی چند روز ہی گزرے تھے یا پھر وہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایسی فضا میں نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں ذوق علم کا پیدا ہونا ایک غیر فطری سی بات تھی۔ جن عوامل نے آپ کے سلسلہ علم کو منقطع کر دیا تھا، وہ اب تک برقرار تھے۔ اس لئے یقینی طور پر حضرت نعمان رحمتہ اللہ علیہ کوچۂ تجارت ہی میں سرگرم عمل تھے اور اپنے والد محترم کی زیر نگرانی اسباب معیشت کے فروغ کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔



ایک خوشگوار انقلاب

پھر ایک دن ولید بن عبدالملک کو بھی رسم فنا کے مطابق دنیا سے اٹھا لیا گیا۔ اب تخت خلافت پر سلیمان بن عبدالملک نمودار ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بھی اپنے بڑے بھائی ولید کی طرح سخت گیر اور ظلم و تشدد کا سفیر ہوگا' مگر بعد میں یہ ساری قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ اللہ کا نظام بھی عجیب نظام ہے۔ وہ سرکشوں کی اولاد میں برگزیدہ نبی پیدا کرتا ہے اور انبیاء کی نسل میں مفسد و نافرمان پیدا کرتا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک کم و بیش اسی اصول کے مطابق مسند خلافت پر جلوہ گر ہوا تھا۔ وہ عبدالملک بن مروان جیسے جابر حکمراں کا بیٹا اور ولید جیسے سفاک فرمانروا کا چھوٹا بھائی تھا۔ سلیمان نے ورثے میں جلے ہوئے مکان اور شرفاء کی لاشوں سے بھرے ہوئے قبرستان پائے تھے...... مملکت اسلامیہ کے مظلوم باشندے سلیمان سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ سلیمان ظلم و ناانصافی کے نئے دروازے کھول دے گا لیکن یہ تمام بدگمانیاں اس وقت دھندلی پڑنے لگیں جب سلیمان نے حجاج بن یوسف کے تعمیر کردہ تمام قید خانے مسمار کرا دیئے اور امت مسلمہ کے فلاحی کاموں پر خصوصی توجہ دی۔ پھر زمین پر وہ لمحہ عجیب بھی نازل ہوا جب سلیمان بن عبدالملک نے اپنے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کو خلیفہ نامزد کیا۔

زمانہ اچانک کروٹ بدلنے لگا تھا اور گردش ایام پیچھے کی طرف لوٹنے لگی تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سلیمان اپنے بزرگوں کے قائم کردہ حصار کو اس بے رحمی کے ساتھ توڑ دے گا۔ تمام نگاہیں خیرہ تھیں اور تمام ذہن متحیر تھے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو اپنی بینائی پر شک ہونے لگا تھا اور سننے والے کانوں کو اپنی سماعتوں پر اعتبار باقی نہیں رہا تھا۔ ہوس و خود غرضی کے برسوں پرانے نظام پر یہ سلیمان کی ایک ایسی کاری ضرب تھی کہ "تاج و تخت" کا خواب دیکھنے والے چیخ اٹھے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کے فیصلے کو بدلنے کے لئے اس پر کیا کیا دباؤ نہ ڈالا گیا ہوگا' مگر خدا اس مرد بیباک کی مغفرت کرے کہ وہ آخری سانس تک اپنے ارادے پر قائم رہا اور مرنے کے بعد مملکت اسلامیہ کو نئی زندگی دے گیا۔ سلیمان نے اپنے پیچھے "خدمت خلق" کا کوئی سرمایہ چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو مگر

اس سچائی کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ وہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت عدل و انصاف سے محروم زمین پر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ کی شکل میں ایک ایسی علامت خیر چھوڑ گیا جس نے رسوائے زمانہ طرز شہنشاہی کو خلافت راشدہ کی طرف موڑ دیا۔ اگر اہل نظر سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ سلیمان کا ملت اسلامیہ پر احسان عظیم ہے کہ اس نے ہزار ہا سازشوں اور مجبوریوں کے نرغے میں محصور ہوتے ہوئے بھی بار امانت حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ کو منتقل کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خدا علیم وخبیر ہے کہ اسلام کی سرزمین اور کتنے نئے فتنوں سے بھر جاتی؟ مسند خلافت سے کیسی کیسی شورشیں پھوٹتیں اور ان کی زد میں کیا کچھ نہ آ جاتا۔



خلیفۂ راشد کا ظہور

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ 99ھ میں مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے۔ خلیفہ راشد نے پہلے ہی خطبے میں اپنے عزائم کا اس طرح اظہار کیا۔

''اگر حق تعالیٰ ہر بدعت کو میرے ہاتھوں سے مردہ کرے اور رسالت مآب ﷺ کی ہر سنت کو میرے ہاتھوں پر زندہ کرے اور اس راہ میں میرے جسم کا ایک ایک ٹکڑا کام آئے۔ یہاں تک کہ آخر میں میری جان کی نوبت آ جائے تو اللہ کے راستے میں یہ بہت ہی معمولی قربانی ہوگی۔''

اور پھر آپ کے خطبے کا سب سے اہم فقرہ یہ تھا۔ ''اللہ کی نافرمانیوں میں ہم سے کوئی تعاون نہ کرے۔''

جیسے ہی حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ بننے کی خبر حجاز مقدس میں پہنچی تو مدینہ منورہ کے مشہور امام حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے بے اختیار ہو کر فرمایا۔

''اب وہ بولیں گے جو نہیں بول سکتے تھے۔'' اہل نظر حضرت قاسم رحمتہ اللہ علیہ کے اس فقرے کی گہرائی کا اندازہ کریں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ کی خلافت سے پہلے کیسا خوفناک دستور زباں بندی تھا؟ مسلسل خاموش رہتے رہتے انسانوں کی صلاحیت گفتار ختم ہو گئی تھی اور ان کی آوازیں سینوں میں گھٹ کر کم وبیش دم توڑ چکی تھیں۔ مدنی امام حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے اسی آزادیٔ تقریر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حاکم جابر کے خوف اور دہشت سے جو نسلیں گونگی ہو گئی تھیں، انہیں یہ دولت عظیم حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اس وقت بخشی تھی جب وہ اپنی قوت گویائی کی دوبارہ بحالی سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو چکی تھیں۔ یہ ایک ایسی بارش کرم تھی جس نے مردہ زمینوں میں جان ڈال دی اور ایک بار پھر وہی شادابی لوٹ آئی جسے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی تھیں۔

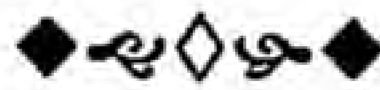
حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اس عدل و انصاف کو زندہ کیا جو آپ کے پیشرو خلفاء کے دور میں یا تو مر چکا تھا اور اگر کہیں کسی شکل میں زندہ بھی تھا تو اسکی معاشرتی حیثیت ایک لاوارث ویتیم بچے کی مانند تھی۔ ایک زمانہ دراز سے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی شان میں خطبات کے ذریعے گستاخیاں کی جاتی تھیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اس کافرانہ رسم کو سختی کے ساتھ روک دیا اور پہلی بار حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ کرم اللہ وجہہ کا لفظ استعمال کیا جس کا مطلب ہے ''اللہ آپ کے چہرے کو روشن کرے۔'' اس کے علاوہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے تمام شہزادگان بنو امیہ کے ہاتھوں سے جاگیریں چھین لیں۔ جہاں جہاں ظالم عمال تھے انہیں بیک قلم

معزول کر دیا گیا۔

اور پھر عمر ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا وہ مذہبی علوم کا احیاء تھا۔ آپ نے حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کو حکم دیا کہ رسالت مآب ﷺ کی احادیث مبارک کو یکجا کیا جائے۔ جب یہ مجموعہ تیار ہوا تو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں اس کی نقلیں بھجوائیں۔ امام قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے بقول "اب وہ لوگ بول رہے تھے جو پہلے نہیں بول سکتے تھے۔"

عشرت کدے بجھا دیئے گئے اور درس گاہیں روشن ہو گئیں۔ علماء کا گمشدہ وقار لوٹ آیا۔ اگرچہ مملکت اسلامیہ کے دیگر عمال (گورنر) علم کے سلسلے میں اتنے زیادہ حساس نہیں تھے' مگر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ کے غیر معمولی رجحان کے باعث وہ لوگ بھی محدثین عظام اور فقہائے کرام کا ادب کرنے پر مجبور تھے۔ خلیفہ وقت کی اس گرم جوشی نے عوام الناس کو بھی علم کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور گھر گھر درس و تدریس کے چرچے ہونے لگے تھے۔

اس وقت حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی عمر انیس سال کے قریب تھی اور آپ پورے انہماک کے ساتھ تجارتی کاموں میں حصہ لے رہے تھے۔ عمر کے اعتبار سے تو یہ تجربے اور پختگی کی منزل نہیں تھی لیکن تاریخی ذہانت نے اس شعبے میں بھی نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو سر بلندی عطا کر دی تھی۔



تجارت کی تفصیلات

عام طور پر حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ ایک تاجر کی حیثیت سے مشہور ہیں مگر بہت کم لوگوں کو اس تجارت کی تفصیل معلوم ہے۔ حضرت ثابت رحمتہ اللہ علیہ خز کی تجارت کرتے تھے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ریشمی کپڑا تھا جس کے کاروبار کو اس خاندان نے بہت فروغ دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خالص ریشمی کپڑا نہیں تھا۔ خز ایک مخصوص قسم کا کپڑا تھا جس کے بنانے میں مختلف چیزیں مثلاً اون اور روئی وغیرہ کے دھاگے استعمال ہوتے تھے اور تانے میں ریشم کا سوت استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض بزرگ حضرات جن کا تقویٰ انتہا کو پہنچا ہوا تھا' ریشم کے استعمال کو کسی بھی صورت میں پسند نہیں کرتے تھے لیکن صحابہ اور تابعین میں چند حضرات کے سوا کوئی ایسا نہیں تھا جو خز استعمال نہ کرتا ہو۔ چنانچہ گرمیوں میں روئی اور سردی میں اون کا خز استعمال ہوتا تھا۔ اس کپڑے کے رنگ بھی مختلف ہوتے تھے۔ ریشم کی وجہ سے کپڑے میں زیادہ مضبوطی ہو جاتی تھی۔ مذہب اسلام میں مردوں کے لئے ریشم کا استعمال حرام کر دیا گیا تھا۔ پھر اس کے جائز استعمال کی یہی صورت نکالی گئی کہ کپڑے کو اون' روئی اور ریشم کا مرکب بنا دیا گیا۔ بہر حال یہ ایک قیمتی کپڑا تھا جس کے تھان کی قیمت کئی کئی ہزار درہم تک پہنچ جاتی تھی۔

اس تجارت میں بنیادی چیز صرف یہ نہیں تھی کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ ریشمی کپڑا خرید کر دوسرے لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتے تھے بلکہ آپ نے کپڑا بننے کا ایک بڑا کارخانہ بھی قائم کیا تھا۔ الیافعی اپنی تاریخ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

"امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ملکیت میں ایک بڑی عمارت تھی جس کے اندر خز بنانے کا کارخانہ قائم تھا اور بہت سے مزدور یہ کام انجام دیتے تھے۔ مستند تاریخوں میں یہ روایت بھی درج ہے کہ کوفے میں سب سے بڑی دکان کے

مالک نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ ہی تھے۔خز کی اعلیٰ ترین قسم جو پورے شہر میں میسر نہیں آسکتی تھی' وہ آپ ہی کی دکان پر ملتی تھی۔ اس ذیل میں یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک شخص مختلف چیزوں کی خریداری کے لئے کوفہ آیا ہوا تھا۔ جب اس نے ایک مخصوص قسم کی خز کی تلاش شروع کی تو وہ اپنی مطلوبہ شے حاصل کرنے میں ناکام ہوگیا۔ پھر اس نے مقامی لوگوں سے دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ۔

''تمہیں اس قسم کا خز ایک فقیہ کے سوا کسی کے پاس نہیں مل سکتا' جو اس کی تجارت کرتا ہے اور اسے لوگ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔''

آپ کے کئی غلام اور ملازم اس کام پر مامور رہتے تھے۔ امام ابوبکر رحمتہ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔''ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے غلام ستر ہزار درہم لے کر واپس ہوئے۔''اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی تجارت کتنے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ آپ کے تجارتی نمائندے مختلف شہروں میں قیام پذیر تھے جن کے ذریعے درآمد و برآمد کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ تھا حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی تجارت کا ہلکا سا خاکہ۔



ایک اور انقلاب

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی خلافت سے کچھ دن پہلے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس نے اسلامی فقہ اور تمام دنیا کے عقلی علوم کی تاریخ بدل ڈالی۔ ایک روز نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کوفے کے بازار کی طرف جارہے تھے۔ راستے میں حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کا مکان بھی پڑتا تھا۔ یہ وہی امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جنہیں بعض تاریخ نویسوں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کا حامی قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی دریدہ دہنی اور نہایت گستاخی کی بات ہے۔ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ آخر امام تھے۔ ان سے ایسی مہمل اور پست روایات کو منسوب کرنا ایک جارحانہ فعل ہے جس سے مذہبی حلقوں کی دل آزاری کرنے کے سوا کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہیں تھا۔ درحقیقت واقعہ یوں تھا کہ جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ جیسے مردان جلیل کو شہید کر دیا اور حرم کعبہ پر سنگ باری کی' اس وقت اہل نظر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اب جو شخص بھی وحشیوں کے اس گروہ کے درمیان حرف احتجاج بلند کرے گا اس کے جسم کو ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا جائے گا...... حجاج بن یوسف اذیت ناک اور لرزہ خیز سزائیں اس لئے دیتا تھا کہ دیکھنے والوں کے دلوں پر ہیبت طاری ہوجائے اور وہ حق بات کہنے سے باز آجائیں۔ حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے سیاسی پس منظر کی اسی روشنی میں نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا اور پھر مجبوراً گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گئے تھے۔ اسی کرب کا شکار حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ بھی تھے۔ وہ عالم جبر تھا یا پھر حالت اضطرار تھی۔ ان دونوں صورتوں میں سکوت اور خاموشی جائز ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جب یہ بات جائز تھی تو کچھ لوگ سر مقتل کیوں گئے اور اپنی جانیں ستمگروں کے ہاتھ کیوں فروخت کر دیں؟ بے خبر لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو لوگ حق کے راستے میں گھروں سے نکلے اور تہ تیغ کر دیئے گئے ان کے لئے خدا کے پاس اجر عظیم ہے اور جو لوگ خاموش رہے مگر ان کے سینے ضبط سخن کی آگ سے جلتے رہے' وہ بھی اللہ کے

نزدیک پسندیدہ لوگ ہیں۔ بس اجر وثواب میں کمی بیشی ہوسکتی ہے لیکن معاذ اللہ انہیں گمراہ انسانوں کا مصاحب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ بھی جلیل القدر محدث وفقیہ تھے۔ جب اسلامی دنیا پر موت کی وبا طاری تھی اس وقت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے تدبر سے کام لے کر سکوت اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے ظالمانہ حکم سے مجبور ہو کر کوئی عہدہ ومنصب بھی قبول کرلیا ہو مگر اس کے باوجود آپ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کو علم کی ترغیب دلانے والے امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ ہی تھے۔ اگر خدانخواستہ شعبی رحمتہ اللہ علیہ جیسے مرد جلیل بھی حجاج کی سفاکیوں کی خوراک بن جاتے تو شاید مسند فقہ پر وہ عظیم انسان بھی نمودار نہ ہوتا جس کی ذہانت اور علم نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی بلند کرداری پر آخری دلیل یہ ہے کہ اگر آپ عبدالملک بن مروان کے درباری مصاحبوں میں شامل ہوتے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ جیسے خلیفہ راشد آپ کو قاضی مقرر نہ کرتے۔ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے علم اور کردار پر ہم آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کریں گے۔

انہی امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے مکان کے سامنے سے نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ گزر رہے تھے۔ اتفاق سے اس دن حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ اپنے دروازے پر کھڑے تھے۔ جیسے ہی آپ نے ایک سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھے

"فرزند! ادھر آؤ۔" حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔

نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ پھر آپ آہستہ روی کے ساتھ چلتے ہوئے امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک پہنچے اور باادب کھڑے ہوگئے۔

"فرزند! اس وقت تم کہاں جارہے ہو؟" امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے اجنبی نوجوان سے دریافت کیا۔

"میں کاروباری سلسلے میں ایک شخص کے یہاں جارہا ہوں۔" نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت نے کوفے کے ایک تاجر کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"میری مراد کسی سوداگر سے نہیں۔" حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کس عالم کی مجلس درس میں جاتے ہو؟"

"کسی مجلس درس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت نے اس طرح جواب دیا کہ آپ کے لہجے سے شرمساری کا رنگ نمایاں تھا۔

"کیا تم کسی سے علم حاصل نہیں کرتے؟" حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں۔" نعمان بن ثابت کا لہجہ تاسف آمیز تھا۔ "مجھے تجارتی امور سے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کوفی نوجوان کے جواب پر چونک اٹھے۔ "افسوس! تمہاری عمر کیسی رائیگاں گزر رہی ہے۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ تم کون ہو اور اس دنیا میں کس کام کے لئے آئے ہو!" حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ یہ کہتے کہتے جذباتی ہوگئے تھے۔

نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت خاموش کھڑے رہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پاس امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''میری آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے، خدا کرے وہ عملی شکل میں ظاہر ہو جائے۔'' امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی بصیرت نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کی پیشانی پر لکھی ہوئی وہ عبارت پڑھ لی تھی' جسے کاتب تقدیر نے روز ازل میں تحریر کیا تھا۔ ''اس مہلت زیست سے فائدہ اٹھاؤ اور عالم اسباب میں اس شے کو تلاش کرو جو تمہارے اندر موجود ہے۔ اگر تجارتی امور سے فرصت ملے تو علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔'' یہ کہہ کر امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ اپنے مکان میں چلے گئے اور نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

پھر آپ جس مقصد کے لئے بازار جا رہے تھے' اسے تکمیل تک پہنچایا مگر ایک لمحے کے لئے بھی حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ کو فراموش نہ کر سکے۔ جہاں بھی جاتے' امام رحمتہ اللہ علیہ کی پرجلال آواز آپ کے ذہن میں گونجتی رہتی۔

''میری آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے، خدا کرے وہ عملی شکل میں ظاہر ہو جائے۔''

اکثر اوقات آپ کو محسوس ہوتا جیسے ہر مقام پر امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھیں نگراں ہوں اور یہ الفاظ تو آپ کے دماغ پر کسی گہرے نقش کی طرح جم کر رہ گئے تھے کہ ''علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔'' غرض کچھ دن تک نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کے ذہن و دل پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اسے علم اور آسائش دنیا کے درمیان کشمکش بھی کہا جا سکتا ہے۔ بالآخر اس کشمکش میں حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی نصیحت غالب آ گئی اور نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت تجارتی سامان کی تلاش کے ساتھ ساتھ علم کی جستجو میں بھی مصروف ہو گئے۔

کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی نصیحت کے فوراً بعد ہی نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن سلیمان کی درسگاہ میں داخل ہو گئے تھے اور اس بے مثال فقیہ کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ بعض محققین کے نزدیک یہ روایت زیادہ معتبر نہیں ہے۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کے بعد نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت علم کی طرف متوجہ ضرور ہو گئے تھے مگر آپ کا رخ مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ کی طرف نہیں تھا۔

اس ذیل میں تین روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت خود امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد رشید حضرت امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

''ایک بار حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آپ کو فقہ کی توفیق کیسے نصیب ہوئی۔''

جواب میں حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''جہاں تک توفیق کا تعلق ہے تو وہ خدائے لم یزل کی جانب سے تھی۔ جب میں طلب علم کے لئے کمربستہ ہوا تو میں نے تمام علوم پر ایک ایک کر کے نظر ڈالی۔ میرے دل میں آیا کہ علم کلام پڑھوں مگر پھر غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ اس کا انجام اچھا نہیں۔ دیگر یہ کہ اس علم میں فائدہ بھی بہت کم ہے اگر علم کلام میں کوئی انسان مہارت بھی حاصل کر لے تو اپنا دلی مقصد برسرعام بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اسے بدعتی اور گمراہ کا لقب دے دیا جاتا ہے۔

پھر میں نے ادب و لغت پر غور کیا مگر وہاں بھی کچھ حاصل نہ ہو سکا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آخر اس علم کا اس کے سوا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ بعد میں بیٹھ کر بچوں کو صرف و نحو کا سبق دیتا رہوں۔

پھر میں شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوا اور اس فن کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ انجام کار اس نتیجے پر پہنچا کہ

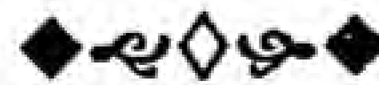
(ش)اعری میں کیا رکھا ہے؟ کسی کی تعریف' کسی کی برائی' جھوٹ' مبالغہ اور ان تمام باتوں کا مطلب تخریب دین کے سوا (کی)یا ہو سکتا تھا؟

پھر میں نے قرأت کے معاملے پر غور کیا تو اس کا بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ آخر چند نوجوان جمع ہو کر میرے (س)امنے تلاوت قرآن کریں گے۔ باقی رہا قرآن حکیم تو اس کی آیات مقدسہ کا مفہوم ہمیشہ ایک دشوار گزار گھاٹی کی مانند (ر)ہے گا۔

پھر خیال آیا کہ طلب حدیث میں عمر بسر کردوں فوراً ہی خیال آیا کہ رسالت مآب ﷺ کی احادیث مبارکہ جمع (ک)رنے کے لئے مجھے طویل عمر کی ضرورت ہو گی۔ بہت ممکن تھا کہ یہ تمام سہولیات میسر آ جائیں مگر یہ خطرہ بھی درپیش (ت)ھا کہ آئندہ آنے والے لوگ مجھ پر کذب بیانی اور حافظے کی خرابی کا الزام عائد کر دیں۔ پھر روز حشر تک یہ الزام میری (گ)ردن کا طوق بن جائے۔

میں نے آخر میں فقہ کی ورق گردانی شروع کی پھر جیسے جیسے اس علم کی تکرار ہوتی گئی مجھ پر اس کا رعب بڑھتا (گ)یا۔ یہاں تک کہ مجھے فقہ میں کوئی عیب دکھائی نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ حصول فقہ کے دوران مجھے بڑے بڑے (علم)اء اور مشائخ کی صحبت نصیب ہو گی۔ ان کے اخلاق جلیلہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے مواقع میسر آئیں گے (۔) آخر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ فرض کی ادائیگی، بندگی کا اظہار اور دنیا و آخرت کا حصول فقہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر کوئی (شخ)ص فقہ کے ذریعے دنیا کمانا چاہے تو وہ نہایت بلند منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور اگر عبادت و گوشہ نشینی کا آرزومند ہو (تو) کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ حصول علم کے بغیر عبادت میں مشغول ہے بلکہ اس کے بارے میں یہ کہا (ج)ائے گا کہ وہ صاحب علم فقیہ ہے اور مسلسل علم کے راستے پر گامزن ہے۔"

حضرت امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی (نص)یحت سے متاثر ہو کر حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے کچھ دن تک تمام علوم کی حقیقت پر غور کیا۔ پھر اپنی (ز)ندگی کو علم فقہ کے لئے وقف کر کے حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن سلیمان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ حضرت (ام)ام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی اس روایت کے مطابق حضرت نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کے غور و فکر کا یہ وقفہ چند (ہف)توں یا پھر بمشکل تمام چند ماہ پر مشتمل تھا اگر ہم اس روایت کو مکمل طور پر درست تسلیم کر لیں تو پھر دو اور مشہور روایات (ک)ی صحت کا جواز باقی نہیں رہتا۔



(د)وسری روایت

دوسری مشہور روایت یحییٰ بن شیبان رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔ اس روایت کے مطابق حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ (عل)یہ نے فرمایا۔

"مجھے مناظرے سے فطری طور پر ایک خصوصی لگاؤ تھا۔ میں طویل عرصے تک اسی میں مصروف رہا۔ جب جب (م)جلس مناظرہ آراستہ ہوتی تو میں علم الکلام کے اسلحے سے جنگ کرتا اور میرے مخالف مجھ پر حملہ آور ہوتے تو میں انہی (ہ)تھیاروں سے اپنا دفاع کرتا۔ اس زمانے میں بصرہ مناظرہ و بحث کا اکھاڑہ تھا۔ میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا۔ کبھی

ایک سال قیام کیا اور کبھی کچھ کم۔ خارجیوں کے فرقہ اباضیہ اور صفریہ سے کئی مرتبہ میری جھڑپیں ہو چکی تھیں (خارجیوں کے فرقہ اباضیہ کا بانی عبداللہ بن اباض تھا۔ اس فرقے کا نظریہ یہ تھا کہ غیر خارجی مسلمان نہ مشرک ہیں نہ مومن۔ البتہ انہیں کفران نعمت کرنے کی وجہ سے کافر کہا جائے گا۔ چوری چھپے کسی غیر خارجی مسلمان کا خون بہانا حرام ہے۔ ہاں' علانیہ طور پر اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ غیر خارجی مسلمانوں کی شہادت قبول کی جا سکتی ہے۔ ان سے معاملات نکاح اور وراثت کے تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں۔ متشدد اور انتہا پسند خارجیوں میں فرقہ اباضیہ کے لوگوں کو معتدل مزاج سمجھا جاتا ہے۔ فرقہ صفریہ کے ماننے والے زیاد بن اصفر کے پیروکار تھے۔ یہ لوگ اپنے عقائد میں انتہا پسندی کے جذبات رکھتے تھے) علم کلام میرے نزدیک افضل العلوم تھا میں کہا کرتا تھا کہ علم الکلام کا تعلق اصول دین سے ہے۔

طویل غور و فکر اور ایک عمر گزرنے کے بعد میرے اس نظریئے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ میں نے سوچا کہ صحابہؓ اور تابعین رحمتہ اللہ علیہ سے کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی' جسے ہم نے پا لیا ہو۔ وہ شرعی امور پر زیادہ قادر' ان سے زیادہ واقف اور ان کے حقائق سے بخوبی آگاہ تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے مناظرے کا بازار گرم نہیں کیا۔ مذہبی معاملات میں غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں کی خود بھی اس سے گریزاں رہے اور دوسروں کو بھی سخت پرہیز کی تلقین کی۔ وہ حضرات صرف شرعی احکام اور فقہی مسائل میں غور و فکر کے عادی تھے۔ وہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور وہ اسی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے اور تحصیل علم کی ترغیب دیتے تھے۔ فتوے بھی دیا کرتے اور مسائل بھی دریافت کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ اسی مسلک پر گامزن تھے پھر تابعین رحمتہ اللہ علیہم نے بھی اسی طریقے کی پیروی کی۔

اس حقیقت کے واضح ہوتے ہی میں نے مناظرے اور علم الکلام کو خیر باد کہہ کر اپنا رخ اسلاف کی طرف موڑ لیا اور ان ہی کے اعمال و خیالات کو اپنانا شروع کیا پھر میں نے اسی راستے کے واقف کار لوگوں کی صحبت اختیار کی اور متکلمین (علم کلام کے ماہرین) کے بارے میں طے کیا کہ یہ لوگ صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔ ان کے دل سخت اور کتاب و سنت کے مخالف ہیں۔''

یحییٰ بن شیبان رحمتہ اللہ علیہ کی اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے نہ صرف علم کلام سیکھا تھا بلکہ آپ بصرہ پہنچ کر اس علم کے ماہرین سے بحث و مناظرہ بھی کرتے تھے۔ اگر ہم حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ سے نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی ملاقات کا زمانہ 97ھ طے کریں تو اس وقت آپ کی عمر سترہ سال تھی۔ یہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا دور حکومت تھا۔ اس وقت ملت اسلامیہ کو ولید اور حجاج بن یوسف جیسے شقی القلب حکمرانوں سے نجات مل چکی تھی اور کسی حد تک علم کی سربلندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو نصیحت کی پھر اسی نصیحت سے متاثر ہو کر آپ علم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ چونکہ ولید اور حجاج ظلم کی سرپرستی کر رہے تھے اس لئے ان کے اور مذہب کے درمیان بہت فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ نتیجتاً اسلام کے نام پر ایسے بے شمار فرقے پیدا ہو گئے تھے جو مذہب کی قبا پہن کر دین ابراہیمیؑ کی بنیادوں پر کاری ضربیں لگا رہے تھے۔ اگرچہ اس عہد کے حکمراں اسلام کے خلاف ان سازشوں سے باخبر تھے لیکن برسر اقتدار طبقے کا مفاد اسی میں تھا کہ عوام الناس خدا اور رسول ﷺ کے حقیقی احکام سے ناآشنا ہوتے چلے جائیں اور طالع آزما لوگوں کو اپنی دولت و حکومت میں اضافے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ حکمرانوں کی انہی ہوس کاریوں اور عیش پرستیوں کے سبب علم کلام کے ماہرین ابھر کر سامنے آئے۔ یہ لوگ فلسفے کی زبان میں گفتگو

کرتے تھے اور قرآنی احکام کو عقل کی روشنی میں اس طرح پرکھتے تھے کہ عام لوگوں کے ذہن الجھ کر رہ جائیں اور عقائد کی روشن آگ سرد ہوتے ہوتے بجھنے کے قریب پہنچ جائے۔

نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے بھی علم کلام کے ماہرین کی پرشور آوازیں سنیں تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس فن کو سیکھنے کے لئے شب و روز محنت کرنے لگے۔ علم کلام میں آپ کے اساتذہ کون تھے اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ بس چند ایسی روایات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ علم کلام پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ یحییٰ بن شیبان رحمتہ اللہ علیہ کی روایت سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ متکلمین کے حلقوں میں بیٹھ کر بھی راہ راست پر گامزن رہے۔ نہ آپ کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی اور نہ آپ کے ذہن میں شکوک و شبہات نے کروٹ لی۔ نوعمری کے باوجود جب آپ بصرے میں خارجیوں کے مختلف فرقوں سے الجھے ہوئے تھے اس وقت بھی اپنے مذہب کا دفاع کر رہے تھے۔ بیس سال کی عمر میں اس احساس کا زندہ ہونا کہ اہل کلام غلط راستے پر ہیں' یہ خالصتاً ہدایت غیبی تھی۔ جب انسان ایک خاص ماحول کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر وہ کسی دوسری فضا سے متاثرہ نہیں ہوتا۔ حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی سماعت اہل کلام کی تقریروں سے بہت زیادہ آشنا تھی' مگر پھر بھی آپ اس نغمہ سرمدی سے بے خبر نہیں تھے، جسے سنتے سنتے صحابہؓ اور تابعین رحمتہ اللہ علیہ اپنے رب کے حضور پہنچ گئے تھے۔ یہ محض قدرت کی رہنمائی تھی کہ اس نے ایسے گمراہ کن حالات میں بھی نسلی زوطی کو غیر متوازن نہیں ہونے دیا تھا۔

پھر جب 99ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے خلافت کی ذمے داریاں سنبھالیں تو اہل کلام اور دیگر عقلیت پرستوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ عمر ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں صرف کردار ہی نہیں علم بھی دوبارہ زندہ ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ ایک اور ذہنی انقلاب سے دوچار ہوئے۔ پہلا انقلاب امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کے بعد ظاہر ہوا تھا' جس کے نتیجے میں آپ علم کلام کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور دوسرے انقلاب کی فضا اس وقت سے ہموار ہونے لگی تھی جب امام زہری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے حکم پر احادیث رسول ﷺ جمع کر رہے تھے۔ اگرچہ 100ھ یا 101ھ میں نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت اہل کلام کے حلقے سے باہر نہیں آئے تھے لیکن پھر بھی آپ کو اس قبیل کے لوگوں سے اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اسے اہل زمین کی تیرہ بختی ہی کہا جائے گا کہ سوا دو سال بعد ہی وہ سورج بجھ گیا جو حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی شہادت کے بعد نصف صدی تک گہرے سیاہ بادلوں میں روپوش رہا تھا۔ 101ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا' مگر اس مختصر ترین وقت میں آپ اتنی روشنی تقسیم کر گئے کہ اہل طلب قیامت تک اندھیروں کا شکار نہیں ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی' حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ ہی کی مجتہدانہ کوششوں کا ایک عکس ہے۔ نظام کائنات کی گردش کو تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے' مگر بعض امور اتنے مشروط ہوتے ہیں کہ ایک عام ذہن رکھنے والا شخص بھی آسانی کے ساتھ ان کا ادراک کر سکتا ہے۔ مثلاً سورج غروب نہیں ہوگا تو رات نہیں آئے گی۔ سمندر کے سینے سے بخارات نہیں اٹھیں گے تو پانی بھی نہیں برسے گا۔ یہ مادی دنیا کی چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح روحانیت کے بھی کچھ آداب ہیں' جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"لوگو! تمہارے حق میں میرا جانا ہی بہتر ہے کہ جب تک میں نہیں جاؤں گا اس وقت تک میرا محبوب' سچائی کی

روح فارقلیطؑ نہیں آئے گا (عبرانی زبان میں رسالت مآب ﷺ کا اسم مبارک فارقلیطؑ ہے)۔

کچھ لوگ تاریخ اسلام کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ مسند خلافت تک نہ پہنچتے تو نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت بھی امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نہ ہوتے۔ بظاہر یہ کوئی کلیہ نہیں ہے مگر ایک عقلی دلیل ضرور ہے۔ جس مرد جلیل نے شہنشاہیت نما طرز حکومت کا رشتہ خلافت راشدہ سے جوڑ دیا وہ یقیناً اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھا۔ ایسے ہی شخص کے دور اقتدار میں کسی دوسری نشانی کا ابھرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ اسے کوئی حسن عقیدت سمجھے یا اظہار حقیقت مگر یہ واقعہ ہے کہ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا ذہنی انقلاب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے عہد خلافت سے مشروط ہے۔ اگر خاندان بنوامیہ کا یہ فرزند افق اقتدار پر طلوع نہ ہوتا تو کون جانے کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت علم کلام کے گرداب سے نکل جاتے یا انہی مباحث اور فلسفیانہ موشگافیوں میں آپ کی پوری زندگی بسر ہو جاتی۔



تیسری روایت

حصول علم کے سلسلے میں تیسری روایت حضرت امام زفر رحمتہ اللہ علیہ بن ہذیل کی ہے۔ امام زفر رحمتہ اللہ علیہ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں ان کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے سنا۔ آپ فرماتے تھے۔

”میں علم کلام پڑھتا بھی تھا اور پڑھاتا بھی تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس میں خاصی شہرت حاصل کر لی۔ ہماری نشست گاہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلمان کے حلقے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک روز ایک عورت آ کر مجھ سے پوچھنے لگی کہ ایک شخص نے ایک کنیز سے نکاح کر رکھا ہے اور اب اسے سنت کے مطابق طلاق دینا چاہتا ہے۔ اس صورت میں اسے اپنی کنیز کو کتنی طلاقیں دینا چاہئیں۔ میں نے عورت سے کہا تمہارے اس سوال کا جواب مجھے معلوم نہیں۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کرو۔ وہ جو کچھ جواب دیں اس سے مجھے بھی آگاہ کر دینا۔ عورت خاموشی کے ساتھ چلی گئی پھر کچھ دیر کے بعد واپس آئی اور اس نے مجھے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا فتویٰ سنا دیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب مجھے علم کلام کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ میں داخل ہو گیا۔“

یحییٰ بن شیبان رحمتہ اللہ علیہ اور امام زفر رحمتہ اللہ علیہ کی روایات سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے نہ صرف علم کلام سیکھا تھا بلکہ اس میں مہارت بھی حاصل کی تھی۔ اب رہی حضرت امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی روایت تو وہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔ دراصل ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے جس غور و فکر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کوئی لمحاتی کیفیت نہیں تھی' بلکہ ایک طویل تجربہ تھا جس سے گزرنے کے بعد امام رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا مشاہدہ بیان کیا تھا۔ الغرض نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ علم کلام کے طلسم سے نکل کر حقیقت ازلی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

بیشتر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں اٹھارہ

سال تک رہے اور امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال 120ھ میں ہوا۔ ان واقعات سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے 102ھ میں مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ کا رخ کیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر بائیس سال تھی اگر یہ تحقیق درست ہے کہ حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی نصیحت سے متاثر ہو کر نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت سترہ سال کی عمر میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تھے تو یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے علم کلام کے کوچے میں پانچ چھ سال گزارے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے بائیس سال کی عمر میں مذہبی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ امام رحمتہ اللہ علیہ کے بیشتر عقیدت مند کسی تاریخی حوالے کے بغیر بضد ہیں کہ حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بچپن ہی سے امامت کی خصوصیات رکھتے تھے اور آپ کا سلسلہ علم کسی بھی دور میں منقطع نہیں ہوا تھا۔ دراصل اس جذبے کے پیچھے انتہا سے زیادہ حسن عقیدت کارفرما ہے۔ وہ لوگ امام رحمتہ اللہ علیہ کے کسی بھی دور کو حیرت انگیز کارناموں سے خالی دیکھنا نہیں چاہتے۔ ان کے نزدیک کارنامہ یہ ہے کہ ایک بچہ علم حاصل کرے اور انتہائی نوعمری کے دور میں برجستہ جواب دے کر اہل عقل کو حیرت میں ڈال دے۔ بے شک! ذہین افراد کی زندگی کا یہ بھی ایک روشن پہلو ہے، مگر وہ لوگ اس طرح کیوں نہیں سوچتے کہ دنیا کا ایک ذہین ترین بچہ کسی بھی وجہ سے اس دور میں تعلیم حاصل نہ کر سکا جو تحصیل علم کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ پھر اچانک ایک شخص اسے احساس دلاتا ہے اور وہی بچہ جو اب جوان ہو چکا ہے، اس منزل کی طرف پلٹتا ہے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ بائیس سال کی عمر ایک پختہ عمر ہے جو تحصیل علم کے لئے اگر غیر مناسب نہیں تو اسے موزوں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اصولی طور پر بچپن ہی وہ بہترین زمانہ ہوتا ہے جب خام ذہن میں ہر بات اور ہر خیال کسی پتھر کے نقش کی طرح جم جاتا ہے اگر یہ وقت گزر جائے تو دقیق اور مشکل مسائل کو ذہن نشین کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے بھی یہی سنگین مرحلہ تھا مگر آپ جس جرأت و مردانگی کے ساتھ آگے بڑھے، وہ تاریخ آدم کا ایک عجوبہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دوسرے افراد نے بھی عہد طفلی گزر جانے کے بعد تعلیم حاصل کی اور صاحب کمال لوگوں کی فہرست میں شامل ہوئے لیکن نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ ان سب سے اس لئے جدا ہیں کہ آپ دور طالب علمی سے گزر کر درجہ امامت تک پہنچے اور پھر امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ قرار پائے۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتی کہ کسی شخص نے سب سے بعد میں کام کا آغاز کیا ہو اور پھر سب سے پہلے تکمیل تک پہنچا کر اس طرح دنیا سے رخصت ہو گیا کہ ماضی پر بھی اس کی گرفت ہو اور زمانہ حال بھی اسی کے افکار کا اسیر ہو۔

کمال یہ نہیں کہ ایک شخص دوسرے انسانوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں شریک مقابلہ ہوا اور پھر تھوڑا فاصلہ قائم رکھتے ہوئے آگے نکل گیا ہو۔ ہمارے نزدیک کمال یہ ہے کہ ایک شخص مقابلے میں شریک ہونے کے لئے اس وقت آتا ہے جب دوسرے لوگ بہت آگے جا چکے ہوتے ہیں۔ اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو وہ لوگ سیکڑوں میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ پھر یہ بعد میں آنے والا شخص نہ صرف اس طویل فاصلے کو عبور کرتا ہے بلکہ ان سے اس قدر آگے نکل جاتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکا۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ بھی وہی تاریخ ساز انسان ہیں جو سب سے آخر میں شریک مجلس ہوئے تھے مگر پھر اس طرح میر مجلس ٹھہرے کہ ہزاروں انقلابات و حوادث کے باوجود آپ کی فضیلت کو جھٹلایا نہ جا سکا۔

انقلاب کا سبب ...... ایک عورت

حضرت امام حمادؒ بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں جانے کے متعلق ایک دوسری روایت بھی مشہور ہے۔ حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

''ایک عورت نے مجھے دھوکا دیا۔ ایک عورت نے مجھے زاہد بنا دیا اور ایک عورت کی وجہ سے میں فقیہ بن گیا۔''

یہ آخری عورت وہی ہے جس نے نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ سے کنیز کی طلاق کے بارے میں دریافت کیا تھا اور جب آپ ماہر علم کلام ہونے کے باوجود کوئی جواب نہ دے سکے تھے تو قلب غیور پر ایک ضرب سی پڑی تھی اور آپ نے اپنے دوستوں سے فرمایا تھا۔

''آخر میں اس علم کے تعاقب میں کیوں اپنی عمر بسر کر رہا ہوں جو ایک عورت کا معمولی سا مسئلہ بھی حل نہ کر سکا۔ افسوس! میرے شب و روز رائیگاں گئے۔'' دوستوں نے دیرینہ صحبتیں یاد دلائیں۔ ذہنی خلش کو دور کرنے کی کوششیں کیں مگر نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت نہیں مانے یہ کہتے ہوئے حلقہ یاراں سے اٹھ گئے۔

''اب مجھے علم کلام کی کوئی حاجت نہیں۔''

بعض روایات میں نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کے یہ الفاظ بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

''جب اس عورت نے واپسی میں امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا فتویٰ سنایا تو مجھے اپنی عاجزی و ناکامی پر بڑا قلق ہوا۔ پھر میں نے اہل کلام کے حلقے کو خیر باد کہہ دیا۔ اپنے جوتے اٹھائے اور مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ میں داخل ہو گیا۔''

علم فقہ کی طرف متوجہ ہونے کے سلسلے میں تمام روایات کم و بیش یکساں ہیں۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے واقعے کی صحت متاثر نہیں ہوتی۔ ہر روایت کا مشترک کردار ایک عورت ہی ہے جس نے نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کا رخ درس گاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ کی طرف موڑ دیا۔

امام رحمتہ اللہ علیہ مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ میں

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ میں داخل ہونے سے پہلے حضرت نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا تھا جس کے باعث آپ کو بے حد ندامت کا احساس ہوا تھا اور پھر علم الکلام سے آراستہ ذہن نئی کروٹ لینے لگا تھا۔ اس روایت کو امام مرغینانی رحمتہ اللہ علیہ نے نعیم بن عمرو رحمتہ اللہ علیہ کی زبانی نقل کیا ہے۔

''میں نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے' فرماتے تھے کہ میں حجاج بن یوسف کے زمانے میں بازار جاتا تھا۔ یہ میرے لڑکپن کی عمر تھی۔ میں اس وقت علم کلام کے ذریعے لوگوں سے مذہبی عقائد پر بحث کرتا تھا۔ عام انسان میری باتیں سن کر خاموش ہو جاتے تھے اور میں سمجھنے لگتا تھا کہ میرا علم اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن ایک روز ایک شخص نے مجھ سے دینی فرائض کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے اپنے حاصل کردہ علم کے سہارے اس شخص کے سوال کا جواب دینے کی بہت کوشش کی مگر عاجز رہا۔

میرے ہونٹ پر مہر سکوت دیکھ کر وہ شخص دوبارہ کہنے لگا۔'' نوجوان! تم ان مسائل میں تو بڑی بے باکی کے ساتھ لب کشائی کرتے ہو جو بال سے زیادہ باریک ہیں' مگر ایک عام سے دینی فریضے کا جواب نہیں دے سکتے۔ بظاہر

تم ہوشمند بھی نظر آتے ہو لیکن ایک معمولی سے مسئلے میں تم ایک عام آدمی کو مطمئن نہیں کر سکتے آخر یہ کیسا علم ہے؟ اتنا کہہ کر وہ شخص تو چلا گیا مگر میں بہت دیر تک اپنی جگہ شرمساری کی حالت میں کھڑا رہا۔"

یہ پہلی ضرب تھی جسے نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت نے شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا' مگر پھر کچھ دیر بعد ہی آپ ہنگامہ روز و شب میں گم ہو گئے تھے اور پھر وہی علم الکلام کی لاحاصل مجلسیں' بے سود بحث و مباحث اور بے فائدہ مناظرے۔ آخر کچھ عرصے بعد ایک عورت کا واقعہ پیش آیا جو نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو علم کلام کی محفل سے اٹھا کر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کی بارگاہ جلال میں لے گیا۔

اس وقت عام طور پر تمام حدیث و فقہ کی مجلسوں کا یہی دستور تھا کہ زیادہ ذہین شاگرد اگلی صف میں بیٹھتے تھے اور پھر اسی طرح حفظ مراتب کے اعتبار سے حاضری کی نشست ہوتی تھی، لیکن اس درجہ بندی کا معیار ذہانت و علم ہی کے مطابق قائم کیا جاتا تھا۔ فقہا کی مجالس میں یہ بے ترتیبی کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ اگر کسی طالب علم کا تعلق کسی امیر و کبیر یا حکمراں خاندان سے ہے تو وہ اگلی صف میں جگہ پائے گا اور اگر کوئی علم کی جستجو رکھنے والا مادی طور پر بے وسیلہ اور مفلس ہے تو اسے بیٹھنے کیلئے آخر میں نشست حاصل ہوگی۔ یہ دنیا کی مادہ پرست درس گاہوں کا حال تو ہو سکتا ہے کہ جب کوئی اہل ثروت داخل ہو تو معلم اس کے احترام میں کھڑا ہو جائے اور جب کسی تنگ دست انسان کا مکتب میں گزر ہو تو استاد اس سے نگاہیں پھیر لے۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان نے وہی سلوک کیا جو مجلس فقہا کا بنیادی اصول تھا۔ یعنی امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے نئے شاگرد کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا اس لئے آپ نے پہلے دن نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کو پچھلی نشست میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اگرچہ خاندان زوطی کا یہ وارث کوفے کا بڑا تاجر اور ظاہری اعتبار سے بہت زیادہ آسودہ حال تھا لیکن امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو نعمان بن رحمتہ اللہ علیہ ثابت کی یہ حیثیت متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجتاً پہلے روز جیسے ہی نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ درس گاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں داخل ہوئے امام رحمتہ اللہ علیہ نے بہ آواز بلند فرمایا۔

"نعمان! تم وہاں بیٹھو' تمہاری نشست ادھر ہے۔" امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے ہاتھ سے درس گاہ کی آخری نشستوں کی جانب اشارہ کر رہے تھے حاضرین مجلس نے امام رحمتہ اللہ علیہ کی اس وضاحت کے بعد اندازہ کر لیا تھا کہ آنے والا نیا طالب علم کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔

نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ مجلس درس میں شریک ہو گئے۔ جب امام رحمتہ اللہ علیہ ہی کو نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی فطری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا تو دوسرے طلباء ایک نووارد شوق کے مقام کا تعین کس طرح کر سکتے تھے؟ اور یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ کسی عملی ثبوت کے بغیر ابتدائی لمحات میں نعمان رحمتہ اللہ علیہ کی ذہنی رسائی سے مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ آگاہ ہو جاتی۔ بے شک آپ آغاز کار میں ایک عام سے طالب علم نظر آتے تھے مگر پہلے ہی دن نعمان رحمتہ اللہ علیہ کے ایک عمل نے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو چونکا دیا تھا۔ آپ اپنی نشست پر اس طرح بیٹھے کہ دوسرے حاضرین مجلس بھی دیکھتے رہ گئے۔ دیگر طالب علم ایک عرصہ دراز سے اپنے امام رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو بیٹھتے تھے لیکن نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کا انداز نشست سب سے جداگانہ تھا۔ آپ اس قدر ادب کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ جیسے کوئی غلام کسی باجبروت شہنشاہ کے سامنے حاضر ہو۔

امام حماد نے اپنے نئے شاگرد کی جانب دیکھا اور چند ساعتوں کے لئے آپ کے چہرہ مبارک پر ایک رنگ آ کر

گزر گیا۔ درس جاری تھا امام حماد رحمتہ اللہ علیہ فقہ کے کسی موضوع پر تقریر فرما رہے تھے اور سننے والوں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے علم کا سمندر موجزن ہو۔ تمام طالب علموں کی نگاہیں اپنے امام رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر مرکوز تھیں مگر نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت ہی شرکائے مجلس میں ایک تنہا شخص تھے' جن کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان نے دوران تقریر کئی بار کوفے کے اس تاجر کی طرف دیکھا۔ امام رحمتہ اللہ علیہ نے محسوس کر لیا کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کے زاویہ نشست میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ نئے شاگرد کی نظریں مسلسل درس گاہ کے فرش پر جمی ہوئی تھیں لیکن پھر بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کی سماعت پورے انہماک کے ساتھ تقریر کی طرف متوجہ ہے۔ یہ ایک نیا انداز تھا جس نے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو متاثر کیا پھر مجلس درس اختتام پذیر ہوئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

دوسرے دن اپنے مقررہ وقت پر مجلس درس آراستہ ہوئی۔ شاگردوں کی نشست کی وہی ترتیب برقرار تھی۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ اپنی جگہ اسی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے پیوستہ تھے' گردن خم تھی اور نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے آج بھی اپنے نئے طالب علم کے اس منفرد انداز نشست کو محسوس کیا تھا، درس شروع ہوا۔ دیگر طالب علم مختلف سوالات کرتے رہے۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ خاموش تھے۔ آپ کی ظاہری حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جسم مجلس فقہ میں موجود ہے' مگر ذہن کسی اور ہی فضا میں مصروف پرواز ہے۔ اچانک امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی پُر جلال آواز گونجی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ' نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ سے کوئی سوال کر رہے تھے۔ استاد گرامی کو براہ راست اپنے آپ سے مخاطب پا کر نعمان رحمتہ اللہ علیہ نے سر اونچا کیا اور امام رحمتہ اللہ علیہ کے سوال کا اس طرح جواب دیا کہ لہجے سے انتہائی عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔

پھر کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ روزانہ مجلس درس کے دوران نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت سے کوئی نہ کوئی سوال ضرور کرتے۔ شاگرد کے جواب کا وہی انداز ہوتا۔ عاجزانہ طرز اظہار' انکسار میں ڈوبا ہوا لہجۂ احترام استاد میں خمیدہ سر۔ مگر حاضر جوابی اور ذہن کی رسائی میں امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے تمام شاگردوں سے آگے۔ حاضرین مجلس نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے ہر جواب پر چونک کر دیکھتے' خاموش طبع نوجوان کی عقل کے اسرار آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔

پھر بہت جلد وہ دن بھی آ گیا جب حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن سلیمان نے برسر مجلس پکار کر کہا۔ نعمان! تمہاری جگہ وہ نہیں ہے تم اگلی صف میں میرے روبرو بیٹھا کرو۔" یہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم و جلیل فقیہ کی طرف سے اس نوجوان کی ذہانت کا اعتراف تھا جسے مجلس فقہ میں بیٹھنے والے محض ریشمی کپڑے کا ایک تاجر سمجھ رہے تھے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حنفی مسلک کے ماننے والوں نے بعض غیر تاریخی باتوں کو بھی جوش عقیدت میں درجہ اعتبار تک پہنچا دیا ہے۔ اس فطرت و مزاج کے لوگ برملا کہتے ہیں کہ حضرت نعمان بن ثابت جس دن مجلس فقہ میں داخل ہوئے اسی روز حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو طلبا کی اگلی قطار میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہمارے نزدیک یہ ایک مفروضہ ہے اور عقیدت کا پرجوش مظاہرہ جس میں اس دور کی علمی روایات کو سہواً یا قصداً فراموش کر دیا گیا ہے۔ تمام مستند مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ آداب مجلس کے مطابق نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت پہلے روز طلباء کی پچھلی صف میں بیٹھے اور پھر چند روز بعد ہی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے کسی رشتے' کسی تعلق اور

کسی رسم کی پروا کیے بغیر نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کو اگلی قطار میں اپنے سامنے جگہ دی۔ یہ بڑا اعزاز تھا' بڑا شرف تھا جس نے حلقہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں یقینی طور پر ہیجان برپا کر دیا ہوگا ۔

وہ پیچھے رہ گئے کرتے تھے جو قصد سفر پہلے

اور یہ بات قرین قیاس ہو بھی نہیں سکتی کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ میں داخل ہوتے اور فوری طور پر استاد کے مرکز نظر بن جاتے۔ یہ واقعہ اسی صورت میں شکل پذیر ہو سکتا تھا کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت' امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے کسی موضوع پر مناظرہ کرتے اور استاد اپنے نو وارد شاگرد کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے مجلس فقہ میں نمایاں طور پر جگہ دے دیتا۔ اگر ہم تاریخی اعتبار سے کسی مناظرے کا وجود تلاش کریں تو یہ ایک کوشش ناکام ہوگی۔ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت اپنے ذہن پر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے علم کی ہمہ گیری کا گہرا نقش لے کر مجلس فقہ میں داخل ہوئے تھے۔ بحث و مباحث آپ کا مقصد نہیں تھا اور پھر یہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کا مزاج بھی نہیں تھا۔ طلب علم رکھنے والے کسی درس گاہ میں سر جھکا کر داخل ہوتے ہیں...... نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت بھی اسی طرح بارگاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں نشست پا کر شرف یاب ہوئے تھے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ ابتدائی دنوں میں آپ کی نشست مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ کی کسی پچھلی قطار میں تھی مگر چند دن بعد ہی درس گاہ کے اس دستور میں انقلاب آ گیا اور نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ استاد کے سامنے اس طرح بٹھائے گئے کہ اکثر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا روئے سخن آپ ہی کی طرف ہوتا تھا۔

حضرت امام حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ جس مسند فقہ پر جلوہ افروز تھے اس پر کبھی حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ تشریف فرما ہوتے تھے۔ درسگاہوں میں علم کے بے شمار طلب گار جمع ہوتے ہیں استاد کسی تفریق کے بغیر دولت علم لٹاتا ہے' مگر یہ پانے والے کے حوصلے پر منحصر ہے کہ اس نے کیا پایا؟ تلاش کرنے والے کی صلاحیت ہے کہ اس نے ذخیرہ علم کو کہاں کہاں ڈھونڈا اور پھر کیا کیا اپنی ذات میں جذب کیا؟ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کے سلسلے میں طلب کا یہی اصول کارفرما تھا۔ یہ سب فطری ذہانت اور کشادگی قلب کی باتیں تھیں۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان نے اپنے خاندانی سرمائے کو حقارت سے ٹھکرا کر استاد گرامی حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی تھی اور تاج زر سجانے کے بجائے ایک مرد فقیہ کے نقش پا کو اپنے سر کی زینت بنا لیا تھا۔ تاریخ آگہی ایک بار پھر اسی انداز میں رقم ہو رہی تھی۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ بھی دنیا کی تمام آسائشوں کو جھٹلا کر درس گاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں اس طرح دست بستہ بیٹھے رہتے تھے کہ احترام استاد کو تحریری شکل میں ظاہر کرنے کے لئے ایک بڑا مجموعہ الفاظ بھی ناکافی ہوگا۔ یہ صرف جذبوں کا معاملہ ہے۔ جذبے کاغذ پر منتقل ہوں گے تو اپنا سوز' اپنی خلش' اپنا درد اور اپنی شگفتگی کھو بیٹھیں گے۔

اگر نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کے دماغ میں صرف ذہانت کی قندیل روشن ہوتی تو ایک فقیہ کی تکمیل ذات ممکن نہ تھی۔ مکمل فقیہ وہی ہے جس کے دل و دماغ ذوق طلب کے شعلوں میں جل اٹھے ہوں۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ صاحب ادراک بھی تھے اور صاحب دل بھی۔ آنکھ نے مشاہدہ کیا ذہن نے اسرار کو سمجھا اور یہ کام تو شاگردان حماد رحمتہ اللہ علیہ بھی انجام دے رہے تھے مگر آخر وہ کیا شے تھی جس نے کوفے کے ایک نوجوان تاجر کو بارگاہ حماد رحمتہ

اللہ علیہ میں حضوری بخشی۔ وہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کا دل ہی تھا جس نے استاد گرامی کے سینہ سوزاں کی تپش کو ادب اور عشق کی تمام تر روایتوں کے ساتھ محسوس کیا۔ دراصل ادب بذات خود کوئی چیز نہیں۔ روحانیت ہو یا مادیت بنیادی طور پر عشق ہی مکمل ترین شے ہے۔ جب عشق رگ جاں سے گزر کر دل اور روح کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو ردعمل کے طور پر ہمیں انسانی زندگی میں مختلف عکس نظر آتے ہیں۔ احترام وادب' وفا، جاں نثاری، یہ سب عشق ہی کے ذیلی مناظر ہیں جو عالم محسوسات میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اگر عشق منزل طلب میں نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کا رہبر نہ ہوتا تو آپ بھی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کے دل کے قریب نہ پہنچتے اور یہ قربت اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک خاندان زوطی کا یہ وارث اپنی ذات کی نفی نہ کر دیتا۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بھی تو اپنے استاد ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کی خاطر دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے اس لئے ضروری تھا کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ میں بھی ایسا ہی کوئی جاں نثار آئے۔ ورنہ عشق کا یہ دائرہ کس طرح مکمل ہوتا۔ بالآخر کوفے ہی کی زمین سے ایک شرار عشق پھوٹا اور نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے اس دائرے کو مکمل کر دیا۔

"ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ" کی وجہ تسمیہ

شاید یہی وہ زمانہ تھا جب نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے "ابوحنیفہ" کنیت اختیار کی۔ یہ موضوع واقعات کی ترتیب کے اعتبار سے آئندہ زیر بحث آتا مگر ضروری سمجھا گیا کہ قبل از وقت ہی اس کی وضاحت کر دی جائے۔ کچھ مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ نعمان بن رحمتہ اللہ علیہ ثابت اس وقت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کہلائے جب حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے اہل کوفہ کے شدید اصرار پر مسند فقہ کو زینت بخشی۔ اس ذیل میں ایک عجیب واقعہ بھی مشہور ہے کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی ایک صاحب زادی حنیفہ تھیں۔ ایک روز ایک خاتون آپ کے گھر آئیں اور نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت سے عورتوں کا ایک مخصوص مسئلہ دریافت کرنے لگیں۔ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ انتہائی ذہانت اور حاضر جوابی کے باوجود ان خاتون کے سوال کا جواب نہ دے سکے۔ امام کی صاحب زادی حنیفہ بہت غور سے یہ تمام گفتگو سن رہی تھیں۔ انجام کار جب وہ خاتون اپنے سوال کے سلسلے میں ناکام و نامراد واپس جانے لگیں تو بنت نعمان رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں رک جانے کے لئے کہا۔ جب وہ خاتون ٹھہر گئیں تو صاحب زادی اپنے والد گرامی سے اس طرح مخاطب ہوئیں۔

"اگر آپ میرے نام کو بطور کنیت اختیار فرمائیں تو میں اس نسوانی مسئلے کا جواب دے سکتی ہوں۔"

روایت ہے کہ حضرت نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے بیٹی کی اس شرط کو قبول کر لیا۔

پھر بنت نعمان رحمتہ اللہ علیہ نے سائل خاتون کی طرف دیکھا اور اتنی مضبوط دلیل کے ساتھ اس مسئلے کا جواب دیا کہ امام رحمتہ اللہ علیہ بھی حیران رہ گئے۔ اس واقعہ کے بعد نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے "ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ" کی کنیت اختیار کر لی پھر یہ نام اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ آپ کے خاندانی نام کو بھی فراموش کر بیٹھے۔

بے شمار کتابوں میں یہ بے بنیاد روایت اسی طرح درج ہے۔ عقیدت مندوں کے جوش و خروش کا یہ حال ہے کہ اسی بے اصل واقعے کو صدیوں سے بیان کئے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی ذرا بھی تحقیق سے کام لیتا تو اس پر یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی کہ ایک صاحب زادے کے علاوہ امام رحمتہ اللہ علیہ کی کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔

پھر "ابوحنیفہ" کے لفظ کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے والوں نے بڑی روشن دلیل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امام رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی اس آیت سے اپنی کنیت اخذ کی۔

فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا O (آل عمران: 11)

اب یہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کا خلوص نیت تھا کہ خدا نے اس لفظ کو قبولیت دوام بخشی۔

کسی معتبر روایت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ امام رحمتہ اللہ علیہ نے کس دور میں ابوحنیفہ کا لقب ذاتی طور پر اختیار کیا مگر ایک واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان نے بھی نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کو ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے پکارا تھا۔ اس تاریخی حوالے کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس وقت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ زندہ تھے اور آپ کی موجودگی ہی میں اس لقب یا کنیت کو اختیار کر لیا گیا تھا۔

اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ ایک بار حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کوفے سے باہر تشریف لے گئے۔ آپ کا یہ سفر نسبتاً طویل تھا اس لئے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو کچھ عرصہ اپنی مسند فقہ سے دور رہنا پڑا۔ ایسے مواقع پر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے صاحب زادے اسمٰعیل یا دوسرے جلیل القدر شاگرد موسیٰ بن ابوکثیر رحمتہ اللہ علیہ کو اپنا جانشین نامزد کر کے کوفے سے باہر چلے جاتے تھے۔ بظاہر نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو ابھی وہ شرف حاصل نہیں ہوا تھا کہ استاد کی عدم موجودگی میں مسند فقہ پر جلوہ افروز ہوتے اور لوگوں کے مسائل حل کرتے' مگر پھر بھی آپ کو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے ایک قربت خاص حاصل ہو گئی تھی۔ عام حاضرین مجلس بھی اندازہ کر چکے تھے کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ روز بروز امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہوں کا مرکز بنتے جا رہے ہیں لیکن یہ بات لوگوں کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی موجود نہیں تھی کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ درپردہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ یہ راز اس دن فاش ہوا کہ جب حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان سفر سے واپس تشریف لائے۔ تمام شاگردوں' عقیدت مندوں اور اہل خانہ نے بڑے والہانہ انداز میں آپ کا استقبال کیا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی علم نوازی کا یہ حال تھا کہ تھکا دینے والے سفر کے باوجود آپ نے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا اور براہ راست اپنی درسگاہ تشریف لے گئے۔ طویل غیر حاضری کے سبب لوگوں کے جس قدر مسائل جمع ہو گئے تھے ان کے مکمل جوابات دیئے اور حسب معمول مغرب کی نماز ادا کر کے اپنے گھر آئے۔ اہل خانہ کی مزاج پرسی کی اور خاندان کے دیگر افراد سے ملاقاتیں کیں۔

جب امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو خلوت میسر آئی تو آپ کے صاحب زادے حضرت اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ "فرزند! آؤ کیا بات ہے؟" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا۔

"اگر آپ سفر کی تھکن زیادہ محسوس نہ کر رہے ہوں تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے سے اسی ادب کا اظہار ہو رہا تھا جو اہل دل کا شیوہ ہے۔

"تم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو، میری تھکن کا خیال نہ کرو۔" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے ایک تبسم دلنواز کے ساتھ فرمایا۔ تمہارا سوال میرے جسمانی آزار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ایک فقیہ کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ خود کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے مگر علم کا کوئی مسئلہ باقی نہ رہے۔"

"میں اس وقت فقہ کے کسی مسئلہ پر آپ کو زحمت کلام نہیں دینا چاہتا۔" اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے عرض کیا، میں آپ کی زبان مبارک سے اس سفر کے حالات سننا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اختصار کے ساتھ اس دوران پیش آنے والے واقعات بیان فرمائیں۔ کہیں کوئی حادثہ تو نہیں گزرا، کسی اذیت ناک مرحلے سے تو آپ کو دوچار نہیں ہونا پڑا۔" یہ ایک سعادت مند بیٹے کی دلی کیفیات تھیں جو بالآخر زبان تک آ گئی تھیں۔

"نہیں فرزند! خدائے عزیز و جلیل کا احسان ہے کہ اس نے تمہارے باپ کو نہ صرف آزمائشوں سے محفوظ رکھا بلکہ قدم قدم پر سرفراز بھی کیا۔" دراصل اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے تمام واقعات اس لئے سننا چاہتے تھے کہ اس وقت سیاسی فضا بہت کشیدہ تھی اور بعض تنگ نظر مخالفین حدیث و فقہ کے مسائل کو بنیاد بنا کر ہنگامہ آرائی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی اس وضاحت کے بعد اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ مطمئن ہو گئے پھر آپ نے گھریلو نوعیت کی باتیں شروع کر دیں۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے فرمانبردار بیٹے کی ہر بات کا جواب دیتے رہے پھر یکایک اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی سے دریافت کیا۔ "اس سفر میں آپ کو اہل کوفہ بھی یاد آتے ہوں گے؟"

"کیوں نہیں؟" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان نے فرمایا۔" میں اپنے اہل شہر کو کس طرح فراموش کر سکتا ہوں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ خاک کوفہ سے کتنی یادیں وابستہ ہیں۔" امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے ایک ایک لفظ سے دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اہل کوفہ میں کون آپ کو سب سے زیادہ یاد آتا تھا؟" اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی سے بڑا نازک سوال کیا تھا۔ دنیا کا ہر بیٹا رشتے کی قربت کے سبب اپنے باپ سے چاہے جانے کی خواہش رکھتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی محبت تمام انسانوں کی محبت پر غالب آ جائے۔ اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اسی جذبے کے زیر اثر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے یہ سوال کیا تھا۔ اگر یہ سوال کوئی دوسرا شخص کرتا تو یقیناً سوال کی نوعیت بدل جاتی' لیکن پوچھنے والا ایک حساس اور باکردار بیٹا تھا اور جواب دینے والا اپنے وقت کا امام اور رقیق القلب باپ...... بڑی جذباتی فضا تھی۔ اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے اس یقین کے ساتھ باپ کی محبت کو آزمایا تھا کہ امام رحمتہ اللہ علیہ کا جواب فرزند کی محبت کے دائرے سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔

"ابوحنیفہ"...... حضرت امام حماد بن ابی سلیمان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور آپ کے فرزند اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ شدید حیرت کے عالم میں اپنے والد گرامی کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت مقدسہ کے مفہوم کے مطابق۔" دولت اور اولاد انسان کے لئے بڑا فتنہ ہے۔" مگر آج امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بڑی سبک رفتاری کے ساتھ آزمائش سے گزر گئے تھے۔ اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئے۔ وہ عظیم باپ کے عظیم فرزند تھے جس بلند حوصلگی سے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے جذبوں کا اظہار کیا تھا، اسی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی کا جواب سنا تھا اور اس بات پر رضا مند ہو گئے تھے کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو زیادہ قربت حاصل ہے۔ یہ قربت تمام نسبی اور خاندانی رشتوں سے بالاتر تھی۔

بعض مؤرخین نے اس واقعے کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ محققین کی اس جماعت کے مطابق جب حضرت

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کوفہ واپس تشریف لائے تو دیگر امور پر گفتگو کرنے کے بعد حضرت اسمٰعیل نے والد گرامی سے پوچھا۔

''اس دوران آپ سب سے زیادہ کسے دیکھنے کے لئے بے قرار تھے؟''

جواباً حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔''میں ابوحنیفہ کو دیکھنے کے لئے مضطرب تھا۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ میں اپنی نگاہ کبھی ان کے چہرے سے نہ ہٹاؤں تو ایسا ہی کرتا۔''

مؤرخین کی بیان کردہ دونوں روایات اپنی جگہ معتبر ہیں۔ تفصیلات میں اختلاف ہوسکتا ہے مگر واقعے کی بنیاد امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا ایک ہی جذبہ ہے، جس کے آگے دنیا کے تمام رشتے ہیچ تھے۔ کوئی رشتہ باقی تھا تو علم کا رشتہ اور اس رشتے کے سبب آپ کو دوران سفر نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ ہی سب سے زیادہ یاد آتے تھے اور اسی نوجوان تاجر کو دیکھنے کے لئے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بے قرار تھے۔

اس واقعے سے جہاں حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کی بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا ہے، وہاں یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ استاد گرامی کے انتقال سے پہلے ہی نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کو ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کہہ کر پکارا جانے لگا تھا۔

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عظمت پر پہلی گواہی

ایک اور موقع پر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس آراستہ تھی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد اور دیگر فقہائے کوفہ حاضر تھے ایک موضوع پر بحث جاری تھی۔ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت استاد گرامی سے سوال کر رہے تھے اور حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے شاگرد جلیل کو مطمئن کرنے کے لئے جواب دے رہے تھے۔ اس وقت نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے ہی ایک سوال کا جواب ختم ہوتا تھا' آپ اسی موضوع سے متعلق دوسرا سوال تراش لیا کرتے تھے۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان ایک مخصوص تبسم کے ساتھ جواب دیتے اور ستائشی نظروں سے اپنے ذہین ترین شاگرد کی طرف دیکھنے لگتے۔ جب استاد گرامی خاموش ہو جاتے تو نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت تیسرا سوال کرنے لگتے۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ حاضرین مجلس حیرت زدہ تھے۔ ان لوگوں نے اپنی ساری زندگی میں ایک ہی موضوع پر اتنے نکات تلاش کرنے والا نہیں دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہی سوال سے بے شمار سوالات پھوٹتے چلے جا رہے ہیں اور وہ اس طرح کہ ہر سوال اپنی جگہ نہایت اہم اور مستقل موضوع نظر آتا تھا۔ یہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کی ذہانت تھی کہ آپ انسانی دماغ کی حد تک کسی امکانی گوشے کو نظر انداز نہیں کر رہے تھے اور دوسری جانب حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی وسعت علم کا یہ حال تھا کہ جیسے ہی شاگرد کی زبان سے سوال ادا ہوتا تھا' استاد گرامی اس طرح وضاحت کرنے لگتے تھے جیسے یہ موضوع پہلے سے طے شدہ ہو اور حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اس کی وضاحت کرنے کے لئے پہلے سے آمادہ ہوں۔

عجیب و غریب منظر تھا ایک طرف سوالات کی یلغار تھی اور دوسری طرف جوابات کی بارش۔ لوگ سمجھتے تھے کہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ' نعمان بن ثابت کے سوال کا جواب دینے کے لئے کسی تامل' کسی فکر اور کسی تاخیر سے کام لیں گے مگر حقیقت یہ تھی کہ سوال سن کر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی پیشانی پر سوچ کی ہلکی سی لکیر بھی نمایاں نہیں ہوتی

تھی اور دوسرے ہی لمحے اس قدر مدلل جواب سامنے آتا تھا کہ اہل مجلس حیران رہ جاتے تھے۔ کثرت سوالات دیکھ کر لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے نوجوان شاگرد کے اس طرز کلام سے بیزار ہو جائیں گے اور پھر برسر محفل ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگیں گے۔ مگر یہ کہاں ممکن تھا، امام حماد رحمتہ اللہ علیہ آخر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ صبر و تحمل کا اعلیٰ ترین نمونہ ایثار کی بہترین مثال اور علم کے راستے میں سب کچھ لٹا دینے والے۔ حاضرین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جب بھی نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کوئی سوال کرتے' حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک پر انبساط و شادمانی کا رنگ نمایاں ہو جاتا اور حاضرین مجلس کو یوں محسوس ہونے لگتا جیسے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ زبان سکوت سے فرما رہے ہوں۔

''نعمان! میں تیرے تحقیقی اضطراب پر نازاں ہوں اور تیری جستجوئے علم سے مطمئن۔''

یہ بڑی بات تھی امام حماد رحمتہ اللہ علیہ علم ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے' علم ہی کے دائرے میں زیست بسر کی تھی اور تمام عمر کے جمع شدہ سرمایہ علم کو اس فراخدلی سے لٹا رہے تھے کہ سخاوت و کرم کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہو رہا تھا۔

پھر وہ لمحہ بھی آیا جب نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت نے اختتام مجلس سے کچھ دیر قبل اس موضوع پر آخری سوال کیا۔

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان نے مذکورہ سوال کے تمام رموز و نکات کی وضاحت کی اور پھر چند لمحوں کے لئے سکوت اختیار کر لیا۔ اہل مجلس منتظر تھے کہ امام رحمتہ اللہ علیہ اس ذیل میں ابھی مزید تشریح پیش کریں گے۔ مگر جب آپ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت سے مخاطب ہوئے تو دیوار و در پر سناٹا چھا گیا اور حاضرین حیرت زدہ رہ گئے۔ عجیب جرأت گفتار تھی اور عجیب حقیقت بیانی تھی جس نے اپنے بعد آنے والوں کے لئے بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کا نیا معیار قائم کر دیا تھا۔

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد جلیل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ابو حنیفہ! تو نے مجھے خالی کر دیا۔''

اس روایت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے ''ابو حنیفہ'' کی کنیت اختیار کر لی تھی۔



''نعمان'' کی وضاحت

اب اہل کوفہ آہستہ آہستہ آپ کا خاندانی نام بھولتے جا رہے تھے اور لوگوں کی زبانیں اس نئے نام سے آشنا ہوتی جا رہی تھیں' جسے مستقبل میں شہرت دوام حاصل ہونے والی تھی۔ بے شک! ''ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ'' کے نام میں بڑی وسعت و ہمہ گیری ہے مگر نعمان رحمتہ اللہ علیہ بھی اپنی معنویت کے اعتبار سے ایک عجیب و غریب نام ہے۔

''ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ'' کا مفہوم ہے صاحب ملت حنیفہ۔ یعنی باطل مذہبوں سے گریز کر کے دین حق کو اختیار کرنے والا۔''

اور ''نعمان'' کے بارے میں علامہ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے عجیب و غریب علمی بحث کی ہے۔ علامہ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''نعمان، لغت میں اس خون کو کہتے ہیں جس پر بدن کا تمام ڈھانچہ قائم ہوتا ہے جس کے ذریعے ایک ایک عضو حرکت کرتا ہے اور زندگی پاتا ہے۔ علامہ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اس قول کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی دستور اسلامی کے لئے ایک محور ہے اور تمام عبادات و معاملات کے احکام کو سمجھنے کے لئے روح کا درجہ رکھتی ہے۔''

آگے چل کر علامہ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے ''لفظ نعمان'' کی مزید وضاحت کی ہے علامہ فرماتے ہیں۔ نعمان سرخ اور خوشبودار گھاس کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نتیجتاً امام رحمتہ اللہ علیہ کے اجتہاد سے بھی اسلامی فقہ اطراف عالم میں مہک اٹھی ہے۔ بہر حال وہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ ہوں یا ابو حنیفہ، یہ دونوں اسمائے گرامی اس مرد عظیم کے حوالے ہیں جس نے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے زیر سایہ ''فقہ'' کی تربیت پائی وہ بارگاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں بہت دیر سے داخل ہوا مگر اس نے اپنی یادگار ذہانت کے سہارے ''تقدیم و تاخیر'' کے تمام کلیات الٹ دیئے اور سارے قوانین کو زیروزبر کر دیا۔ اس نے ثابت کیا کہ جس انسان کی ذات پر رحمت ذوالجلال سایہ فگن ہو وہ لمحوں میں برسوں کا اور برسوں میں صدیوں کا سفر طے کر سکتا ہے۔ وہ آیا تو پھر آنے ہی کے لئے آیا۔ اس طرح آیا کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی محبتوں کا مرکز بن گیا۔ ایسا مرکز جسے امام رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہیں ہمہ وقت ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ پھر اس نے کتاب علم کیا تو ہر نکتہ، ہر رمز اپنی سماعت میں منتقل کر لیا۔ فکر و عمل کی روشنی کو اپنے دل و دماغ میں جذب کر لیا۔ یہاں تک کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بے ساختہ پکار اٹھے۔

''ابو حنیفہ! تو نے مجھے خالی کر دیا۔'' اہل نظر غور کریں تو یہ بڑی سند ہے۔ تاریخ میں شاید ہی ایسی کوئی سند نظر آئے کہ علم کا سمندر خشک ہونے لگے اور طلب رکھنے والے کے ہونٹوں پر پیاس کے گہرے نشانات موجود ہوں۔ ممکن ہے کہ تحقیق کرنے والے ایسی چند مثالیں تلاش بھی کر لیں، مگر ڈھونڈنے والے یہ ادا کہاں ڈھونڈیں گے کہ سمندر خود پکار کر کہے۔

''اے تشنہ لب! میرا ایک ایک قطرہ آب ختم ہوا، میں تیری پیاس کس طرح بجھاؤں؟'' اگر لوگ سمجھنا چاہیں تو سمجھ لیں کہ سمندر کا اعتراف عجیب اعتراف ہے، سمندر تو سمندر، شبنم بھی اپنے قحط آب کا اقرار نہیں کرتی پھر یہ کیسا اعتراف تھا؟ اگر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے ادا ہونے والے چند الفاظ پوری سچائی کے ساتھ ذہنوں پر منکشف ہو جائیں تو دنیا کا ہر شخص جان لے کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کون تھے...... اور ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کس ذات گرامی کا نام تھا؟

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان نے کوفے کے ایک نوجوان تاجر کو یہ سند یونہی عطا نہیں کی تھی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ کی روشن آنکھیں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پیکر میں روشنی کے بلند ترین مینار کو طلوع ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

استاد گرامی سے پہلا اور آخری اختلاف

یہ شاگردی کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے

کسی سفر میں ساتھ چلنے کے لئے کہا آپ استاد گرامی کے حکم کی تعمیل میں فوراً آمادہ ہو گئے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس سفر میں دیگر فقہائے کرام بھی شریک تھے۔ یہ سفر نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد شروع ہوا تھا۔ ابھی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اور آپ کے دوسرے رفقائے سفر منزل پر نہیں پہنچے تھے کہ راستے میں ہی عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے تمام ساتھیوں سے نماز ادا کرنے کے لئے کہا۔

جواب میں کچھ لوگوں نے پانی میسر نہ ہونے کا عذر پیش کیا۔ ان افراد میں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے ان لوگوں کا عذر قبول نہیں کیا اور یہ فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اگر پانی میسر نہیں تو پھر تیمم کر کے نماز ادا کر لی جائے۔''

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد سنتے ہی تمام افراد نے تیمم کیا اور نماز کے لئے تیار ہو گئے پھر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھا۔ آپ خاموش کھڑے تھے۔

''ابو حنیفہ! کیا تم نماز ادا نہیں کرو گے؟'' حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں نماز ادا کرنا چاہتا ہوں مگر وضو کے لئے پانی دستیاب نہیں۔''

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں نے تیمم کر لیا اور دوسرے افراد نے بھی یہی روش اختیار کی پھر تمہیں کون سی چیز نماز کی ادائیگی سے روک رہی ہے؟'' حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی نرمی اور شفقت کے ساتھ اپنے نوجوان شاگرد سے سوال کیا۔

''میں آپ کے فکری اجتہاد سے گریزاں ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا' مگر میرے نزدیک یہ بات زیادہ مستحسن ہے کہ آدمی پانی ملنے کی امید میں نماز کو مؤخر کر دے۔'' ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے پہلی بار استاد گرامی کے فیصلے سے اختلاف کیا تھا' مگر اس طرح کہ جب آپ گفتگو کر رہے تھے تو آواز بہت آہستہ تھی اور سر عقیدت سے خم تھا۔

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر مزید کوئی سوال نہیں کیا اور نہایت خوش دلی کے ساتھ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ بالآخر نماز ختم ہوئی اور سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم فقیہ کو ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی رائے پر کوئی اعتراض نہیں تھا' مگر شرکائے سفر نے نوجوان طالب علم کے فیصلے کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ لوگ جو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی شاگردی پر نازاں تھے' انہیں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے طرز عمل سے بڑی شکایت تھی۔ وہ پہلے ہی اس بات سے ناخوش تھے کہ ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کم عمری کے باوجود حلقہ درس میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اب ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس اختلافی مسئلے نے دبے ہوئے جذبات میں شدت پیدا کر دی تھی اور وہ لوگ آپ کو غیر فرمانبردار شاگردوں کی صف میں کھڑا کر کے عجیب عجیب باتیں سوچ رہے تھے۔

بعض نے زیر لب یہ بھی کہا کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی ناز برداریوں کے سبب ابو حنیفہ سرکش و مغرور ہو گئے ہیں۔ ان کے نزدیک ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ عمل ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی لوگوں کے ان جذبوں سے باخبر تھے لیکن آپ نے اپنے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ استاد گرامی کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

ابھی فقہا کی اس جماعت نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اتفاق سے ایک مقام پر پانی نظر آ گیا۔ ابو حنیفہ

رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے اجازت طلب کی اور وضو کرنے کے لئے تشریف لے گئے پھر آپ نے تنہا نماز ادا کی۔ اس دوران تمام لوگوں کی نظریں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر مرکوز رہیں۔ دیکھنے والے آپ کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے مگر ان سب کا زاویہ نگاہ یکساں تھا۔ یعنی ایک نوجوان طالب علم کو اس قدر بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ دوسرے الفاظ میں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی روش قابل گرفت تھی۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بھی اپنے شاگرد کے قیام و سجود کا مشاہدہ کر رہے تھے لیکن اس طرح کہ آپ کے چہرہ مبارک پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا تھا۔

جیسے ہی ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نماز ختم کی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی پر جلال آواز گونجی۔ ''ابو حنیفہ! تمہارا اجتہاد لائق ستائش ہے۔'' پھر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت پر جوش آواز میں فرمایا۔ ''اگر دوران سفر ایسی ہی صورت حال پیش آ جائے تو لوگوں کو ابو حنیفہ کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔'' امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد جلیل کو ایک اور سند عطا کر دی تھی۔

ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ استاد گرامی کا یہ حسن سلوک دیکھ کر اشک بار ہو گئے۔ تمام مستند روایات گواہ ہیں کہ ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی پوری زندگی میں حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے یہ پہلا اختلاف کیا تھا اس کے بعد دم آخر تک کبھی استاد کے سامنے لب کشا نہیں ہوئے۔ بعض تنگ نظر حضرات نے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس اختلاف کو گستاخانہ رنگ دینے کی کوشش کی ہے مگر وہ لوگ اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عظمت کے اسرار اہل دنیا پر کس طرح ظاہر ہوتے۔ یہ قدرت خداوندی کی کرشمہ سازی ہی تھی کہ ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ذہن کو کشادہ کیا اور پھر آپ کے طرز فکر کی صداقت کے لئے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم فقیہ کی گواہی فراہم کی۔ تعصب و حسد کا شکار ہونے والے اس واقعے کی کوئی توجیہ پیش کریں مگر سچ تو یہ ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ذہن میں کسی نمود و نمائش کا شائبہ تک نہ تھا وہ ایک سوچ تھی' ایک اجتہاد تھا جس پر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے انتہائی فراخدلی کے ساتھ اپنی شہادت پیش کی اور امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت' بڑی شہادت ہے۔

احترام استاد کی ایک عجیب مثال

ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ اختلاف اپنی تسکین نفسی کے لئے نہیں تھا۔ آپ اول و آخر خدا کی رضا مندی کے لئے فقہی مسائل میں تدبر کرتے تھے اور جس بات کو حق سمجھتے تھے پوری دیانت داری اور بے باکی کے ساتھ بیان کر دیا کرتے تھے۔ جو لوگ اس واقعے سے استاد کے عدم احترام کا جواز پیش کرنا چاہتے ہیں ان کے ذہنوں کی کجی دور کرنے کے لئے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کی یہ روایت کافی ہے۔

حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایسی کوئی نماز نہیں پڑھی جس میں اپنے والدین کے ساتھ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اور تمام اساتذہ کے لئے دعائے مغفرت نہ کی ہو۔

اور پھر ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس طرز عمل پر تو استاد کا احترام ختم ہے کہ آپ جب تک زندہ رہے اس وقت تک امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے مکان کی طرف پاؤں پھیلا کر نہیں سوئے۔

اگر کبھی کسی شخص نے آپ سے اس کا سبب پوچھ لیا تو انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "ابوحنیفہ کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ وہ استاد گرامی کی شان میں کسی گستاخی کا مرتکب ہو۔"

استاد کے مکان کی طرف پاؤں پھیلانے کے عمل کو گستاخی سے تعبیر کرنا' دراصل ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی کے شایان شان تھا۔ آپ جس طرح حدیث وقرآن کے رموز ونکات پر غور فرماتے تھے' اسی طرح آپ کی فطرت حساس انسانی کردار کی بلندیوں سے بھی ہم کنار رہتی تھی۔ مثال کے طور پر حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ ہمیشہ مدینہ منورہ میں برہنہ پا رہتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ سے اس کی وجہ دریافت کرتا تو امام رحمتہ اللہ علیہ اشکباری کی حالت میں فرماتے۔

"پتا نہیں کہ مدینے کی سرزمین پر کہاں کہاں میرے آقا کے قدم پڑے ہیں۔ غلام نہیں چاہتا کہ اس کے جوتوں سے وہ "مقدس نشانات" آلودہ ہو جائیں۔"

ہزاروں فقہا اور محدثین کا قافلہ مدینہ رسول ﷺ سے گزرا ہوگا۔ کیا یہ تمام مردان جلیل "دیار نبی ﷺ" کے تقدس سے واقف نہیں تھے۔ یقیناً باخبر تھے اور ان سے زیادہ کون آگاہ ہوگا۔ مگر امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے سوا تاریخ کے اوراق کسی محدث کے بارے میں یہ شہادت پیش نہیں کرتے۔ پھر امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا یہ جذبہ کیا تھا؟ عشق کے سوا اسے اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا اپنا سارا مال ومتاع حضور اکرم ﷺ کے پائے اقدس پر رکھ دینا اور نہایت فخر کے ساتھ یہ اعلان کرنا کہ ؎

صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسول ﷺ بس

حضرت عمر فاروقؓ کا "غزوہ احد" میں رسالت مآب ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر تلوار توڑ دینا۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ کے وصال کے موقع پر کچھ دیر کے لئے ذہنی عدم توازن کا شکار ہو جانا اور شمشیر کھینچ کر علی الاعلان کہنا کہ "خدا کے آخری پیغمبر کو موت کے ہاتھ کبھی نہیں چھو سکتے۔ جو یہ کہے گا کہ سرور کونین ﷺ کو موت آ گئی میں اس کی زبان اس کے دہن سے جدا کر دوں گا۔"

حضرت علیؓ کا موت کے خوف سے بے نیاز ہو کر بستر رسول ﷺ پر سو جانا۔

حضرت عثمان غنیؓ کا انتہائی پر آشوب حالات میں اپنے جسم پر قبائے خلافت کو سجائے رکھنا کہ حالت خواب میں سرکار دو عالم ﷺ نے آپ کو یہی حکم دیا تھا۔

غزوہ احد میں تیروں کی بارش کے دوران حضرت ابودجانہؓ کا اپنے جسم کو دیوار بنا دینا کہ رسالت مآب ﷺ کے جسد اطہر پر کوئی خراش نہ آئے۔

حضور کی شان میں گستاخانہ کلمات ادا کرنے پر حضرت معاذ بن جبلؓ کا اپنے باپ کو قتل کر دینا۔

حضرت بلالؓ بن رباح کا برہنہ پشت جلتے ہوئے ریت پر کھینچے جانا اور بدن کی چربی سے انگاروں کا بجھ جانا۔

حضرت خبیبؓ کا اس جرم میں شہید ہو جانا کہ آپ اپنے آقا ﷺ کے بارے میں بے ادبی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہ سب عشق کے مختلف مدارج ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی منزل عشق کے مسافر تھے۔ اسی لئے آپ کو یہ

گوارہ نہیں تھا کہ استاد گرامی کے مکان کی طرف پاؤں کر کے بے ادبی کے مرتکب ہوتے۔ حالانکہ دوسرے فقہا اور محدثین کے نزدیک یہ فعل گستاخی کے دائرے میں نہیں آتا۔ دراصل عشق کا اپنا ایک مزاج ہے اور اس مزاج کو ناپنے کے لئے ''اصول وقانون'' کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ بس

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ اپنے فرزند کا نام بھی ''حماد'' رکھا یہ عقیدت کے اظہار کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے مگر اس میں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ جذبہ بھی پوشیدہ تھا کہ دنیا کی محبوب ترین شے کو بھی استاد ہی کے نام سے نسبت ہو۔ ''بیٹے'' کی محبوبیت سے کون انکار کر سکتا ہے' لیکن حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے اس محبوب کی شکل میں بھی استاد گرامی ہی کا عکس دیکھنا چاہتے تھے۔

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ ایک عظیم وجلیل فقیہہ تھے۔ اگر شاگردی کا رشتہ نہ ہوتا تب بھی ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ان کے احترام میں کھڑے ہونے کے لئے مجبور تھے۔ تاریخ کے دامن میں تو ایک ایسا واقعہ بھی محفوظ ہے جب ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک خاکروب کے احترام میں اپنی نشست سے اٹھ جاتے تھے اور علی الاعلان فرمایا کرتے تھے۔

''یہ شخص ایک مسئلے کے حل کرنے میں میرا استاد ہے۔''

پھر ان روشن دلائل کے بعد یہ کس کی جرأت ہے کہ وہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اختلاف رائے کو بے ادبی قرار دے سکے۔

مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ کے دروازے ہر خاص و عام پر کھلے ہوئے تھے اور اہل کوفہ دن رات ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نکتہ آفرینیوں کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

پھر یہ بات سارے شہر میں عام ہوگئی کہ ریشمی کپڑے کے ایک تاجر کے سامنے بڑے ذکی وفہیم افراد عاجز رہ جاتے ہیں۔ حاسدین ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی اس شہرت کو برداشت نہ کر سکے۔ کہنے والوں نے بڑی دریدہ دہنی کے ساتھ کہا۔

''ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا علم سے کیا رشتہ ہے؟ وہ تاجر ہیں' محض ایک تاجر۔''

جواب دینے والوں نے جواب دیا کہ علم کسی کی میراث نہیں جس کا ذوق طلب جتنا شدید ہوگا اسے اتنی ہی سربلندی حاصل ہوگی۔ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی علم کی طلب میں دنیاوی سود وزیاں سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اب علم ہی ان کا سرمایہ ہے اور علم ہی اعلیٰ نسبی کی پہچان۔

جھٹلانے والے نے اپنی تنگ دلی کے سبب اس دلیل کو بھی جھٹلا دیا۔ وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذہانت اور فکرو نظر کی گہرائی کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے اعتراضات کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو غلام کہہ کر اپنی کثافت نفسی کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ جب غلام ثابت نہ کر پاتے تو عجمی کہہ کر اپنی برتری کا اظہار کرتے۔ پھر علم کے راستے میں عرب وعجم کی حیثیت باقی نہ رہتی تو ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر قیاس اور رائے کا الزام عائد کر کے قرآن وسنت سے گریزاں ہونے کی تہمت تراشتے۔ مگر علم کی منزل کے مسافر نے طعنہ زن افراد کی طرف ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی یہ بے مثال قوت برداشت مخالفین پر ایک تازیانہ عبرت تھی لیکن وہ کم

نگاہی کے اسیر، اس تازیانے کی ضرب کو محسوس نہ کر سکے۔

پھر یوں بھی ہوا کہ بے شمار لوگوں کو اس روشن قندیل کے سامنے اپنی مومی شمعیں دھواں دھواں نظر آنے لگیں۔ جن کے علم کی اساس خود پرستی پر قائم تھی۔ وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازی سے ڈرنے لگے۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اس خوف و دہشت نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف دنیا پرست علما کا ایک محاذ قائم کر دیا۔ سیاسی ناہمواریوں کے سبب اس وقت کوفے میں خارجیوں کا ایک گروہ بہت زیادہ طاقت پکڑ گیا تھا۔ جب ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تو یہ خارجی اپنا صبر و قرار کھو بیٹھے۔ انہیں اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اس نوجوان کی اثر انگیزی کا یہی عالم رہا تو پھر عوام الناس کے عقائد کی عمارت میں گہرا شگاف نہیں ڈالا جا سکے گا۔ دراصل خارجیوں کی زندگی کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ لوگوں کی اکثریت کو اسلام کی روح سے بے خبر کر دیا جائے۔ پھر اس تن مردہ کی تقسیم سہل تر ہو جائے گی۔ خارجیوں کی یہ جماعت اپنے ظاہری عقائد کے اعتبار سے مسلمانوں کی بہترین جماعت نظر آتی تھی، لیکن در پردہ اس کے تمام نمائندے گمراہ تھے۔ جن کے شر انگیز سلوک سے صحابہ کرامؓ تک محفوظ نہیں تھے۔

علم کلام کے پرستار بھی اسی گروہ مفسدین کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ لوگ عقل کو معیار بنا کر خدا اور رسول ﷺ کے بارے میں ایسی فلسفیانہ گفتگو کرتے تھے کہ انسانی ذہن الجھ کر رہ جائے۔ پھر یہ الجھن اسے مذہب سے باغی بنا دے یا کم سے کم شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے۔ علم کلام کے ماہرین کے دلائل اس قدر پیچیدہ ہوتے کہ عام انسان ان کا جواب دینے سے قاصر رہتا۔ یہاں تک کہ دل کی گہرائیوں سے وسوسے ابھرتے اور پھر عقائد کی مضبوط دیواریں لرزنے لگتیں۔ بے شک اس وقت کوفے میں بڑے بڑے محدثین کا اجتماع تھا۔ ان کے علم کی وسعت و گہرائی بھی قابل دید تھی اور کردار بھی اس قدر بے داغ تھا کہ بدترین دشمن کو بھی انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی مگر جب شرپسندوں کی جماعت ان مردان کامل میں کوئی عیب تلاش نہ کر سکی اور عوام الناس کو ان کی طرف رجوع ہونے سے نہ روکا جا سکا تو پھر شاہراہوں پر عقل و منطق کے قد آور بت نصب کیے گئے۔ لوگوں نے ان مجسموں کو بغور دیکھا۔ اصنام خرد کے نقش و نگار کو دلائل کے شوخ اور گہرے رنگ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ یہ تمام مجسمے علم کلام کی اصطلاحات میں گفتگو کرتے تھے۔ ان بتوں کے لہجے اس قدر عجیب ہوتے تھے کہ سننے والا متزلزل ہو کر رہ جاتا تھا۔ پھر وہ سادہ لوح انسان پلٹ کر اپنے علما کی جانب جواب طلب نظروں سے دیکھتا تھا۔ علما اپنی تحقیق و جستجو میں مکمل تھے مگر وہ علم کلام کے حملہ آوروں سے اس طرح جنگ نہیں کر سکتے تھے کہ مخلوق خدا مذہب و عقل دونوں کے حصار میں رہ کر مطمئن ہو جاتی۔ عوام الناس چاہتے تھے کہ ان کے مذہبی پیشوا فتنہ پردازوں کے گروہ کو منطقی استدلال کے ہتھیاروں سے سر راہ ذبح کر دیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ عالم ظاہری میں بھی اپنے یقین کو مجسم دیکھنا چاہتی ہے۔ علم کلام کے ماہرین انسانی فطرت کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان کاموں کے لئے بڑی بڑی پرشکوہ محفلیں سجائی گئی تھیں، بڑے بڑے ماہر لسانیات جمع کیے گئے تھے اور ان لوگوں کی خدمات مستعار لی گئی تھیں جو بڑے شعلہ بیان تھے اور جنہیں اپنے عقائد فروخت کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اہل کلام کا طرز گفتگو بڑا بے حجابانہ ہوتا تھا۔ خدا اور رسول ﷺ کا ذکر اس طرح کرتے تھے کہ معاذ اللہ جیسے ان کا درجہ زیادہ سے زیادہ کسی امیر کے برابر ہو۔

علم کلام کی ایک مجلس کا احوال

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ ایک محفل مناظرہ میں شریک تھے۔آپ نے بڑی اذیت وکرب کے ساتھ فرمایا۔"لوگو! میں نے جابر جعفی کی زبان سے ایسی گفتگو سنی ہے کہ میں اس کے بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ جب وہ مذہب واخلاق کی تمام قیود کو توڑ کر گفتگو کر رہا تھا تو میں خوف سے لرز گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ کہیں مکان کی چھت نہ پھٹ جائے اور میں اس کے ملبے میں دب کر نہ رہ جاؤں۔" حضرت امام سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ کے بیان کردہ اس واقعے سے ایک عام انسان بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ اہل کلام مذہب کے سلسلے میں کس نقطۂ نظر کے حامل تھے۔شاید زمین پر ان کا وجود اسی لئے برقرار تھا کہ وہ عام مسلمانوں کے دلوں میں شبہات کی فصل بوتے رہیں اور جب یہ فصل تیار ہو جائے تو اپنی آنکھوں سے عام گمراہی کا تماشا دیکھیں۔

اس کے برعکس خارجیوں کی جماعت اپنے عقائد میں انتہا سے زیادہ متشدد تھی۔ گردش وقت کے سبب ان کے ہاتھوں میں دولت اور طاقت بھی منتقل ہو گئی تھی۔ یہ گروہ اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "مشرک و کافر" سمجھتا تھا۔خارجیوں کی عام عادت تھی کہ وہ اپنے عقائد کی تبلیغ شمشیر کے ذریعے کرتے تھے۔ اکثر مواقع پر یہ لوگ جمع ہو کر درس گاہوں میں داخل ہوتے اور اپنی تلواریں بے نیام کر کے فضا میں لہراتے' پھر سادہ دل مسلمانوں سے مطالبہ کرتے کہ وہ اپنے عقائد بیان کریں۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ خارجیوں کی جماعت صحیح العقیدہ مسلمان کو قتل کر دیتی غرض کچھ حلقوں میں اسلام کے نام پر گمراہی کا عجیب بازار گرم تھا۔

وہ معتزلہ ہوں یا خارجی' دونوں طبقے اس بات سے مطمئن تھے کہ ان کے پھیلائے ہوئے ہوش وخرد کے جال ایک نہ ایک دن عام مسلمانوں کو اسیر کر لیں گے اور پھر نفاق کا وہ منصوبہ تکمیل تک پہنچ جائے گا جس کے پس پردہ غیر اسلامی قوتیں کارفرما تھیں۔ مفسدین کے یہ گروہ انتہائی طمانیت قلب کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ ان کی طمانیت کا ایک ہی سبب تھا کہ ان پیچیدہ عقلی دلائل کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا پھر ان کے اطمینان کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ خلاف بنوامیہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے بعد ایک بار پھر پرانی روش اختیار کر چکی تھی۔ فرمانرواؤں کو اس کے سوا کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اپنی حکومت کے خفیہ دشمنوں کی پناہ گاہیں تلاش کریں اور پھر انہیں اقتدار کے ذریعے نفرت وغضب کی آگ میں جلا کر خاکستر کر ڈالیں۔ کسی حکمران کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ مذہب کی حالت زبوں دیکھے' فتنہ گروں کے دماغوں میں پرورش پانے والے منصوبوں کو پڑھے اور اسلام کی بیخ کنی کرنے کے لئے بلند ہوتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھے۔ ایک بااختیار خلیفہ اس بات کی طاقت رکھتا تھا کہ وہ مفسدین کی چند جماعتوں کو تہ تیغ کر کے افق مذہب پر چھانے والے گھرے سیاہ بادلوں کو ہمیشہ کے لئے ہٹا دے۔ مگر صد حیف' ایسا نہ ہو سکا باطل عقائد رکھنے والے بڑے شاطر تھے۔ انہوں نے بے عمل حکمرانوں کی شان میں مسلسل قصائد پڑھ کر اپنا اعتبار قائم کر لیا تھا۔ وہی چند لوگ سب سے بڑے بہی خواہان سلطنت ٹھہرے تھے جو مطلق العنان شہنشاہیت کو خلافت کا نام دے کر اپنے اغراض ومقاصد حاصل کرتے رہتے تھے۔ ان کی خوشامدیں اور چاپلوسیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ بعض خلفاء بھی ان کے تراشے ہوئے شیشوں میں اپنے جسم وجان کے ساتھ اتر گئے تھے۔ تاریخ کے

پس منظر میں یہی وہ اسباب تھے جن کی بناء پر فتنہ پردازوں کو کئی اعتبار سے مکمل آزادیاں حاصل تھیں۔

ہاں! وہ ایک ہی مردِ جلیل تھا کہ جس کے سوا دو سالہ دورِ حکومت میں ان تخریب کاروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ نے تائید غیبی کے سہارے وقت کے بہتے ہوئے سرکش دھارے کو روک دیا تھا۔ جب خلیفہ راشد مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو جدید سیاست کی زبان میں یہی فریب کار جماعتیں زیرِ زمین چلی گئی تھیں۔ پھر جب خدا نے زمین پر حجت قائم کر کے اپنے اس پسندیدہ بندے کو واپس بلا لیا تو سارے خارجی اور تمام معتزلہ چہرے بدل بدل کر اسلامی معاشرے میں پھیل گئے۔ یہاں تک کہ خلیفہ وقت بھی ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا اور مذہب میں نئے نئے فتنے سر ابھارنے لگے۔

شمشیروں کے سائے میں پہلا مناظرہ

جب محدود عقل کو بنیاد بنا کر اہل کلام نے عقائد پر مشق ستم شروع کی تو خالق کائنات نے حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو پیدا کیا۔ اس وقت پورا عراق مناظروں کی زد میں تھا۔ اتفاق سے ابتداء میں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اہل کلام سے ایک خاص تاثر قبول کیا اور ان مجلسوں میں شریک ہونے لگے جہاں صرف منطق و استدلال کو درجہ اعتبار حاصل تھا۔ اہل کلام بہت خوش تھے کہ ان کی صفوں میں دنیا کا ذہین ترین نوجوان شامل ہو گیا تھا۔ پھر یکایک ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طبیعت میں انقلاب برپا ہوا تو آپ کے مضطرب قدم بارگاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ کی طرف اٹھ گئے۔ اہل کلام غمگین نظر آنے لگے تھے کہ ان کا ایک نکتہ آفریں ساتھی بچھڑ گیا تھا۔

پھر جب حلقہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا شور بلند ہوا تو عقلیت پرستوں پر قیامت ٹوٹ پڑی، خارجیوں کی نیندیں حرام ہو گئیں اور معتزلہ کا صبر و قرار چھن گیا۔ اب ہوش و خرد کے تراشے ہوئے بتوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے کا وقت آ گیا تھا۔ کسی خارجی نے اپنے گروہ کو اس نئے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ابو حنیفہ کا علم ہمارے لئے سامان موت ہے۔ اگر اسے مناظرے کے دوران عاجز نہیں کیا گیا تو ہماری تحریک مر جائے گی۔"

دوسرے خارجی نے جواباً کہا۔ "ابو حنیفہ ذہین ہے مگر ہمارے علم تک اس کی رسائی نہیں۔ ہم اسے اپنے دلائل سے شکست دیں گے۔ ایسے سوالات اٹھائیں گے کہ وہ بہر حال ان کا جواب دینے سے قاصر رہے گا۔"

بالآخر منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ خارجیوں کی ایک جماعت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آئی۔ آپ نے اپنی فطری ذہانت سے سمجھ لیا کہ یہ شر پسند ہیں اور ان کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔

پھر ایک خارجی آگے بڑھا جو عمر کے اعتبار سے بوڑھا اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے بہت زیادہ زمانہ شناس معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں، کیا تمہارا علم مجھے اور میری جماعت کو مطمئن کر سکے گا؟"

"میں مسائل کا مشکل کشا نہیں۔" حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔ "میری حیثیت اسلامی فقہ کے ایک طالب علم کی ہے پھر بھی میری یہی کوشش ہو گی کہ کسی طرح تم لوگ اطمینان قلب حاصل کر سکو۔ اس وضاحت کے بعد اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو اپنا مسئلہ بیان کرو میں اپنے علم کی حد تک جواب دینے کی کوشش

کروں گا۔"

بوڑھے خارجی نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے عاجزانہ لہجے کو آپ کی جھجک اور کم علمی سے تعبیر کیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ کوفے کا یہ نوجوان اس مسئلے کا جواب نہ دے سکے گا اور انجام کار حماد رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد کی شہرت میں کمی آ جائے گی۔ اپنے ذہن کو تسلیاں دینے کے بعد بوڑھے خارجی نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے کہا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کے دروازے پر دو جنازے رکھے ہوئے ہیں' ان میں سے ایک جنازہ ایک ایسے شرابی انسان کا ہے جو شب و روز شراب پیتا تھا۔ کثرت بادہ نوشی نے اس کی صحت تباہ کر ڈالی پھر ایک دن وہ شراب پی رہا تھا کہ اچانک سانس گھٹ جانے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ دوسرا جنازہ اس عورت کا ہے جو بدکاری کی مرتکب ہوئی پھر کچھ دن بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے رسوائی کے خوف سے خودکشی کر لی۔ اب تم بتاؤ کہ وہ دوزخ میں داخل ہوں گے یا جنت ان کا مقام ہو گا؟"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بوڑھے خارجی کے بیان کردہ مسئلے کو بغور سنتے رہے پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد آپ نے اس سے پوچھا۔ "ان دونوں مرنے والوں کا تعلق کس مذہب سے تھا؟"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا سوال سن کر بوڑھا خارجی خاموش رہا۔

"کیا مرنے والوں کا تعلق یہود سے تھا؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوسرا سوال کیا۔

"نہیں۔ وہ یہودیت سے کوئی رشتہ نہیں رکھتے تھے"۔ بوڑھے خارجی نے جواب دیا۔

"کیا وہ عقائد کے اعتبار سے عیسائی تھے؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے تیسری بار استفسار کیا۔

"نہیں۔ ان کا تعلق عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب سے بھی نہیں تھا۔" بوڑھے خارجی کے لہجے سے ناگواری کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"کیا موت سے دوچار ہونے والے مجوسیوں کا نظریۂ حیات رکھتے تھے؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے چوتھا سوال کیا۔

اب بوڑھا خارجی بری طرح جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اس نے اپنے چہرے سے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم مسئلے کا شرعی حل بتانے کے بجائے مجھے فروعی باتوں میں الجھا رہے ہو۔"

بوڑھے خارجی کی بات سن کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے انتہائی تحمل کے ساتھ فرمایا۔ "میرے سوالات ہرگز فضول نہیں ہیں۔ تم ایسے افراد کے بارے میں سوال کر رہے ہو جو دنیا سے گزر چکے ہیں۔

میں تفصیلات جانے بغیر مرنے والوں کے انجام کی نشان دہی نہیں کر سکتا پھر تمہارا یہ طرز عمل بھی آداب گفتگو کے خلاف ہے۔ عام علمی مباحث میں بھی غصے کا اظہار نہیں کیا جاتا' نہ کہ تم شرعی مسائل میں اپنے غضب کی نمائش کر رہے ہو۔ جب تک تم مجھے مرنے والوں کے مذہبی عقائد کے بارے میں نہیں بتاؤ گے اس وقت تک میں تمہارے پیش کردہ مسئلے کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔"

بوڑھا خارجی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس انداز کلام کو دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ مجبوراً اسے کہنا پڑا کہ وہ شرابی مرد اور گناہ گار عورت مجوسیوں کے عقائد سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔

"پھر آخر وہ دونوں اپنی زندگی میں کس مذہب پر قائم تھے؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بوڑھے خارجی

سے دریافت کیا۔

"لاالہ اللہ محمد رسول اللہ کہنے والی ملت سے تعلق رکھتے تھے۔" بوڑھے خارجی نے مرنے والوں کے عقائد کی وضاحت کی۔

"اچھا تم یہ بتاؤ کہ کلمہ طیبہ کی شہادت ایمان کا تیسرا حصہ ہے' چوتھا یا پانچواں؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس خارجی کی نئے انداز سے گرفت کی۔

"ایمان اجزاء میں تقسیم نہیں ہوسکتا۔" بوڑھا خارجی چراغ پا ہوگیا۔ "تم ایمان کو مختلف حصوں میں بانٹ کر مجھے الفاظ کی شعبدہ بازیوں میں الجھا رہے ہو۔ آخر شرعی مسائل کے جواب دینے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے خارجی کے لہجے کی تلخی کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم اس بات کی وضاحت کردو کہ ایمان کو شہادت سے کیا نسبت ہے؟"

"ہمارے نزدیک یہ شہادت' ایمان کامل ہے۔" بوڑھے خارجی کے چہرے پر غصے کا ہلکا سا رنگ اب بھی نمایاں تھا۔

"جب تم شہادت کو ایمان کامل تسلیم کرچکے تو پھر مرنے والوں کے بارے میں سوال کرنے کا کیا مطلب ہے؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"ابوحنیفہ! تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔" بوڑھے خارجی کی ناگواری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"میں اصولی بات کررہا ہوں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "جو لوگ خدا کی وحدانیت اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر گواہی دے چکے ان کے بارے میں پوچھنا ہی عبث ہے۔"

بوڑھا خارجی چند لمحوں تک خاموش رہا۔ وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے طرز استدلال سے خائف تھا۔ آخر کچھ دیر غور کرنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "یہ بحث ترک کرو اور ہمیں صرف اس بات کا جواب دو کہ وہ دونوں مرنے والے جنت میں جائیں گے یا ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا؟"

خارجی کا خیال تھا کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے باخبر انسان مرنے والوں کے انجام پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے تھے۔ یہی وہ نازک پہلو تھا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان شرپسندوں نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو لاجواب کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک فتنہ پرور جماعت کا کامیاب منصوبہ تھا' مگر جب خدا حضرت حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دستگیری و رہنمائی کررہا ہو تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ آپ جواب دینے سے عاجز رہ جاتے۔

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بوڑھے خارجی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم مجھ سے مرنے والوں کے حشر کے بارے میں پوچھتے ہو اور میں وہی الفاظ دہراتا ہوں جو حضرت ابراہیم علیہ والسلام نے ان سے بھی بڑی مجرم قوم کے بارے میں فرمائے تھے۔"

"جس نے میری اتباع کی' وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو اے خدا تو بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے خارجیوں کی جماعت پر ایک نگاہ کی اور پھر اس بوڑھے سے دوبارہ مخاطب

ہوئے۔ "تم مجھ سے ایک ایسے مرد کے بارے میں سوال کرتے ہو جو نشے کی حالت میں انتقال کر گیا اور تم ایک ایسی عورت کا انجام جاننا چاہتے ہو جس نے خودکشی کر لی۔ غور سے سنو! میں تمہیں حضرت عیسیٰؑ کی بات یاد دلاتا ہوں جو انہوں نے ایک بہت بڑی گناہ گار قوم کے حق میں کہی تھی۔"

"اگر آپ ان کو عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر بخش دیں تو آپ غالب حکمت والے ہیں۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے تیسری بار خارجیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں تمہیں وہی بات یاد دلاؤں گا جو حضرت نوح علیہ السلام نے علی الاعلان کہی تھی۔"

"جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ مجھ پر نہیں۔ ان کا حساب تو اللہ تعالیٰ پر ہے۔ وہ جو چاہے کرے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن کریم کے مختلف حوالوں سے خارجیوں پر اس حقیقت کو ظاہر کر دیا تھا کہ کلمہ طیبہ کی گواہی دینے والا اول و آخر مسلمان ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس خارجیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔ اب رہا مرنے والوں کے انجام کا سوال تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی روشن آیات تلاوت فرما دی تھیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو شرط ایمان کے ساتھ بدترین گناہ کرنے والوں کو معاف کر سکتا ہے اور اگر وہ انہیں اذیت ناک عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی تمام گفتگو اس قدر طاقت ور دلائل رکھتی تھی کہ خارجی بے دست و پا نظر آنے لگے اور پھر وہ شرمساری کے عالم میں سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔

بعض مؤرخین نے اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تقریباً ستر خارجی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مکان میں داخل ہوئے اور اپنی شمشیریں بے نیام کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر ان میں سے کچھ شرپسندوں نے چیخ کر کہا۔ "ابوحنیفہ! آج ہم تمہیں قتل کر ڈالیں گے۔"

"آخر تم لوگ مجھے کس گناہ کی پاداش میں قتل کرنا چاہتے ہو؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔

"تم گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار نہیں دیتے۔ اس لئے ہمارے نزدیک تمہارا قتل واجب ہے۔" خارجیوں کا لہجہ غضبناک تھا۔

"میں تمہارے ہاتھوں جان دینے کے لئے تیار ہوں مگر اس سے پہلے تم قرآن کریم سے اپنے دعویٰ کا کوئی ثبوت پیش کر دو۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے خارجیوں کی بے نیام شمشیروں کی چمک اور ان کے خوفناک تیوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

تمام خارجی کچھ دیر تک سوچتے رہے اور جب ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو ایک بوڑھا شخص چند قدم آگے آیا پھر اسی مردہ شرابی اور سیاہ کار عورت کا قصہ بیان کرنے لگا۔ بالآخر ایک طویل جرح کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے خارجیوں کے گروہ کو عاجز کر دیا اور ان شرپسندوں نے اپنی تلواریں نیام میں کر لیں۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دلائل سن کر خارجیوں کی وہ جماعت اپنے عقائد سے تائب ہو گئی تھی اور ان لوگوں نے اہل سنت کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ بہرحال یہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی غیر معمولی ذہانت اور نکتہ آفرینی ہی تھی کہ آپ کے سامنے بڑے سے بڑا گمراہ اور سرکش بھی حقیر و ناتواں اور بے زبان

نظر آتا تھا۔

تاریخ کا ایک اور گمراہ

اسی طرح ''جہمیہ'' فرقے کا بانی جہم بن صفوان بھی ایک بار حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور طویل بحث کے بعد اسے شکست ہوگئی تھی۔ اس تاریخی مناظرے کی تفصیلات رقم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جہم بن صفوان کی گمراہ شخصیت پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔ جہم بن صفوان قبیلہ بنی راسب کا غلام تھا۔ یہ سب سے پہلے خراسان میں ظاہر ہوا اور لوگوں کو اپنے تراشے ہوئے نئے مذہب کی دعوت دینے لگا۔ بنوامیہ کے آخری زمانے میں مسلم بن احوز مازنی نے اس گمراہ شخص کو قتل کیا۔

جہم بن صفوان کا عقیدہ تھا کہ جنت و دوزخ بالآخر فنا سے ہمکنار ہوں گے۔ کوئی چیز دائمی اور ابدی نہیں ہوتی۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ ایمان صرف معرفت کا نام ہے کفر جہل کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ اس نے ساری زندگی اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ خدا زندہ ہے۔ جہم بن صفوان کہا کرتا تھا کہ میں خدا کی ذات میں ان اوصاف کو شامل نہیں کرتا جن کا اطلاق حوادث پر ہو سکے۔

وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن ہے۔ یہ بھی جہم بن صفوان کے ذہن کی کجی تھی کہ وہ قرآن کو مخلوق سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ کی آخری کتاب مقدس فنا ہو جانے والی تھی۔ ویسے تو بے شمار لوگ جہم بن صفوان کے ہمنوا ہو گئے تھے مگر جن خیالات نے اسے زیادہ شہرت بخشی وہ نظریہ جبر تھا۔ جہم بن صفوان کہا کرتا تھا کہ انسان مجبور محض ہے' نہ اس کا کوئی ارادہ ہے' نہ قدرت ہے اور نہ فعل۔

یہی جہم بن صفوان ایک روز حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو حاضر ہوا اور آپ سے عرض کرنے لگا۔
''میں چند مسائل میں آپ سے تبادلہ خیالات کرنے حاضر ہوا ہوں۔''

''میرے لئے تمہارے ساتھ گفتگو کرنا بھی باعث شرم ہے۔'' اگرچہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فطرتاً نہایت شیریں کلام تھے لیکن جہم بن صفوان سے بات کرتے وقت آپ کا لہجہ انتہائی تلخ ہو گیا تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جہم بن صفوان کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم جن مسائل میں شب و روز مشغول رہتے ہو ان پر بحث کرنا بھی ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے۔''

جہم بن صفوان' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی تلخ گفتاری کے باوجود صبر و سکون کے ساتھ بیٹھا رہا اور اپنے چہرے سے ناگواری کا کوئی تاثر دیئے بغیر کہنے لگا۔ ''ابوحنیفہ! تم نے مجھ سے کبھی ملاقات نہیں کی اور ہم دونوں کے درمیان مذاکرات کا بھی کوئی موقع نہیں آیا۔ پھر تم نے میری گمراہیوں اور ہلاکت کا فیصلہ کس طرح کر دیا؟'' جہم بن صفوان شروع ہی سے اپنے دفاع کے لئے عجیب و غریب منطق پیش کر رہا تھا۔ اس نے عقلی استدلال کے طور پر اعتراض وارد کرنا چاہا مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ عقائد کے معاملات میں ایک تیغ بے نیام تھے جس کی کاٹ کو کوئی بے راہ رو انسان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''تمہارے جو اقوال مجھ تک پہنچے ہیں ان کو گناہ گار سے گناہ گار مسلمان کی زبان بھی ادا نہیں کر سکتی۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بے تعلقی کے ساتھ فرمایا۔ ''تمہارے نظریات سننے کے بعد مجھ جیسے انسان کے لئے بحث کی

کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔"

"ابوحنیفہ! اصولی طور پر تم سے ایک بنیادی غلطی سرزد ہو رہی ہے۔" اب کی بار جہم بن صفوان کا لہجہ طنز آمیز تھا۔ "تم نے آج تک مجھے اپنے روبرو نہیں دیکھا اور نہ میری زبان سے عقائد کی تشریحات سنیں۔ پھر میں تمہاری نگاہ میں کس طرح لعنت زدہ قرار پایا؟"

تمہارے متعلق یہ باتیں اطراف میں مشہور ہیں"۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی رائے پر سختی کے ساتھ قائم تھے۔" جب کسی شخص کے نظریات عوام میں اس قدر شہرت رکھتے ہوں تو پھر کسی دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا تھا اور آپ جہم بن صفوان سے مزید گفتگو کے لئے آمادہ نہیں تھے۔

وہ کج رو انسان کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بڑی شکستہ آواز میں بولا۔" ٹھیک ہے، میں اپنے نظریات کی تفصیل بیان نہیں کرتا مگر پھر بھی تم سے ایمان کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" جہم بن صفوان کی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رکھے۔

"کیا تم ابھی تک ایمان کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جہم بن صفوان سے پوچھا۔" تمہارے سوال کی نوعیت بتا رہی ہے کہ تمہیں اپنے ایمان کے سلسلے میں اطمینان قلب حاصل نہیں۔"

"یہ بات غلط ہے کہ میں حقیقت ایمان سے بے خبر ہوں۔" جہم بن صفوان نے پرزور الفاظ میں کہا۔" میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایمان کیا ہے مگر ایک معاملے میں اشتباہ کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے تمہارے ساتھ گفتگو کر کے اپنے اس شک کو دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایمان میں ذرا بھی شک کرنا سراسر کفر ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ایک بار پھر آپ نے جہم بن صفوان کے ساتھ گفتگو کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ بڑا شاطر و عیار تھا۔ اس نے اہل کلام کے انداز میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے ایک نئی دلیل پیش کی۔" تم جیسے باخبر انسان کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ مجھے کفر کی وجہ نہ بتاؤ۔ کافر قرار دینے کے بعد لازم ہے کہ اس کا کوئی ثبوت بھی پیش کیا جائے۔ جہم بن صفوان بڑی ذہانت سے مناظرے کی راہ ہموار کر رہا تھا۔

بالآخر وہ شر پسند اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مجبوراً فرمایا۔" پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ایک شخص دل سے خدا کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔" جہم بن صفوان نے کہنا شروع کیا۔" وہ شخص خدا کو اس کی ذات میں واحد تسلیم کرتا ہے۔ نیز صفات الٰہی سے بھی آشنا ہے۔ مگر ان باتوں کا اپنی زبان سے اقرار کئے بغیر انتقال کر جاتا ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ وہ شخص کفر پر مرا یا اس کی موت اسلام پر واقع ہوئی؟"

"میرے نزدیک مرنے والا شخص کافر ہے اور ایک کافر دوزخ کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ حاصل کر نہیں کر سکتا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔" جب تک کوئی شخص قلبی معرفت کے ساتھ زبانی طور پر گواہی نہ دے۔ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا۔"

"آخر وہ مومن کیوں نہیں؟ جب کہ اسے خدا کی معرفت اس طرح حاصل ہے کہ وہ اس کی تمام صفات کو بھی دل سے مانتا ہے۔" جہم بن صفوان نے جرح کے انداز میں کہا۔

''کیا تم قرآن پر ایمان رکھتے ہو؟'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جہم بن صفوان سے دریافت کیا۔ ''اگر کتاب مقدس پر تمہارا ایمان نہیں تو پھر میں تم سے اسی لہجے میں گفتگو کروں گا جو مخالفین اسلام کے لئے روا رکھا جاتا ہے۔''

''میں اللہ کی کتاب پر نہ صرف ایمان رکھتا ہوں بلکہ اسے حجت بھی تسلیم کرتا ہوں''۔ جہم بن صفوان نے جواباً کہا۔

''تو پھر غور سے سنو! حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی پر جلال آواز ابھری۔ ''اللہ نے قرآن حکیم میں ایمان کا تعلق انسان کے دو اعضاء سے وابستہ کیا ہے۔ ایک دل' دوسرے زبان۔'' یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے سورہ المائدہ کی یہ آیات تلاوت کیں۔

''جب وہ لوگ آیات قرآنی سنتے ہیں تو معرفت حق کے سبب ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ (علی الاعلان) کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لا چکے ہمیں حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ہم خدا اور اس کے نازل کردہ حق و صداقت کو نہ مانیں۔ ہم امیدوار ہیں کہ ہمارا خدا ہمیں نیک لوگوں کی جماعت میں داخل فرمائے گا۔ ان کے اس قول کی وجہ سے خدا نے انہیں بدلے میں جنت عطا فرمائی جس کے اندر نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور نیکی کرنے والوں کی یہی جزا ہے۔''

یہ آیات قرآنی تلاوت کرنے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جہم بن صفوان سے مخاطب ہوئے۔ ''تم نے دیکھا کہ خدا نے معرفت قلب اور زبانی اقرار کے سبب انہیں جنت کی بشارت دی اور مومن کا درجہ عطا فرمایا۔''

پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے سورہ الحج کی یہ آیت تلاوت کی۔ ''انہیں پاکیزہ قول (باتوں) کی ہدایت کی گئی۔''

اس کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے سورہ ''ابراہیم'' کی یہ آیت بہ آواز بلند پڑھی۔ ''اللہ تعالیٰ مومنوں کو دنیا اور آخرت میں قول محکم کی وجہ سے ثابت قدم رکھتا ہے۔''

بعد ازاں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے رسالت مآب ﷺ کی یہ حدیث مبارک بطور سند پیش کی۔ ''لا الٰہ الا اللہ کہہ دو فلاح پا جاؤ گے۔''

پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے سرور کونین ﷺ کی دوسری حدیث مقدس پیش کی۔ ''جو شخص زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دے اور وہ دل سے بھی اس پر ایمان رکھتا ہو تو وہ دوزخ سے نکل جائے گا۔''

ان احادیث مبارکہ کے حوالوں کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جہم بن صفوان سے فرمایا۔ ''خدا اور رسول ﷺ کے یہاں اقرار قلب کے ساتھ قول (زبان) کی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ جب تک یہ دونوں چیزیں شہادت کے ایک نقطے پر جمع نہیں ہوتیں اس وقت تک کسی شخص کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اگر صرف دل کا اقرار کافی ہوتا تو لوگ اپنی زبانیں خاموش رکھ کر ایمان کے حصار میں داخل ہو جاتے' لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے اور بالفرض تمہارے نزدیک محض دل کی معرفت ایمان کی تکمیل کے لئے کافی ہے تو پھر ابلیس کے انکار کو کس صف میں شامل کرو گے؟ شیطان کو مکمل طور پر اس حقیقت کا علم تھا کہ اللہ اپنی ذات میں واحد ہے' کائنات کا خالق ہے اور تمام جانداروں پر حیات و موت کا نظام مسلط کرنے والا ہے۔ پھر ابلیس رجیم کو کافروں کی قوم میں کیوں شمار کیا گیا؟''

جہم بن صفوان یہ روشن دلائل سن کر حیرت زدہ تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے چہرے پر نظر کی اور پھر سورہ ''النمل'' کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''یقین کرنے کے باوجود انہوں نے انکار کر دیا۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس آیت مقدسہ کی تشریح کرتے ہوئے جہم بن صفوان سے کہا۔ ''اللہ نے قرآن کریم میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے' وہ دل سے اس کی خدائی کا اعتراف کرتے تھے' مگر ان کی زبانیں حرف اقرار سے محروم تھیں۔ اس لئے معرفت قلب کے بعد بھی کافر ٹھہرے۔''

جہم بن صفوان کے چہرے پر آثار شکست نمایاں ہو چلے تھے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے سورہ ''یونس'' کی یہ آیات تلاوت فرمائیں۔ ''ان سے پوچھئے کہ تمہیں زمین و آسمان سے رزق کون بہم پہنچاتا ہے؟ یا کان اور آنکھیں کس کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ اور زندوں کو مردہ اور مردوں کو زندہ کون کرتا ہے؟ جملہ امور کس کے زیر تصرف ہیں۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ سب کچھ خدا کے قبضے میں ہے۔ پھر ان سے پوچھئے' تم خدا سے ڈرتے کیوں نہیں؟''

ان آیات کی تلاوت کے بعد ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جہم بن صفوان کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''زبانی اقرار کے بغیر ان کی معرفت قلبی قطعاً بے کار تھی۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے قرآن و حدیث سے اخذ کردہ دلائل ختم ہو چکے تھے اور جہم بن صفوان آپ کی بارگاہ جلیل میں نادم و پشیمان' سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد زبان سے اپنی شکست کا اعتراف کرنے لگا۔ ''ابوحنیفہ! تم نے میرے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ میں پھر لوٹ کر آؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے اعصاب پر شکست کا بار گراں لے کر چلا گیا۔

تاریخ کی گواہی موجود ہے کہ جہم بن صفوان اپنے وعدے کے مطابق واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ کئی سال تک حیران و پریشان پھرتا رہا۔ وہ اکثر لوگوں سے کہا کرتا تھا۔ ''ابوحنیفہ نے چند لمحوں میں میرے عقائد کے اس محل کو مسمار کر دیا' جسے میں نے زندگی بھر کی کاوشوں کے بعد تعمیر کیا تھا۔''

یہ سچ ہے کہ خدا نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ذریعے جہم بن صفوان کے ذہن کی تمام گرہیں کھول دی تھیں مگر آخری ہدایت اس کے مقدر میں نہ تھی یہاں تک کہ مسلم بن احوز مازنی کی شمشیر بے نیام ہوئی اور جہمیہ فرقے کا بانی اپنے خون فاسد میں نہا گیا۔ اگرچہ جہم بن صفوان کی جسمانی موت کئی سال بعد واقع ہوئی لیکن عقلی طور پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اسے بہت پہلے ہلاک کر چکے تھے۔

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر ایک نیا الزام

جہم بن صفوان کی شکست سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذہانت کے چرچے مزید عام ہوئے۔ اس ذیل میں یہ بڑی تلخ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ بعض صحیح العقیدہ مسلمان بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخالفت کے سبب اس بات کے منتظر تھے کہ مناظرے کے دوران کسی نہ کسی طرح جہم بن صفوان غالب آ جائے۔ اصولی طور پر عقائد کی ہم آہنگی کے باعث ان لوگوں کی دلی ہمدردیاں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ہونی چاہئے تھیں مگر نظر کی کمی، دل کی تنگی اور فطرت کے حسد نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ ایک بدعقیدہ انسان کو سربلند ہوتے ہوئے دیکھیں

اور اس مرد جلیل کی شکست کا نظارہ کریں جس کے سینے میں تمام ملت اسلامیہ کا درد آگ کی طرح روشن تھا۔ مگر یہ خواب وخیال کی باتیں ہیں۔ جب انسانی فطرت پستیوں میں اترتی ہے تو پھر کسی رشتے، کسی تعلق کا احساس باقی نہیں رہتا۔

لوگوں کا یہ کیسا اذیت ناک سلوک تھا کہ جہم بن صفوان کو برسر عام شکست فاش سے دوچار کرنے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مخالفین کی بدترین تنقید کا نشانہ بن گئے تھے۔ تاریخ نے اس روایت کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بعض مخالفین جو خوف خدا سے بے نیاز ہو چکے تھے، محفل محفل علی الاعلان کہا کرتے تھے۔

''کوفے کا یہ تاجر اپنے نظریات کے اعتبار سے جہمی ہے۔'' اس تشہیر کا مقصد صرف اتنا تھا کہ کسی نہ کسی عنوان حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو جہم بن صفوان کا ہم عقیدہ ثابت کیا جا سکے۔

اس ذیل میں حاسدین کی ایک جماعت نے تہمت طرازیوں کی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔ یہ لوگ ہم عقیدگی کے الزام سے آگے بڑھ کر کہا کرتے تھے کہ جہم بن صفوان نظریاتی لحاظ سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا رہنما تھا۔ مخالفت میں شدت پیدا کرنے کے لئے لوگ یہ کہنے سے بھی باز نہ رہ سکے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جہم بن صفوان کی تقلید کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دلائل میں رنگ آمیزی کرنے کے لئے یہ باتیں مشہور کر دی تھیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اکثر مجالس میں جہم بن صفوان کی اس طرح تعریف کیا کرتے تھے جیسے کسی حکمراں کی شان میں کوئی شخص قصیدہ پڑھ رہا ہو۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے فتنہ پردازوں نے چیخ چیخ کر یہ بھی کہا کہ جب جہم بن صفوان کسی محفل میں آتا تھا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ الزام تراشنے والوں نے دروغ گوئی کا افسانہ یوں بھی بیان کیا کہ جہم بن صفوان گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے اس کی لگام پکڑے ہوئے آگے آگے چلتے تھے۔ الغرض ان لوگوں نے اپنے بیانات میں اثر انگیزی پیدا کرنے کے لئے جھوٹ کے ایسے اصولوں کو اپنا لیا تھا جن کا تصور بھی کسی غیرت مند مسلمان کے لئے حرام ہے۔

اگر مخالفین کے خون میں صداقت اور غیرت کے چند ذرات بھی شامل ہوتے تو وہ اس مناظرے کو ضرور یاد رکھتے جب جہم بن صفوان کا پورا جسم عرق ندامت میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ ہذیانی انداز میں سیکڑوں انسانوں کے سامنے کہہ رہا تھا۔

''ابوحنیفہ نے آج میری ساری عمر کی محنت وجستجو کو تباہ کر ڈالا۔''

اگر حاسدین کے ذہنوں میں یہ واقعہ محفوظ نہ رہ سکا تھا تو کم سے کم انہیں ایک بار حضرت امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی اس روایت کو باہوش وحواس سن لینا چاہئے تھا۔ تمام معتبر مورخین نے حضرت امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی اس روایت کو مستند حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے بقول حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نہایت پرجوش انداز میں فرماتے تھے۔

''خراسان میں دو بدترین فرقے پائے جاتے ہیں اور ان میں سرفہرست فرقہ جہمیہ ہے''۔

کیا حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ اظہار مسلسل جہم بن صفوان سے شدید نفرت کا ثبوت نہیں؟ اگر لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ نہ ہوتی تو وہ خدا سے ڈر جاتے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مذہبی عقیدے کو ایک گمراہ انسان

کے نظریات سے وابستہ نہ کرتے ...... لیکن فرمودہ خداوندی کے آئینے میں انسان جہاں احسن تقویم (بہترین شکل) ہے وہاں اس کا شمار اسفل سافلین (پست ترین) میں بھی ہوتا ہے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی انسانی کردار کی اسی پستی کا ہدف بن گئے تھے۔ اگر اہل نظر واقعات کے پس منظر میں ذرا بھی غور کریں تو ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی بیک وقت کئی محاذوں پر برسر پیکار تھی۔ باطل عقائد رکھنے والی جماعتیں چاہتی تھیں کہ عوام الناس کی سماعتیں ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی اثر انگیز آواز سے محروم رہیں۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر دل و دماغ میں انقلاب برپا کر دینے والی یہ آواز اسی طرح گونجتی رہی تو ان کی فتنہ طرازیوں کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ اس لئے گمراہ کن نظریات کے بانی، حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو مناظرات کی مجالس آراستہ کرنے پر مجبور کرتے تھے اور پھر ان کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہزاروں انسانوں کے سامنے کسی سوال کا جواب دینے سے عاجز رہ جائیں۔ اگر ہم مفسدین کی جماعت کے اس منصوبے پر صبر و تحمل کے ساتھ غور کریں تو وہ لوگ زیادہ قصوروار نہیں تھے۔ اول و آخر ان کی حیثیت ایک شب تاریک کی سی تھی اور رات کا تو کام ہی اندھیروں کی تقسیم ہے۔ شکایت تو ان افراد سے ہے جو خود کو علم کا خورشید ضیا بار بھی کہتے تھے لیکن ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی مخالفت نے انہیں سیاہی کے تاجروں کا شریک کار بنا دیا تھا' دین کی خدمت آپ کے علم کی بنیاد تھی اور محض رضائے الٰہی آپ کا مقصد حیات تھا۔ پھر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس شور و غل سے کس طرح متاثر ہوتے۔ آپ نے دشمنان ملت کی طرف بھی بے نیازانہ دیکھا اور ہم عقیدہ مخالفین کی جانب بھی قلندرانہ نظر کی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پروا...... ایک کار عظیم کو جاری رہنا تھا سو جاری رہا۔

کچھ اور فتنہ گر

اسی زمانے میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ یہ خاندان بنو امیہ کے ''مشہور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا دور حکومت تھا۔ ہشام ایک مضبوط عقیدہ رکھنے والا حکمراں تھا اور اسے مذہب میں ایسی کوئی بدعت پسند نہیں تھی' جس سے عام مسلمانوں کے عقائد خلل پذیر ہوں۔ مذہبی معاملات میں ہشام کی سخت گیری کا یہ حال تھا کہ جب غیلان بن یونس نے اپنا نیا عقیدہ پیش کیا تو وہ ان نظریات کو برداشت نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ غیلان بن یونس کو اپنی زندگی سے محروم ہونا پڑا۔ یہ وہی غیلان بن یونس تھا جس نے پہلی بار حضرت عمر بن العزیز رحمتہ اللہ علیہ کے عہد خلافت میں نظریہ قدر پیش کیا تھا۔

غیلان بن یونس کا نظریہ قدر پانچ اصولوں پر مشتمل تھا۔ پہلا یہ کہ انسانی آنکھ کے ذریعے کسی طرح بھی دیدار الٰہی ممکن نہیں ...... اس فرقے کے ماننے والوں کا دوسرا اصول یہ تھا کہ انسان اپنے تمام کاموں میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ اس طرح یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ پوری کائنات کسی عنوان بھی جبر کے دائرے میں داخل نہیں ہوتی ...... ان لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ خدا گناہ کبیرہ کے مرتکب انسانوں کی بخشش نہیں کرتا ...... اس عقیدے پر عمل پیرا ہونے والوں کا یہ نظریہ بھی راسخ ہو چکا تھا کہ گناہ کبیرہ سے آلودہ ہونے والا انسان نہ مومن ہے اور نہ کافر ...... یہ لوگ گناہ کبیرہ میں ملوث ہو جانے والوں کو ''فاسق مسلمان'' کہتے تھے۔ ان کی نظر میں ایسا شخص ہمیشہ کے لئے آتش دوزخ میں جلتا رہے گا۔

غیلان بن یونس اپنے اسی نظریئے کی پر زور تبلیغ کر رہا تھا کہ ایک دن حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا اور بہت دیر تک سمجھاتے رہے۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جیسے خلیفہ راشد کا جبروت ہی تھا کہ غیلان بن یونس کو اپنے عقائد کا مضبوط کہسار راکھ کا ایک ڈھیر نظر آنے لگا۔ اس نے دوران گفتگو بارہا کہا۔ ''آپ درست فرماتے ہیں۔ میں صریح گمراہی میں مبتلا تھا۔ آپ سے ملاقات کے بعد میں اپنی اصلاح حال کرلوں گا۔'' بظاہر غیلان بن یونس کی کجی دور ہو چکی تھی اور ایک فتنہ سر اٹھانے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا مگر کون جانتا ہے کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا رعب وجلال تھا کہ جس سے مجبور ہو کر غیلان بن یونس اپنے مفسدانہ خیالات سے تائب ہو گیا تھا...... یا پھر وہ ایک زمانہ ساز انسان تھا جس نے مذہب کے معاملات میں خلیفہ راشد کی سخت گیری سے مجبور ہو کر جھوٹ اور مصلحت کا سہارا لیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوتے ہی غیلان کے جذبوں نے دوبارہ سرکشی اختیار کی اور اس کے ذہن میں فراموش کردہ تصورات پوری شدت کے ساتھ سر ابھارنے لگے۔ غیلان کچھ دن تک دوستوں اور قریبی حلقوں میں اپنے نظریات کی تبلیغ کرتا رہا پھر اس کی بدحواسی بڑھی تو وہ مجلسوں میں نکل آیا۔ یہاں تک کہ غیلان بن یونس کی گمراہ کن تقریریں عوام الناس میں شہرت پانے لگیں۔

پھر ایک دن خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے کانوں تک بھی یہ فریب کار نظریات پہنچے۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر غیلان بن یونس کو پابہ زنجیر کر کے اپنے دربار میں طلب کرلیا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ ہشام غیلان بن یونس سے اس کے عقائد پر مناظرہ کرے گا اور بعد میں کسی نتیجے پر پہنچ کر اپنا فیصلہ سنائے گا مگر اس وقت لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہشام بن عبدالملک نے غیلان بن یونس کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تجھ جیسے کج رو انسان سے یہ مطالبہ نہیں کروں گا کہ اپنے نظریات سے رجوع کر کے توبہ کے حصار میں داخل ہو جا۔ تو ایک بار میرے پیش رو خلیفہ کے سامنے تائب ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود تیرے مفسدانہ خیالات کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ تو اپنی فتنہ انگیزیوں سے باز نہیں آئے گا۔'' اتنا کہہ کر ہشام نے جلاد کو حکم دیا کہ غیلان کے کاندھوں سے اس کے سر کا بوجھ کم کر دیا جائے...... ہشام کا یہ حکم اس قدر سریع الاثر تھا کہ چند ساعتیں گزرنے کے بعد ہی غیلان بن یونس خاک وخون میں نہا گیا۔

اسی طرح ہشام بن عبدالملک نے جعد بن درہم کو بھی قتل کر ڈالا۔ جعد بن درہم وہ شخص ہے۔ جس نے سب سے پہلے قرآن کریم کو مخلوق کہہ کر پکارا تھا۔ بعض روایات میں درج ہے کہ جہم بن صفوان وہ پہلا فتنہ گر تھا جس نے اللہ کی کتاب مقدس کے بارے میں مخلوق اور حادث ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے برعکس کچھ محققین کا خیال ہے کہ جعد بن درہم نے پہلی بار قرآن حکیم کے حوالے سے مسلمانوں کے عقائد میں خلل اندازی کی تھی۔ بہر حال اس مسئلے میں جہم بن صفوان کو اولیت حاصل ہو یا جعد بن درہم کو یہ ایک تحقیقی مسئلہ ہے پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ جعد بن درہم فساد برپا کرنے والوں کی جماعت میں سرفہرست تھا۔ اس کے بارے میں ایک معتبر روایت یہ بھی موجود ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے اسے براہ راست قتل نہیں کیا بلکہ اپنی حکومت کے ایک بااختیار شخص خالد بن عبداللہ کو حکم دیا کہ وہ جعد بن درہم کے غلیظ وجود سے اللہ کی زمین کو پاک کر دے۔

جعد بن درہم کے قتل کی تفصیل اس طرح ہے کہ اسے کوفے میں عید الاضحیٰ کے دن خالد بن عبداللہ کے سامنے اس طرح لایا گیا کہ اس کا پورا بدن آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ خالد بن عبداللہ نے جعد بن درہم کی طرف دیکھا

اور پھر حاضرین نے محسوس کیا کہ خالد بن عبداللہ کی آنکھوں میں اس کے لئے ساری دنیا کی نفرت سمٹ آئی ہے۔ نماز عید کی ساعت قریب تھی اس لئے تمام لوگ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ جعد بن درہم کی اسیری کا یہ حال تھا کہ وہ لوگوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بظاہر اسے فرار ہونے سے روکنے والا کوئی نہ تھا مگر یہ عجیب محرومی تھی کہ کسی نگراں کے موجود نہ ہوتے ہوئے بھی وہ عیدگاہ سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ سرکاری محافظوں نے جعد بن درہم کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی کر سکے۔

نماز عید ختم ہوئی اور خالد بن عبداللہ نے شرکائے نماز کے سامنے ایک طویل خطبہ دیا پھر آخر میں اس کا چہرہ غضب ناک ہو گیا اور لہجے سے حقارت و تضحیک کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ خالد بن عبداللہ نے عیدگاہ میں جمع ہونے والے انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"لوگو! اب تم جاؤ اور اپنی اپنی قربانی کے جانور ذبح کرو۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے دن جعد بن درہم کو ذبح کروں۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کیا کیا ہذیان بکتا ہے۔ اس گمراہ انسان کا کہنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے باتیں نہیں کیں۔ گویا اس کے نزدیک حضرت موسیٰ کلیم اللہ نہیں تھے۔ اسی سیاہ کار شخص کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل (دوست) نہیں بنایا۔ تم لوگ غور سے سن لو کہ یہ کج رو انسان خدا کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے' خدا ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے۔"

اتنا کہہ کر خالد بن عبداللہ منبر سے نیچے اتر آیا اور پھر اس نے محافظوں کو جعد بن درہم کی زنجیریں کھولنے کا حکم دیا۔ محافظ آگے بڑھے اور پھر چند لمحوں بعد وہ بدعقیدہ انسان طوق و سلاسل کے بوجھ سے ہلکا ہو چکا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ خالد بن عبداللہ کی شمشیر بے نیام ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی جابرانہ اور سفاک مسکراہٹ نمایاں تھی۔

"جعد! آج میں بہت خوش ہوں کہ ایسی مقدس ساعتوں میں تیرا خون بہا کر خدا کی زمین کے اس حصے کو غسل دے رہا ہوں جسے تیرے ناپاک وجود نے آلودہ کر دیا ہے۔" ابھی فضاؤں میں خالد بن عبداللہ کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ اس کا ہاتھ بلند ہوا۔ تلوار کی چمک سے ایک لمحے کے لئے حاضرین کی نگاہیں خیرہ ہوئیں اور دوسرے ہی لمحے میں ان کی سماعتوں سے جعد بن درہم کی دردناک چیخ ٹکرائی۔ بدعقیدگی کا سارا تماشا ختم ہو چکا تھا اور قرآن حکیم کو مخلوق کہنے والے کی لاش فرش خاک پر تڑپ رہی تھی۔ مختصر یہ کہ ہشام بن عبدالملک کے دور خلافت میں گمراہیاں پھیلانے والے دو فتنہ گر غیلان بن یونس اور جعد بن درہم تہ تیغ کیے گئے۔

اسلامی عقائد کے خلاف ایک اور منصوبہ

اسی ہشام کے زمانہ حکومت میں جہاں در پردہ کچھ سیاسی انتشار تھا' وہاں مذہبی معاملات میں رخنہ اندازی کرنے والے بے شمار افراد موجود تھے۔ اس میں سے کچھ لوگ اپنی ذہانت اور علم کے باعث گوشہ گمنامی سے نکل کر عام مسلمانوں کے سامنے بے نقاب ہو چکے تھے اور کچھ زیر زمین رہ کر اہل ایمان کے عقائد میں خلل ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسی ہی فساد برپا کرنے والی ایک غیر مسلم طاقت نے ایک رومی راہب کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنی عقلیت پرستی کے ذریعے کچھ ایسے سوالات ترتیب دے جنہیں سن کر عام مسلمانوں کے ذہن منتشر ہو جائیں۔ اسی منصوبے کے تحت رومی راہب نے ایک طویل عرصے تک گوشہ نشین رہ کر سادہ لوح کلمہ گویوں کے لئے الفاظ کا ایک

دام زریں تیار کیا پھر وہ اپنے غیر مسلم حامیوں کے سامنے نمودار ہوا۔ رومی راہب نے بطور آزمائش اپنے نظریات کا خاکہ ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو سرور کونینؐ کی رسالت کا انکار کر رہے تھے اور واضح طور پر جن کا شمار مشرکین میں ہوتا تھا۔ یہ تمام لوگ رومی راہب کے خیالات سن کر بہت متاثر ہوئے۔ اس کی نظر میں یہ ایک مکمل منصوبہ تھا جو اسلامی عقائد کی پرسکون صفوں میں ابتری پھیلا سکتا تھا۔

سازش کے مکمل ہو جانے کے بعد اسلام دشمنوں نے رومی راہب سے کہا۔ ''اب تم مملکت اسلامیہ کا طویل سفر اختیار کرو اور عام مسلمانوں کے سامنے اپنے نظریات اس طرح پیش کرو کہ ان کا یقین راسخ' وہم و گمان کا شکار ہو جائے۔ دین عیسوی کے لئے یہی تمہاری ناقابل فراموش خدمات ہوں گی اور یہی تمہارا تاریخ ساز کارنامہ ہوگا۔''

رومی راہب کو ہر طرح آسودہ کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف دنیاوی اعتبار سے اسے تمام آسائشیں میسر تھیں اور دوسری طرف اس کی فتنہ انگیزیوں کو عیسائی مذہب کی یہ تائید حاصل تھی کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے' خدا اور اس کے بیٹے (مسیح) کی خوشنودی کے لئے کر رہا ہے رومی راہب نے اہل کلام کے انداز میں ایک عجیب و غریب سوال نامہ ترتیب دیا تھا۔ معتبر تاریخی کتابوں میں اس سوال نامے کی کچھ تفصیل اسی طرح درج ہے۔

رومی راہب کے عیار ذہن نے پہلا سوال یہ تراشا تھا کہ اگر دنیا میں خدا موجود ہے تو خدا سے پہلے کون تھا؟ (یہ سوال کوئی نیا نہیں ہے۔ دور حاضر کے ریاضی داں اور سائنس کے پجاری کائنات کی تخلیق پر بحث کرتے کرتے بالآخر یہاں پہنچ جاتے ہیں کہ خدا سے پہلے کون تھا؟ مشہور فلسفی لارڈ برٹرینڈ رسل کا تو یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک بار وہ کسی مذہبی عالم سے بحث کر رہا تھا۔ خدا کی خلاقی زیر بحث تھی۔ وہ مذہبی عالم سائنس کی روشنی میں اللہ کی تخلیقات پر ناقابل تردید دلائل پیش کر رہے تھے۔ اور لارڈ برٹرینڈ رسل اس کے سامنے بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ حاضرین مجلس کو امید ہو چلی تھی کہ بالآخر یہ مشہور فلسفی عاجز آ کر خدائے واحد پہ ایمان لے آئے گا مگر اچانک اس کا ذہن خلل کا شکار ہوا۔ جب رسل کے لئے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی تو اس نے کائنات کے عمل تخلیق کے سلسلے میں مذہبی عالم سے ایک عجیب احمقانہ سوال کر ڈالا۔ ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ عالم اسباب میں تمام موجودہ اشیاء خدا کی تخلیق کردہ ہیں مگر وہ کون ہے جس نے خدا کو تخلیق کیا؟ اگر کوئی شخص میرے اس سوال کا جواب دے دے تو میں اپنے نظریات درست کر لوں گا۔''

لارڈ برٹرینڈ رسل کا مطالبہ اس قدر جاہلانہ تھا کہ بحث ختم ہو گئی اور پھر جب یہ مشہور فلسفی جس سے موجودہ نوجوان نسل بہت زیادہ متاثر ہے' دنیا سے رخصت ہوا تو اس کا شمار ملحدین میں ہوتا تھا۔ بعض لوگ رسل کی محبت میں اسے اس الزام سے بچاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ خدائے واحد کے بجائے نظریہ مثلیث (تین خداؤں) کا قائل تھا۔ مختصر یہ کہ جس طرح لارڈ برٹرینڈ رسل نے یہ سوال کیا تھا کہ خدا کا خالق کون ہے' اسی طرح ماضی و حاضی دونوں زمانوں میں یہ سوال کیا جاتا رہا ہے کہ خدا سے پہلے کون تھا؟ رومی راہب نے بھی اسی وسوسے کو بنیاد بنا کر یہ سوال تراشا تھا)۔

رومی راہب کا دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر ہم خدا کے وجود کو تسلیم کر لیں تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ خدا کا رخ کس طرف ہے؟ (اس وسوسے کی بنیاد وہی انسانی فطرت ہے جو اپنی پسندیدہ ہستی کو مجسم انداز میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اسی خواہش کی شدت نے انسان کو خدا کی صورت گری پر اکسایا' یہاں تک کہ بت پرستی کا آغاز ہوا۔ صنم تراشنے والے

جب کسی بحث کے دوران عاجز آجاتے ہیں تو ان کی آخری دلیل یہی ہوتی ہے کہ یہ پتھر کے تراشیدہ بت' خدا نہیں ہیں مگر ہم اپنے ذہن وقلب کی یکسوئی کے لئے خدا کی مختلف شکلیں تراشتے رہتے ہیں۔ جب اس نظریئے نے وحشت کا رنگ پکڑا تو ہندو قوم نے اپنی اکثریت کے لحاظ سے بے شمار خداؤں کے بت بناڈالے۔ اب وہ مطمئن تھے کہ ان کے خدا (معاذ اللہ) دست و پا بھی رکھتے ہیں۔ آنکھیں بھی اور چہرے بھی۔ تجسیم وتشکیل کے اسی تصور کو سامنے رکھ کر رومی راہب نے خدا کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی)

اس کا آخری سوال یہ تھا کہ خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟ (رومی راہب کا یہ سوال اس انسانی اندیشے کے تحت تھا کہ جب خدا ہمہ وقت متحرک ہے تو کسی خاص ساعت میں اس کا کیا عمل ہوگا؟ بنیادی طور پر یہ سوال ذہنی خلل کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی شے کی حرکت کا اسی وقت مشاہدہ کیا جاسکتا ہے' جب وہ مطلوبہ شے انسانی آنکھ کو نظر آجائے۔ روز ازل سے آج تک یہ کلیہ برقرار ہے کہ ظاہری آنکھ سے خدا کا دیدار ممکن نہیں۔ اس صورت میں یہ سوال ہی مہمل تھا کہ کوئی شخص خدا کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کرے اور پھر اپنے اس مشاہدے کو انسانی ہجوم کے سامنے بیان کرے۔ رومی راہب بھی اس راز سے باخبر تھا کہ اس کا ترتیب دیا ہوا سوالنامہ' پراگندہ خیالی کا ایک مجموعہ ہے مگر جب کسی منصوبے کے تحت دیوانگی کی باتیں کی جائیں تو ان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عام تماشائیوں کے ذہن بھی ان بے سروپا سوالات میں الجھ کر رہ جائیں)

پھر جب رومی راہب نے اپنے منصوبے کی تفصیلات غیر مسلم فتنہ گروں کے سامنے پیش کیں تو وہ بہت زیادہ محظوظ ہوئے ...... انہیں یقین تھا کہ رومی راہب کے یہ سوالات کسی نہ کسی عنوان عام مسلمانوں کے عقائد کی عمارت میں شگاف ڈال دیں گے۔ دراصل عیسائیوں کا یہ ایک خوفناک منصوبہ تھا جس کے پس منظر میں یہودی سازش بھی پوری توانائی کے ساتھ کارفرما تھی۔

عیسائیوں اور یہودیوں کے مشترک فتنے تو رسالت مآب ﷺ کی حیات مقدسہ کے دوران بھی سرابھارتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی مرد نبوت کا دعویٰ کرتا اور کبھی کوئی عورت اس ذہنی خلل میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ پھر خلافت راشدہ کے دور میں بھی نبوت کے یہی فتنے نئی نئی قبائیں بدل کر سامنے آتے رہے۔ اس کے بعد سازشی گروہ نے خدا اور مذہبی عقائد کو عقل کے پیمانے سے جانچنے کی بنیاد ڈالی۔ اس فتنے کے پس پشت ہمیشہ عیسائی اور یہودی قوتیں سرگرم عمل رہیں۔ ان تخریب کاروں نے اپنے بے پناہ سرمائے کی طاقت کا سہارا لے کر ان کمزور عقائد رکھنے والے مفلوک الحال انسانوں کو خرید لیا تھا جو آسانی کے ساتھ اپنے مذہب کے خلاف صف آرا ہو سکتے تھے۔ دشمنوں کے پروردہ ان لوگوں کے نام بھی مسلمانوں جیسے ہوتے تھے' لباس بھی اور چہرے بھی۔ یہ بظاہر اسلامی معاشرے کے ممتاز افراد میں شمار ہوتے تھے مگر ان کے ذہن اسلام کے قائم کردہ اصولوں سے ہم آہنگی نہیں رکھتے تھے۔ غیر مسلم قوتیں ان کے اسی نفاق سے فائدہ اٹھاتی تھیں اور انہیں اس منصوبے کے ساتھ مسلمانوں کی صفوں میں چھوڑ دیا جاتا تھا کہ جہاں بھی کوئی خلا نظر آئے وہ اسے اپنے گمراہ کن نظریات سے بھرنے کی کوشش کریں۔ یہ لوگ بڑے صبر وتحمل کے ساتھ عوام الناس سے روابط رکھتے تھے اور پھر جیسے ہی کوئی موقع میسر آتا تھا' انسانی ذہن کو متزلزل کرنے کے لئے منطق وکلام کے حربے استعمال کرتے تھے۔

رومی راہب بھی ایسے ہی فتنہ پرداز عیسائیوں اور یہودیوں کا آلۂ کار تھا۔ اس قسم کی سازشوں میں ''شکست روم''

کا بھی بڑا دخل تھا۔ مسلمانوں نے جس طرح میدان جنگ میں "ناقابل تسخیر" رومیوں کو ذلت و رسوائی سے ہم کنار کیا تھا' وہ کوئی ایسی داستان الم نہیں تھی' جسے اہل روم آسانی سے فراموش کر دیتے۔ جب مسلمان تعلیم شہادت کے سبب موت کو ایک دلچسپ کھیل سمجھنے لگے تو پھر رومی ہمیشہ کے لئے اس بات سے مایوس ہو گئے کہ وہ دوبارہ عرصہ کارزار میں جمع ہو کر مسلمانوں سے اپنی شکست کا انتقام لے سکیں گے۔ اس حوصلہ شکن صورت حال نے بالآخر انہیں عقل کی شعبدہ بازیوں کے مظاہرے پر ابھارا اور ملت اسلامیہ کی صفوں میں انتشار برپا کرنے کے لئے عقل عیار کے سہارے تلاش کرنے لگے۔

رومی راہب کو اسی منصوبے کے تحت مسلمانوں کے ساتھ آمادہ بحث کیا گیا تھا۔ گروہ مفسدین کا خیال تھا کہ ملت اسلامیہ میں کوئی شخص بھی رومی راہب کے قائم کردہ سوالات کا ایسا جواب نہیں دے سکے گا جسے سن کر عام ذہنی سطح رکھنے والا مسلمان آسودہ و مطمئن ہو جائے۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ عیار رومی راہب شہر شہر' قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ مسلمانوں سے بحث و مناظرہ کرنے لگا۔ عام مسلمان تو ان مشکل ترین سوالات کا جواب دینے سے فطرتاً عاجز ہی تھے مگر جن علماء پر عقیدہ وحدانیت کی تبلیغ کا دارومدار تھا' وہ بھی رومی راہب کے شاطرانہ حربے کے سامنے بے دست و پا نظر آنے لگے۔ بات یہ نہیں تھی کہ ہنرمندان اسلام کا علم نامکمل تھا بلکہ صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ علمائے کرام نے اپنے ذہنوں کو خدائے واحد کے سلسلے میں پراگندہ ہونے سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ روح کی گہرائیوں کے ساتھ خدا کو صرف خدا تسلیم کرتے تھے۔ ان کے عقیدے کی سچائیوں کا یہ عالم تھا کہ ایک بار خدا کی وحدانیت کی تصدیق کر چکے تو لاشعور میں بھی شک کا کوئی عکس نہیں ابھرا۔ ان کی عقل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی یہ تصور نہیں آ سکتا تھا کہ خدا کا رخ کس طرف ہے' خدا کیا کر رہا ہے اور خدا سے پہلے کون تھا؟ یہی وہ عوامل تھے جس کے باعث کوئی اہل علم بھی رومی راہب کے سوالات کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

پھر جب اس فتنہ ساز کو یقین ہو گیا تو وہ دمشق کی سرزمین پر نمودار ہوا۔ اس وقت دمشق مرکز اہل نظر تھا۔ رومی راہب کے خیال میں اگر یہ شہر بھی اس کے سوالوں کا جواب دینے سے عاجز رہا تو پھر پوری ملت اسلامیہ میں ایسا کوئی مقام باقی نہیں رہے گا جہاں اس گمراہ کن تصوراتی منصوبے کی نفی کی جا سکے۔ کچھ دن تک رومی راہب نے اہل دمشق سے بھی مناظرات کئے مگر کوئی بھی ذی ہوش مسلمان اس کے ذہن کے پیچ و خم کو نہ سمجھ سکا۔ رومی راہب کو منزل فتح قریب تر نظر آنے لگی تھی۔ عام مسلمان حیرت اور بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض جذباتی لوگوں کو اپنے عجز پر رونا آ جاتا تھا...... اور رہے علمائے وقت تو وہ یہ کہہ کر اپنا دامن بچا لیا کرتے تھے کہ رومی راہب شیطان کا سفیر ہے جو اہل ایمان کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اہل علم کا یہ جواب بھی اپنی جگہ درست تھا مگر عوام الناس اس نظریئے سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اپنے علماء کے بارے میں ایک عجیب حسن ظن تھا۔ وہ ہر صورت میں اس پر یقین رکھتے تھے کہ دنیا کا مشکل ترین مسئلہ بھی علمائے اسلام کے ذہنوں کی دسترس میں ہے۔ وہ جب چاہیں گے رومی راہب کو برسر مجلس لاجواب کر دیں گے مگر اہل دمشق کی یہ خواہشات تکمیل تک نہ پہنچ سکیں اور ہر طرف ایک عجیب سا شکست آمیز سکوت طاری ہو گیا۔

پھر ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ رومی راہب خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں شرف باریابی طلب کر رہا

تھا۔ ہشام نے اپنی حکومت کے چند معتبر لوگوں کو رومی راہب کے پاس بھیجا کہ وہ اس کی آمد کا مقصد دریافت کریں۔

رومی راہب نے انتہائی سادہ دلی اور معصوم چہرے کے ساتھ کہا۔ ''میرے ذہن میں چند علمی سوالات ہیں جنہیں میں علمائے اسلام کے سامنے پیش کر کے اپنی ذہنی الجھنوں کا علاج چاہتا ہوں۔ عیسائی اور یہودی اہل کمال تو مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ اگر حلقہ اسلام میں بھی اتنی کشادگی نہیں تو پھر میں واپس چلا جاتا ہوں۔'' رومی راہب نے بڑی فریب کاری کے ساتھ خواہش ملاقات کی توجیہ بیان کی تھی۔

جب خلافت کے معتمدین نے رومی راہب کا نقطہ نظر ہشام بن عبدالملک کے سامنے پیش کیا تو اس نے کسی فکرو تردد کے بغیر اسے اپنے دربار میں طلب کر لیا۔ ''رومی راہب سے کہہ دو کہ اسلامی آغوش زمین و آسمان کی طرح کشادہ ہے۔ وہ بصد شوق آئے اور اپنے عقلی مسائل علمائے اسلام کے سامنے پیش کرے۔ اسے کسی بھی مرحلے میں مایوسی نہیں ہوگی۔'' ہشام بن عبدالملک کا خیال تھا کہ رومی راہب اپنے مذہبی عقائد سے برگشتہ ہو چکا ہے اور اس کے دل و دماغ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں مگر جب رومی راہب دربار خلافت میں داخل ہوا تو صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔

آنے والے نے ہشام بن عبدالملک کو بلند آواز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اے مسلمانوں کے جلیل القدر خلیفہ! کیا تو خدائے واحد پر مکمل یقین رکھتا ہے؟'' الفاظ رومی راہب کے ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئے تو پورے دربار پر سناٹا چھا گیا۔ ایک غیر مسلم کے لہجے سے بے ادبی اور گستاخی کا رنگ نمایاں تھا۔

اہل دربار کی پیشانیاں نفرت و غضب کی لکیروں سے بھر گئیں مگر ہشام بن عبدالملک نے اسلام کے روایتی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اے شخص! آخر تجھے میرے کس عمل نے ایسا سوچنے پر مجبور کیا؟ ایک میرے ہی عقیدے کا کیا ذکر ہے' کوئی بھی مسلمان خدا کی وحدانیت پر زبان و دل کی مکمل گواہی کے بغیر حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا۔''

''میں کسی کے یقین پر شک نہیں کرتا مگر مسلمانوں کے اس دعوے نے مجھے یہاں تک آنے کے لئے مجبور کیا ہے کہ ان کے سوا خدا کی ذات کو سمجھنے والا کوئی دوسرا اس کرہ خاک پر موجود نہیں ہے''۔ رومی راہب کے لہجے میں بڑی تلخی شامل تھی۔ ''میں خدا کو جاننے والوں سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

ہشام بن عبدالملک' راہب کے تیور دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی مجلس مناظرہ آراستہ کرنا چاہتا ہے پھر بھی اسے نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور بہت نرمی کے ساتھ کہنے لگا۔ ''میری مملکت میں کسی ایسے مسلمان کی گنجائش نہیں جو نئے نئے عقائد تراشے اور عام انسانوں کے سامنے اپنی پریشان خیالی کے مظاہرے کرتا پھرے۔ میں تجھے بھی تیرے اس عمل سے باز رکھ سکتا تھا مگر تو اہل ایمان کے دائرے میں نہیں آتا' اس لئے اجازت ہے کہ اپنے شکوک و شبہات بیان کر۔ خدا کو منظور ہوگا تو جواب دینے والے تجھے مطمئن کر دیں گے۔''

رومی راہب نے اپنی عیارانہ حرکتوں سے صورت حال کو اس نقطے تک پہنچا دیا تھا جہاں انسانی ذہن خوامخواہ وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے اور دل میں اضطراب کی شدید لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ ہشام بن عبدالملک کے درباریوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اس بات کا منتظر تھا کہ فریب کار رومی کی زبان سے کون سا نیا فتنہ پھوٹتا ہے؟

آخر مشرکین کا وہ آلۂ کار' خلیفہ وقت سے مخاطب ہوا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ خدا سے پہلے کون تھا؟'' رومی

راہب نے عجیب وغریب سوال کیا تھا۔ ہشام بن عبدالملک اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ درباری بھی حیران و پریشان تھے اور اپنے اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ جعد بن درہم اور غیلان بن یونس کی طرح عقائد کے ایک نئے فتنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ کسی خاص عقیدے کا مسئلہ نہیں تھا لیکن پھر بھی لوگوں کے ذہنوں میں مختلف اندیشے سر ابھار رہے تھے۔

ہشام بن عبدالملک نے اپنے درباری علماء کی طرف دیکھا۔ ان برگزیدہ ہستیوں کی موجودگی میں خود ہشام بن عبدالملک کا جواب دینا احترام علم کے منافی تھا۔

ایک عالم نے اپنی نشست سے اٹھ کر بلند آواز میں کہا۔ "ہم صرف خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس بحث میں نہیں الجھتے کہ خدا سے پہلے کون تھا اور آخر میں کون ہوگا؟" واضح طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک اول و آخر خدا ہے مگر ان کے مخاطب پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔

رومی راہب اپنی حرکت سے باز آنے والا نہیں تھا۔ اس نے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے درباری عالم سے جرح کرتے ہوئے کہا۔ "یہ محض عقیدے کی بات نہیں۔ خدا خود انسان کو دعوت عقل دیتا ہے۔ اس کے بقول غور کرنے والوں کے لئے نظام کائنات میں بڑی نشانیاں موجود ہیں۔" رومی راہب آیات قرآنی کی غلط تاویل بیان کر رہا تھا۔

دوسرے عالم نے سر دربار اٹھ کر رومی راہب کو ٹوکا۔ "آیات قرآنی کی یہ تفسیر غلط ہے خدا جب بھی نوع آدم کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہوتا ہے کہ خدا کی تخلیقات اور قائم کردہ نظام کے بارے میں سوچا جائے۔ اس غور و فکر سے منشائے الٰہی یہ ہے کہ جب انسان خدا کی نشانیوں میں تدبر سے کام لے گا تو پھر اس کی بے پناہ صفت خلاقی پر بھی ایمان لے آئے گا۔"

"میں ایمان کی بات نہیں کرتا رومی راہب آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی کجی کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔" جنہیں ایمان لانا تھا وہ ایمان لا چکے۔ ہم بھی اس کی خدائی پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر ایک مخلوق ہونے کے سبب کبھی کبھی ہماری عقل مسائل کے گرداب میں الجھ جاتی ہے۔ فی الوقت یہ مسئلہ درپیش ہے کہ خدا سے پہلے کون تھا؟ یہ محض ایک عقلی سوال ہے اور میں عقل ہی کی روشنی میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔"

ہشام بن عبدالملک کے دربار پر سناٹا چھا گیا علمائے کرام اور دیگر درباری بھی رومی راہب کی عقل کے پیچ و خم پر غور کرتے ہی رہ گئے۔ بعض اہل نظر کو گمان ہوا کہ وہ اہل کلام کے انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔ اب یہ اتفاق تھا کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں اکابر محدثین بھی موجود تھے اور مقتدر فقیہ بھی۔ مگر کوئی ایسا شخص حاضر نہیں تھا جو منطق و استدلال کی طاقت سے رومی راہب کو زیر کر سکے۔

پھر ایک طویل سناٹے کے بعد راہب نے اپنا دوسرا سوال پیش کیا۔ "خدا کا رخ کس طرف ہے؟"

اہل ایمان کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں۔ آج پہلی بار ان لوگوں نے خداوند ذوالجلال کے بارے میں ایسے گستاخانہ کلمات سنے تھے پھر بھی ایک عالم بزرگ نہایت صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنی نشست پر کھڑے ہوئے "ہم اپنے معزز مہمان پر اظہار کر دینا چاہتے ہیں کہ وجود باری تعالیٰ انسانی حیثیت نہیں رکھتا کہ ہم اس کے چہرے کی سمت کا اندازہ کر سکیں۔"

رومی راہب کے چہرے پر تمسخر کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ بڑے بے نیازانہ انداز میں ایک ایک درباری کا جائزہ لیتا

رہا۔ اس کے طرزِ عمل سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ علمائے اسلام کی عاجزی پر نہایت اطمینان و آسودگی محسوس کر رہا ہے۔

پھر دوسرے عالم نے راہب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "خدا کے چہرے کا تعین ہمارے مذہب میں کفر ہے اور چہرے کے تعین کے بغیر سمت معلوم کرنا ناممکن ہے۔"

"مجھے کفر و ایمان سے کوئی غرض نہیں۔" رومی راہب کی حجت اپنی جگہ قائم تھی۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خدا کا رخ کس طرف ہے؟"

دربار کے ایک اور عالم جو اپنی ظاہر شکل و صورت سے بہت زیادہ سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ رومی راہب کی اس گستاخانہ گفتگو کو برداشت نہ کر سکے اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے تند و تیز لہجے میں کہنے لگے۔ "اے مسلمانوں کے امیر! اس مطلق العنان شخص کی زبان کو قابو میں رکھنے کا حکم دیجئے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر لایعنی باتیں کر رہا ہے اس کا ذہن شیطانی وسوسوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ اسے اہل ایمان کی کوئی دلیل مطمئن نہیں کر سکتی۔"

وہ عالم اپنے نظریات کے سلسلے میں برحق تھے مگر اصولی طور پر رومی راہب کے سوال کا یہ جواب ہرگز نہیں تھا کہ طاقت و جبر کا استعمال کر کے اسے خاموش کر دیا جائے۔

خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے مسلمان علماء کی رائے پر اپنے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ مسلسل رومی راہب کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ "غالباً تمہارا آخری سوال باقی ہے۔" ہشام نے رومی راہب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے مسلمانوں کے عظیم الشان خلیفہ! مجھے یہاں آکر شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے"۔ یکایک رومی راہب کا لہجہ بدل گیا تھا۔ "میں تیرے درباریوں سے علم کی زبان میں گفتگو کر رہا ہوں مگر یہ لوگ مجھے شمشیر و سناں کی زبان میں جواب دینا چاہتے ہیں۔ کیا یہ اسلامی عدل کا مظاہرہ ہے؟" رومی راہب نے کمال عیاری سے مناظرے کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔ شاید اسے مسلمان علماء کی برہمی سے یہ اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں وہ عوام الناس یا حلقہ اقتدار کی سخت گیری کا شکار نہ ہو جائے (اگرچہ یہ اندیشہ مسلمانوں کی رواداری پر ایک تہمت تھا لیکن پھر بھی رومی راہب یہ سوچنے میں حق بجانب تھا۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ خدا کے سلسلے میں یہ عقلی سوالات کسی وقت بھی کوئی ہنگامہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ اس لئے پیش بندی کے طور پر اس نے ہشام بن عبدالملک کے انصاف کو آواز دی تھی)

"اسلامی عدل تیرے وہم و گمان سے بھی ماوراء ہے۔" اچانک ہشام بن عبدالملک کے لہجے میں تلخی شامل ہو گئی تھی۔ "تو نے دربار میں آنے کی اجازت طلب کی' سو دے دی گئی۔ کیا کسی نے تجھے روکا؟ پھر تو نے ایسے مسائل پر گفتگو چھیڑ دی جس کی ہمارے مذہب میں کوئی گنجائش نہیں۔ کیا کسی نے تیری زبان پر پابندی عائد کی؟ نہ تیرے قدموں میں بیڑیاں ہیں اور نہ زبان پر پہرے' پھر تجھے اسلامی عدل کے مظاہرے میں کس کمی کا احساس ہوا؟" ہشام بن عبدالملک کے ایک ایک لفظ سے جلال خلافت کا اظہار ہو رہا تھا۔

اس طویل گفتگو کے دوران پہلی بار حاضرین دربار کو احساس ہوا کہ رومی راہب کا چہرہ چند لمحوں کیلئے بجھ کر رہ گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی بخشی ہوئی مراعات نے راہب کو حد درجہ گستاخ بنا دیا تھا اور وہ نہایت بے حسی کے ساتھ علمائے اسلام سے استہزا کر رہا تھا پھر جب ہشام نے اس سے لہجہ بدل کر بات کی تو وہ کچھ دیر کے لئے سہم گیا۔ مگر یہ ایک عارضی کیفیت تھی۔ چند ساعتیں عالم سکوت میں گزریں اور پھر رومی راہب اسی

انداز میں بولنے لگا۔

"میرا آخری سوال یہ ہے کہ اس وقت خدا کیا کر رہا ہے؟"

رومی راہب کے تینوں سوالات مکمل ہو چکے تھے۔ دربار خلافت میں جمع ہونے والے تمام مسلمان علماء نے پہلے دو سوالات کے سلسلے میں اپنی عاجزی کا اظہار کر دیا تھا پھر جب رومی راہب کے ہونٹوں پر تیسرا سوال آیا تو اہل دربار کو اندازہ تھا کہ یہ سوال بھی تشنہ جواب ہی رہے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ایک عالم بھی رومی راہب کے اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ ویسے برسر دربار جس قدر بھی جوابات دیئے گئے۔ ان کا حاصل کچھ اس طرح تھا۔

کسی نے کہا خدا کو انسان اپنی ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس صورت میں خدا کا فعل بھی حلقہ چشم کی دسترس سے دور ہے۔ کسی نے کہا کہ خدا صرف ارادہ کرتا ہے اور فرشتے اس کی مرضی کو عالم اسباب میں نافذ کرتے ہیں۔

کسی نے کہا کہ خدا لامحدود ہے اور انسانی حواس انتہائی محدود۔ پھر ایک محدود شے کسی لامحدود ہستی کے کاموں کا جائزہ کس طرح لے سکتی ہے؟

غرض اسی قسم کے جوابات تھے جو مسلمان علماء کی طرف سے دیئے گئے۔ فی الوقت اگر ان جوابات پر اسلامی عقائد کے اعتبار سے غور کیا جائے تو جو کچھ علمائے اسلام نے کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست مگر رومی راہب کے نقطہ نظر سے پیش کئے جانے والے دلائل سخت ناکافی تھے۔ بنیادی طور پر وہ تو یہ چاہتا تھا کہ معاذ اللہ خدا کے عمل کی تشریح اس طرح کی جائے کہ اسے انسانی عقل فوراً قبول کر لے۔ اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

بالآخر ایک مسلمان عالم جو خاموشی کے ساتھ اس مناظرے کے تماشائی تھے رومی راہب کو مخاطب کر کے بولے۔ "بے شک! ہمارا سرمایہ علم تمہارے کسی کام نہیں آیا۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کہ ہمارے ذہنوں کی رسائی تمہارے قائم کردہ معیار تک ممکن نہیں۔ مگر کیا تم ذاتی حیثیت سے ان سوالات کا جواب دے سکتے ہو؟" مسلمان عالم نے اس پراگندہ خیال راہب کو محصور کرنے کی کوشش کی۔

مگر وہ تو منصوبہ ساز تھا۔ اسے کسی طرح بھی الفاظ کے پیچ وخم میں الجھایا نہیں جا سکتا تھا۔

"تمام دربار گواہ ہے کہ میں نے خدا کو پہچاننے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ میرے ذہن میں تو پہلے ہی بے شمار شکوک وشبہات موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان میرے ان سوالات کا جواب دیں"۔ پھر کسی مسلمان عالم نے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے نزدیک خدا کا تصور جداگانہ ہے۔ ہم اس ہستئ مقدس کو انسانی حرکات کے دائرے میں لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"اس کا واضح مطلب ہے کہ تم لوگ بھی خدا کی ذات پر محض اندھا یقین رکھتے ہو۔" اب رومی راہب دوسرے انداز سے مسلمانوں کو چھیڑ رہا تھا۔ "پھر تمہارا یہ دعویٰ بھی کھوکھلا اور بے دلیل ہے کہ تم اس زمین پر خدا کو سب سے زیادہ جاننے والی مخلوق ہو۔ بہر حال مجھے اپنی زحمت سفر پر خوشی بھی ہے اور شدید تکلیف کا احساس بھی۔ خوشی اس لئے کہ میرے تمام اندازے درست نکلے۔ مجھے بحث اور مناظرے سے پہلے یقین کامل تھا کہ تم لوگ میرے سوالات کے جواب دینے سے عاجز رہو گے۔ آج میں اپنے اس تصور کو اپنی آنکھ سے عملی دنیا میں کامیاب ہوتے دیکھ رہا ہوں اور دوران سفر مصائب کا احساس اس لئے ہے کہ میں جس مقصد کے لئے عیش وآرام ترک کر کے گھر سے نکلا تھا' وہ تکمیل نہ پا سکا۔ میں نے دمشق آنے سے پہلے سوچا تھا کہ اگر کسی مسلمان نے عقل کے آئینے میں میرے سوالوں کے جوابات

دے دیئے اور مجھے میری مرضی کے مطابق مطمئن کر دیا تو میں خود بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔ مگر افسوس! ایسا نہ ہو سکا۔ میں بہت دن تک اس قوم سے مخاطب رہا جو خود ہی بے خبر تھی پھر مجھے کس طرح خبر دیتی۔"

ہشام کے دربار پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ رومی راہب کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ بالآخر خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو درمیان میں مداخلت کرنا پڑی۔

"میں اپنے مہمان کے جارحانہ روّیے کی شکایت نہیں کرتا۔" ہشام کے لہجے میں بڑا تحمل تھا۔ "مناظرہ و بحث کا اپنا ایک انداز ہے۔ اگر یہ انداز سنجیدگی کی حدود سے نکل کر تضحیک کے دائرے میں داخل ہو جائے تو اصولی طور پر مناظرے کی روح مر جاتی ہے۔ ہمارے مسلمان علماء فی الوقت ایک غیر مسلم شخص کو مطمئن نہ کر سکے' یہ ایک حقیقت ہے مگر اس صورت حال کی تعبیر مجرمانہ انداز میں نہیں کی جا سکتی۔" یہ کہہ کر ہشام بن عبدالملک نے رومی راہب کی طرف غور سے دیکھا "میرے خیال میں یہ بحث کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو چکی ہے مگر میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ابھی یہ مناظرہ اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچا ہے۔ رومی مہمان کو سمجھ لینا چاہئے کہ مملکت اسلامیہ صرف دمشق تک محدود نہیں۔ بے شک! یہاں علماء کی ایک کثیر تعداد موجود ہے مگر حرف آخر کے طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ مسلمانوں کا علم تمام ہو چکا ہے۔ ابھی اسلامی مملکت میں بے شمار ایسے اہل علم موجود ہیں جو ان پیچیدہ سوالوں کی یورش سے انسانی ذہن کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔"

تمام درباری ہشام بن عبدالملک کے طرز گفتگو پر حیران ہو رہے تھے۔ وہ اپنے خلیفہ کے مزاج سے بخوبی آشنا تھے۔ انہیں علم تھا کہ ان کا صحیح العقیدہ حکمران' رومی راہب کے سامنے اتنی آسانی کے ساتھ شکست تسلیم نہیں کرے گا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ اچانک ہشام کے لہجے میں ایک خاص تبدیلی نمایاں ہو گئی۔ وہ بلند آواز میں رومی راہب کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم ابھی کچھ دن تک دمشق میں قیام کرو گے۔" بظاہر یہ ہشام کی درخواست نظر آتی تھی مگر درپردہ ایک حکم تھا۔ "میں مملکت اسلامیہ کے گوشے گوشے سے اہل کمال کو طلب کروں گا پھر مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ذہن کی تمام گرہیں کھول دیں گے۔ اگر خدا چاہتا ہے کہ اس کی صفات اہل عقل پر بھی روشن ہو جائیں تو وہ اپنی کرشمہ سازی کو زمین پر ضرور ظاہر کرے گا۔ میرا دل پرسوز کہتا ہے کہ وہ آنے والا آ کر رہے گا جس کے حرفوں کی تپش طلسم خانہ دماغ کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔"

اس تنبیہ کے بعد ہشام بن عبدالملک نے دربار برخاست کر دیا اور رومی راہب کے سلسلے میں احکامات جاری کر دیئے کہ اسے سرکاری طور پر تمام آسائشیں فراہم کی جائیں اور مسلمانوں کی روایتی وضعداری کے مطابق رسم میزبانی ادا کی جائے۔

اب رومی راہب' خلیفہ کا مہمان تھا۔ وہ سرکاری عمارات میں آزادانہ گھومتا' لوگوں سے روابط قائم کرتا اور ہر موقع پر مخاطبین کے سامنے اپنے سوالات پیش کرتا۔ عام انسان اس کے ذہن کے تراشے ہوئے معمے کا کیا حل تلاش کرتے؟ ان کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ قیام دمشق کے دوران رومی راہب مختلف حلقوں اور مجلسوں میں بھی جاتا اور اپنے وہی سوالات دہراتا جنہیں سن کر عقل انسانی الجھ کر رہ جاتی۔

روایت ہے کہ اس عرصے میں ہشام بن عبدالملک نے دیگر علماء سے بھی رجوع کیا مگر وہ رومی راہب کے

تراشیدہ چیستاں کو حل نہ کر سکے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی عالم ان سوالوں کے جواب نہ دے پاتا تو ہشام بن عبدالملک کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ پھر وہ انتہائی اضطراب کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں اس طرح پیوست کر لیتا کہ غیر معمولی دباؤ کے سبب رگیں تک ابھر آتیں پھر آسمان کی طرف رخ کر کے خود کلامی کے انداز میں کہنے لگتا۔

''کیا اب کوئی نہیں آئے گا؟ یہ کیسا قحط الرجال ہے کہ مسلمانوں کی صفوں سے ایک بھی مرد ذکی نہیں اٹھتا جو رومی راہب کی زبان بند کر سکے۔ میرا یہ لشکر عظیم' میری یہ تاریخی فتوحات' میرا یہ رعب و جلال آج کتنے حقیر نظر آ رہے ہیں۔''

بعض عاقبت نا اندیش مصاحب ہشام کی یہ بے قراری دیکھ کر اسے مشورہ دیتے کہ جس طرح اس کی شمشیر اقتدار نے جعد بن درہم اور غیلان بن یونس کی فتنہ انگیزیوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا اسی طرح رومی راہب سے بھی اس کی زبان چھین لی جائے۔

کچھ حاشیہ برداروں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ شیطانی دماغ رکھنے والے راہب کو اسلامی مملکت کی حدود سے باہر نکال دیا جائے تاکہ عوام الناس اس کے فتنہ و شر سے محفوظ رہ سکیں۔

ہشام بن عبدالملک نے اس قسم کے تمام مشورے بغور سنے اور پھر مصاحبوں کو بری طرح جھڑک دیا۔ ''جعد بن درہم اور غیلان بن یونس خود کو مسلمان کہتے تھے مگر ان کی باتیں گمراہ کن تھیں۔ اس لئے ہم نے انہیں ان کے عقائد کے ساتھ دفن کر دیا۔ رومی راہب مسلمان نہیں ہے اور پھر اسلام پر طعنہ زنی بھی نہیں کر رہا ہے۔ میں اسے کس طرح ہلاک کر سکتا ہوں؟ دنیا کیا کہے گی؟ یہودی اور عیسائی میرے اس عمل کی آڑ لے کر اسلام کو کس کس طرح بدنام کریں گے اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ میں اس راہب کو مملکت اسلامیہ کی حدود سے خارج بھی نہیں کر سکتا کہ یہ میرے اہل علم کی شکست فاش ہے۔ میں آج بھی اس یقین کے ساتھ زندہ ہوں کہ خدا کوئی نہ کوئی سبب پیدا کرے گا اور پھر سارا عالم اپنی آنکھوں سے اس راہب کے فلسفے کی عمارت کو زمیں بوس ہوتے دیکھے گا۔''

پھر کچھ دن اور گزر گئے۔ ہشام کا اضطراب بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک روز کسی شخص نے سر دربار اٹھ کر کہا۔

''امیر المومنین! دمشق کے سارے علماء کے ذہن کی آزمائش ہو چکی مگر کوئی بھی راہب کو مطمئن نہیں کر سکا۔ میری گزارش ہے کہ اس سلسلے میں کوفے کے ایک نوجوان تاجر کو بھی طلب کیا جائے۔''

''تاجر؟'' ہشام کی پیشانی پر شکن ابھر آئی۔ ''ایک نوجوان تاجر کو علمی امور میں کیا دخل ہے؟''

کہنے والے نے کہا۔ ''تجارت اس کا آبائی پیشہ ہے اور علم مقصد حیات۔''

''جب بڑے بڑے باکمال اس مسئلے میں عاجز رہے تو پھر ایک نوجوان کے علم پر کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے؟'' ہشام بن عبدالملک نے سوال کیا۔

''امیر المومنین کے فرمودات بجا مگر دنیا میں ایسے شواہد بھی موجود ہیں کہ علمی مسائل کو مخصوص عمر یا پیشے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بے شک! وہ نوجوان تاجر عمر کے اعتبار سے بہت پیچھے ہے مگر فہم و فراست نے اسے اس قدر آگے پہنچا دیا ہے کہ بڑے بڑے سن رسیدہ بزرگ اس کے سامنے عاجز نظر آتے ہیں۔'' کہنے والے نے پوری صداقت کی ساتھ نوجوان فقیہ کا مختصر سا تعارف کرا دیا تھا۔

"وہ کون ہے اور اس کا تعلق کس درس گاہ سے ہے؟" ہشام بن عبدالملک نے نوجوان تاجر کے بارے میں تفصیلات جاننے کی خواہش ظاہر کی۔

بتانے والے نے بتایا۔ "میں ذاتی طور پر اس نوجوان کو نہیں جانتا۔ میں نے سنا ہے کہ اس کا نام ابوحنیفہ ہے اور وہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا شاگرد ہے۔"

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے نام پر ہشام بن عبدالملک چونکا۔ "حماد رحمتہ اللہ علیہ تو بڑے بزرگ ہیں مگر ان کا شاگرد....." ہشام کی بات نامکمل رہ گئی۔ شاید وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی کم عمری کے سبب اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ شاگرد استاد کے سامنے کئی بار اپنی غیر معمولی ذہانت کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ کوفے میں یہی مشہور ہے کہ اس کا ذہن مسائل کے نازک ترین گوشوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ رومی راہب کی کج فہمی کا جواب دے سکے گا۔" ہشام بن عبدالملک کو کوفے کے ایک نوجوان تاجر کی عقل و دانش پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

کہنے والے نے درخواست کے انداز میں کہا۔

"اگر امیر المومنین اسے ایک بار طلب کر لیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟"

"میں رومی راہب کو شکست خوردہ دیکھنے کے لئے مملکت اسلامیہ کے ایک ایک فرد کو دربار میں بلانے کے لئے تیار ہوں' مگر اب میں مسلمان علما کی عاجزی کا منظر برداشت نہیں کر سکتا۔" ہشام بن عبدالملک کے چہرے پر ایک بار پھر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ "میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایک صاحب فہم آئے اور راہب کے قصر توہمات کو ریزہ ریزہ کر دے۔"

"بہت ممکن ہے کہ آپ جس صاحب ادراک کی تلاش میں ہیں' وہ کوفے کا وہی نوجوان تاجر ہو۔" کہنے والا بضد تھا کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو سر دربار طلب کیا جائے اور پھر ان کے سامنے رومی راہب کے سوالات پیش کئے جائیں۔

بالآخر ہشام راضی ہو گیا اور اس نے اجازت دے دی کہ کوفے کے نوجوان تاجر کو عزت و احترام کے ساتھ دربار میں لایا جائے۔ خلیفہ کی آمادگی دیکھتے ہی برق رفتار گھوڑے کوفے کی جانب روانہ ہو گئے۔

پھر ان سواروں نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا پتا دریافت کیا۔ خلافت کے سفیروں کو اس بات پر شدید حیرت تھی کہ اس نوجوان کو بیشتر مقامی باشندے اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ اس کی شہرت و عزت پر روشن دلیل تھی۔ پھر کچھ دیر بعد ان شہسواروں نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مکان تلاش کر لیا۔



خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے قاصد ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے حضور میں

دروازے پر دستک دی گئی اور پھر آنے والا باہر آیا۔ دربار خلافت کے نمائندے اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ واقعتاً نوجوان تھا۔ ایسا نوجوان جس کے نقش و نگار دلکش تھے اور چہرے پر ایک مخصوص روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ حکومت

کے سفیر چند لمحوں کے لئے گنگ ہو کر رہ گئے۔
نوجوان فقیہ کے چہرے کے جلال نے انہیں آمرانہ گفتگو سے باز رکھا تھا۔
"فرمائیے! کیسے زحمت کی؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مخاطب ہوئے تو ہشام کے قاصدوں نے ایک ایسی آواز سنی جو براہ راست دلوں میں اتر جانے والی تھی۔
"نوجوان!" ایک شہسوار نے اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔ "ہم دربار خلافت سے تمہاری جستجو میں یہاں پہنچے ہیں۔ امیر المومنین ہشام بن عبدالملک تم سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔ تم ہمارے ساتھ دمشق چلنے کی تیاریاں کرو۔"
حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ آنے والوں کو خیال گزرا کہ یہ نوجوان دربار خلافت تک جانے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اس اندیشے کے ساتھ ہی ان سفیروں میں سے ایک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "حکومت کی نظر میں تم مجرم نہیں ہو۔ امیر المومنین صرف تم سے ملنا چاہتے۔"
"میں کسی جرم کے احساس سے لرزاں نہیں ہوں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی باوقار آواز گونجی۔ "اگر مجھ سے کوئی جرم سرزد بھی ہو جاتا تو تم لوگ میرے پیروں میں کوئی لرزش محسوس نہ کرتے۔ میں کسی جھجک کے بغیر دربار خلافت میں داخل ہو جاتا اور خود کو امیر المومنین کے سامنے پیش کر دیتا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا طرز گفتار قابل دید تھا۔ کوفے کے نوجوان کی جرأت و بیباکی نے حکومت کے نمائندوں پر گہرے تاثرات چھوڑے تھے۔
"پھر تم پس و پیش سے کام کیوں لے رہے ہو؟" ان میں سے ایک شخص نرم لہجے کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوا۔
ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ سوچنے لگے تھے۔ چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آپ کا ذہن اس طلبی کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے میں مصروف ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ دربار خلافت سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے آپ کو ہشام بن عبدالملک کی دعوت قبول کرنے میں تردد ہو رہا تھا۔
جب خلیفہ کے دوسرے نمائندے نے اپنا سوال دہرایا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔
"میں والدہ محترمہ کے حکم کے بغیر کوفے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی خاموشی کی توجیہ بیان کر رہے تھے۔ "وہ میری جدائی سے مضطرب ہو جاتی ہیں اور میں اپنی ذات سے انہیں کسی اضطراب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔"
"تم اپنی والدہ سے اجازت طلب کر لو۔" خلافت کے قاصدوں نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو سمجھایا۔ "انہیں بتا دو کہ خلیفہ کے سامنے ایک علمی مسئلہ درپیش ہے۔ اس کے حل ہوتے ہی تمہیں تیز رفتاری کے ساتھ کوفے واپس پہنچا دیا جائے گا۔ اس کے سوا خلیفہ کے طلب کرنے کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے۔"
یہ سن کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے مکان کے اندر تشریف لے گئے اور مادر گرامی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ یہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی خاص عادت تھی کہ جب بھی والدہ محترمہ سے گفتگو کرنی ہوتی تو آپ ہاتھ باندھ کر خاموشی کے ساتھ والدہ محترمہ کے روبرو کھڑے ہو جاتے۔ اور اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک کہ مادر گرامی خود مخاطب نہ ہوتیں۔ اس مرتبہ بھی آپ حسب روایت والدہ محترمہ کے حضور پہنچے اور اس مقدس ہستی

کے سامنے اپنا سرخم کر دیا۔

کچھ دیر بعد مادر گرامی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''کہو نعمان! کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ مہربان آواز فضا میں بلند ہوئی اور ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو قرار سا آ گیا۔

''مجھے خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح اپنا مقصد بیان کیا کہ آپ کا لہجہ نہایت عاجزانہ اور آواز بہت مدھم تھی۔

''چلے جاؤ۔ آخر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' مادر گرامی نے مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔ ''نعمان! تمہارے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم دربار خلافت میں جانا نہیں چاہتے۔''

''یہ خدائے بے نیاز کا کرم ہے کہ نعمان کو اقتدار کی قربت کسی عنوان بھی گوارا نہیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بدستور نظریں جھکائے بول رہے تھے۔ ''اور یہ آپ ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اس نے نعمان کو دنیاوی جاہ و حشم سے بے پروا کر دیا ہے۔''

''پھر وہ کیا چیز ہے جو تمہیں دربار خلافت تک جانے سے روک رہی ہے؟'' والدہ محترمہ نے اپنے فرزند سے استفسار کیا۔

''حکومت کے چند نمائندے جو مجھے لینے کے لئے آئے ہیں' ان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ ہشام کو کوئی علمی مسئلہ درپیش ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مادر گرامی کی بارگاہ میں عرض کیا۔ ''میں قیاس سے کہتا ہوں کہ وہ کوئی عام مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس ذیل میں علمائے دمشق بھی طلب کئے گئے ہوں گے۔ اگر مسئلہ حل ہو جاتا تو ہشام بن عبد الملک کو میری ضرورت کیوں پیش آتی؟

کوئی سوال تشنہ جواب ہے اور پھر خلیفہ وقت ذاتی طور پر مجھے جانتا بھی نہیں۔ اس صورت حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں عنقریب کسی آزمائش میں مبتلا ہونے والا ہوں۔''

آزمائشوں سے نہ گھبراؤ۔'' مادر گرامی نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ''آزمائش مزاج قدرت بھی ہے اور تمہاری خاندانی روایت بھی۔ قدرت انہی لوگوں کو اس کار عظیم کے لئے منتخب کرتی ہے جنہیں وہ زمین پر بلند دیکھنا چاہتی ہے۔''

''مادر گرامی! نعمان کی تو پہچان ہی آپ کی دعاؤں کے سبب ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ عرض کرنے لگے۔ ''میں ان ساعتوں میں بھی آپ ہی کی دعاؤں کا طلب گار ہوں۔ اگر آپ کی چشم کرم نعمان کی طرف سے پھر جائے تو کون ہے جو مجھے خدا کے غضب سے محفوظ رکھ سکے اور میں آزمائش کے مرحلے سے سلامتی کے ساتھ گزر سکوں۔'' بڑے عجیب انداز میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دعا کی درخواست کی تھی۔

''نعمان! تم جاؤ۔ جب تک واپس نہیں آ جاؤ گے میں اپنے رب کے حضور تمہارے لئے عافیت طلب کرتی رہوں گی۔''

اب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر ایک ایسی طمانیت کا عکس موجود تھا جو عالم اسباب میں کسی کا حاصل ہوتی ہے۔

پھر آپ بارگاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں پہنچے اور استاد گرامی سے اجازت طلب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ہشام کو

کسی علمی مسئلے میں میری ضرورت ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی آواز سے لرزش نمایاں تھی۔ ''میں علم کی دنیا کا ایک نووارد مسافر تھا جو قدم قدم پر بھٹک رہا تھا پھر ایک رہنما نے مجھے میری منزل کا پتا دیا۔ میں آگہی کے شہر کا رہنے والا ایک لاوارث بچہ تھا جسے ایک مہربان اور عظیم انسان نے تربیت دی۔ وہ بچہ پرورش پا کر اب جوان ہوا ہے تو ساری دنیا کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں۔ میں اس بات سے سخت اذیت میں مبتلا ہوں کہ استاد گرامی کی موجودگی میں ایک کم فہم شاگرد کو طلب کیا گیا ہے۔'' ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کر رہے تھے۔

''جس بچے کو اپنے بزرگوں کی خوشنودی کا اس قدر خیال ہے' وہ بچہ دونوں جہان میں شرف یافتہ ہے۔ اسے کسی کا خوف نہیں ہونا چاہئے۔ سارے سن رسیدہ اور سارے برگزیدہ اس بچے کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ بالآخر وہی بچہ سرخرو ہوگا۔ خدا اس بچے کی دلی کیفیات سے بخوبی واقف ہے اور دل ہی انسان کو بارگاہ ذوالجلال میں پسندیدہ بناتا ہے۔ جان حماد! جاؤ۔ تم اس راہ میں تنہا نہیں ہو۔''

پھر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' مادر گرامی اور حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی دعاؤں کے سائے میں دمشق کی طرف روانہ ہوئے۔

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہشام کے دربار میں

دربار خلافت میں موجود ہر شخص حیران تھا۔ حاضرین کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ رومی راہب جیسے پیچیدہ اور جہاندیدہ انسان کے سوالات کا جواب دینے کے لئے ایک ایسے نوجوان کو لایا جائے گا جس کی عمر کسی طرح بھی چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور وہ اپنے لباس کی وضع قطع اور چہرے کے رنگ سے اس قدر باوقار معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اپنے دلوں پر اس کا جلال محسوس کرنے لگے تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے بھی ایک خاص نگاہ سے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور اس نے اپنے ہی خیالات کو جھٹلا دیا۔ کوفے کے نوجوان تاجر کا سراپا' علم کا پیکر نظر آتا تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے خلیفہ اور دیگر حاضرین دربار کو اسلامی انداز میں سلام کیا اور دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک بار پھر آپ کی ہیبت چھا گئی۔ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا انداز خوشامدانہ تھا نہ گستاخانہ' آپ کے طرز عمل میں اعتدال تھا اور ایک باوقار بے نیازی تھی۔

''نوجوان!'' ہشام بن عبدالملک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوا۔ ''دمشق کے کچھ لوگ تمہاری ذہانت کے قائل ہیں۔ میں ذاتی طور پر تمہاری شخصیت سے واقف نہیں پھر بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہارا یہ فرض ہے کہ تم ہمارے مہمان رومی راہب کے چند سوالات کا جواب عقل کی روشنی میں دو۔ دربار میں ایک بار پہلے بھی مجلس مناظرہ آراستہ ہو چکی ہے۔ پہلے بھی کچھ علماء نے اپنے علم کی روشنی میں ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ رومی راہب کو مطمئن نہ کر سکے۔ اب اہل شہر کی نظریں تمہاری جانب ہیں۔ تم اپنے امیر کی بے قراریوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میرے شب و روز ایک اسی فکر میں بسر ہوتے ہیں کہ وہ آنے والا کب آئیگا اور ایک ایسے شخص کو عاجز کر دے گا جس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ علمائے اسلام پر طعنہ زن ہے۔ نوجوان! آگے بڑھو۔'' ہشام بن عبدالملک' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوا۔ تاریخ آدم کا یہ ذہین ترین نوجوان دربار کی

رسموں کے مطابق خلیفہ کی نشست کے عین سامنے کھڑا تھا۔ ہشام کے دائیں جانب مملکت کے سربرآوردہ وزیر بیٹھے تھے اور عین بائیں جانب رومی راہب کبر و غرور کی ایک خاص ادا کے ساتھ موجود تھا۔ ہشام کا حکم پاتے ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ کی نشست کے روبرو، بہت قریب آ کر ٹھہر گئے۔

پھر آپ نے باوقار انداز میں اس رومی بوڑھے کی طرف دیکھا جس نے کئی ماہ سے علم کے نام پر ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ ''محترم راہب! اگرچہ ہم دونوں کی منزلیں جدا جدا ہیں لیکن پھر بھی علم دنیا کے ہر باہوش انسان کا ورثہ ہے۔'' ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا طرز کلام عجیب تھا۔ دربار پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ ''علم کے حوالے سے میرے اور آپ کے درمیان ہر وقت گفتگو ہو سکتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ جن سوالات نے خود آپ کو بھی وسوسوں اور اندیشوں کا شکار کر دیا ہے' انہیں میرے سامنے بیان کریں۔ شاید خدا مجھ کم علم کے ذریعے آپ کی مشکل کشائی پر راضی ہو جائے۔''

رومی راہب کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر نظر ڈالتا اور اہل دربار کی طرف دیکھنے لگتا۔ حاضرین محسوس کر رہے تھے کہ پہلی بار ایک کوئی نوجوان نے اسے اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ کچھ لمحے اسی عالم سکوت میں گزر گئے پھر رومی راہب نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور اسی سرکش لہجے میں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوا جس کا مظاہرہ وہ ہر اہل علم کے سامنے کر چکا تھا۔

''میرا پہلا سوال یہ ہے کہ......'' ابھی رومی راہب کا سوال مکمل ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ ہشام کے دربار میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی پرجلال آواز ابھری اور راہب کی گفتگو منقطع ہو گئی۔

''یقیناً میری یہ حرکت آپ پر گراں گزری ہو گی۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' رومی راہب سے مخاطب تھے۔ ''میں خود بھی جانتا ہوں کہ میرا طرز عمل آداب مجلس کے خلاف ہے مگر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ آپ کی حیثیت ایک سائل سے زیادہ نہیں۔ اگر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ آپ کے در پر کچھ طلب کرنے کے لئے حاضر ہوتا تو پھر وہ سائل قرار پاتا۔ فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ آپ مجھ سے کسی چیز کی طلب رکھتے ہیں اور طلب رکھنے والے کا یہ انداز ہرگز نہیں ہوتا کہ مانگنے والا اپنی نشست پر اطمینان سے بیٹھا رہے اور دینے والا اس طرح کھڑا رہے جیسے وہ خود سائل ہو۔''

دربار میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے کلام کی صدائے بازگشت باقی تھی اور رومی راہب کے چہرے پر ندامت و شرمساری کے کئی رنگ ابھر کر ڈوب چکے تھے۔

''نوجوان! آخر تم کیا چاہتے ہو؟'' جواباً رومی راہب نے کہا اور پہلی بار حاضرین نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش موجود ہے۔

''اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ اپنی نشست سے اتر کر میری جگہ کھڑے ہو جائیں۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے مجلس علم میں اسی روایت کو زندہ و تابندہ دیکھا ہے۔''

رومی راہب اس جرأت گفتار کی تاب نہ لا سکا اور خاموشی کے ساتھ اپنی نشست چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ باوقار انداز میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہشام بن عبدالملک کی بائیں جانب تشریف فرما ہوئے

جہاں چند لمحے قبل رومی راہب بیٹھا ہوا تھا۔
"اب آپ اپنے سوالات دہرائیں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "میں توفیق الٰہی کے سہارے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔" کچھ دیر کے لئے دربار خلافت پر ایسا سناٹا چھا گیا کہ وہاں کسی ایک متنفس کی موجودگی کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔
پھر رومی راہب کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "خدا سے پہلے کون تھا؟" یہ کہتے کہتے رومی راہب کے چہرے پر طمانیت کا رنگ ابھر آیا تھا جیسے وہ خیالوں کی دنیا میں کوفے کے نوجوان تاجر کو بھی دیگر علمائے اسلام کی طرح شکست سے دوچار ہوتے دیکھ رہا ہو۔
"اعداد کو شمار کرو۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ایک لمحہ سوچے بغیر ارشاد فرمایا۔
رومی راہب اس صورت حال کے لئے تیار نہیں تھا کہ جس شخص سے سوال کیا جا رہا ہے' وہ جواب دینے کے بجائے خود اس سے ایک نیا سوال کر دے گا۔ نتیجتاً وہ خاموش رہا اور حیرت سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھتا رہا۔
پھر جب آپ نے دوبارہ اس سے اعداد کے شمار کے لئے کہا تو وہ ترتیب کے ساتھ گنتی گننے لگا۔ رومی راہب ابھی دس کے عدد تک پہنچا تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "یہ تو اعداد کے شمار کا عام طریقہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک سے پہلے کا عدد بتاؤ۔"
رومی راہب ایک لمحے کے لئے گھبرا گیا پھر اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "کوئی بھی ذی ہوش انسان ایک سے پہلے کا عدد شمار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ایک سے پہلے کوئی دوسرا عدد موجود نہیں۔"
"یقیناً موجود ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "میرا علم مجھے بتلاتا ہے کہ ایک سے پہلے بھی کوئی عدد موجود ہے۔"
"ہرگز نہیں۔" رومی راہب کی آواز معمول سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ "علم ریاضی کے ماہرین خوب جانتے ہیں کہ ایک سے پہلے بھی ایک ہے۔"
"آپ کے ایک سوال کا جواب دے دیا گیا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت تحمل کے ساتھ فرمایا۔ "دوسرا سوال کیا ہے؟"
اس طرز گفتگو پر رومی راہب بدحواس ہو گیا۔ "ابھی میرا پہلا سوال جواب سے محروم ہے۔"
"جب ایک سے پہلے بھی ایک ہی موجود ہے تو پھر خدا سے پہلے بھی خدا تھا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح فرمایا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر نہ غرور و کبر کا رنگ نمایاں تھا اور نہ لہجے میں کسی طنز کی جھلک تھی۔ بس ایک عالمانہ وقار تھا جس پر آپ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا تھا۔
دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ہشام بن عبدالملک شدید اضطراب کے عالم میں اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا اور رومی راہب کی پوری شخصیت وحشت ناک کرب کے گرداب میں الجھ کر رہ گئی تھی۔
حاضرین سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اچانک دربار خلافت میں کوفے کا ایک نوجوان داخل ہو گا اور اس بوڑھے راہب کو عام سی درس گاہ کے ایک معمولی طلب علم کی مانند عاجز کر دے گا۔ جس طرح راہب کا سوال محیر العقول تھا'

اسی طرح حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب بھی ذہانت و برجستگی کی اعلیٰ ترین مثال تھا وہ کفرشکن آواز کیا ابھری کہ فضائیں ساکت ہو کر رہ گئیں اور ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس مناظرے کے تماشائیوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نبض کائنات رک گئی ہے اور وقت سے اس کی رفتار چھین لی گئی ہے۔

مسلسل کئی ماہ سے مشرکین کے دماغوں کا تراشا ہوا ایک فتنہ ملت اسلامیہ کی سادہ اور معصوم روحوں پر کسی عفریت کی مانند مسلط تھا۔ جب لوگ مایوسی کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں گم ہو چلے تھے' اس وقت ایک نوجوان نے افق علم پر طلوع ہو کر تاریکی کے سینے میں گہرا شگاف ڈال دیا تھا اور اہل ایمان کے ہونٹوں کا گم شدہ تبسم دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ اہل دمشق کا خیال تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ باقی دو سوالات کے جواب بھی اسی سہل اندازی کے ساتھ دیں گے اور رومی راہب کا علم اپنی تمام تر کثافتوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے گا۔

پہلے ہی مرحلے میں رومی راہب بھی اپنی شکست دیکھ کر بدحواس ہو گیا تھا' مگر وہ زمانے کے سرد و گرم سے آشنا ایک عیار شخص تھا۔ اس نے چند لمحوں میں خیالات کی پریشانی پر قابو پا لیا اور اپنے چہرے سے وحشتوں کے تمام آثار مٹا دیئے۔ اب وہ پہلے کی طرح مسلمانوں کے قافلہ علم پر شب خون مارنے والا ایک تند و تیز قزاق تھا۔

یکا یک ہشام بن عبدالملک کے دربار میں اس کی کریہہ آواز ابھری۔ ''میرے نزدیک یہ ایک معمولی سوال تھا۔'' رومی راہب اپنی شکست کی عجیب و غریب توجیہ پیش کر رہا تھا۔ ''میرے خیال میں خدا کے وجود سے پہلے دوسری ہستی کے وجود کو ثابت کرنا کوئی دشوار مسئلہ نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر بوڑھا راہب خاموش ہو گیا اور استہزائیہ نظروں سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی جانب دیکھنے لگا۔

''مشکلیں اور آسانیاں تو حیات آدم کا ایک حصہ ہیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے رومی راہب کی لاف زنی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ''محترم مہمان کو چاہیئے کہ وہ ان فروعی باتوں سے گریز کر کے اپنے ذہنی شکوک و شبہات بیان کریں تا کہ رسالت مآب ﷺ کا یہ گناہ گار و عاجز' نام لیوا' اس شخص کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے جو واضح نشانیاں ہونے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا ہے۔''

پیغمبر اسلام ﷺ کا نام سن کر رومی راہب ظاہری طور پر تو اپنی کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کر سکا مگر اس کے چہرے پر اچانک ابھرنے والا اضطراب اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ رسول ﷺ ہاشمی سے اپنے دل میں بغض و عناد رکھتا ہے اور یہ فطری امر تھا۔ یہود و نصاریٰ کے علماء نے آگہی کے باوجود خاتم النبیین ﷺ کی رسالت کا انکار کیا تھا۔ وہ تو بس یہ سمجھتے تھے کہ (معاذ اللہ) خدا اور فرشتے' بنی اسرائیل کے پابند ہیں۔ جب بھی کوئی پیغمبر اعلان نبوت کرے گا تو اس کا مرکز و محور سرزمین یہود ہو گی اور جب بھی کوئی فرشتہ وحی لے کر آسمان سے اترے گا تو بیت المقدس کے بلند مینارے اس کے گواہ ہوں گے۔ رومی راہب بھی اپنی اسی کج روی کے سبب ذکر خیر البشر ﷺ سے خوش نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی گفتگو کا رخ موڑ دیا اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ خدا کا رخ کس طرف ہے؟'' بالآخر رومی راہب نے اپنا دوسرا سوال بیان کیا۔

''خدا کو کسی ایک سمت میں قید نہیں کیا جا سکتا۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اسی باوقار لہجے میں فرمایا۔ ''یہ ذات ذوالجلال کے بارے میں سوئے ظن ہے کہ اس کا رخ متعین کر دیا جائے۔ جس طرح وہ اپنی قدرت میں لامحدود ہے اسی طرح اس کا رخ بھی کسی ایک جانب نہیں ہے۔''

"نوجوان! تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خدا ہر طرف ہے؟" رومی راہب نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ کی گرفت کی کوشش کی۔

"بے شک! خدا ہر جگہ موجود ہے اور اس کا رخ نورانی ہر طرف نگراں ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے پریقین لہجے میں فرمایا۔

"خدا کی ذات کے بارے میں یہ ایک عام قول ہے۔" رومی راہب نے تمسخر کے انداز میں کہا۔ "میں یہی سنتا آیا ہوں مگر انسانی آنکھ اور عقل اس دعوے کا عملی ثبوت چاہتی ہے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر آپ نے رومی راہب کو نظر انداز کر کے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی طرف دیکھا۔ "امیر المومنین! ہمارے محترم مہمان ہر شے کو عالم اسباب میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس لئے میں درخواست کروں گا کہ مجھے ایک مومی شمع فراہم کر دی جائے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مطالبہ بڑا عجیب تھا۔ چند ساعتیں عالم سکوت میں گزر گئیں۔ دیگر درباری تو پہلے ہی دم بخود تھے' ہشام بھی اب کوفے کے اس نوجوان کی شخصیت کا اسیر ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو شمع فراہم کر دی گئی۔

آپ چند قدم آگے بڑھے اور ایک بلند جگہ پر شمع روشن کر کے رومی راہب سے فرمانے لگے۔ "میں اپنے معزز مہمان سے یہ سوال کرنا پسند کروں گا کہ اس شمع کا رخ کس طرف ہے؟"

رومی راہب گھبرا گیا پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "شمع کا کوئی ایک رخ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس صورت میں کسی سمت کا صحیح اندازہ ممکن نہیں۔"

"آخر کیوں؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوسرا سوال کیا۔

"یہ ایک عام سی بات ہے کہ بعض اوقات روشنی ایک ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے جب انسان کے لئے اس کی کسی مخصوص سمت کا اندازہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔" رومی راہب کی آواز بلند تھی اور اس کے لہجے نے کسی فلسفی کا آہنگ اختیار کر لیا تھا۔ "جلتی ہوئی شمع کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی روشنی ہر طرف بکھری ہوئی ہے پھر کون ذی ہوش ہے جو روشنی کو ایک دائرے میں قید کر سکے۔"

"اے ارض روم کے معزز شخص! جب ایک معمولی شمع کا رخ متعین نہیں کیا جا سکتا تو پھر انسانی ذہن کا یہ کیسا خلل ہے کہ وہ خدا کی صورت گری کے لئے مجرمانہ سرکشی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی' مگر ایک ایک لفظ سے جلال روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اگرچہ خدا کی ذات جلیل کے لئے شمع کی مثال ایک توہین آمیز عمل ہے لیکن جب بنی نوع انسان شوریدہ سر ہو جائے تو پھر بات کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے مادی تشبیہات و استعارات کا سہارا لیا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی طرف دیکھا۔ ہشام اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھا اور اس کی نگاہیں مستقل کوفے کے اس نوجوان پر مرکوز تھیں۔ وہ نوجوان جس کے کاروان عمر نے علم کے راستے میں ابھی چند منزلیں طے کی تھیں مگر اس کی ذہنی سطح ان تمام مسافروں سے بلند نظر آتی تھی جو تحقیق و جستجو میں زیست بسر کرنے کے بعد بوڑھے ہو چکے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے ہشام کی نظروں میں ایک خاص جذبے اور ایک خاص عقیدت کی چمک موجود تھی۔ "امیر

المومنین! میں مجبور ہوں کہ محترم راہب کو سمجھانے کے لئے مجھے ایک مادی شے کا سہارا لینا پڑا۔"

ہشام بن عبدالملک کے چہرے پر طمانیت کا واضح رنگ ابھر آیا۔ "نوجوان! تمہارا طریقہ بحث نہ صرف جائز ہے بلکہ دیگر اہل علم کے مقابلے میں منفرد بھی ہے۔ میں خوش ہوں کہ تم ہمارے رومی مہمان کی تشنہ عقل کو سیراب کر رہے ہو۔

ہشام کی پسندیدگی دیکھ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ دوبارہ رومی راہب سے مخاطب ہوئے۔ "جس طرح شمع کا چہرہ چاروں طرف ہے اسی طرح خداوند ذوالجلال کا رخ بھی ہر طرف موجود ہے۔" یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔

رومی راہب کوفی نوجوان کی اس طاقتور دلیل کے سامنے عاجز تھا۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ سرگریباں بوڑھا یقیناً کوئی نیا حیلہ تراشنے کے لئے عقل کی انتہائی حدوں تک سوچ رہا ہوگا مگر در پردہ اس کے غور و فکر کے تمام چشمے خشک ہو چکے ہوں گے اور اس کا پراگندہ ذہن کسی اجاڑ صحرا کی مانند ہوگا جہاں ہر طرف شکست و ریخت کی آندھیاں چل رہی ہوں گی اور ناکامی و محرومی کا جلتا ہوا غبار اٹھ رہا ہوگا۔

رومی راہب کا سکوت طویل ہوا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی باوقار آواز دوبارہ گونجنے لگی۔ "صرف مسلمان ہی نہیں، وہ لوگ بھی جو اہل کتاب ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، اس راز سے باخبر ہیں کہ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر نور کا کوئی رخ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر سمت میں ہے اور ہر طرف موجود ہے۔ یہاں تک کہ ساری کائنات اس کے حصار قدرت میں سمٹ گئی ہے۔ نور کا وہ دائرہ ہر شے پر محیط ہے۔ جس طرح شمع کی روشنی چاروں طرف نگراں ہے، اسی طرح خداوند ذوالجلال کے حلقہ بصارت سے کوئی ایک ذرہ بھی باہر نہیں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی یہ نکتہ آفرینی دیکھ کر پورا دربار بے قابو ہو گیا، ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق آپ کی شان میں رطب اللسان تھا۔ کیا خلیفہ ہشام بن عبدالملک، کیا امراء، کیا وزراء اور کیا عام درباری ہر شخص کی زبان پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے تحسین و ستائش کے پرجوش کلمات تھے۔

رومی راہب کا اضطراب ناقابل بیان تھا۔ دونوں مرحلوں میں اسے سخت ندامت و شرمساری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بظاہر تیسرا سوال باقی تھا مگر حاضرین دربار جانتے تھے کہ رومی راہب کے ذہن کی یہ آخری پناہ گاہ بھی حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دسترس سے دور نہیں ہے۔

کچھ لمحے مکمل سکوت کے عالم میں گزر گئے۔ رومی راہب اپنے منتشر خیالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی روشن و تابناک نظریں رومی راہب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب خاموشی کی ایک ساعت بھی آپ کے قلب حساس پر گراں گزر رہی ہے۔

بالآخر رومی راہب کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اگرچہ بوڑھے رومی نے اپنے لہجے کو بلند رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی، لیکن اس کی آواز کی تھکن نمایاں تھی۔ ہشام کے درباری محسوس کر رہے تھے کہ یہ ایک ایسے شکست خوردہ انسان کی صدا ہے جو اپنے مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے مگر پھر بھی اس امید پر بازی کھیل رہا ہے کہ شاید وقت کی تیز ہوا بساط کو الٹ کر رکھ دے اور مملکت اسلامیہ میں اس کے نام نہاد علم کا تھوڑا بہت بھرم باقی رہ جائے۔

"نوجوان! تمہارا عقیدہ ہے کہ خدا ہمہ وقت بیدار رہتا ہے، اسے اونگھ بھی نہیں آتی۔" رومی راہب نے گفتگو کا

آغاز کرتے ہوئے سورہ البقرہ کی ایک آیت کا سہارا لیا تھا۔ ”اور تم کہتے ہو کہ خدا ایک ایک لحہ کائنات کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔“ رومی راہب مسلسل آیات الٰہی کا تحفظ لے کر بول رہا تھا۔ ”اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ خدا پر جمود طاری نہیں، وہ مستقل حرکت میں رہتا ہے۔“ اتنا کہہ کر رومی راہب خاموش ہو گیا۔

”بے شک! ہمارا یہی عقیدہ ہے۔“ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ ”مگر خدا کے متحرک رہنے کی مثال کسی جاندار شے کی حرکت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ خدا کا عمل ایک خاص عمل ہے، جسے ہم دنیا کے پیرائے میں بیان نہیں کر سکتے۔“

”جب خدا اتنا فعال ہے تو بتاؤ کہ وہ اس وقت کیا کر رہا ہے؟“ رومی راہب نے ہشام بن عبدالملک کے دربار میں اپنا تیسرا اور آخری وسوسہ بھی بیان کر دیا۔

اہل دمشق اور ہشام بن عبدالملک کے درباری، رومی راہب کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ کئی بار سن چکے تھے۔ اکثر لوگوں نے اس شخص کو فاتر العقل اور وحشت زدہ قرار دیا تھا، مگر اہل نظر کے نزدیک وہ دیوانہ نہیں تھا۔ اس نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنا سوال نامہ ترتیب دیا تھا اور اس کے قائم کردہ تینوں سوالوں میں ایک ہی نکتہ پوشیدہ تھا کہ مسلمان کسی نہ کسی طرح خدا کی تجسیم ظاہری کے بارے میں سوچنے لگیں۔ اگر ایک بار اہل ایمان کے ذہن اس طرف متوجہ ہو جاتے تو پھر گمراہیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ رومی راہب کے آخری سوال سے بھی یہ فریب کار صورت حال واضح ہو جاتی تھی کہ (معاذ اللہ) خدا دیگر اشیاء کی طرح ظاہری جسم رکھتا ہے اور اس کی حرکت و فعل کو انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اتمام حجت کے لئے اپنے نظریات پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”کسی شے کے فعل کو عالم اسباب میں دیکھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنا ظاہر وجود رکھتی ہو۔ ہم جس خدا پر ایمان لائے ہیں، وہ اول و آخر کسی شرکت کے بغیر اس کائنات کا خالق ہے۔ اصولی طور پر خالق و مخلوق میں ایک نمایاں فرق ہونا چاہئے۔ اگر کسی آنکھ کی بینائی زائل نہ ہوئی ہو تو خدا اور انسان کے درمیان اس فرق کو بڑی آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ زمین پر بنی نوع انسان کا وجود ثابت کرنے کے لئے خدا نے اسے ایک مخصوص شکل عطا کی۔ اب اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کا خالق بھی ظاہر جسم کا پابند ہو جائے تو یہ محض دیوانگی ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان اس فرق کو کسی طرح بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔“ یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے رومی راہب کی طرف دیکھا۔ ”اگر ہم اس فرق کو تسلیم کر لیں تو خدا کی برتری اسی طرح ظاہر ہوتی ہے کہ جسم ظاہر سے بے نیاز ہو جائے۔ پھر جب خدا مادی وجود سے ماورا ہو جاتا ہے تو انسانی آنکھ بصارت کے عام اصول کے مطابق ”اللہ کی ہستی“ کا تصور نہیں کر سکتی اور جب یہ تصور ممکن نہیں تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت خدا کیا کر رہا ہے؟“

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دلائل سن کر اہل دربار پر سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں کے لئے خلیفہ ہشام بن عبدالملک بھی پریشان سا نظر آنے لگا۔ حاضرین کے خیال میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک عام مسلمان عالم کی طرح بحث کر رہے تھے جسے سن کر رومی راہب مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ رومی راہب جو کچھ دیر پہلے تک نہایت شکستہ اور غمزدہ نظر آ رہا تھا، ایک بار پھر اپنے آپ کو اس معرکہ آرائی میں توانا محسوس کرنے لگا۔ ”میں خدا کی تجسیم ظاہر و باطنی کے متعلق کچھ جاننا نہیں چاہتا۔“ رومی راہب

کے لہجے کی تندی و تیزی دوبارہ لوٹ آئی تھی۔ ”میرا سوال خدا کے موجودہ فعل سے ہے کہ وہ اس وقت کیا کر رہا ہے۔“

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ چند ساعتوں کے لئے خاموش رہے پھر آپ نے بڑی وارفتگی کے عالم میں فرمایا۔ ”کچھ دیر پہلے میرا خدا اس کام میں مصروف تھا کہ اس نے آپ جیسے معزز و محترم شخص کو درباری نشست سے اتار کر فرش پر کھڑا کر دیا تھا اور کوفے کے ایک عام نوجوان کو خلیفہ وقت کے برابر بیٹھنے کا اعزاز بخشا تھا۔ اب میرے خدا کی نئی مصروفیت یہ ہے کہ اس نے روم کے عظیم دانشور کو ایک ایسے طالب علم کے سامنے عاجز کر دیا جس کا علم معمولی ہے۔“ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نہایت انکسار کے ساتھ بول رہے تھے اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے درباری شدید اضطراب کا شکار تھے۔ وہ بار بار ایک کوفی نوجوان کی وسعت علم اور حاضر جوابی کا شاندار الفاظ میں اعتراف کر رہے تھے۔

خود ہشام بن عبدالملک کی زبان پر بھی تحسین و تعریف کے نہایت فراخدلانہ کلمات تھے۔ اموی خلیفہ بے اختیار کہہ رہا تھا۔ ”نوجوان! تم نے میرے حسن ظن کی آبرو رکھ لی۔ مجھے یقین تھا کہ رومی راہب' مملکت اسلامیہ سے ناکام و نامراد نہیں لوٹے گا۔ اچانک کسی گوشے سے میری قوم کا کوئی ذکی و فہیم فرزند اٹھے گا اور عقل پرستوں کے خالی دامنوں کو اس طرح بھر دے گا کہ ان کی ناآسودگیوں کو قرار آ جائے گا۔ میں بحضور رب جلیل تمہاری درازیٔ عمر کا طلب گار ہوں۔

مجھے بتاؤ کہ تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟“ ہشام بن عبدالملک کا مشفقانہ سلوک اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم حصول علم کی خاطر دنیا کی ہر ضرورت سے بے نیاز ہو جاؤ۔ میری خواہش ہے کہ تمہارے شب و روز تحقیق و جستجو کی دنیا میں بسر ہوں۔ حکومت کو تمہارے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس ہے۔ تم اپنی ضروریات بیان کرو۔“

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کم عمری کے باوجود ایک خاص شان بے نیازی سے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی جانب دیکھا اور مسلمانوں کے سربراہ کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے باوقار لہجے میں فرمایا۔ ”میرے لئے یہی اعزاز بہت ہے کہ امیرالمومنین اہل علم کا اس قدر لحاظ رکھتے ہیں۔ خداوند ذوالجلال میری کفالت کر رہا ہے۔ میں کوفے میں ریشمی کپڑے کا ایک تاجر ہوں اور مجھے قدرت کی طرف سے اتنی آسانی فراہم کی گئی ہیں کہ میں حصول معاش کے ساتھ تحصیل علم کی جانب بھی پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ رہوں۔ آپ اس سلسلے میں فکرمند نہ ہوں۔ خدا کی مرضی شامل حال ہوئی تو میرا سفر علم اسی طرح جاری رہے گا۔ ہو سکے تو ان لوگوں کی طرف ضرور دیکھیے جن کا ذوق طلب مجھ سے کہیں زیادہ ہے اور وہ بڑے علم والے ہیں۔ ان پر معاشی مسائل نے اللہ کی زمین تنگ کر رکھی ہے مگر وہ خالی شکم رہ کر بھی جہل کے خلاف مسلسل جہاد کر رہے ہیں۔ شعلہ آگہی نے ان کے دماغوں کو روشن رکھا ہے مگر آتش ضرورت ان کے جسموں کو جلائے دے رہی ہے۔ وہ اہل غیرت ہیں اس لئے کسی کے سامنے اپنے ہاتھوں کو دراز نہیں کرتے۔ وہ اہل دل ہیں اس لئے ان کی آنکھوں میں کوئی عکس سوال نہیں ابھرتا' آپ اسی قافلہ علم کی میزبانی کیجئے کہ یہی کار عظیم ہے' یہی عمل لازوال ہے۔“ نوجوان فقیہ کے باوقار لہجے نے اہل دربار کو زندگی کا نیا درس دیا تھا اور بے نیازی کے نئے آداب سکھائے تھے۔

علامہ موفق رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”مناقب“ میں اس واقعے کا تفصیلی ذکر کیا ہے مگر کسی عنوان یہ ظاہر نہیں

ہوتا کہ رومی راہب کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ مناظرہ کس خلیفہ کے دربار میں ہوا تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے قیاساً تحریر کیا ہے کہ وہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا عہد حکومت تھا اور اسی کے دربار میں یہ تاریخی واقعہ پیش آیا تھا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ یہ واقعہ بغداد میں پیش آیا تھا' مگر اس روایت کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ "شہر بغداد" کی تعمیر منصور کے زمانہ خلافت میں ہوئی تھی اور اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس قسم کے مناظروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ یہ روایت اس لئے بھی مجہول نظر آتی ہے کہ منصور کے دربار میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور پھر سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں اسے اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ وہ کسی مناظرے کی سرپرستی کرتا۔

اکثر عقیدت مندوں کا دعویٰ ہے کہ اس مناظرے کا تعلق حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بچپن سے ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو امام رحمتہ اللہ علیہ کے عہد طفلی سے غیر معمولی واقعات منسوب کر کے اپنے آپ کو "خوش عقیدہ" ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس جماعت کا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب امام رحمتہ اللہ علیہ کی عمر صرف سات سال تھی، عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے رومی راہب کے "عقلی معمے" کا جواب دے کر اس فتنہ گر کو عاجز کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے دعوے کی بنیاد خود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول پر ہے کہ "میں بارگاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں حاضر ہونے سے پہلے علم کلام کی مجلسوں میں بیٹھا کرتا تھا اور اہل بصرہ سے مناظرے کرتا تھا۔" اگر اس دعوے کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ عہد حجاج بن یوسف کے سیاسی تشدد کا عہد تھا اور اس مسموم فضا میں یہ ممکن نہیں تھا کہ خلیفہ کسی رومی راہب اور مسلمان علماء کو اپنے دربار میں مناظرے کی اجازت دیتا۔ عوامی سطح پر اس قسم کے مناظرات کی مجلسیں قائم کی جاتی تھیں مگر سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ حکومت میں انہیں دربار خلافت کا تعاون حاصل نہیں ہوتا تھا کہ ان دنوں "دستور زبان بندی" اسلامی مملکت کے ہر گوشہ زمین پر نافذ تھا۔ اس لئے مجبوراً خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دربار کی جانب دیکھنا ہوگا کہ وہ عقلی شعبدہ بازوں اور مذہبی حیلہ سازوں کی فتنہ سامانیوں سے پوری طرح باخبر رہتا تھا...... اور ان کا قلع قمع کرنے میں طاقت کے بے دریغ استعمال کو بھی جائز سمجھتا تھا۔

بعض تاریخوں میں درج ہے کہ وہ رومی راہب کوفے کے ایک نوجوان کی غیر معمولی ذہانت اور وسعت علم سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے دین اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ غیر مسلم قوتیں جو رومی راہب کی کامیاب واپسی کی منتظر تھیں' سرِ رہ گزار بیٹھی ہوئی زحمت کش انتظار ہی رہیں۔ جب کبھی راستوں سے غبار اٹھتا تھا' یہود و نصاریٰ سمجھتے کہ رومی راہب کا سرخ و روشن چہرہ ابھرے گا اور پھر وہ علمائے اسلام کی شکست کا مژدہ جانفزا سنائے گا مگر ان کی آنکھوں نے یہ خوشگوار منظر نہیں دیکھا اور ان کی سماعتیں چند الفاظ سننے کے لئے ترستی رہیں۔ کچھ یہودیوں نے رومی راہب کے قبول اسلام پر بھی یہ کہا تھا کہ وہ جادوگروں کی بستی ہے۔ وہاں جو شخص بھی جاتا ہے' اپنے آباؤ اجداد کے عقائد کو نیلام کر دیتا ہے۔

کچھ معتبر تذکرہ نگاروں نے رومی راہب کی تبدیلیٔ مذہب کا صریحاً انکار کیا ہے۔ ان کے خیال میں رومی راہب 'حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے لاجواب ہو گیا تھا اور پھر شرم و ندامت کے پسینے میں نہا کر اپنے وطن واپس چلا گیا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر اسلام کی صداقت روشن ہو چکی تھی مگر ہدایت اس کے مقدر میں نہیں تھی۔ تمام عمر دمشق

کے اس واقعے پر شرمسار رہا لیکن زبان پر حرف حق نہ لا سکا۔ یہاں تک کہ دیگر یہودیوں کی مانند نفاق وتعصب کا شکار رہ کر دنیا سے گزر گیا۔

اس مناظرے میں باوقار سربلندی نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شہرت میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا کہ پورا اعراق آپ کی ذہانت وفراست کے واقعات سے گونج رہا تھا۔ جب ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کوفے کی جانب روانہ ہوئے تو آپ کی مادر گرامی بے چینی کے ساتھ منتظر تھیں۔ سرزمین کوفہ پر قدم رکھتے ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی مضطرب ہو گئے اور پھر جیسے ہی مادر گرامی کا رخ تاب ناک آپ کی نظروں کے سامنے آیا تو بے اختیار مقدس ہستی کے قدموں میں جھک گئے جس نے اپنا خون جگر صرف کر کے اس نابغہ روزگار فرزند کی تربیت کی تھی۔

"ام محترم! خداوند ذوالجلال نے آپ کی دعاؤں کے طفیل مجھے دربار خلافت میں بھی سرخرو کیا اور اسلامی عقائد سے شرانگیز کھیل کھیلنے والے راہب کو بھی اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ آئندہ کبھی لب کشائی کر سکے۔"

"نعمان! کیا اس فتح سے تمہارا نفس مسرور ومطمئن ہے؟" مادر گرامی نے اپنے سعادت مند بیٹے سے عجیب سوال کیا تھا۔ "مجلس مناظرہ میں اپنے حریف کو شکست سے ہم کنار دیکھ کر کیا تمہارے قلب نے لذت نشاط حاصل کی تھی؟"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی والدہ محترم کی گفتگو سنتے ہی کچھ دیر کے لئے ساکت ہو کر رہ گئے۔ آپ ان سوالات کے مفہوم سے بخوبی واقف تھے۔

"نعمان! میری باتوں کا جواب دو کہ یہی جواب تمہاری آئندہ زندگی کا عکاس ہوگا۔" مادر گرامی نے اپنے فرزند کو خاموش پا کر کہا۔

"نہیں ام محترم! میرے نفس کو اس واقعے سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بہت غور وفکر کے بعد جواب دیا۔

"اپنی روح کی گہرائی میں اتر کر سوچو۔" مادر گرامی نے فرمایا۔ "کبھی کبھی انسان کے دل اور زبان میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ تم اپنے لاشعور کو بے نقاب کرو۔ کہیں کوئی تمہاری خواہش' نظر سے تو پوشیدہ نہیں۔"

"میں اپنے لاشعور کی وسعتوں میں جا کر دلی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا پھر بھی واضح طور پر اتنا محسوس کرتا ہوں کہ رومی راہب کو شکست خوردہ دیکھ کر مجھے خوشی حاصل ہوئی تھی اور یہ خوشی اس لئے نہیں تھی کہ ابوحنیفہ اس معرکہ آرائی میں سربلند رہا۔ یہ طمانیت' یہ سکون محض اس لئے تھا کہ مسلمانوں پر طعنہ زنی کرنے والا بالآخر عاجز و ناکام ہو گیا۔ میں نے اس کے سکوت اور زبان بندی پر اپنے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک ہے کہ خلاق عالم ہر شے پر قادر ہے۔ جب کسی راز کو فاش کرنا چاہتا ہے تو پوری کائنات بھی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی اور جب وہ کسی چیز کو انسانی عقل کی گرفت سے دور کرنا چاہتا ہے تو پھر کس میں اتنی طاقت ہے کہ اسے اس کے فیصلے سے باز رکھ سکے۔ اگر ابوحنیفہ نہ ہوتا تو کسی دوسرے شخص کی قسمت میں یہ سرفرازی رقم کر دی جاتی۔ اب یہ آپ کے فرزند کی انتہائی خوش بختی ہے کہ اس کے ذہن کی گرہ کھول دی گئی اور نعمان بن ثابت' بزرگ علماء کے ہجوم میں زیادہ معتبر ٹھہرا۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر مادر گرامی کی آنکھیں نمناک ہو گئیں پھر بڑے رقت آمیز لہجے میں

فرمایا۔ ''جب بھی کسی فتح' کسی نصرت کے وقت تیرا دل آسودگی کا احساس کرنے لگے تو سمجھ لینا کہ یہ سب کچھ حصول دنیا کی خاطر ہے۔ یہ نمود ذات ہے' یہ نمائش وجود ہے جس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان اپنے نفس کی پرورش کرتا رہے۔ یہاں تک کہ وقت معلوم آ پہنچے اور پھر اسے اس کے رب کے حضور اس طرح لایا جائے کہ بار ندامت سے اس کا سر جھکا ہو اور ہونٹوں پر حسرت و یاس کے کلمات ہوں کہ وہ تباہ ہو گیا' وہ ہلاک ہو گیا۔''

مادر گرامی کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا پورا جسم لرزنے لگا۔ ''امین وہی ہے' جب اس سے امانت طلب کی جائے تو ایک ایک ذرہ' ایک ایک حرف اور ایک ایک درم اس کے مالک کو واپس کر دے۔ تمہارا علم بھی خدا کی امانت ہے۔ ابھی یہ آزمائشوں کا مرحلہ آغاز ہے۔ ابھی تمہیں امتحان کے بڑے پر پیچ راستوں سے گزارا جائے گا۔ قدم قدم پر بڑے نشیب و فراز آئیں گے۔ اگر تم اس امانت کو اہل دیانت کی طرح لوٹانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر تمہارے لئے دونوں جہان میں سلامتی ہے' عافیت و نجات ہے۔ جاؤ اور اپنے روز و شب اسی امانت کے تحفظ میں بسر کرو۔ میں تم سے راضی ہوں اور میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا اپنے پکارنے والوں کو زمین پر کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔'' جیسے ہی مادر گرامی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے' حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس حالت میں آگے بڑھے کہ فرط ادب سے آپ کی گردن جھکی ہوئی تھی پھر ایک عظیم ماں کا دست مہربان دراز ہوا اور خاندان زوطی کے اس نوجوان وارث کے سر پر سایہ فگن ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد محترم حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کی بارگاہ میں پہنچے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مجلس علم کے در و دیوار آپ کے منتظر ہوں۔ ایک ایک گوشہ حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے چشم براہ تھا۔ حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ نے مسند درس سے اٹھ کر اپنے شاگرد جلیل کو گلے لگایا اور پھر دمشق میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل دریافت کی۔ حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ رومی راہب کی شکست کا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔

''یہ سب مجلس حماد کا فیضان ہے کہ ایک مشرک کی عقل عیار کو فرار کا کوئی راستہ نہ مل سکا۔'' حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد گرامی کے فیض صحبت کا برسر مجلس اعتراف کر رہے تھے۔ ''اگر وہ راہب اپنے ہمراہ مسائل کی ایک طویل فہرست بھی لے آتا تو آپ کے خدام بالآخر اسے عاجز کر دیتے۔''

ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا اعتراف عجیب اعتراف تھا۔ جب علم کی طلب رکھنے والے کا دل پگھلا اور سینے کا گداز ہونٹوں تک پہنچا تو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ بڑے جذب کا عالم تھا۔ دنیائے اسلام کے عظیم فقیہ نے بے اختیار ہو کر فرمایا۔

''نہیں' ابو حنیفہ! کوئی نہیں۔ ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے وارث! تیرے سوا کون ہے جو ان سوالوں کے جواب دے سکتا ہے؟ خدا تیری عقل کو اتنی کشادگی بخشے کہ اہل دنیا قطار در قطار تیری طرف آتے رہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن خالی ہو جائیں اور روئے زمین پر کوئی مسئلہ باقی نہ رہے۔''

شاگرد کا انکسار بھی عجیب تھا اور استاد کی دعا بھی عجیب تھی۔ چشم فلک' سرزمین کوفہ پر کائنات کے دو عجیب انسانوں کو محو کلام دیکھ رہی تھی اور وقت واضح اشارہ کر رہا تھا کہ مستقبل میں حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی عقل و دانش کی بنیاد قرار پائیں گے اور مکتب حماد رحمتہ اللہ علیہ ہی زیادہ وسیع النظر ٹھہرے گا۔

مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ سے علیحدگی کا خیال

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب آپ طویل سفر سے واپس آئے اور آپ کے فرزند نے دریافت کیا کہ اس عرصہ فراق میں آپ کو زیادہ کون یاد آتا تھا تو آپ نے اولاد کے نازک ترین رشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے پر جوش لہجے میں فرمایا تھا۔

"ہر وقت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پیش نظر رہتے تھے۔ میرے اختیار میں ہوتا تو ایک لمحے کے لئے بھی انہیں اپنے آپ سے جدا نہ کرتا۔"

پھر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذہانت اور طلب علم کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے شاگردوں کے ہجوم میں فرمایا تھا۔ "ابوحنیفہ نے مجھے خالی کر دیا۔"

دوسری جانب احترام استاد کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جب تک امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے رو برو رہتے' فرط ادب سے آپ کا سر جھکا رہتا' گفتگو کرتے تو اس قدر آہستہ کہ کبھی کبھی کچھ فاصلے سے بیٹھے ہوئے لوگ آپ کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات سن بھی نہیں سکتے تھے۔

اور یہ واقعہ تو احترام استاد کے سلسلے میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جب تک زندہ رہے' اس وقت تک آپ نے اس جانب اپنے پاؤں نہیں پھیلائے' جدھر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا مکان تھا۔

اس شدت احترام اور جذبہ عقیدت کے باوجود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ بھی آیا تھا جب آپ اپنا حلقہ درس علیحدہ قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

مولانا شبلی نے اپنی تصنیف "سیرت نعمان رحمتہ اللہ علیہ" میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں؟

"میں دو سال تک حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کی مجلس علم میں حاضر ہوتا رہا پھر خیال ہوا کہ اب خود درس و تدریس کا سلسلہ قائم کروں' لیکن استاد کا ادب مانع ہوتا تھا۔"

اگر مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ حضرت ابوحنیفہ کو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے دامن سے وابستہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور آپ استاد گرامی سے علیحدگی کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ اس واقعے پر نظر کرتے ہوئے انسانی ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا اتنے مختصر سے وقت میں کوئی طالب علم' فقہ جیسے مشکل ترین فن کی گہرائیوں کو اس حد تک سمجھ سکتا ہے کہ آئندہ امور میں اسے کسی رہنمائی کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس سوال کے جواب میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے عقیدت مند کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی غیر معمولی ذہانت وقت کی پابند نہیں تھی۔ ذہن کا جو سفر سالوں پر محیط تھا' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اسے مہینوں میں طے کر سکتے تھے۔ یہ دلیل اہل نظر کے لئے قابل تسلیم ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس تیز رفتاری کا مظاہرہ کر سکتے تھے' مگر جب ہم اس مرد جلیل کی متانت و سنجیدگی کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی میں عجلت و بے قراری کا شائبہ تک نہ تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فطری طور پر نہایت متحمل مزاج انسان تھے۔ جب آپ نے تمام علوم دنیا کو ترک کر کے فقہ اسلامی کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا تو یہ بات ممکن نہیں تھی کہ آپ اس

قدر جلد حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے درس سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنا علیحدہ مکتب فکر قائم کر لیتے۔ حالات کے اس پس منظر میں مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔

پھر اصل واقعہ کیا ہے؟ مشہور مسلمان دانشور پروفیسر ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب "حیات حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کی تحقیق کے مطابق ایک بار حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد امام زفر رحمتہ اللہ علیہ سے فرمایا تھا۔

"میں دس سال تک اپنے استاد گرامی حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا پھر میں نے سوچا کہ اپنا حلقہ درس علیحدہ قائم کر لوں۔"

ہمارے نزدیک پروفیسر ابوزہرہ مصری کی یہی روایت درست ہے۔ دیگر تذکرہ نویسوں نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دس سال گزر جانے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے الگ ہو کر سلسلہ درس جاری رکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ نعمانی کی روایت ضعیف نظر آتی ہے مگر ہمارے خیال میں شبلی رحمتہ اللہ علیہ جیسے محقق کا قصور نہیں۔ مولانا نے بھی یقیناً اپنی کتاب میں "دس سالہ مدت" کا ذکر کیا ہوگا لیکن اتفاق سے "سیرت نعمان" کا جو نسخہ ہمارے پاس موجود ہے اس میں "دو سال" درج ہے۔ تحقیق کا عام اصول ہے کہ جب روایت کو پرکھا جاتا ہے تو اکثر اوقات زمانے اور عہد میں یکسانیت پائی جاتی ہے مگر کبھی کبھی بیان کردہ اوقات میں تھوڑا بہت فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور یہ فرق کسی بھی صورت میں سال یا چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری اور مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ نعمانی کی روایات میں آٹھ سال کا فرق بڑا غیر فطری محسوس ہوتا ہے۔ مولانا کی تاریخ دانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ "سیرت نعمان" میں کتابت کی غلطی سے "دو سال" رقم ہو گئے۔ ورنہ شبلی رحمتہ اللہ علیہ کا تحریر کردہ اصل نسخہ دیکھا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ اس میں یہ عرصہ "دس سال" پر مشتمل ہوگا۔

اس مختصر سی تحقیقی بحث کے بعد اگر ہم دس سال والی روایت کو صحیح مان لیں تو پھر یہ واقعہ 112ھ میں پیش آیا ہو گا۔ اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر بتیس سال تھی اور آپ جوانی کے درمیانی دور سے گزر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن آپ کو خیال آیا کہ حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس سے اٹھ جائیں اور اپنے مدرسہ فکر کی بنیادیں کھڑی کر دیں۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی یہ خواہش کسی طرح حرص یا نام و نمود کے سبب نہیں تھی۔ بس ایک تصور تھا کہ علم کی حدود کو نئے انداز میں مزید وسعت دی جائے۔

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن مجلس درس آراستہ تھی۔ لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر بارگاہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ میں داخل ہو رہے تھے اور یہ مرد جلیل نہایت شگفتہ مزاجی کے ساتھ ان کے ذہنوں کی گرہ کھول رہا تھا پھر جب فقہی مسائل کا دور ختم ہوا تو ذاتی نوعیت کی گفتگو شروع ہو گئی۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے تمام شاگرد اور کوفے کے دیگر علماء اگلی نشستوں میں موجود تھے۔ حاضرین میں امام زفر رحمتہ اللہ علیہ بھی نمایاں تھے۔ امام زفر رحمتہ اللہ علیہ کو نہ صرف شاگردی کا اعزاز حاصل تھا بلکہ وہ اپنی بے پناہ عقیدت کے سبب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے ربط خاص بھی رکھتے تھے۔ دوران گفتگو امام زفر رحمتہ اللہ علیہ نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانہ شاگردی کے کچھ واقعات بیان کریں اور حضرت امام حماد

رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان سے وابستگی اور پھر علیحدگی کا ذکر فرمائیں کہ اس سے اہل طلب کی معلومات میں اضافہ ہو۔

ابوزہرہ مصری نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اپنا حلقہ درس علیحدہ قائم کرنے کے اس جذبے کو خالص دنیا پرستی کے انداز میں رقم کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کے بیان کے مطابق حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام زفر رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''میں دس سال تک اپنے مہربان وشفیق استاد حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کے زیر سایہ رہا پھر میرا دل حصول اقتدار کے لئے للچایا تو میں نے الگ حلقہ جمانے کا ارادہ کرلیا۔'' اس واقعے کو تواتر کے ساتھ تمام مورخین نے قلم بند کیا ہے۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے علیحدگی کے تصور کو سارے معتبر اور مستند تذکرہ نویس تسلیم کرتے ہیں مگر پروفیسر ابوزہرہ مصری نے حصول اقتدار کے لالچ کا ذکر کر کے ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

ہم پروفیسر ابوزہرہ مصری کی شخصیت کو غیر معتبر قرار نہیں دیتے۔ بے شک وہ زمانہ جدید کے ایک بڑے عالم اور نامور محقق ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پروفیسر ابوزہرہ بیباکی کے ساتھ اپنے نظریات بیان کر دیتے ہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی ان کے یہ تصورات نامور علمائے اسلام کے خیالات سے ہم آہنگی نہیں رکھتے۔ یہاں پروفیسر کا کوئی عقیدہ یا نظریہ زیر بحث نہیں۔ قابل اعتراض یہ فقرہ ہے کہ ''حضرت ابوحنیفہ کے دل میں حصول اقتدار کا لالچ پیدا ہوا۔''

فلسفۂ اقتدار

پہلے ہم مملکت علم میں اقتدار کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔ اقتدار اپنی فطرت کے اعتبار سے وہ عجیب لفظ ہے جس کا اطلاق معاشرے کے ہر شعبے پر ہوتا ہے۔ عام انسان ''اقتدار'' کو سیاسی حلقوں سے نکل کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اقتدار گھر کی چار دیواری سے لے کر مدرسہ ومکتب اور مسجد وحرم تک جا پہنچتا ہے۔ جن لوگوں کی رسائی اقتدار ملکی تک نہیں ہوتی تو وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں سربلند ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ علم کا میدان بھی اسی دائرہ کار میں آتا ہے' جہاں اقتدار کی کشاکش نمایاں ہو جاتی ہے۔ ہم نے دنیا کے تمام علوم میں انسان کے اسی جذبہ اقتدار کو شدت کے ساتھ متحرک پایا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جب رسالت مآب ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا عہد مبارک انسانی تہذیب وتمدن سے دور ہوتا چلا گیا اور گردش روز وشب نئے دور میں داخل ہو گئی تو پھر ''مسند علم'' نے بھی ''مسند اقتدار'' کی شکل اختیار کرلی۔ بیشتر علما نے صرف اس لئے علم حاصل کیا کہ وہ انسانی ہجوم کے درمیان سربلند نظر آئیں اور دربار خلافت بھی ان کے زیر اثر رہے۔ جب اولاد آدم کے سینے تمنائے اقتدار کی سوزش سے جل اٹھے تو ''مدرسہ ومکتب'' کے در ودیوار بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے اور پھر ثابت ہو گیا کہ علم کی دنیا میں بھی اقتدار کی شدید کشمکش اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری نے دور جدید کا ایک باہوش انسان ہونے کے سبب کشاکش اقتدار کے بیشتر مظاہرے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے ہوں گے اور تاریخ کے حوالوں سے ماضی کے زخموں کا مشاہدہ بھی کیا ہو گا۔ شاید اسی وجہ سے عہد حاضر کے اس دانشور نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ایک وقتی جذبے اور عارضی خیال کو ہوس اقتدار سے تعبیر کیا۔ اس حوالے کے لئے ہمارے پیش نظر فیصل آباد (پاکستان) کا شائع کردہ اردو ترجمہ ہے۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ 66 پر حرف بہ حرف یہی

عبارت درج ہے کہ

"پھر میرا جی حصول اقتدار کے لئے للچایا تو میں نے الگ اپنا حلقہ جمانے کا ارادہ کر لیا۔"

اگر ہم پروفیسر ابوزہرہ مصری سے حسن ظن نہ رکھیں اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی پر ان کے تبصرے کو ترجمے کی غلطی خیال نہ کریں تو یہ ایک صریح بے ادبی اور فاش گستاخی ہے۔ یقیناً ابوزہرہ مصری نے اس نازک موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ جدید نظریات کے شعور میں انہوں نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بھی عہد حاضر کا کوئی مذہبی عالم سمجھا جو سیاسی پیچ و تاب سے مجبور ہو کر اپنے افکار کی بساط سجانے کے لئے نئے نئے زاویئے اختیار کرتا ہے۔ غالباً وہ سائنس کی برق رفتاریوں میں اس نکتے کو فراموش کر گئے کہ جو علم محض خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کے لئے حاصل کیا جاتا ہے وہ کسی نام و نمود اور اقتدار کا طالب نہیں ہوتا۔ اور ہم تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ دنیا پرستی کی اس منزل سے گزرنے والا سب کچھ ہو سکتا ہے امام نہیں ہو سکتا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید خاص مجذوب کا ایک شعر ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

یہ اردو کا نازک ترین شعر ہے جس میں عشق کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جس کا متحمل ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک راز ہے کہ محبوب اسی وقت حریم دل میں جلوہ گر ہو سکتا ہے جب مکمل پردہ داری ہو اور نامحرم خواہشات کا ہجوم رخصت ہو جائے۔ ہم علوم الٰہیہ پر بھی مجذوب کے اسی نظریئے کا اطلاق کرتے ہیں۔ اہل دنیا کو سمجھ لینا چاہئے کہ آسمانی علم اس وقت تک کسی انسان کے سینے میں منتقل نہیں ہو سکتا جب تک نمائش ذات اور جاہ و اقتدار کا جذبہ دل سے رخصت نہ ہو جائے۔ مخالفین کے تعصب اور تنگ نظری کے باوجود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امام جلیل تھے۔ اور یہ جلالت علم اسی وقت ممکن تھی جب نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کوچہ اقتدار کی جانب اپنی پشت کر لیں اور محفلِ جاہ و حشم سے اس طرح اٹھ کر چلے جائیں کہ واپسی تو کجا، ادھر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کریں۔ تاریخ کا ایک ایک ورق گواہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے علم کے حوالے سے دنیا کے ہر اقتدار کی نفی کی (آئندہ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی شروع ہوگی تو پروفیسر ابوزہرہ مصری اور ان کے چند ہم نواؤں کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ مرد فقیہ کیسا عظیم و جلیل قلندر تھا۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے بقول ؎

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

اور حقیقت یہ ہے کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جسم بھی اپنا تھا اور دل بھی۔ وہ خدا کے سوا کسی کے آگے خم نہیں ہوئے اور بندگی کا یہ انداز کسی انسان کو "اقتدار کا لالچی" نہیں بنا سکتا)

پروفیسر ابوزہرہ مصری بھی اس سلسلے میں احتیاط سے کام نہ لے سکے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی کے ساتھ "حرص اور اقتدار" کے دو ایسے الفاظ منسوب کر دیئے جو ہمارے نزدیک گستاخی و بے ادبی کے سوا کچھ نہیں۔

حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ دس سال تک فیض صحبت حاصل کر کے تقریباً 112ھ میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو محض خیال آیا تھا کہ آپ اپنا حلقہ علیحدہ قائم کر کے نئے انداز میں سلسلہ درس کا آغاز کر دیں۔ تمام مورخین نے

اس واقعے کو پوری صحت وصداقت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دس سال کی طویل تعلیم وتربیت کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں اپنی علیحدہ مجلس درس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اہل نظر صرف ایک لفظ ''خیال'' پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھیں۔ خیال' انسانی ذہن کا لازمہ ہے۔ جب تک ذہن بیدار رہے گا اس وقت تک مختلف خیالات پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہمارے نزدیک ''خیال'' اور ''منصوبے'' میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ خیال محض خیال ہوتا ہے جس کا وجود عارضی لمحات سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ایک دن' دو دن' یا زیادہ سے زیادہ ایک ماہ۔ خیال ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے اور پھر لاشعور کی گہرائیوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ''حصول اقتدار'' کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ خیال اقتدار چند لمحات کے لئے کسی ذہن میں گردش نہیں کرتا' بلکہ وہ مستقل انسانی دماغ پر مسلط رہتا ہے۔ یہاں تک کہ روح میں اتر جاتا ہے۔ اور پھر انسان یا تو صریحاً بغاوت کر دیتا ہے یا پھر اس وقت تک درپردہ سازشیں کرتا رہتا ہے جب تک اس کے مقصد کی تکمیل نہ ہو جائے۔ ہمارے نزدیک ''اقتدار'' کا آفاقی اصول یہی ہے۔

اس کے برعکس جب ہم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کے دل میں اقتدار کی دھندلی سی خواہش کا بھی کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ بس ایک دن یہ خیال ابھرا تھا کہ اپنا حلقہ درس الگ قائم کرلیں اور علم فقہ کو نئی وسعتیں بخش دیں۔ یہ خیال اس قدر عارضی تھا کہ رات کے کسی لمحے میں پیدا ہوا اور جب دوسرے دن حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم میں پہنچے تو استاد گرامی کا رخ روشن دیکھتے ہی یہ خیال ذہن سے اس طرح محو ہو گیا جیسے کبھی دماغ کے کسی گوشے میں موجود ہی نہیں تھا۔

اس سلسلے میں ہم پہلے پروفیسر ابوزہرہ مصری کی پیش کردہ روایت بیان کرتے ہیں۔ ابوزہرہ' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دلی کیفیت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

''ایک روز میں پچھلے پہر اپنے مکان سے نکلا اور اس مسجد کی طرف روانہ ہوا جہاں امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا حلقہ درس قائم تھا۔ جیسے ہی میں نے مسجد میں قدم رکھا اور حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ پر میری نظر پڑی تو ان سے علیحدگی پسند نہ آئی اور پھر جا کر ان ہی کے پاس بیٹھ گیا۔''

پروفیسر ابوزہرہ مصری نے ''حصول اقتدار'' کی بات پورے زور وشور سے کہی اور فلسفہ اقتدار بھی دلائل کے ساتھ بیان کیا مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس جذبے کی وضاحت نہ کی کہ استاد گرامی کا رخ تابناک دیکھتے ہی خواہش اقتدار کو اپنے سینے سے کیوں نکال پھینکا؟ اور خاموشی کے ساتھ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو کیوں بیٹھ گئے؟ ابوزہرہ کے کسی حوالے سے یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جذبہ اقتدار وقتی طور پر سرد پڑ گیا تھا اور بعد میں آپ نے از سر نو اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے جدوجہد کی تھی۔ جب ہم ایسا کوئی سراغ نہیں پاتے تو ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ وہ محض ایک عارضی خیال تھا' کوئی جذبہ اقتدار نہیں تھا جسے خوامخواہ رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

اب آیئے! ہم دوسری مستند تاریخوں کی روشنی میں اس واقعے کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ علم کی ایک فطرت ہے کہ وہ چار دیواری میں قید ہو کر زندہ نہیں رہتا۔ دنیا میں علم ہی ایک واحد شے ہے جو آسمانوں کی طرح بیکراں ہے۔ علم کا کوئی بھی شعبہ ہو' اس کی ایک شاخ سے دوسری شاخ پھوٹتی ہے' جو کام استاد تکمیل تک نہ پہنچا سکے' اسے شاگردوں

نے اتنی خوبی سے سرانجام دیا کہ نہ صرف استاد سر بہ گریباں رہے بلکہ ساری دنیا بھی محوِ حیرت ہو گئی۔ ہم اس ذیل میں بے شمار مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ سقراط کا علم ایک زمانے میں بہت زیادہ معتبر سمجھا گیا مگر جب لوگوں نے افلاطون کو ان کے حلقہ شاگردی میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو سمجھنے والے سمجھ گئے تھے کہ سقراط نے علم کو جہاں منزل آخر سمجھ کر چھوڑا تھا' افلاطون یقیناً اس منزل سے گزر جائے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا...... سقراط کے مقابلے میں اس کا شاگرد افلاطون زیادہ وسیع النظر ٹھہرا۔ پھر افلاطون کا دور تمام ہوا تو بساط عام پر اس کا شاگرد ارسطو ابھرا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ سقراط اور افلاطون کے مقابلے میں ارسطو کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ فلسفے کی دنیا سے یہ روشن مثال پیش کرنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ علم ایک حصار میں قید نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنی وسعتوں کے لئے لامحدود میدانوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی یہی سوچتے تھے کہ اپنا الگ حلقہ درس قائم کر کے علم فقہ کو نئی وسعت دی جائے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اہل علم کی اس خواہش میں نمایاں فرق ہے۔ دوسرے علماء کی خواہش میں ان کی نمائش ذات بھی شامل ہوتی تھی اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا دل کشادہ نام ونمود کے جذبات سے یکسر پاک تھا۔

اس وضاحت کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد امام زفر رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ اس روایت کو غور سے سنئے جس کو لوگوں نے عجیب عجیب مفہوم پہنا دیئے ہیں۔

امام زفر رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا۔

"میں اپنے استاد گرامی امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں دس سال تک اگلی صف میں بیٹھا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ مجھ پر تمام شاگردوں سے زیادہ مہربان تھے۔ خداوند ذوالجلال نے آپ کو جس قدر ذخیرہ علم بخشا تھا۔ اسے اہل طلب کے درمیان بے دریغ لٹاتے رہے۔ میں نے جب بھی کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ تمام رموز ونکات میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حماد رحمتہ اللہ علیہ نہایت اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ وہ ہمہ وقت اس لئے بے قرار رہتے تھے کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے علم کا کوئی نکتہ' کوئی رمز ان کے سینے میں موجود نہ رہے اور جب وہ عالم خاکی کو الوداع کہیں تو سرمایہ علم ان کے وارثوں کو منتقل ہو چکا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے علم کے کسی زاویئے کو میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رکھا۔ اسی دوران میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم سے اٹھ جاؤں اور اپنا حلقہ درس علیحدہ قائم کر لوں۔ یہ خیال کئی دن تک میرے ذہن میں پرورش پاتا رہا۔ میں حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں پابندی وقت کے ساتھ روزانہ حاضر ہوتا تھا مگر جب بھی امام رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو حاضر ہوتا تو میرے ذہن سے یہ خیال اس طرح نکل جاتا کہ جیسے میں نے اس موضوع پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی اس ذہنی کشمکش کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔ "آخر ایک دن میں نے طے کر لیا کہ آج امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دوں گا۔ یہ سوچ کر میں اپنے مکان سے نکلا اور سیدھا مسجد کا رخ کیا...... جیسے ہی میں نے مسجد میں قدم رکھا' وہی روح پرور منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اہل طلب سر جھکائے حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کے سامنے بیٹھے تھے' امام حماد رحمتہ اللہ

علیہ کی بارعب آواز دماغوں کے زنگ دھو رہی تھی اور دلوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹا رہی تھی۔ میں نے امام رحمتہ اللہ علیہ کے چہرہ تابناک کی جانب دیکھا اور پھر میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ جس مہربان وشفیق استاد کا علم اور محبت سمندر کی طرح بے کنار ہو اس کی آغوش محبت کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں۔ یہ خیال آتے ہی میں سر جھکائے ہوئے آگے بڑھا اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے علم وعرفان کا چشمہ پھوٹ رہا تھا اور حاضرین مجلس اس بارش کرم سے سیراب ہو رہے تھے۔ ہر شخص امام رحمتہ اللہ علیہ کے جوش گفتار میں گم تھا مگر میں بار بار اپنے دل سے عہد کر رہا تھا کہ

"جب تک میری عقل کا رہنما میرا امام زندہ ہے' میں کسی دوسرے آستانے کی طرف نہیں دیکھوں گا اور اس کے ساتھ ہی دعا کرتا رہا کہ خدا سالہا سال تک ہمارے سروں پر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا سایہ قائم رکھے۔"

اس واقعے کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ جذبہ اقتدار تھا یا محض ایک خیال۔ جن لوگوں کے سینے میں جذبہ اقتدار پوری توانائی کے ساتھ پرورش پا جاتا ہے' وہ ماضی کے کسی تعلق یا رشتے کو یاد نہیں کرتے۔ اور نہ ان کے دل میں غیرت کی لہریں اٹھتی ہیں اور نہ شرم وحیا موجزن ہوتی ہے۔ یقیناً حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں یہ جذبہ اقتدار تو کجا' اس کا دھندلا سا عکس تک نہ تھا۔ ورنہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھ کر غیرت کیوں بیدار ہوتی اور حیا آپ کا دامن کیوں کھینچتی؟

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی علمی زندگی کا ایک اہم واقعہ

اسی زمانے میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس نے استاد گرامی کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عقیدت و وابستگی میں مزید اضافہ کر دیا۔ اسی دوران ایک اجنبی شخص حلقہ درس میں داخل ہوا اور امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہنے لگا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اچانک اداس ہو گئے۔ اہل مجلس سمجھ گئے کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا کوئی شناسا یا عزیز دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ استاد گرامی کو مضمحل دیکھ کر شاگرد اور حلقہ درس میں بیٹھنے والے دیگر افراد بھی افسردہ ہو گئے۔ بعض ایسے لوگوں نے جو عمر کے اعتبار سے بزرگی کا درجہ رکھتے تھے' امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے اس اضطراب کا سبب دریافت کرنا چاہا' مگر آپ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ آنے والے شخص کو اپنی مسند کے قریب بٹھایا اور دوبارہ درس دینے لگے۔ آواز سے کبھی کبھی اداسی جھلکنے لگتی' مگر لہجے کا جلال اسی طرح برقرار تھا۔

آخر درس ختم ہوا تو حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اہل مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "آپ حضرات یقیناً اس خبر سے رنجیدہ ہوں گے کہ بصرے میں میرے ایک قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔"

اہل مجلس جو پہلے ہی اندازہ کر چکے تھے' امام رحمتہ اللہ علیہ کی زبانی یہ انکشاف سن کر بے قرار ہو گئے۔ پھر بہت دیر تک رسم تعزیت جاری رہی۔ اس کے بعد حاضرین نے خاموشی اختیار کی تو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ ایک بار پھر مخاطب ہوئے۔ "میرا دل تو نہیں چاہتا کہ کوفے کی حدود سے باہر قدم نکالوں مگر میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس عرصے میں اہل طلب پیاسے رہ جائیں گے اور خود میں بھی مجلس علم سے دور ہو جاؤں گا' لیکن میرے سوا مرحوم کا کوئی وارث نہیں ہے۔ مجبوراً مجھے جانا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہو گئے۔

''آپ کی عدم موجودگی میں مجلس درس کس طرح آراستہ ہوگی؟'' حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو خاموش پا کر ایک شاگرد اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے نہایت ادب کے ساتھ سوال کیا۔

''مجلس اسی طرح قائم رہے گی۔ اگر حماد رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے بھی اٹھ جائے تو کارخداوندی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔'' امام رحمتہ اللہ علیہ نے پرسوز لہجے میں فرمایا۔

''خدا وہ وقت نہ لائے کہ ہم اس زمین پر بے اماں ہو جائیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر عرض کیا۔ ''خدا آپ کی عمر میں ہمارے ماہ وسال بھی شامل کر دے کہ آپ علم کی زندگی ہیں۔''

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ایک نگاہ خاص سے اپنے شاگرد جلیل کی طرف دیکھتے رہے۔

''شیخ محترم! ہمارا مقصد یہ ہے کہ آپ کی غیر حاضری میں مجلس کے آداب کیا ہوں گے؟'' دوسرے شاگرد نے بصد ادب و احترام گزارش کی۔ ''یقیناً بصرے میں آپ کا قیام طویل ہوگا۔ اس دوران اہل کوفہ اپنے مسائل کے سلسلے میں کس سے رجوع کریں گے؟ مناسب ہے کہ آپ روانگی سے پہلے کسی ایک شخص کو نامزد فرما دیجئے کہ حلقۂ درس کی بدنظمی اور عدم توازن کا شکار نہ ہو۔''

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے فوری طور پر اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اہل مجلس واضح طور پر محسوس کر رہے تھے کہ امام رحمتہ اللہ علیہ گہری فکر میں ہیں اور اس شخص کے متعلق سوچ رہے ہیں جسے آپ کی عدم موجودگی میں یہ مشکل اور اہم فریضہ انجام دینا تھا۔

عام خیال یہی تھا کہ اس موقع پر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے لائق فرزند اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ کا انتخاب کریں گے۔ اگر امام رحمتہ اللہ علیہ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکے تو پھر دوسرا نام موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ کا ہوگا جو آپ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ اور تجربہ کار تھے۔

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بہت دیر تک خاموش رہے اور اہل مجلس قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ مگر ان کی قیاس آرائیاں امام رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ اور موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیات کے دائرے سے باہر نہ نکل سکیں۔

پھر سکوت مجلس ختم ہوا اور حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کی پرشکوہ آواز گونجنے لگی۔ ''حماد کے حلقہ درس میں حاضر ہونے والے بغور سن لیں کہ میرے جانے کے بعد ابوحنیفہ مسند فقہ پر جلوہ گر ہوں گے۔ اہل کوفہ اگر ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اس مکتب فقہ سے ان کے مسائل کا حل پیش کیا جائے تو وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے رجوع کریں۔ جب تک میں اس مجلس سے دور ہوں، وہی میرے علم کے وارث ہیں، وہی میرے جانشین ہیں۔''

امام حماد کا حکم سن کر حلقہ درس پر سناٹا طاری ہوگیا اور حاضرین سوچتے رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ حضرت موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ کو نظرانداز کر کے ایک ایسے نوجوان کو منتخب کریں گے جو عمر اور تجربے کے علاوہ ظاہری علم میں بھی دوسرے لوگوں سے کم تھا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا فیصلہ بڑا عجیب فیصلہ تھا۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے علم کے وارث قرار پائیں گے۔ اگرچہ یہ وراثت اور جانشینی عارضی تھی لیکن مسند فقہ پر جلوہ آرا ہونا ایک بڑا شرف تھا۔

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اسی دن بصرے روانہ ہو گئے اور حلقہ درس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ بیشتر شرکاء مجلس کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا انتخاب پسند نہیں آیا تھا۔ جب امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے یہ حکم صادر کیا تھا، اس وقت حضرت اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ حضرت اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ کے لئے والد محترم کا فیصلہ حیرت ناک نہیں تھا کہ آپ حضرات ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلے میں امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے جذبات سے بخوبی واقف تھے۔ البتہ حضرت موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ ایک اعلیٰ ظرف فقیہ تھے۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی غیر موجودگی میں مسند نشینی کو اپنا حق سمجھتے تھے' اسی لئے اہل مجلس نے انہیں لمحاتی اضطراب میں مبتلا دیکھا تھا' لیکن یہ ایک عارضی جذبہ تھا جو استاد گرامی کے حکم کے سامنے ماند پڑ گیا اور موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی تقرری پر مطمئن نظر آنے لگے۔

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے دیگر شاگرد' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو ملنے والے اعزاز سے خوش نہیں تھے۔ ان کے نزدیک عمر کی زیادتی اور شاگردی کی مدت ہی مسند نشینی کی بنیاد بن سکتی تھی۔ وہ سن و سال میں بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ تھے اور حلقہ درس میں ان کی شرکت کا عرصہ بھی طویل تھا۔ بس انہی دو باتوں کے پیش نظر وہ خود کو حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی جانشینی کا مستحق سمجھتے تھے پھر جب ان کی خواہش تکمیل نہ پا سکی تو وہ مجبوراً خاموش ہو گئے۔ کس میں اتنی جرأت تھی کہ وہ امام رحمتہ اللہ علیہ کے حکم سے سرتابی کر سکتا۔

مسند فقہ پر عارضی جلوہ نمائی

آخر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کا وہ نازک ترین وقت بھی آ گیا جب آپ مسند فقہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کے قدموں میں لرزش تھی اور ہمیشہ روشن رہنے والا چہرہ اچانک بجھا بجھا نظر آنے لگا تھا۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی اس کیفیت کو وحشت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اگر اس حالت کے لئے "وحشت" کا لفظ درست ہے تو پھر وہ وحشت ہی ہو گی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فطرتاً شجاع تھے۔ بڑے سے بڑے مجمع میں ایسی دلکش تقریر فرماتے تھے کہ حاضرین ساکت و جامد ہو کر رہ جاتے تھے۔ پھر ان کے قدموں میں یہ لرزہ کیوں تھا اور چہرے پر گھبراہٹ کے آثار کیوں نمایاں تھے؟ ممکن ہے بعض حضرات نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی اس کیفیت کی کوئی اور توجیہ پیش کی ہو مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جس مسند پر جلوہ افروز ہونے والے تھے' وہ آپ کے استاد گرامی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا منبر تھا۔ اس پُر جلیل کا منبر جس کے آگے بڑے بڑے اکابر علم بھی سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مسند کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے اور اس بلند نشست کی طرف دیکھا جہاں بیٹھ کر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ درس دیا کرتے تھے۔ شدت جذبات سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس اشک ریزی کا سبب منزل فراق تھی۔ جس مرد بزرگ کے چہرے کو دیکھ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ زندگی کی نئی توانائی حاصل کرتے تھے' آج وہ اہل کوفہ سے دور جا چکا تھا۔ اگرچہ یہ جدائی چند روزہ تھی لیکن مشتاق دید پر تو ایک ساعت فراق بھی گراں ہوتی ہے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اسی ایک لمحہ جانگداز کو یاد کر کے رو رہے تھے پھر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی وہ بے مثال محبت یاد آئی جس کے سبب ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہزاروں انسانوں کے درمیان

محترم قرار دیئے گئے تھے۔

آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مضطرب ذہن ماضی میں سفر کرتا رہا۔ آج امام حماد رحمتہ اللہ علیہ جس مسند فقہ سے اٹھ کر بصرہ چلے گئے تھے' اس پر کبھی حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ جلوہ افروز ہوتے تھے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ جلیل القدر تابعی تھے۔ آپ کو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت اقدس میں باریابی کا شرف حاصل تھا۔ آپ کی وفات پر امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔ ''ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے آپ سے زیادہ عالم اور فقیہ اس زمین پر نہیں چھوڑا۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ حدیث کے نقاد تھے۔

پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے تصور میں ایک اور روشن چہرہ ابھرا۔ یہ رخ تابناک ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی حضرت عمرو بن شرجیل ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کا تھا۔ امام عمرو بن شرجیل رحمتہ اللہ علیہ نہایت عابد و زاہد انسان تھے۔ امام عمرو بن شرجیل رحمتہ اللہ علیہ کے معتبر ہونے کا یہ عالم ہے کہ حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ حضرت امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام ترمذی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت امام نسائی رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم محدثین نے آپ کی روایات کو تسلیم کیا ہے۔ کچھ دیر تک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے تصورات میں امام عمرو بن شرجیل رحمتہ اللہ علیہ کا خیالی پیکر روشن رہا اور آپ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔

پھر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی چشم تصور میں ایک اور روشن چہرہ ابھرنے لگا۔ یہ روئے پر جلال امام عمرو بن شرجیل رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا تھا۔ ایک صحابی رسول کا خیال آتے ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آپ جس مسند فقہ پر بیٹھنے والے تھے اس کا سلسلہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عظیم و جلیل صحابی سے ملتا تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بہت دیر تک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تصور میں گم رہے جن کا علم بیکراں امام عمرو بن شرجیل رحمتہ اللہ علیہ کے سینے میں منتقل ہوا۔ پھر امام عمرو بن شرجیل رحمتہ اللہ علیہ نے علم کی یہ امانت حضرت امام ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ تک پہنچائی۔ پھر ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کو علم کے اس سرمائے کا محافظ قرار دیا۔ پھر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے فقہ کی یہ وراثت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سپرد کی اور بصرہ تشریف لے گئے۔

اب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خیالات کی دنیا سے نکل آئے تھے اور اس مسند فقہ کو غور سے دیکھ رہے تھے جس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رحمتہ اللہ علیہ جیسے صحابی رسول جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ ان بزرگوں کے ہیبت و جلال سے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے جسم پر لرزہ طاری تھا مگر استاد گرامی کے حکم کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ نتیجتاً آپ جھکے ہوئے سر اور کانپتے قدموں سے آگے بڑھے اور امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی نشست پر بیٹھنے کا گرانقدر اعزاز حاصل کیا۔

اہل کوفہ اپنے اپنے مسائل لے کر مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ میں حاضر ہونے لگے' مجلس وہی تھی مگر صاحب مجلس بدل چکا تھا۔ اب مسائل کا حل پیش کرنے والے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نہیں' کوفے کا ایک نوجوان تاجر تھا جسے دیکھ کر کچھ افراد کے چہروں پر رشک کی علامات نمایاں ہو گئی تھیں اور کچھ لوگ حسد کا شکار ہو گئے تھے۔

مسائل سامنے آتے رہے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے فیصلوں کی روشنی میں انہیں

ل کرتے رہے پھر اچانک ایک شخص سر مجلس اٹھا اور ایسا مسئلہ پیش کیا جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دس سالہ رس کے دوران آج سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا چند لمحوں کے لئے آپ نے سکوت فرمایا۔ ماضی کے تمام اوراق الٹ یے۔ نہ کہیں یہ مسئلہ درج تھا اور نہ اس کا جواب تحریر کیا گیا تھا۔ مسند درس پر بیٹھنے کے بعد یہ پہلا مرحلہ تھا کہ حضرت بوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد گرامی کی کوئی سند کوئی حوالہ تلاش کرنے سے عاجز تھے۔ مجبوراً آپ نے اپنے فہم دراک کا سہارا لیا اور محض قیاس کے ذریعے سوال کرنے والے کو مطمئن کر دیا۔ پھر جب مجلس ختم ہوئی تو آپ گھر شریف لے گئے اور تمام کاموں کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے وہ مسئلہ ایک کاغذ پر رقم کیا اور اس کے سامنے اپنا دیا ہوا جواب تحریر کر دیا۔

دوسرے دن اس قسم کے کئی واقعات پیش آئے۔ تمام مسائل کی بنیادی نوعیت یہ تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ یہ نے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی زبانی ایسے کسی مسئلے کا جواب نہیں سنا تھا۔ ایک بار پھر آپ نے قیاس کے ذریعے والوں کے جوابات دیئے اور پھر حسب معمول انہیں ایک کاغذ پر لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

تیسرے دن بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ کے سامنے کئی ایسے سائل پیش کئے گئے جو اس سے پہلے سننے میں نہیں آئے تھے اور حضرت حماد رحمتہ اللہ علیہ کے دیئے گئے جوابات میں ن کا کہیں ذکر نہیں ملتا تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ایسے تمام مسائل کو خاموشی کے ساتھ سنا۔ ایک بار سوچا کے مسائل کے سامنے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیں' مگر پھر آپ نے انتہائی غور و فکر کے بعد ان تمام سوالوں کے جوابات یے۔ بالآخر مجلس درس ختم ہوئی تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے گھر پہنچتے ہی ان سارے مسائل کو ایک کاغذ پر تحریر کیا اور اپنے جوابات بھی رقم کر دیئے تا کہ ایک ایک حرف محفوظ ہو جائے۔

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی واپسی

تقریباً ایک ہفتے کے بعد حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان بصرہ سے کوفہ تشریف لائے۔ ایک بار پھر لم کی طلب رکھنے والوں میں جان سی پڑ گئی۔ تمام چہرے مطمئن نظر آنے لگے مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی خوشی بل دید تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت کو ان کی گمشدہ متاع جاں دوبارہ میسر آ گئی ہو۔

مسافت کی تھکن دور ہو جانے کے بعد دوسرے روز حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حاضرین مجلس کی اگلی قطار میں سب سے آگے، امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو بیٹھے تھے۔ جیسے ہی استاد گرامی کی نظر اٹھی' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ آگے بڑھے اور امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے پہنچ کر دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

"ابوحنیفہ! اس دوران تمہارے روز و شب کیسے گزرے؟" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے شاگرد جلیل سے مخاطب تھے۔

"شیخ محترم! نعمان بن ثابت جسمانی طور پر آسودہ و مطمئن رہا' مگر روح بے قرار تھی کہ آج سے پہلے اپنی تشنگی کا س قدر احساس نہیں ہوا تھا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔

"آخر کیوں؟" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا۔

"آپ کی عدم موجودگی میں مسند علم ویران تھی اور مجلس درس پر سناٹا طاری تھا۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا لوگوں نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا؟" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"نہیں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے کا گداز کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ "سب کچھ وہی تھا۔ مجلس درس بھی وہی تھی، در و دیوار بھی وہی تھے، طالبان علم بھی وہی تھے، مسائل بھی وہی تھے، جواب دینے والا بھی موجود تھا مگر ایک وہ ذات گرامی ہی نہیں تھی جس سے بچھڑ کر ہم علم و آگہی سے دور ہو گئے تھے۔ بے شمار تشنہ لب تھے لیکن چشمہ افکار نہیں تھا۔ کس کے پاس جاتے؟ کون ہمیں سیراب کرتا؟ ذہن منتشر ہوئے تو انہیں سکون بخشنے والا کوئی نہیں تھا۔ مسائل پیدا ہوئے تو انسانی عقل کو مطمئن کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپ سے جدا ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ علم کیا شے ہے اور اس بحر بے کنار میں ہماری کیا حیثیت ہے؟"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے جذبات کی وارفتگی اور اظہار عقیدت دیکھ کر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بھی اس قدر متاثر ہوئے کہ چند لمحوں کے لئے آپ کے چہرے پر بھی افسردگی نمایاں ہوگئی۔ پھر آپ نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے شاگردوں کی جانب دیکھ کر فرمایا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ تم لوگوں نے میری کمی محسوس کی ہوگی۔ خدا تمہارے دلوں کو ہمیشہ کشادہ رکھے اور ذہنوں کو انتشار سے بچائے۔"

اتنا کہہ کر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ "اس دوران تمہیں مسائل کا حل پیش کرنے میں کوئی دشواری تو محسوس نہیں ہوئی؟"

"میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ آپ کی جانشینی کا اہل نہیں ہوں، مگر حکم کی تکمیل میں اس دشوار گزار راستے پر آگے بڑھا۔ میں نہیں جانتا کہ کہاں تک میرے قدم متوازن رہے اور میں کس کس مقام پر لڑکھڑایا۔ آپ کی عدم موجودگی میں اہل کوفہ اپنے بے شمار مسائل لے کر بارگاہ حماد رحمتہ اللہ علیہ میں حاضر ہوئے تھے۔ میں نے ان مسائل کا حل آسانی کے ساتھ پیش کر دیا جن کے سلسلے میں آپ کی کوئی سند موجود تھی، مگر جہاں آپ کا کوئی حوالہ نظر نہیں آیا، ان مسائل کو میں نے اپنے قیاس سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی کم علمی کے سبب اہل طلب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔" یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے وہ سارے کاغذات امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کر دیئے جن پر تمام مسائل اور ان کے جوابات درج تھے۔

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک ان کاغذات کا بغور جائزہ لیتے رہے پھر زیر لب تبسم کے ساتھ فرمانے لگے۔ "ابوحنیفہ! تم ذہین بھی ہو اور علم کے ساتھ انصاف کرنا بھی جانتے ہو۔ یہ تمہاری تحقیق پسند فطرت کا روشن ثبوت ہے کہ جب تک آخری دلیل تلاش نہ کر لو اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے۔ تم میں وہ انکسار بھی ہے جو ایک فقیہ کی زندگی کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ تم اپنی فکر کو حرف آخر کا درجہ دے کر مطمئن بھی ہو سکتے تھے، مگر تمہارا یہ طرز عمل گواہی دیتا ہے کہ تم حقائق کی جستجو میں رہتے ہو۔ میں تم سے خوش ہوں کہ تم نے جانشینی کا حق ادا کر دیا۔"

یہ کہہ کر حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے فرداً فرداً تمام مسائل اور ان کے جوابات کا جائزہ لیا۔ پھر جو جواب درست تھا اس کے آگے اپنے قلم سے درست کا نشان لگاتے رہے۔ یہاں تک کہ آخری مسئلہ بھی امام حماد رحمتہ اللہ علیہ

کی نظروں سے گزر گیا۔

یہ مسائل تعداد میں ساٹھ تھے جن کے جوابات حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دیئے تھے۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے ان میں سے چالیس کو حرف بہ حرف درست قرار دیا تھا اور بیس مسائل کے جوابات سے اختلاف تھا یہ صورت حال دیکھ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو اس لئے نہیں تھے کہ آپ مسائل کی گہرائی تک پہنچنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ یہ اشک ریزی یوں تھی کہ ابھی آپ کا علم نامکمل تھا۔ ابھی ایک طالب علم کو استاد کی چشم نگراں درکار تھی' ابھی ایک تشنہ ذہن کو دریائے آگہی مطلوب تھا' ابھی ایک سائل کو اس آستانے کی ضرورت تھی جہاں سے سرمایہ علم تقسیم ہوتا تھا۔ آنسوؤں کی یہ بارش اس لئے بھی تھی کہ ابھی ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ جیسے مرد فقیہ کی قربت میسر تھی۔

پھر ان ہی بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے عہد کیا۔ "جب تک امام حماد رحمتہ اللہ علیہ زندہ ہیں ان کے دامن سے وابستہ رہوں گا۔ آج اندازہ ہوا کہ ہمارے علم کی کیا حیثیت ہے اور ہم فکر و نظر کی لامحدود دنیا میں کس مقام پر کھڑے ہیں؟"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس اعتراف کے بعد لوگوں کو حقیقت کا ادراک ہو جانا چاہئے کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس سے علیحدگی' صرف ایک عارضی خیال تھا جو ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ذہن میں ابھرا تھا۔ پھر جب امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی عدم موجودگی میں آپ کو فقہ کے بعض مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑا تو فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور برسرعام اعلان کیا کہ استاد گرامی کی زندگی تک اس مرد جلیل کے سایۂ عافیت سے نکل کر کہیں اور نہیں جاؤں گا۔

تاریخ بغداد میں اسی انداز کا ایک اور واقعہ نظر آتا ہے۔ مجلس درس کے دوران حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے کسی شاگرد نے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے وابستگی کا ذکر کیا تو جواباً حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"ایک بار میں بصرہ آیا تو لوگوں کا ہجوم میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ہر آنے والے کی زبان پر مختلف سوالات تھے اور مجھے اپنی ذات پر اعتماد تھا کہ ہر شخص کے سوال کا اس طرح جواب دوں گا کہ وہ مطمئن ہو جائے گا۔ پھر لوگوں نے مجھ پر سوالات کی بارش کر دی۔ میں برجستہ ان سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ مرحلہ آسانی کے ساتھ طے ہو جائے گا مگر میں اس وقت حیران رہ گیا جب اہل بصرہ نے کچھ ایسے سوالات بھی کئے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے اپنی تمام فکری قوتوں کو استعمال کیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان مسائل کا حل میرے اختیار میں نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں حلقہ حماد رحمتہ اللہ علیہ سے نکل کر کہاں جاؤں گا؟ آخر میں نے عہد کیا کہ مجلس حماد رحمتہ اللہ علیہ ہی میری پناہ گاہ ہے اور جب تک استاد گرامی زندہ رہیں گے' میں کسی دوسری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔

اس واقعے سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اپنا حلقہ درس علیحدہ قائم کرنے کی خواہش ایک عارضی خواہش تھی۔ ایک وقتی خیال تھا جو تجربے کی نئی منزل سے گزرنے کے بعد ذہن کے کسی بعید ترین گوشتے میں روپوش ہو گیا تھا۔ اگر یہ آرزوئے اقتدار ہوتی تو پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں ان سے الگ ہو چکے ہوتے۔

آوازِ غیب

الغرض علم فقہ کے تکمیلی مراحل آہستہ آہستہ طے ہوتے رہے۔ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کے پاس جو کچھ تھا' وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دامن میں سماتا رہا۔ غالباً یہ 105ھ کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خلوت نشین تھے اور اپنے خالق کی حمد وثنا کررہے تھے۔ اچانک آپ کے ذہن میں ایک خیال پوری شدت کے ساتھ ابھرا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح سنا جیسے کوئی مردِ غیب سرگوشی کررہا ہو کہنے والا کہہ رہا تھا۔

"ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ! کیا تجھے یہ گمان ہے کہ تیرا علم مکمل ہو چکا ہے۔"

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خاموشی کے ساتھ اس آواز کو سنتے رہے۔

کہنے والے نے پھر کہا۔ "قرآنی علم کے ساتھ علم حدیث بھی ضروری ہے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور ذہن کی ایک ایسی گرہ کھل گئی جس کے بارے میں آپ نے ابھی تک سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا تھا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی شاگردی سے پہلے آپ کے سینہ پرسوز میں علم حدیث حاصل کرنے کی آرزو پیدا ہوئی تھی مگر پھر اس علم کی نزاکتوں کو محسوس کر کے آپ ہمہ تن فقہ کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد اس خوابیدہ آرزو نے پھر کروٹ لی تھی اور ایک صدائے غیب آپ کو عجیب انداز میں تنبیہ کررہی تھی۔

کہنے والا کہہ رہا تھا۔ "ابوحنیفہ! حدیث کی مجلسوں میں بھی جاؤ اور ان لوگوں کو بھی غور سے دیکھو جو سرور کائنات ﷺ کے اقوال کی حفاظت کرنے کے لئے آزمائشوں کی کیسی جاں گداز منزلوں سے گزر رہے ہیں۔"

یہ کوئی مردِ غیب نہیں تھا جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو پکار رہا تھا۔ یہ آپ کے مضطرب دل کی آواز تھی جو رات کی تنہائی میں واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ یہ ایک کھلا ہوا اشارہ تھا کہ علوم مذہبی صرف کوفے تک محدود نہیں۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اشارے کو سمجھا' اس آواز کو پہچانا اور مزید علم کی طلب میں کوفے سے باہر قدم رکھا۔ آپ نے اس سے پہلے بھی بے شمار سفر اختیار کیے تھے اور اہل بصرہ کو اکثر مناظروں میں شکست دی تھی' لیکن اب آپ کا زاویہ نظر بدل چکا تھا اور جو قدم بھی اٹھ رہا تھا، وہ کوچہ حدیث وفقہ کی جانب تھا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور روایت ہے کہ آپ نے پچپن یا چھپن بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ پہلی مرتبہ آپ سولہ سال کی عمر میں اپنے والد گرامی کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور اس فریضہ اسلامی کو بڑے پرجوش انداز میں ادا کیا تھا۔ اس کے بعد جب تک حیات رہے' ہر سال اس گھر کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو روشن کرتے رہے' جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے مقدس ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔

شروع میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حج کی ادائیگی کے بعد کوفہ واپس تشریف لے آتے تھے مگر جب قدرت نے آپ کے علم کو وسعت بخشی تو دیارِ حجاز کے سفر نے نیا انداز اختیار کر لیا۔ اب آپ کا طریق کار یہ تھا کہ پہلے ارکان حج ادا کرتے' پھر محدثین کرام کی مجلسوں میں شریک ہوتے۔

جہاں تک فقہ کا تعلق ہے تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد و جانشین تھے' لیکن جب ہم شوق طلب کی بات کرتے ہیں تو شاید پوری تاریخ آدم میں ایسی کوئی مثال نظر نہ آئے کہ جب ایک شخص نے تلاش علم میں چار ہزار سے زیادہ معتبر درس گاہوں میں حاضری دی ہو۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں وہ کون سا فقیہ تھا جس کے دروازے تک آپ کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ وہ کون سا محدث تھا جس کے در پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بصد احترام دستک نہ دی ہو اور وہ کون سا ہوشمند تھا جس سے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے عقل کی بات نہ سیکھی ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی چشمہ علم نظر آتا تھا، اہل دنیا خاندان زوطی کے اس وارث کو وہاں موجود پاتے تھے۔

علم کی خاطر

جستجوئے علم کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو گی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جابر جعفی جیسے بدعقیدہ انسان سے بھی ''عقلیات'' کا درس لیا۔ جابر جعفی کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ بدعات کا شکار تھا' مگر اس کے باوجود نہایت ذکی و فہیم انسان تھا۔ جب عقل کی بنیاد پر کسی سے بحث کرتا تو اسے منطق و استدلال کے ذریعے عاجز کر دیتا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جابر کی اس غیر معمولی صفت سے آگاہ تھے۔ اس لئے آپ نے ''عقلیات'' کی حد تک اس سے بھی استفادہ کیا۔

آپ جابر جعفی کے متعلق برملا اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔

''جابر نے بدعت کا اظہار کر کے اپنے آپ کو بگاڑ لیا ہے' مگر جہاں تک علم کے ایک مخصوص شعبے کا تعلق ہے تو کوفے میں جابر کا کوئی ہمسر نہیں۔''

ابویحییٰ رحمانی رحمتہ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ایک بار کسی نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے جابر جعفی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے نہایت بے باکی کے ساتھ فرمایا۔

''میں نے اپنی زندگی میں عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ کسی انسان کو افضل نہیں پایا اور میری آنکھوں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا شخص کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا دستور تھا کہ جب بھی جابر جعفی سے ملاقات ہوتی تو گھنٹوں گفتگو کرتے' مگر اس ملاقات کا خاص پہلو یہ ہوتا کہ گفتگو میں کسی تیسرے شخص کو شریک نہ کرتے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ملاقاتیں تنہائی میں ہوتی تھیں۔ اگر کبھی آپ کا کوئی شاگرد اس گفتگو میں شامل ہونے کی درخواست کرتا تو آپ اسے سختی سے منع فرما دیتے۔

آپ کا یہ طرز عمل دیکھ کر کسی شاگرد نے برسر مجلس اعتراض کیا کہ آپ تو ان ملاقاتوں کو روا رکھتے ہیں' مگر ہمیں اس راہ پر جانے سے روک دیتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''میں جس کام کو تمہارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں' اس کو اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور جو چیز تمہارے لئے ضرر رساں ہوتی ہے' اس سے باز رکھتا ہوں۔ تم جابر جعفی کو نہیں جانتے کہ وہ کون ہے؟ خبردار! اس کے قریب بھی نہ جانا۔ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تو کسی بڑے فتنے میں

مبتلا ہو جاؤ گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنی ساحرانہ عقل کے ذریعے تمہیں گمراہ نہ کر دے۔ وہ بڑا فریب کار ہے۔"

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو عقل و ہوش کی کیسی دولت عظیم سے سرفراز کیا تھا۔ آپ کی یہ خاص عادت تھی کہ ہر اہل کمال سے ملتے‘ اس کی باتیں سنتے‘ علم کے مظاہرے دیکھتے اور پھر جو چیز اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے مفید ہوتی اسے حاصل کر لیتے۔ خیر و شر میں تمیز اور سود و زیاں میں فرق کرنے کی یہ صلاحیت بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ بے شک! حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا شمار بھی ان ہی چند انسانوں میں ہوتا ہے جنہیں ہر قدم پر قدرت کی رہنمائی حاصل تھی۔ آپ ہر اس مقام پر پہنچتے جہاں علم کی جھلک نظر آتی‘ ہر اس آدمی سے گفتگو کرتے جس کی باتوں سے ہوش و خرد کی خوشبو محسوس ہوتی۔ آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ یہ کیا جگہ ہے اور کون شخص بول رہا ہے؟ آپ نے ہمیشہ علم کی افادیت پر نظر رکھی۔ دل کی یہ کشادگی اور نگاہ کی یہ بلندی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی امتیازی خصوصیت تھی جس نے آپ کو یگانہ روزگار بنا دیا تھا۔

اسی اضطراب مسلسل اور شوق طلب نے آپ کو زندگی بھر بیٹھنے نہیں دیا۔ تحقیق و جستجو کی اسی چنگاری نے شعلہ سوز اں کا لباس پہن لیا تھا اور آپ ہر اس دروازے پر کاسہ سوال لے کر پہنچ جاتے تھے جہاں سے امید ہوتی تھی کہ دینے والا خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔ یہی وہ جذبہ بے اختیار تھا جس نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو چار ہزار علمائے کرام کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا منفرد اعزاز بخشا۔

اب ہم ایسے چند اساتذہ کا ذکر کریں گے جن کے افکار کی روشنی سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے دل و دماغ کو منور کیا اور پھر خود ایک مینار نور بن گئے۔

تمام مستند مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ علم میں بھی حاضری دی ہے۔



مجلس عطا رحمتہ اللہ علیہ میں

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دوسرے استاد حضرت عطا ابن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ تھے جن سے آپ کو ایک تعلق خاص تھا۔

جب پہلی بار حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ‘ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم میں داخل ہوئے تو اس مرد جلیل نے آنے والے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مجلس میں بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اشارہ کیا اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حلقہ درس کے ایک گوشے میں چپ چاپ جا کر بیٹھ گئے۔ درس جاری ہوا۔ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے لب کشائی کی تو دیوار و در ساکت ہو گئے اور حاضرین کی سانسیں رک گئیں۔ خود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کے ہیبت و جلال کو براہ راست اپنے دل پر محسوس کر رہے تھے۔ بہت دیر تک علم و حکمت کا سمندر موجزن رہا اور اہل طلب دماغوں کے ساتھ روح کی گہرائیوں تک سیراب ہوتے رہے۔

پھر جب مجلس اختتام پذیر ہوئی تو حاضرین ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علاوہ مجلس میں کوئی تیسرا فرد باقی نہیں رہا۔ پھر وہ نگاہ کرم اٹھی اور حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی جانب دیکھا۔ آپ اس عظیم فقیہ کے احترام میں کھڑے ہو گئے، مگر اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔

''نوجوان! میرے قریب آؤ۔'' حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کیا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ گردن خم کئے ہوئے آہستہ خرامی کے ساتھ اس طرح آگے بڑھے جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے روبرو طلب کیا گیا ہو۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مسند درس کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت شفقت سے فرمایا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بیٹھ گئے مگر آپ کی نشست کا انداز اس قدر مؤدبانہ تھا کہ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''نوجوان! تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'' حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ نے آنے والے سے سوال کیا۔

''میں ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ہوں اور کوفہ میرا وطن ہے۔''

(یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ارکان حج ادا کرنے کے بعد پہلی بار حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ میں داخل ہوئے تھے، اس وقت حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ ذاتی طور پر آپ سے واقف نہیں تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نوعمری اور تحصیل علم کا زمانہ تھا۔ اگرچہ آپ کوفے کی حدود تک بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے اور بعض مناظرات میں فتح حاصل کرنے کے بعد اہل عراق بھی آپ کو پہچاننے لگے تھے، لیکن جہاں تک پوری ملت اسلامیہ کا تعلق ہے تو ابھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا نام حجاز مقدس کے باشندوں کی سماعتوں تک نہیں پہنچا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے تعارف کے طور پر بنیادی سوالات کئے تھے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ سے آپ کی پہلی ملاقات 105ھ یا 106ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر پچیس یا چھبیس سال تھی)

''مشغلہ حیات کیا ہے؟'' حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ نے دوسرا سوال کیا۔

''میں خاندانی طور پر ریشمی کپڑے کا تاجر ہوں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نہایت آہستہ لہجے میں جواب دے رہے تھے۔

''فرزند! میں تو مکے کا ایک گمنام سا فقیہ ہوں پھر بھی تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں؟'' حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کا انکسار قابل دید تھا۔

''تجارت صرف میرا پیشہ ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے وضاحتاً کہا۔ ''سوداگری زیست بسر کرنے کا ایک انداز ہے، مقصد حیات نہیں۔''

''اپنی زندگی کا مقصد بھی بیان کرو۔'' حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کا لہجہ مشفقانہ تھا۔

''میں نے اپنی زندگی کو تحصیل فقہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً کہا۔
''ابھی ابتدا کر رہے ہو یا کسی کے دامن سے وابستگی بھی اختیار کر چکے ہو؟'' حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے دریافت کیا۔
''مجھے حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان کی خدمت گزاری کا شرف حاصل ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے اپنے استاد گرامی کا نام لیتے ہوئے کہا۔
''حماد رحمتہ اللہ علیہ تو بہت بڑے فقیہ ہیں پھر تم نے کوفہ چھوڑ کر اتنا طویل سفر کیوں اختیار کیا؟'' حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔'' حماد کے دامن سے وابستہ رہو، منزل بھی مل جائے گی اور فلاح بھی پا جاؤ گے۔''
''میری نظر میں آپ بھی بڑے عظیم فقیہ ہیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے عرض کیا۔'' میں امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ آپ کے دامن کرم سے بھی وابستگی چاہتا ہوں۔ علم کوفے کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ دولت عظیم تو خدا کی زمین پر ہر طرف بکھری ہوئی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ جلیل سے چند ذرے اٹھا کر اپنے پیشانی پر سجا سکوں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ وارفتگی کے عالم میں بول رہے تھے۔
حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کو آپ کے طرز گفتار نے اس قدر متاثر کیا کہ چہرہ مبارک پر ایک خاص رنگ نمایاں ہو گیا۔ یہ رنگ محبت کی وہ علامت تھی، جسے چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس رنگ کو دیکھ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مطمئن ہو چکے تھے کہ علم کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹیں گے، لیکن حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ خاموش تھے اور آپ کے ظاہری انداز سے پتا چلتا تھا کہ جیسے کسی پہلو پر غور و فکر کر رہے ہوں۔
جب حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کا یہ سکوت طویل ہو گیا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے سے اضطراری کیفیت نمایاں ہونے لگی۔ آپ نے بے قرار ہو کر پوچھا۔'' کیا میں تشنہ لب، اس چشمہ علم تک پہنچنے کے بعد بھی پیاسا لوٹ جاؤں؟'' حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی خاموشی سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو گمان ہونے لگا تھا کہ کہیں یہ عظیم فقیہ انکار نہ کر دے۔
''اس سے پہلے کہ میں تمہیں شریک درس ہونے کی اجازت دوں، تم پر میرے ایک سوال کا جواب لازم ہے۔'' آخر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوئے۔
''میں آپ کے حلقہ درس سے وابستہ رہنے کے لئے ہر آزمائش سے گزر جانا چاہتا ہوں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بہت زیادہ پرجوش نظر آنے لگے تھے۔'' میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔''
حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے ایک بار پھر خاموشی اختیار کر لی اور چہرے سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ وقفہ سکوت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے بہت گراں تھا۔ آپ ذہنی طور پر بہت بے چین نظر آ رہے تھے اور دماغ میں عجیب عجیب خیالات ابھر کر ڈوب جاتے تھے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو خوب اندازہ تھا کہ آپ جس عالم و فاضل شخص کے روبرو حاضر ہیں وہ پوری مملکت اسلامیہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس لئے آپ کو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کوئی ایسا سوال نہ پوچھ لیں جو آپ کے ذہن کی گرفت سے دور ہو۔

خاموشی کچھ اور طویل ہو گئی۔ اچانک حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آنے لگے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جسے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی محسوس کر لیا تھا مگر احترام کے پیش نظر' حضور شیخ لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

سکوت کے لمحات میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر کرب کا رنگ بدستور نمایاں تھا۔ شیخ مکہ کو خاموش دیکھ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی اضطرابی کیفیت سے دوچار ہو گئے تھے' لیکن آپ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کیسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں؟ یہ عظیم فقیہ جو کچھ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھنا چاہتا تھا' وہ ایک نازک سوال تھا۔ ایسا سوال جس سے کوفے کے نوجوان تاجر کی دل آزاری بھی ہو سکتی تھی اور اس سوال کے جواب سے خود حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کو بھی دکھ پہنچ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خاموشی کا وقفہ مزید طول کھینچتا جا رہا تھا۔

بالآخر حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور زبان پر وہ بات آ ہی گئی جسے معلوم کرنے میں آپ تامل اور تاخیر سے کام لے رہے تھے۔

"ابوحنیفہ! مجھے بتاؤ کہ تم کیا عقائد رکھتے ہو؟" حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے بہت آہستہ لہجے میں فرمایا۔ آواز کی یہ آہستگی کسی مصلحت کے سبب نہیں تھی۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ تو وہ مرد بیباک تھے کہ حق بات کہنے پر آتے تو آپ کی زبان شمشیر بے نیام کی شکل اختیار کر لیتی مگر جب حلقہ احباب یا عام محفل میں تشریف فرما ہوتے اور گفتگو ذاتی نوعیت کی ہوتی تو حرف گرم سننے کے باوجود خاموش رہتے۔ مخاطب کی دل شکنی کے سبب اسے کوئی جواب نہ دیتے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے ان کے عقائد کے بارے میں دریافت کرتے وقت بھی حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی یہی کیفیت تھی۔

عقائد کی بات سنتے ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سنبھل گئے۔ یہ ایک سخت آزمائش تھی جس سے بہرحال آپ کو گزرنا تھا کہ اس امتحان میں کامیابی کے بغیر حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ میں داخلہ ممکن نہیں تھا۔

"میں اپنے اسلاف (بزرگوں) کو برا نہیں کہتا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ امتحان کا پہلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ "اور بتاؤ؟" حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ابھی آپ کے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"میں گناہ گار کو کافر نہیں سمجھتا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے نظریات کا اظہار کیا۔ یہ آزمائش کا دوسرا مرحلہ تھا۔

"اور بتاؤ؟" حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی نظریں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر اس طرح مرکوز تھیں جیسے ممتحن کسی طالب علم کا نگراں ہو۔

"میں قضا و قدر کا قائل ہوں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ مطمئن نظر آنے لگے۔

امتحان ختم ہو چکا تھا۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی

کامیابی کا یقین تھا' مگر پھر بھی آپ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے نتیجہ سننے کے لئے مضطرب تھے۔ "تم شریک درس ہو سکتے ہو۔" آخر حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ "تمہارے حسن ظن کے باوجود میرا علم زیادہ وسیع نہیں پھر بھی مجھے جو کچھ آتا ہے۔ تمہاری نذر کر دوں گا۔" حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کے عجز و انکسار نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو رلا دیا' مگر ان آنسوؤں میں ایک لازوال خوشی بھی شامل تھی۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر مجلس عطا رحمتہ اللہ علیہ کے دروازے کھل گئے تھے اور یہ بڑا شرف تھا' بڑا اعزاز تھا۔

شروع میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی عام شاگردوں کی طرح شریک درس ہوتے رہے۔ اس وقت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کو اندازہ نہیں تھا کہ آنے والا نوجوان کس فہم و فراست کا مالک ہے۔ مگر بہت جلد وہ لمحات بھی آ گئے جب تمام حاضرین پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذہانت آشکار ہو گئی پھر انداز نشست بھی بدل گیا۔ اب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ شاگردوں کی اگلی قطار میں بیٹھتے تھے اور ہمہ وقت حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہتے تھے۔

عام خیال ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جب بھی حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جاتے، حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شریک ہوتے۔ مدت قیام کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس ایک اندازہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس دیار مقدس میں ماہ دو ماہ یقیناً ٹھہرتے ہوں گے۔ بہر حال جب تک آپ کا مکہ معظمہ میں قیام رہتا' بیشتر وقت حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں گزارتے۔

حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس وہی تھی' مگر شاگردوں کی نشستیں اور ان کے مقامات بدل چکے تھے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فقہ کی اس عظیم مجلس میں بہت دیر سے داخل ہوئے تھے مگر آپ اپنی ذہانت اور نکتہ آفرینی کے سبب تمام حاضرین سے زیادہ محترم ٹھہرے تھے۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کے دیگر شاگرد مستقل طور پر حلقہ درس سے وابستہ رہتے تھے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ آپ جب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لاتے تو ایک مختصر مدت تک حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ شرکت درس کی یہ مدت زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ماہ ہوتی۔ کبھی کبھی کاروباری مصروفیات اور دیگر مسائل کی وجہ سے مکہ معظمہ میں دو تین ہفتے ہی قیام کرتے مگر پھر بھی حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں آپ کو درجہ محبوبیت حاصل تھا۔

وہ لوگ جو سربلندی کے لئے عمر کی زیادتی اور کثرت حاضری کو لازمی قرار دیتے تھے' انہیں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی "محبوبیت" سے بہت شکایت تھی۔ اس انداز فکر کے لوگ اکثر کہا کرتے تھے۔

"حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کے آستانے پر حاضری دیتے دیتے ہماری زندگی تمام ہو گئی اور ہم پھر بھی معزز و محترم قرار نہیں پائے مگر کوفے کا یہ نوجوان تاجر آتے ہی پوری مجلس پر چھا گیا۔ یہاں تک کہ استاد گرامی بھی اس کی ناز برداریوں پر مجبور ہو گئے۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟"

حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے وہ شاگرد جو محتاط طرز گفتگو کے عادی تھے' سرگوشیوں میں اس قسم کی باتیں کرتے مگر جن کے جذبات بھڑک اٹھے تھے اور جن کی زبانیں احتیاط کی حدود سے گزر چکی تھیں، وہ کسی تکلف کو

گوارانہ کرتے اور مجلس میں برملا کہہ دیتے کہ یہ کھلی ہوئی جانب داری ہے اور سراسر ناانصافی ہے۔

حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے کانوں تک بھی اڑتے اڑتے یہ باتیں پہنچ جاتیں۔ آپ لوگوں کے اس غیر محتاط ناقدانہ عمل پر اپنی زبان مبارک سے کچھ نہ کہتے۔ اکثر خاموش ہی رہتے اور کبھی بہت زیادہ احساس کرتے تو زیرلب مسکرا کر رہ جاتے۔

حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ ان اعتراض کرنے والوں سے کس طرح کہتے کہ۔ "علم کسی عمر' کسی خاندان اور کسی موسم کا پابند نہیں۔" حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ لوگوں کو یہ کس طرح بتاتے کہ اگر کسی شخص کو خدا کی طرف سے ہزار سالہ زندگی بھی بخش دی جائے تو یہ ضروری نہیں کہ اسے آگہی بھی نصیب ہو جائے۔ بے شمار انسان اپنی طویل عمروں کے ساتھ زیر قبر چلے جاتے ہیں اور انہیں ایک حرف کا بھی شعور حاصل نہیں ہوتا اور جن پر قدرت کا کرم خاص سایہ فگن ہوتا ہے' وہ چند ساعتوں میں علم کے خزانے سمیٹ بھی لیتے ہیں اور پھر اس دولت کو بندگان خدا میں تقسیم کر کے دنیا سے گزر بھی جاتے ہیں۔ یہ آسمان کا ایک فیصلہ ہے جس پر کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ یہ اللہ کی نوازش بے کنار ہے جو ہر شخص کا مقدر نہیں بن سکتی۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا کہ جس منزل سے گزرتے، وہ منزل شب و روز یاد کرتی 'جس شخص سے ملاقات کرتے، وہ آپ کی ذات کا اسیر ہو جاتا اور جس محفل میں نمودار ہوتے' میر محفل قرار پاتے۔ شاگردان عطا رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو ماہ و سال کے پیمانے سے ناپتے رہے مگر آپ کا سفر علم لمحوں اور ساعتوں میں طے ہوتا رہا۔

جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پہلے سال حلقہ عطا رحمتہ اللہ علیہ میں پہنچے تو کچھ دن اہل طلب کی عام قطار میں بیٹھے۔ پھر کوئی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو اگلی صف میں طلب کر لیا۔

دوسرے سال حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد گرامی کے روبرو حاضر ہوئے تو مجلس کا رنگ ہی بدل گیا۔ حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ آپ کے ساتھ اس محبت سے پیش آئے کہ اہل مجلس دیکھتے ہی رہ گئے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حسب معمول حاضرین کی قطار میں بیٹھنا چاہا مگر حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ نے بے اختیار ہو کر فرمایا۔

"ابوحنیفہ! میرے نزدیک آؤ۔ تمہاری جگہ یہاں ہے۔"

استاد گرامی کا حکم سنتے ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ آگے بڑھے اور مسند درس کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک بٹھا لیا اور پھر جب بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ درس میں شریک ہوتے' حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے۔ اس واقعے میں اہل نظر کے لئے بڑی نشانی ہے اگر وہ سمجھنے کی کوشش کریں۔

جب تک حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ زندہ رہے' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پابندی کے ساتھ آپ کی مجلس علم میں حاضر ہوتے رہے۔ حدیث و فقہ کی نئی منزلیں جن سے آپ کے قدم آشنا نہیں تھے' وہ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی رہنمائی میں طے کی گئیں۔ پھر دل کچھ اور کشادہ ہوا، عقل کچھ اور روشن ہوئی' یہاں تک کہ حضرت ابوحنیفہ

رحمتہ اللہ علیہ نے جلیل القدر تابعی کی نظر میں درجہ محبوبیت حاصل کرلیا۔

حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال 114ھ یا 115ھ میں ہوا تھا۔ اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر چونتیس یا پینتیس سال تھی۔ اگر ہم کچھ دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے آخری سال میں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا تو یہ روشن حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ آپ اپنی جوانی کے زمانے ہی میں اساتذہ کے مرکز نظر بن گئے تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ عمر کی پختگی کے بعد اس درجہ قبولیت تک پہنچتے ہیں مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے شہرت و عظمت کے سارے مراحل اس عمر میں طے کر لئے تھے جو وسعت و گہرائی کی عمر نہیں ہوتی۔

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کا یہ کرم بے سبب نہیں تھا۔

تمام مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ بعض معاملات میں حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ' ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے نہ صرف مشورے کیا کرتے تھے بلکہ اپنے نوجوان شاگرد کی نکتہ آفرینیوں کے معترف بھی رہتے تھے اور کبھی تو یوں ہوتا کہ جس رمز کو استاد گرامی نہ سمجھ پاتے، اس تک شاگرد کے ذہن کی رسائی ہو جاتی اور پھر کم نظر لوگ ایک ہنگامہ برپا کر دیتے۔ کسی منطق اور دلیل کے بغیر کہا جاتا کہ ''یہ کوفی نوجوان قیاس سے کام لیتا ہے۔'' اگرچہ وہ ''قیاس'' نہیں ایک زندہ حقیقت ہوتی تھی لیکن جب کوئی انسانی ذہن حقیقت کا ادراک نہ کر سکے تو پھر اسی انداز کی الزام تراشی کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔

ایک بار حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس آراستہ تھی۔ کسی شخص نے حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک قرآن کریم کی اس آیت کا کیا مفہوم ہے۔؟

واتینٰه اهله و مثلهم معهم ط

یہ سورہ انبیاء کی آیت ہے جس کے ذریعے خداوند ذوالجلال نے اپنے برگزیدہ پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام کی مخصوص آزمائش اور پھر انعام واکرام کا اظہار کیا ہے۔

جواباً حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔ ''خدا نے حضرت ایوب علیہ السلام کی آل واولاد جو مرگئی تھی، زندہ کردی اور اس کے ساتھ نئی پیدا کر دی۔''

اس مجلس میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ آپ نے استاد گرامی کے حضور بصد احترام عرض کیا۔ ''نعمان بن ثابت کی کیا مجال کہ بارگاہ عطا میں لب کشائی کر سکے اس کا علم بہت قلیل اور نظر بہت محدود ہے۔''

حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ' ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا اور پھر نہایت مؤدب لہجے میں عرض کرنے لگے۔ ''آپ نے ابھی فرمایا ہے کہ خدا نے حضرت ایوبؑ کی مردہ اولاد کو دوبارہ زندہ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی نئی بھی پیدا کر دی۔ اس سلسلے میں میری گزارش ہے کہ جو بچہ کسی کے صلب (نطفے) سے نہ پیدا ہو وہ اس کی اولاد کس طرح ہو سکتا ہے۔''

جیسے ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے' پوری مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کے وہ شاگرد جو ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے حسد رکھتے تھے' ان کی پیشانیوں پر ناپسندیدگی کی شکنیں ابھر آئیں اور وہ دل ہی دل میں کوفے کے نوجوان تاجر کی جرأت اظہار کو سخت گستاخی و بے ادبی سے تعبیر کرنے

لگے۔ مگر حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے سے وہی باوقار سنجیدگی نمایاں تھی جس کے لئے آپ پورے عالم اسلام میں مشہور تھے۔

''ابوحنیفہ! تمہارے نزدیک اس آیت مقدسہ کا کیا مفہوم ہے؟'' حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم محدث وفقیہ نے اس بے نیازی کے ساتھ فرمایا جیسے کسی محفل میں دو دوستوں کے درمیان مکالمات کا تبادلہ ہو رہا ہو۔ شریک مجلس ہونے والا کوئی نیا شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ میں استادی وشاگردی کا محترم رشتہ قائم ہے۔ عمروں کے فرق سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں میں ایک شخص علم تقسیم کرنے والا ہے اور دوسرا خالی دامن کو بھرنے والا۔ مگر جہاں تک حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کے طرز گفتگو کا معاملہ تھا، وہ بڑا سادہ اور مشفقانہ تھا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ایک نظر اس مرد جلیل کی طرف دیکھا جس کی چشم کرم نے اپنے شاگردوں کو اس قدر جری اور بیباک بنا دیا تا کہ وہ علم کے مسئلے میں کسی عنوان بھی خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی ہی تھی کہ جس نے اپنی مجلس علم میں ہر خاص وعام کو زبان بخشی تھی۔ ورنہ کس میں اتنی جرأت تھی کہ وہ آپ کی بارگاہ جلال میں آزادی کے ساتھ لب کشا ہوتا...... حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بھی یہ جرأت اظہار حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ ہی نے بخشی تھی۔ اپنے استاد گرامی کی یہ خوئے دلنوازی دیکھ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا سر احترام سے خم ہو گیا اور آپ نے اسی حالت میں عرض کیا۔

''میرے نزدیک اس آیت الٰہی کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند کریم نے حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے خاندان کا اجر دیا (یعنی جو لوگ امتحان و آزمائش کے عرصے میں ہلاک ہو گئے تھے، انہیں زندہ کر دیا) اور خاندان میں اس قدر مزید اضافہ کر دیا۔ (یعنی بعد میں حضرت ایوبؑ کی افزائش نسل کا سلسلہ جاری رہا)

''صحیفہ ایوبیؑ سے بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ اسی صحیفے میں ایک مقام پر پوری وضاحت کے ساتھ یہ تحریر نظر آتی ہے۔

''اس آزمائش سے نجات پانے کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام ایک سو چالیس سال زندہ رہے۔ پھر آپ نے اپنے بیٹوں کے بیٹے چار پشتوں تک دیکھے۔ یہاں تک کہ بوڑھے ہو کر دار فانی سے عالم بالا کی طرف رخصت ہو گئے۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں نسل ایوبیؑ کے اسی اضافے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد کی جانب محبت کی ایک نگاہ خاص سے دیکھا اور آپ کے چہرے پر سکون واطمینان کا رنگ اس طرح نمایاں ہو گیا کہ اہل مجلس بھی اسے محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کو اس کا ملال نہیں تھا کہ سیکڑوں افراد کے ہجوم میں ایک نوجوان نے آپ کے طویل مشاہدات وتجربات اور علمی اجتہاد سے اختلاف کیا تھا' بلکہ آپ کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نکتہ آفرینی سے بے اندازہ خوشی حاصل ہوتی تھی اور پھر حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی اس بے پناہ مسرت کا اظہار کرنے کے لئے برسر مجلس کہا تھا۔

''ابوحنیفہ! تم درست کہتے ہو۔ اس آیت مقدسہ کا یہی مفہوم حقیقت سے زیادہ قریب ہو سکتا ہے۔''

حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کے اس اعتراف نے جہاں بلند نگاہی اور کشادہ دلی کی ایک تاریخ رقم کی تھی وہاں اپنے دور کے محدثین اور فقہا کے لئے یہ روشن اشارہ بھی چھوڑ دیا تھا کہ کوفے کے جس تاجر کو آپ کی بارگاہ علم میں غیر معمولی مقام حاصل ہے' اسے ایک عام نوجوان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس واقعے کی تفصیل کے بعد اہل نظر کو سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ یوں ہی ادا نہیں ہوئے تھے کہ

''ابو حنیفہ! میرے قریب آؤ۔ تمہاری جگہ یہاں ہے۔''

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کسی مسئلے میں اپنے دلائل پیش کرتے' کسی حدیث یا کسی آیت کا مفہوم بیان کرتے وقت مروّجہ معانی سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرتے اور مخاطب آپ کی بات سمجھنے سے قاصر رہتا تو فوراً ناراض ہو جاتا اور انتہائی ناخوشگوار لہجے میں کہنے لگتا۔

''ابو حنیفہ! تمہاری باتیں ہماری عقل سے بالاتر ہیں۔ خدا جانے تم کون سی زبان میں گفتگو کرتے ہو؟''

حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مخاطب کی تلخ کلامی کے باوجود نہایت شیریں لہجے میں فرماتے۔ ''میں تو وہی زبان بولتا ہوں جو تمہاری زبان ہے اور جس کے ذریعے تمام اہل عرب اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ میری زبان تمہارے لئے ہرگز اجنبی نہیں ہے۔''

''بے شک! تم عربی زبان میں بات کرتے ہو مگر تمہاری گفتگو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔'' مخاطب شخص' حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نرم کلامی کا لحاظ کئے بغیر اپنی ضد پر قائم رہتا۔

حضرت ابو حنیفہ! اسے عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کرتے مگر بالآخر ناکام رہتے۔

اور پھر وہ شخص کسی تحقیق' کسی جستجو کے بغیر حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر یہ سنگین الزام عائد کر کے چلا جاتا۔

''ابو حنیفہ! تم کلام الٰہی اور قول رسول کی موجودگی میں اپنی رائے کو زیادہ اہمیت دیتے ہو اور صریحاً قیاس سے کام لیتے ہو۔''

حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس ضرب شدید سے تڑپ اٹھتے اور بڑے دردناک لہجے میں فرماتے۔ ''خدا گواہ ہے' میں ایسا نہیں کرتا۔ میرے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی اس سرکشی اور نافرمانی کا تصور موجود نہیں کہ میں خدا اور رسول کے کلام پر اپنی عقل کو ترجیح دوں۔ معاذ اللہ' اگر ایسا ہے تو میرا وجود کہاں باقی رہے گا؟ میں ہلاک نہیں ہو جاؤں گا۔ تم کیوں نہیں سوچتے کہ ایک کھلی ہوئی گواہی دینے والا شخص ایمان و عقائد کے کھینچے ہوئے حصار سے کس طرح باہر نکل سکتا ہے۔ لوگو! میری باتیں سنو! میں وہم و گمان کی دنیا میں نہیں رہتا۔ حقیقت کی تلاش میرا مقصد حیات ہے۔ میں ہرگز قیاس سے کام نہیں لیتا۔''

حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کبھی کبھی اپنے طرز فکر کی وضاحت کرتے کرتے تھک جاتے مگر کہنے والے بار بار ایک ہی بات کہتے۔

''ابو حنیفہ قیاس سے کام لیتے ہیں۔'' یہ ایک لفظ اتنی بار دہرایا گیا تھا کہ بیشتر حلقوں میں آپ کا لقب ہی ''قیاس'' پڑ گیا تھا۔

کم نظر لوگوں کا تو ذکر ہی کیا' حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر تابعی نے بھی ایک بار ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو ''قیاس'' کہہ کر پکارا تھا۔

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر قیاس کا الزام

بعض مؤرخین نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ عرصے تک امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح فطری طور پر دونوں ائمہ کے درمیان شاگردی و استادی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ کسی مستند کتاب سے اس زمانے کی نشان دہی نہیں ہوتی جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ علم میں حاضر ہوئے اور اس عظیم محدث سے کسب فیض کیا۔ اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی وقت تھا جب امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو تحصیل علم کی نصیحت کی تھی۔ اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال 104ھ میں ہوا۔ جب یہ مرد جلیل دنیا سے رخصت ہوا تو اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ چوبیس برس کے تھے۔ اس طرح امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی شاگردی اختیار کرنے کا زمانہ 102ھ یا 103ھ کے قریب قریب ہے۔

اس تاریخی تحقیق کے بعد ہم ایک ایسے واقعے کا ذکر کرتے ہیں جس سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی غیر معمولی ذہانت کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آغاز علم کے دوران ہی کہا جانے لگا تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قیاس سے کام لیتے ہیں۔

''عقود الجمان'' کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب ''سیرت نعمان'' میں تحریر کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کسی دریائی سفر پر جا رہے تھے۔ جب استاد و شاگرد کشتی میں سوار ہو گئے تو اس خاص مسئلے کا ذکر آیا کہ معصیت (گناہ) میں کفارہ ہے یا نہیں؟

حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ اس بات کے قائل تھے کہ معصیت میں کوئی کفارہ نہیں۔ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوبارہ اسی مسئلے کو چھیڑا تو امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ پر جوش لہجے میں فرمانے لگے۔

''ہاں۔ میں کہتا ہوں کہ معصیت میں کوئی کفارہ نہیں۔''

''اگر دوسرے لوگ اس مسئلے میں آپ سے اختلاف کریں تو پھر آپ کا کیا مؤقف ہوگا؟'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے استاد گرامی کے حضور بصد احترام کہا۔

لوگوں کو اختلاف رائے کا حق ہے مگر وہ ایسی کوئی دلیل نہیں لا سکیں گے جس سے میرے نظریات کی تردید ہو سکے۔'' حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''میں نے قرآن کریم کی بعض آیات کے مفہوم سے یہی نتائج اخذ کیے ہیں۔''

''اگر کوئی دوسرا شخص قرآن کریم ہی کے حوالے سے کوئی دلیل پیش کرے تو کیا آپ اسے تسلیم کر لیں گے؟'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح عرض کیا کہ آپ کی آواز بہت مدھم تھی اور فرط ادب سے سر جھکا ہوا تھا۔

''اس دنیا میں وہ کون اہل ایمان ہے جو قرآنی دلائل کو جھٹلا سکے۔'' حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کا لہجہ بدستور پر جوش تھا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ گفتگو کے آغاز ہی میں اپنی دلیل پیش کر سکتے تھے مگر آپ کا طریق کار عام شاگردوں سے مختلف تھا۔ آپ کے یہاں اس بات کی بہت زیادہ اہمیت تھی کہ اختلاف کا اظہار کرنے سے پہلے استاد

سے اجازت طلب کی جائے۔ جب حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے واضح اشارہ کر دیا تو آپ لب کشا ہوئے۔
''میرے نزدیک معصیت میں کفارہ موجود ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت انکسار کے ساتھ کہا۔

حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ جو ایک شان بے نیازی کے ساتھ دریا کے پانی کی لہروں کو دیکھ رہے تھے، حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر چونک اٹھے۔ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کو اس بائیس تیئس سالہ نوجوان کی گفتگو پر شدید حیرت تھی۔ وہ نوجوان جو چند روز پہلے تک صرف کوفے کے تاجروں کی دکانوں پر جایا کرتا تھا اور جسے محض کچھ سوداگروں کی صحبت حاصل تھی، آج وہی نوجوان ایک ایسے پچاسی چھیاسی سالہ بزرگ کے نظریئے کی تردید کر رہا تھا جس کی ساری عمر ہی کوچہ علم میں بسر ہوئی تھی۔

''ابوحنیفہ! کیا تم کوئی دعویٰ کر رہے ہو؟'' حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے میں استعجاب کے ساتھ قدرے ناگواری بھی شامل تھی۔

''نہیں، استادِ محترم! انسان کسی دعوے کی اہلیت نہیں رکھتا۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً عرض کیا۔

''پھر تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کے لئے کوئی حوالہ بھی رکھتے ہو؟'' حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا۔

''میرا حوالہ بھی کتاب الٰہی سے ماخوذ ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔ ''میں خدائی قانونی کے دائرے سے کس طرح باہر نکل سکتا ہوں؟'' یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی اور ثابت کرنا چاہا کہ معصیت میں کفارہ موجود ہے۔

حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک اپنے شاگرد کا بیان سنتے رہے۔ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن کریم کے حوالے سے استدلال پیش کیا تھا۔ مگر امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی خاموشی بتا رہی تھی کہ آپ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دلیل سے مطمئن نہیں ہیں۔

سکوت زیادہ طویل ہو گیا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے استادِ گرامی کی جناب میں عرض کیا۔ ''کیا آپ میری پیش کردہ اس دلیل کو کافی نہیں سمجھتے؟''

حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ بدستور خاموش رہے۔ استادِ گرامی کا طرزِ عمل دیکھ کر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو خیال گزرا کہ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ آپ کی بات سے اختلاف کرنے کے لئے کوئی نئی دلیل تلاش کر رہے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر بیزاری کی کیفیت نمایاں ہونے لگی۔ پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے نہایت تلخ لہجے میں فرمایا۔

''انت قیاس'' (تم قیاس کرنے والے ہو)

اگرچہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی دلیل کے پس پردہ قرآن کریم کا حوالہ رکھتے تھے، لیکن امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کے اخذ کردہ مفہوم کو قبول نہیں کیا اور محض اپنی بزرگانہ شان اور علمی جلال کے سہارے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ساری گفتگو کو ''قیاس'' کہہ کر سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔

کسی مستند کتاب میں اس مناظرے کے بعد کی کیفیات تو رقم نہیں مگر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ

رحمۃ اللہ علیہ کو امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بے وجہ ناراضگی یقیناً شاق گزری ہوگی (معاذ اللہ! یہاں حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات جلیل پر کوئی نکتہ چینی مقصود نہیں بلکہ ان دشواریوں کو ظاہر کرنا ہے جو کبھی کبھی علم کے راستے میں ایک نووارد کا مقدر بن جاتی ہیں۔ حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی رائے کے اظہار میں دیانت دار بھی تھے اور مخلص بھی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انہیں حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زاویہ نظر سے اتفاق نہیں تھا۔ تاریخ انسانیت میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ تحقیق و جستجو کے بعض گوشے اہل نظر کی نگاہ سے بھی پوشیدہ رہتے ہیں۔ عمر اور تجربہ جن مسائل کو حل نہیں کر پاتے' انہیں راہ طلب کا ایک کم سن مسافر اس طرح سلجھا دیتا ہے کہ صاحبان ہوش و خرد سوچتے ہی رہ جاتے ہیں۔ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہی مرحلہ درپیش تھا۔ آپ ایک ایسے عظیم فقیہ و محدث سے محو گفتگو تھے جس کی رائے عالم اسلام میں سند کا درجہ رکھتی تھی مگر جب حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مضبوط دلیل کے ساتھ حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا تو ''عمر اور تجربہ'' کم سنی کے موقف کو تسلیم نہیں کر سکے)

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی جن آنکھوں نے حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیشانی پر ذہانت و فراست کے آثار دیکھے تھے' وہی آنکھیں اس اضطراب کا بھی مشاہدہ کر لیتیں جو ایک نابغہ روزگار نوجوان کے دل و دماغ میں موجزن تھا' لیکن تاریخ کا مطالعہ ہم پر یہ انکشاف کرتا ہے کہ فقہا اور محدثین کی ایک بڑی جماعت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے محض اس لئے ناراض رہتی تھی کہ آپ انسانی عقل کے سفر کے لئے نئی راہیں تلاش کرتے تھے اور قلب آدم کے سکون کی خاطر مشاہدات کے نئے دروازے کھولتے تھے۔

اس ذیل میں ہمارے پاس کوئی معتبر حوالہ تو نہیں مگر ایک اندازے کے مطابق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاید حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ پہلے محدث و فقیہ تھے جنہوں نے حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ''قیاس'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ پھر تو یہ ایک روایت سی بن گئی تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس بارگاہ علم میں جاتے' جس مجلس مناظرہ میں شرکت کرتے' لوگ بے ساختہ پکار اٹھتے کہ ''یہ شخص ابوحنیفہ قیاس سے کام لیتا ہے۔ اور خدا کے رسول ﷺ کے اقوال پر اپنی رائے کو ترجیح دیتا ہے۔''

اگرچہ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مسلسل اٹھارہ سال تک حضرت حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہے اور بیشتر مواقع پر اپنے استاد گرامی سے بحث کی مگر حماد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار بھی نہیں فرمایا کہ ابوحنیفہ تم قیاس سے کام لیتے ہو۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہوگی کہ حضرت امام حماد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے استاد حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں حضرات بھی قیاس سے کام لیتے تھے' لیکن اس کے باوجود حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی مثال ہمارے سامنے روشن ہے کہ آپ نے برسر مجلس حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریے کی تائید کی تھی۔ اہل مجلس جانتے تھے کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ انبیاء کی جس آیت کا مفہوم بیان کیا تھا، حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے اختلاف تھا۔ یہاں حالات کا یہ پہلو بھی قارئین کی نظر میں رہنا چاہئے کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی ان چند عظیم مفسرین قرآن کی فہرست میں شامل ہے جن پر تاریخ اسلام ناز کرتی ہے۔ خود حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تفسیر کا علم حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ بہت آسانی کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو جھٹلا سکتے تھے۔ آخر انہیں روکنے والا کون تھا؟ مگر حضرت عطا

رحمتہ اللہ علیہ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو قیاس کہہ کر نہیں پکارا' بلکہ نہایت والہانہ انداز میں اپنے نوعمر شاگرد کی تعریف وتوصیف کی۔

''ابوحنیفہ! تم درست کہتے ہو۔'' حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے ان الفاظ نے اہل مجلس پر واضح کر دیا تھا کہ یہ کوئی نوجوان قیاس سے کام نہیں لیتا ہے۔

قیاس کی تشریح

اب ہم مختصراً قیاس کے بارے میں کچھ عرض کریں گے کہ اس لفظ کا کیا مفہوم ہے۔ اور یہ ایک لفظ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نام کا ضروری حصہ کیوں بن گیا تھا؟

حدیث وفقہ میں ''قیاس'' کے ساتھ ایک اور لفظ ''رائے'' بھی مشہور ہے۔ ''منصوص'' کے ساتھ ''غیر منصوص'' مسئلے کے حکم کا بیان قیاس ہے۔ ''منصوص'' اس حکم کو کہتے ہیں جو قرآن وحدیث سے ثابت ہو...... اور ''غیر منصوص'' وہ مسئلہ ہے جو قرآن وحدیث سے براہ راست ثابت نہ ہو سکے۔ معتبر علماء نے قیاس کی یہی تعریف کی ہے...... مگر غیر ذمے دار افراد نے اس بات کو بہت ہوا دی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قرآن وحدیث کے مقابلے میں اپنی رائے کو ترجیح دیتے تھے...... پھر یہ الفاظ غیر معمولی شہرت پا گئے۔ یہاں تک کہ بعض برگزیدہ محدث اور فقیہ بھی آپ کو ''صاحب قیاس'' کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس ذیل میں حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ ایک روشن مثال ہے۔ اب رہے وہ لوگ' جو علمی اعتبار سے کم درجہ رکھتے تھے' ان کی زبانیں زیادہ شدت اختیار کر گئی تھیں۔ جہاں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر آتا' وہ لوگ سوچے سمجھے بغیر کہہ اٹھتے۔

''ابوحنیفہ کی کیا بات کرتے ہو؟ وہ شخص تو صریحاً قیاس سے کام لیتا ہے۔''

جب تاریخ' حدیث وفقہ میں قدم قدم پر یہ شور برپا ہو تو کیا ایک عام انسان ایسا سوچنے پر مجبور نہیں ہو جائے گا کہ واقعتاً ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قیاس سے کام لیتے تھے۔ اگر سوچنے والے نے حسن ظن سے کام لیا تو وہ خاموش ہو جائے گا' مگر اس کے ذہن پریشاں میں مسلسل اندیشے سر ابھارتے رہیں گے اور پھر وہ تمام عمر ایک عجیب سے کرب میں مبتلا رہے گا کہ اس کا امام ''صاحب قیاس'' یا ''اہل الرائے'' تھا۔

پھر چند تاریخی شواہد کے ہوتے ہوئے حقیقت کیا ہے؟ جن مسلمانوں کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے رغبت نہیں ہے وہ تو برملا کہہ دیں گے کہ ''حنفیہ کا امام صاحب قیاس'' ہے۔ کوئی ان سے دلیل طلب نہیں کرے گا تو وہ بے دریغ کہہ دینگے کہ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو ''قیاس'' کہہ کر پکارا ہے۔ حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ بھی ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ایک ملاقات کے دوران کہا تھا۔ ''تم وہی ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہو جو اپنے قیاس کی بنیاد پر ہمارے نانا کی احادیث کا انکار کرتا ہے؟''

سطحی علم رکھنے والے اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کر دیں گے مگر کوئی یہ زحمت گوارا نہیں کرے گا کہ اس قسم کے واقعات کب پیش آئے تھے؟ اعتراض کرنے والوں نے کیا اعتراض کیا تھا؟ اور پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے جواب سے ان فقہائے کرام کو کس طرح مطمئن کیا تھا۔ تنگ نظر حضرات کو تاریخ کا یہ حصہ یاد نہیں رہتا۔ وہ

اپنی تنگی قلب کے باعث صرف الزامات کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ انہیں اس کی توفیق کبھی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ بعد کے واقعات کی بھی چھان بین کر سکیں۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی اہل دنیا کا یہی طرز عمل تھا کہ آپ کسی سبب کے بغیر ''صاحب قیاس'' اور ''اہل الرائے'' کے الزامات سے نوازے جاتے تھے۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو فطری طور پر زبردست ذہانت اور قوت اجتہاد بخشی گئی تھی۔ آپ دین و دنیا کے تمام امور میں اپنی اسی بے مثال صفت سے کام لیتے تھے۔ مثال کے طور پر جب آپ کے سامنے قرآن کریم کی کوئی آیت تلاوت کی جاتی تھی تو آپ کلام الٰہی کے مروجہ معانی کو سامنے رکھتے ہوئے غور و تدبر سے کام لیتے تھے پھر جب آپ کے ذہن رسا پر اس آیت مقدسہ کا نیا مفہوم منکشف ہو جاتا تو آپ برملا اس کا اظہار کر دیتے۔ اگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان کردہ مفہوم دیگر مفسرین کے معانی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا تو کچھ لوگ کسی دلیل کے بغیر کہہ دیتے کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قیاس سے کام لے رہے ہیں۔ مفسرین کی یہ جماعت تفسیر کے سلسلے میں اس اصول کی قائل تھی کہ متقدمین بزرگ کلام الٰہی کی جو تفسیر بیان کر گئے ہیں وہ حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم ان بزرگوں کے اس فیصلے پر تبصرے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ وہ اپنے نقطہ نظر میں اس قدر مخلص تھے کہ موجودہ عہد کا انسان ان کے خلوص و دیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر اس حقیقت کے باوجود قرآن کریم میں قدم قدم پر تدبر (غور و فکر) کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ قرآن حکیم ان تمام لوگوں کے لئے نازل کیا گیا ہے جو قیامت کے دن تک اس زمین پر پیدا ہوں گے اور یہ تنہا کتاب ان افراد کو بھی مطمئن کرے گی جو ہزاروں سال بعد کرہ ارض میں سانس لیں گے۔ جس کتاب مقدس کی مخاطب آنے والی صدیاں ہوں گی، اسے کسی طرح بھی جامد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فطری طور پر قرآن حکیم کے مطالب و معانی میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص 4000ء میں کسی آیت مقدسہ کے ذریعے اپنی ذہنی تسکین چاہتا ہے تو قرآن کریم یقیناً اسے مطمئن کر دے گا۔ یہی وسعت' یہی گہرائی اور یہی مسلسل حرکت قرآن کریم کا وصف نمایاں ہے۔ اس پر کسی بھی زمانے میں جمود طاری نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ انسان و حیوان' نباتات و جمادات' سب جم کر رہ جائیں گے۔ مگر قرآن کریم کا ایک ایک حرف ابد تک متحرک رہے گا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی قرآن کریم کی اسی بے مثال اور لازوال خوبی کے پیش نظر آیات مقدسہ کے مفاہیم پر نئے نئے زاویے سے غور فرماتے تھے پھر جب آپ ماہرین تفسیر کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کرتے تو وہ لوگ ایک نوجوان کے انداز فکر پر محبت اور کشادہ دلی سے غور کرنے کے بجائے اس عجمی النسل طالب علم کو ''قیاس'' کہہ کر اپنا دامن بچا لیتے۔ پھر علماء کی یہ عادت سی بن گئی کہ جب بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نئے انداز سے کسی آیت کی تفسیر کرتے' آپ کی فکر پر قیاس کا الزام عائد کر دیا جاتا۔ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اجتہاد کا یہی وہ پہلو ہے جس کے متعلق بڑی جارحیت کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ یہ ''فارسی النسل'' کوفی خدا کے کلام پر اپنے قول کو ترجیح دیتا ہے۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

مگر یہ کیسی بات تھی کہ جب اس قلندر نے اسرار کتاب بیان کئے تو بیشتر اہل مجلس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس بعض نظروں پر ہی یہ رموز حکیمانہ کھلا...... اور جن لوگوں کے ذہنوں پر یہ راز فاش نہ ہو سکا وہ کسی دلیل کے بغیر کہنے

لگے۔ "ابوحنیفہ انسانی مسائل میں قرآن وسنت کو چھوڑ کر اپنی رائے اور قیاس سے کام لیتے ہیں۔"

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس قسم کی باتیں قصداً یا کسی منصوبے کے تحت کی گئیں۔ یہ ان بزرگوں کی حالت اضطرار بھی ہوسکتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر قیاس ورائے کا الزام صریحاً غلط تھا۔

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی وضاحت

اس سلسلے میں خود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی واضح طور پر ان الزام تراشیوں کا جواب دیا ہے۔ جب ایک شخص نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ آپ فقہی مسائل کا حل کس طرح تلاش کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا۔

"میں پہلے کتاب اللہ اور سنت نبوی ﷺ پر عمل کرتا ہوں (مفہوم یہ ہے کہ جب مجھے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو میں سب سے پہلے احکام الٰہی اور سنت نبوی ﷺ کے آئینے میں اس سوال کا جواب ڈھونڈتا ہوں) پھر صحابہ کرامؓ کے طرز عمل کو دیکھتا ہوں۔ دوسرے لوگوں کے فتاویٰ اور اقوال میرے نزدیک قابل اعتنا نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ بھی انسان ہیں اور میں بھی۔"

یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہوگئے۔ سوال کرنے والے نے دوبارہ پوچھا۔ "پھر کیا آپ اجتہاد سے کام لیں گے؟"

"یقیناً' ہم بھی اجتہاد ہی سے کام لیں گے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے باوقار لہجے میں فرمایا۔ مگر آپ کے چہرے یا کسی لفظ سے نمود ونمائش کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔

"آپ اجتہاد کے بجائے دوسرے بزرگوں کے اقوال سے بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔"

سوال کرنے والے نے نئے انداز میں بحث کو طول دینے کی کوشش کی۔

"میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کے بعد کسی شخص کا عمل ہمارے لئے حجت نہیں ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "یہ کوئی ضد یا سرکشی نہیں۔ اگر صحابہ کرامؓ کے علاوہ بھی کسی شخص کا عمل مجھے مطمئن کرتا ہے تو میں اس سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتا ہوں لیکن پھر بھی اجتہاد ہمارا حق ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابراہیم نخعی، حضرت ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سعید بن میسب رحمتہ اللہ علیہ' سب اجتہاد کرتے تھے، اس لئے ہم بھی اجتہاد کریں گے۔"

حدیث وفقہ کے اکابرین کے حوالے سے مثالیں دی جاچکی تھیں' دلائل روشن ہوچکے تھے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی ذات پر عائد شدہ الزامات کی وضاحت کرچکے تھے۔ مگر بیشتر افراد نے اپنی روش تبدیل نہیں کی۔ وہ کوفہ ہو یا بصرہ' مکہ ہو یا مدینہ، عراق ہو یا شام' حجاز ہو یا کوئی دوسرا عرب علاقہ، یہ آوازیں ہر طرف پوری شدت کے ساتھ گونجتی رہتی تھیں۔

"حضرت ابوحنیفہ روایت کے اعتبار سے ضعیف ہیں اور وہ مسائل کے سلسلے میں قیاس ورائے سے کام لیتے ہیں۔"

غرض لوگ' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اجتہادی علم پر اعتراضات وارد کرتے رہے اور ابوحنیفہ ان تمام

باتوں سے بے نیاز ہو کر انسانی عقل کی پرواز کے لئے نئی فضائیں تلاش کرتے رہے۔

نئے سفر' نئی منزلیں

اسی دوران آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس وقت دیار رسول کے در و دیوار حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی علمی موشگافیوں اور نکتہ طرازیوں سے گونج رہے تھے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اہل بیت سے ایک عقیدت خاص رکھتے تھے' اس لئے جب مدینہ منورہ پہنچے تو یہ آپ کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ علم میں حاضر ہوں اور اس مرد جلیل کے روشن چہرے کو دیکھنے کی سعادت عظیم حاصل کریں۔

مجلس درس جاری تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے حضور پہنچے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھتے ہی اہل مجلس کی نظریں آپ کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ خود حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھنے لگے جو اپنی ظاہری شکل وصورت سے غیر مقامی نظر آ رہے تھے۔

حاضرین مجلس میں سے چند افراد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بخوبی پہچانتے تھے اس لئے ایک شخص اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "امام! یہ ابوحنیفہ کوفی ہیں۔" وہ شخص اپنے ہاتھ سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

جیسے ہی حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا نام سنا، آپ اضطرابی کیفیت سے دو چار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجلس پر عجیب سا سکوت طاری تھا۔ بیشتر لوگ جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو ان کے نام یا شکل سے نہیں پہچانتے تھے' وہ بھی شدید حیرت میں مبتلا تھے کہ آخر یہ کون شخص ہے، جس کے احترام میں حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ جیسا مرد جلیل مسند درس چھوڑ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اگرچہ امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کا کھڑا ہونا' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے احترام کے سبب نہیں تھا۔ وہ کوئی اور ہی بات تھی جس سے اہل مجلس قطعاً بے خبر تھے۔

جب حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے کانوں میں یہ الفاظ گونجے کہ یہ "ابوحنیفہ کوفی ہیں۔" تو آپ بے قرار ہو کر فرمانے لگے۔ کیا تم وہی ابوحنیفہ ہو جس نے میرے نانا کے دین اور احادیث کو قیاس سے بدل ڈالا ہے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت انکساری سے فرمایا۔ "معاذ اللہ! یہ کس طرح ممکن ہے۔ اگر واقعتاً میں اس گناہ عظیم کا مرتکب ہو چکا ہوں تو پھر میرا ایمان کہاں باقی رہا اور میں حلقہ اسلام میں کس طرح داخل ہو سکتا ہوں۔"

"پھر یہ باتیں کیوں مشہور ہیں؟" حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ دین وعقائد کا نازک ترین مسئلہ تھا اس لئے شدت جذبات میں حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کا شیریں لہجہ تلخی میں بدل گیا تھا۔

"امام! میں نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بصد احترام عرض کیا۔ "میں اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو مجھے دوزخ کی آگ کا ایندھن بنا ڈالے۔ یہ صریحاً تہمت ہے۔"

"تو پھر دلائل سے ثابت کرو کہ تم "قیاس ورائے" کے الزام سے بری ہو۔" حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا مگر آپ کے لہجے سے تلخی بدستور نمایاں تھی۔

"آپ تشریف تو رکھیں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا۔

"تم جو کچھ چاہتے ہو' کہہ ڈالو۔ میری حالت ظاہری کا خیال نہ کرو۔" حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے ایک

شان بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔

”یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ کھڑے رہیں اور میں امام کے حضور بولتا رہوں۔“

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ”آپ مسند علم پر تشریف رکھیں تو میں کچھ عرض کروں۔“

ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی مؤدبانہ گزارش سن کر حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ تشریف فرما ہوئے ...... اور پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ آگے بڑھے' یہاں تک کہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک پہنچ کر فرش پر بیٹھ گئے۔

”اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟“ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ادب واحترام کے تمام تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے کہا۔

”تم جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو، آزادی کے ساتھ کہو۔“ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کا لہجہ نرم ہو گیا تھا مگر پھر بھی چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی آپ کا دل ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف سے صاف نہیں ہے۔

”آپ کے نزدیک عورت کمزور ہے یا مرد؟“ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے سوال کیا۔

”یہ ایک عام سی بات ہے کہ عورت کو جسمانی اور فطری اعتبار سے کمزور بنایا گیا ہے۔“ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”جہاد میں عورت کو کیا حصہ ملتا ہے؟“ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دریافت کیا۔ (واضح رہے کہ ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب ”حیات امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ“ میں جہاد کے حصے کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ بیشتر کتابوں میں وراثت کا ذکر ملتا ہے۔ اس لئے ہم بھی وراثت ہی کا ذکر کریں گے۔)

پھر سوال اس طرح ہوگا کہ وراثت میں عورت کا کیا حصہ ہوتا ہے؟

”مرد کے دو حصے اور عورت کا ایک حصہ۔“ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن وسنت کے فیصلے کے مطابق فرمایا۔

”اگر معاذ اللہ، میں رسالت مآب ﷺ کی حدیث مبارک پر اپنے قیاس اور رائے کو ترجیح دیتا تو پھر میرا فتویٰ یہ ہوتا کہ عورت کو دو حصے ملنے چاہئیں اور مرد کو ایک حصہ۔ قیاس کی بنیاد پر یہ فیصلہ اس لئے ہوتا کہ عورت فطری طور پر کمزور ہے اور ایک کمزور زیادہ امداد کا مستحق ہوتا ہے۔ مگر میں تو علی الاعلان کہتا ہوں کہ وراثت میں مرد دو حصے کا حقدار ہے اور عورت ایک حصے کی مستحق ہے۔“

اہل مجلس نے دیکھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر سکون وطمانیت کا واضح رنگ ابھر آیا...... حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کے ابتدائی لمحوں میں تکدر کی جو فضا پیدا ہوئی تھی وہ اب بتدریج زائل ہوتی جا رہی تھی۔

لمحاتی سکوت کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوسرا سوال کیا۔ ”نماز افضل ہے یا روزہ؟“

”یہ بات ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ نماز کو روزے پر فوقیت حاصل ہے۔“ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

”روزہ کسی شرعی عذر کی موجودگی میں ترک کیا جا سکتا ہے مگر نماز کی ادائیگی ہر حالت میں فرض ہے۔“

"یہ آپ کے نانا رسالت مآب ﷺ کا ارشاد مقدس ہے۔ اگر معاذ اللہ! میں نے سرور کونین ﷺ کا قول تبدیل کر دیا ہوتا تو میں عورت سے کہتا کہ حیض سے پاک ہو جانے کے بعد وہ روزے کے بجائے قضا نمازیں ادا کرے کیونکہ نماز کو ہر حال میں اولیت حاصل ہے۔ مگر میں تو وہی فتویٰ دیتا ہوں جو سرور کائنات ﷺ کا حکم ہے۔" اتنا کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہو گئے۔

پھر اہل مجلس نے دیکھا کہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر خوشی کی ایسی کیفیت نمایاں ہو گئی جو حاضرین کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ پھر اہل مجلس نے ایک اور عجیب وغریب منظر دیکھا۔ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ اچانک مسند درس سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ احتراماً حاضرین کو بھی اپنی اپنی نشستیں چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی مسند کے قریب دست بستہ کھڑے تھے۔ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ مسند سے نیچے اترے اور آگے بڑھ کر نہایت والہانہ انداز میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے بغلگیر ہو گئے۔ پھر اہل مجلس نے یہ بھی دیکھا کہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی پیشانی پر بوسے دے رہے تھے اور بار بار فرما رہے تھے۔

"لوگوں نے تمہارے بارے میں حقیقت بیانی سے کام نہیں لیا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے اپنی رائے سے کام لیتے ہو۔ مگر میرا مشاہدہ ہے کہ شرعی دلیل کی موجودگی میں تم قیاس پر عمل نہیں کرتے۔"

حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی اس گواہی کے بعد یہ الزام خود بخود مسترد ہو جاتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قرآن وحدیث کی روشن مثالوں کے ہوتے ہوئے اپنے قیاس ورائے سے کام لیتے تھے۔ امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی گواہی عام گواہی نہیں تھی۔ آپ جب گویا ہوتے تھے تو اہل بیت کا تمام علم اور کردار ایک ایک لفظ سے نمایاں ہوتا تھا۔

حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے 114ھ میں وفات پائی۔ کچھ مؤرخین نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ اس مناظرے کے علاوہ بھی امام باقر رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے درمیان مزید ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں کی تحقیق کے مطابق ملاقاتوں کا یہ سلسلہ استادی اور شاگردی کا رشتہ قائم نہیں کر سکا۔ ان ملاقاتوں سے بس اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور اہل بیت کے اس عظیم فرزند کی تقاریر سے فیض یاب ہوتے تھے (ہمارے نزدیک یہ بھی شاگردی کا ایک انداز ہے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ ایک بار اگر کوئی تقریر سن لیتے تو اس کا ایک ایک حرف آپ کے ذہن پر نقش ہو جاتا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو شاگردی کے لئے اس عام طریقے کی ضرورت نہیں تھی کہ استاد کسی موضوع پر درس دیتے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اسے ایک کاغذ پر منتقل کر کے کئی نشستوں میں یاد کرنے کی کوشش کرتے۔ آپ پیدائشی طور پر قوی الحافظہ تھے' اس لئے آپ کو کسی تقریر کے باقاعدہ حفظ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی) بہر حال اس سلسلے میں دو گروہ موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ سے متاثر بھی تھے۔ ان کی مجلس درس میں شریک بھی ہوتے تھے مگر

شاگرد نہیں تھے۔ دوسرے گروہ نے واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے اپنے دعوے میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے بھائی حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کا شاگرد قرار دیا جاسکتا ہے تو پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کو بھی اپنا استاد تسلیم کیا ہو۔

اس دعوے کو مزید تقویت یوں بھی حاصل ہوتی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد امام محمد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا استاد محترم قرار دیا ہے۔ اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کی یہ روایت اس لئے معتبر ہے کہ آپ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بہت محبوب شاگرد تھے۔ ہر وقت قریب رہتے تھے اور استاد گرامی کے بیان کردہ واقعات کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔ یقیناً حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے امام محمد رحمتہ اللہ علیہ سے یہ حقیقت بیان کی ہوگی ورنہ امام محمد رحمتہ اللہ علیہ ''کتاب آلاثار'' میں اس لازوال رشتے کا ذکر نہ کرتے۔

اس واقعے سے جہاں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی قرآن وحدیث پر نظر کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے' وہاں یہ عجیب پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ نوعمری کے باوجود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کم وبیش سارے عالم اسلام میں مشہور ہو گئے تھے۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اس وقت تک آپ کی دیگر صفات زمانے پر منکشف نہیں ہوئی تھیں بلکہ آپ کی تمام تر شہرت ''قیاس ورائے'' پر مبنی تھی۔ اگرچہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم فقہا نے چند مناظرات کے بعد یہ سند عطا کر دی تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ شرعی دلائل کی موجودگی میں ہرگز قیاس سے کام نہیں لیتے لیکن پھر بھی عام فقہا اور محدثین کا یہی شیوہ تھا کہ کسی تحقیق کے بغیر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر ''قیاس ورائے'' کا الزام عائد کر دیا کرتے تھے۔ یہ بے خبری تھی یا تنگ نظری' خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے جہاں تک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی وسعت علم اور حاضر جوابی کا سوال ہے تو اس وقت روئے زمین پر شاید ہی ''ذہانت وہوش'' کی ایسی کوئی دوسری مثال موجود ہو۔

شاگردی کا ایک نیا انداز

حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے حقیقی بھائی زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ مختلف اسلامی علوم وفنون میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ قرأت کے بے مثال جاننے والے تھے۔ آپ کو فقہ اور علم العقائد میں کامل مہارت حاصل تھی۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری کے بقول معتزلہ آپ کو اپنے شیوخ میں شمار کرتے تھے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ آپ دو سال تک حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے اور علم وعمل کے اس سورج کی روشنی سے اپنے دل ودماغ کو منور کرتے رہے۔ اہل تحقیق کے نزدیک یہ روایت ضعیف ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ دو سال تک حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ عقیدت مند کچھ بھی کہیں لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اہل بیت کے اس عظیم فقیہ سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا اور آپ نے حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی چند مجالس میں شرکت بھی کی تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں کے نزدیک حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادوں میں شمار

ہوتے ہیں' مگر اس کے ساتھ ہی یہ تحقیق بھی اپنی جگہ درست ہے کہ حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی شاگردی کا عرصہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ اس ذیل میں ہم مختصراً اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' رحمتہ اللہ علیہ زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ایک موقع پر آپ نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا تھا۔

''میں نے حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کو دیکھا ہے۔ وہ یکتائے روزگار تھے۔ میں نے اس زمانے میں ان سے زیادہ' فقیہ، زیادہ عالم' حاضر جواب اور زیادہ فصیح و بلیغ کسی دوسرے شخص کو نہیں پایا۔'' ممکن ہے کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس خراج تحسین سے لوگوں کو گمان ہوا ہو کہ آپ طویل مدت تک حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ شاگردی میں رہے تھے۔ مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد امام محمد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''آثار محمد'' میں آپ کے استادوں کی جو فہرست پیش کی ہے' اس میں حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کا اسم گرامی شامل نہیں ہے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی تصنیف ''تہذیب التہذیب'' میں حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کا نام حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد کی حیثیت سے شامل نہیں کیا ہے۔

''طبقات الحفاظ'' کے مطالعے سے بھی پتا نہیں چلتا کہ حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے درمیان استادی و شاگردی کا رشتہ قائم ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان حضرات کے نزدیک چند ملاقاتیں شاگردی کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔ ان حضرات کے خیال میں شاگردی کے لئے مستقل حاضری اور مسلسل اکتساب فیض ضروری ہوتا ہے۔ ممکن ہے دوسرے طلباء کی نظر میں یہ اصول درست ہو مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس سلسلے میں اتنے حساس انسان تھے کہ اگر کسی شخص سے ایک حرف بھی سیکھ لیتے تو ہمیشہ اسے اپنا استاد سمجھتے اور جب بھی وہ شخص سامنے آتا تو آپ نہایت احترام سے پیش آتے۔

اس ذیل میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن کسی شخص نے برسر مجلس کھڑے ہو کر کہا۔

''میں اس سلسلے میں کئی علماء سے رجوع کر چکا ہوں مگر وہ مجھے کسی روشن دلیل کے ساتھ جواب نہ دے سکے کہ ایک کتا منزل بلوغت کو کب پہنچتا ہے؟''

بڑا عجیب سوال تھا۔ حاضرین مجلس ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے احترام کے پیش نظر زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکے مگر ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں فقہ کی محفل میں یہ بے ربط سوال بہت گراں گزرا ہے۔

''روشن دلیل سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اہل مجلس کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

''ایسی دلیل' جسے ایک عام آدمی کا ذہن بھی فوراً قبول کر لے۔'' اس شخص نے اظہار مطلب کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ آپ کی ظاہری کیفیت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے آپ تصورات میں غرق ہیں اور اس عجیب و غریب سوال کا جواب تلاش کرنے میں آپ کو دشواری پیش آ رہی ہے۔

اہل مجلس بھی یہ سوچ کر حیران و پریشان تھے کہ جس فقیہ نے بڑے بڑے فلسفیانہ عقدوں کو حل کیا تھا' وہ آج ایک معمولی سوال کے جواب میں خاموش کیوں ہے؟

پھر جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے لب کشائی کی تو اہل مجلس کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ اس شخص کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔ "بظاہر تمہارا سوال بہت آسان نظر آتا ہے۔ میں نے اتنی دیر میں کئی زاویوں سے غور کیا مگر خود اپنی کسی دلیل سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس لئے تمہیں میرا کوئی جواب مطمئن نہیں کر سکے گا۔" یہ بڑا عجیب اعتراف تھا۔ اہل مجلس سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دنیا کا انتہائی ذکی و فہیم انسان بھی ایک معمولی سے مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہے گا۔ عقیدت مندوں اور شاگردوں کو مضطرب دیکھ کر آپ نے فرمایا۔ "کبھی کبھی غیر اہم باتیں بھی انسانی عقل سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات معمولی مسائل کی بھی گرہ کشائی نہیں کی جا سکتی۔"

پھر مجلس برخاست ہو گئی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مختلف زاویوں سے اس معمولی مسئلے پر غور و فکر کرتے رہے مگر آپ کے ذہن کی گرفت میں وہ دلیل نہیں آتی تھی' جسے سن کر آپ کا مخاطب قائل ہو جاتا۔ بعض روایات میں درج ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس سوال پر تمام رات سوچتے رہے۔

پھر اس مسئلے کو خاکروب نے حل کر دیا جو روزانہ صبح کے وقت امام رحمتہ اللہ علیہ کے دروازے کے سامنے جھاڑو دیتا تھا۔

"جب کتا پیشاب کے وقت اپنا پاؤں زمین سے اٹھا لیتا ہے تو اس کی بالغانہ صلاحیت نمودار ہو جاتی ہے اور جب تک وہ ایسا نہیں کرتا تو اس منزل سے دور ہی رہتا ہے۔" جاہل خاکروب نے ایک جانور کی فطرت کے ایک خاص پہلو کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک خاکروب کے جواب پر غور کرتے رہے اور پھر پر زور لہجے میں فرمایا۔ "تم درست کہتے ہو' تمہاری پیش کردہ دلیل میرے ذہن کو مطمئن کرتی ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

دوسرے دن حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم میں اس شخص نے دوبارہ وہی سوال کیا۔ جواباً حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "ہاں! آج تمہارے مسئلے کا حل میرے پاس موجود ہے۔" اتنا کہہ کر آپ نے خاکروب کا جواب دہرا دیا۔

اس شخص نے بے اختیار ہو کر کہا۔ "امام رحمتہ اللہ علیہ! خدا آپ کی عمر دراز کرے کہ میں اس دلیل سے مطمئن ہوں۔ یہی وہ روشن دلیل ہے جس کا مشاہدہ ہم دن رات کرتے ہیں اور جسے ایک عام انسان کا ذہن بھی کسی مزید حجت کے بغیر قبول کر سکتا ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل گیا۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم مطمئن ہو گئے مگر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ میرا ذہن اس مسئلے کا حل تلاش نہیں کر سکا تھا۔ یہ دلیل ایک خاکروب کی پیش کردہ ہے جسے تم بھی قبول کرتے ہو اور خود میں بھی اپنی طمانیت کا اظہار کرتا ہوں۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے یہ انکشاف سن کر پوری مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک پیچیدہ مسئلے کے سلسلے میں اس شخص کا حوالہ پیش کریں گے جو کوفے کا ایک

خاکروب ہے اور جس کی ساری زندگی جہل میں گزری ہے مگر یہ عام اہل مجلس کی سوچ تھی اور جو لوگ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بہت قریب سے جانتے تھے انہیں خوب اندازہ تھا کہ امام حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کا یہ شاگرد کس قدر اعلیٰ ظرف اور کتنا وسیع النظر ہے اور طلب علم میں اس کے قدم کیسے کیسے ناہموار راستوں سے گزرے ہیں اور انہی صفات نے اسے عظمت وجلالت کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچایا ہے۔

وقت گزرتا رہا مگر وہ خاکروب جب تک زندہ رہا' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہ میں محترم قرار پایا۔ روایت ہے کہ اگر کبھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے مکان کے سامنے تشریف فرما ہوتے اور وہ خاکروب راستے سے گزرتا تو آپ اسے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک آپ کے اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ حائل نہ ہو جاتا۔ شروع میں تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے احباب آپ کے اس طرز عمل کو محسوس نہ کر سکے مگر جب ان حضرات نے بار بار ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی نشست سے اٹھتے دیکھا تو بالآخر ایک دن کہہ اٹھے۔

''امام! ہم لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جب وہ خاکروب آپ کے سامنے سے گزرتا ہے تو آپ اسے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی راز ہے یا ایک عام اتفاق؟''

''ہرگز نہیں' یہ کوئی اتفاق نہیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت صاف گوئی سے فرمایا۔ ''وہ خاکروب ایک معاملے میں میرا استاد ہے۔ اس لئے جب بھی میرے روبرو ہوتا ہے تو میں احتراماً کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ابوحنیفہ کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ وہ اپنے استاد کی موجودگی میں بے نیازانہ بیٹھا رہے۔''

ہم نے بعض تنگ نظر لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا ہے کہ اس قسم کے واقعات' افسانہ طرازی کے سوا کچھ نہیں۔ اس ذیل میں معترضین یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نام لیواؤں نے جوش عقیدت میں اپنے امام رحمتہ اللہ علیہ کی ذات سے انسانی کردار کی ہر بلندی منسوب کر دی ہے۔ ان کے خیال میں ایک خاکروب کے احترام کا واقعہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ محض زیب داستاں کے لئے ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ تاریخ کیا ہے اور روایت کسے کہتے ہیں' مگر اعتراض کرنے والے اس زندہ حقیقت کو کیا کہیں گے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تمام عمر اپنے استاد گرامی امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے مکان کی طرف پاؤں کر کے نہیں سوئے۔ بالفرض اگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس کیخلاف عمل کرتے اور اس قدر احتیاط برقرار نہ رکھتے تو احترام استاد میں کیا کمی واقع ہو جاتی؟ یقیناً آپ کی ذات پر کوئی حرف نہ آتا۔ مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جس فطرت حساسؒ کے مالک تھے اس کا یہی تقاضہ تھا کہ آپ احترام استاد کے سلسلے میں کوئی منفرد مثال پیش کرتے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اس کے برعکس عظمت استاد کا بھی فطری تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ اسے جان و دل کی گہرائیوں اور جذبوں کی وارفتگی کے ساتھ قبول کیا جائے۔ اس طرح جب ہم امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے مکان کی طرف پاؤں نہ کرنے کے عمل کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر اس واقعے کو بھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک خاکروب کے احترام میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ معترضین نے اپنی زبانیں دراز کر دیں مگر ان کے دل کشادہ نہیں ہوئے۔ اگر وہ ذرا بھی وسعت قلب کا مظاہرہ کرتے تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ علم کی آگ کیسی آگ ہے' جو بھڑکتی ہے تو کس کس انداز سے بھڑکتی ہے اور پھر اسی آگ کے شعلے انسان کو کہاں کہاں پھراتے ہیں۔ اگر ہم اپنی سرکشی اور ضد کی خاطر ایک

خاکروب کے احترام کے واقعے کو جھٹلا بھی دیں تو یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے علم حاصل کرنے کے لئے کسی موسم کی پروا نہیں کی' کسی فضا کی ناسازگاری کو تسلیم نہیں کیا اور کسی شخص کا نام نہیں پوچھا۔ بس جہاں سے جتنا علم مل سکا حاصل کر لیا جس نے جتنی آگہی بخشی' اسے پوری احسان مندی کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ کسی سے ایک حرف بھی سیکھا تو تمام عمر اس کے شکر گزار رہے۔

جب ہمیں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی اس فطرت حساس کا صحیح ادراک ہو جاتا ہے تو ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ چند وقتی ملاقاتوں کے باوجود حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد تھے۔ ایسے استاد کہ جن کے فیض صحبت پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہمیشہ نازاں رہے۔

استاد سے ایک علمی بحث

اور یہ وسعت نظر یوں ہی نہیں تھی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے اسباب معیشت فراہم کرنے کے بعد ہمہ وقت علم کی تلاش میں رہتے تھے۔ آپ نے عظیم وجلیل محدث وفقیہ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ علم میں بھی حاضری دی ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ کا نام بھی نمایاں ہے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو مشہور محدث حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی شاگردی کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ (یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم زمانے کے اعتبار سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس ذیل میں ہمیں جس قدر معلومات حاصل ہو سکی ہیں وہ محض اس لئے نذر قارئین کی جارہی ہیں کہ اہل دل دوسرے ائمہ کے حالات زندگی اور سیرت وکردار سے بھی واقف ہو جائیں اور انہیں اس بات کا بھی اندازہ ہو جائے کہ کیسے کیسے اکابر نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی تربیت کی ہے اور خود یہ مرد جلیل تلاش علم میں کہاں کہاں پہنچا ہے؟ اب تک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے جن استادان گرامی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ تمام برگزیدہ ہستیاں حضرت امام حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں موجود تھیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے لیکن آپ کے اضطراب اور جستجو کا یہ حال تھا کہ جہاں بھی آگہی کی کوئی بات نظر آتی تھی، اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ جہاں بھی علم کا ایک ذرہ نظر آتا تھا' وہاں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک سائل کی طرح اپنا دامن پھیلا دیا کرتے تھے۔ یہی تڑپ آپ کو حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کے دروازے پر بھی لے گئی تھی)

حضرت قتادہ بن وعامہ رحمتہ اللہ علیہ کے بے پناہ علم سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی کچھ دن تک فیض یاب ہوئے۔ یہ اکتساب علم اس طرح نہیں تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ محض چند علمی نشستوں میں شریک ہو گئے تھے بلکہ تمام معتبر تذکرہ نویسوں نے تسلیم کیا ہے کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد تھے۔

ایک دن حضرت قتادہ بن وعامہ رحمتہ اللہ علیہ کوفہ تشریف لائے۔ (حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے 118ھ میں انتقال کیا تھا۔ اس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ 116ھ یا 117ھ میں پیش آیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر چھتیس یا سینتیس سال تھی اور آپ کے استاد گرامی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان رحمتہ

اللہ علیہ حیات تھے۔)

کوفہ آتے ہی حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے اعلان کرا دیا کہ جس کو جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لے (قارئین کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اسلام میں جس قدر محدثین اور فقہا گزرے ہیں وہ نمود و نمائش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس دور کے دیگر علماء نے بھی اس قسم کے اعلانات کرائے ہیں جن کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ ان اعلانات کے ذریعے وہ بزرگ اپنے فضل و کمال کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے اور اس طرح عوام کے دلوں پر ان کے علم کی ہیبت طاری ہو جاتی اور وہ لوگوں کی اکثریت کے درمیان درجہ بلند حاصل کر لیتے۔ یہ تو وہ مردان قلندر تھے کہ انہیں حکومت وقت کے فرمانروا منہ مانگی قیمت پر خریدنا چاہتے تھے' ساری دنیا کی آسائشیں اور اعزازات فراہم کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ خدا رسیدہ لوگ نہ تو کسی فرمانروا کے دربار میں فروخت ہوئے اور نہ سیاست کے مقتل میں حق بات کہنے سے باز رہے۔ جب کبھی کسی شہر کی فضاؤں میں یہ الفاظ گونجتے کہ جسے جو کچھ معلوم کرنا ہے معلوم کر لے تو اس کا واضح مطلب یہی ہوتا تھا کہ عوام الناس آئیں اور اپنے علم میں اضافہ کر لیں۔ اس زمانے میں آج کی طرح ذرائع ابلاغ نہیں تھے۔ اس لئے کبھی کبھی مناظروں کی محفلیں اور علم کی خصوصی مجلسیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کا اعلان بھی کچھ اسی انداز کا تھا۔)

اعلان سنتے ہی اہل کوفہ قطار در قطار مجلس قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف آنے لگے۔ آنے والوں میں حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی تھے۔ اس مجلس میں بے شمار علماء نے حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے لاتعداد سوالات کئے۔ ابھی سوال کرنے والے کی صدائے بازگشت ختم بھی نہیں ہوتی تھی کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب اسے مطمئن کر دیتا۔ حاضرین اس قوت یادداشت اور ذہن کی رسائی پر حیران رہ جاتے۔

پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ آگے بڑھے اور حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے آواز سے پہچان لیا کہ آنے والا کون ہے؟

"یہ تم ہو ابوحنیفہ؟" حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"جی! میں آپ کا ادنیٰ ترین خادم' نعمان بن ثابت۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً عرض کیا۔ اہل مجلس کی نظریں استاد اور شاگرد کے روشن چہروں پر مرکوز تھیں۔

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی خیر و عافیت دریافت کرتے رہے پھر مجلس میں آمد کا سبب پوچھنے لگے۔

"جس طرح دیگر اہالیان کوفہ اور علمائے شہر یہاں جمع ہوئے ہیں' میں بھی آپ کا اعلان سن کر حاضر ہوا ہوں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت انکسار کے ساتھ کہا۔ "میں بھی اپنے ذہن میں کچھ سوالات رکھتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ ان کا حل پیش کریں۔"

"تمہارے ذہن میں جو مسائل ہیں انہیں پیش کرو۔ میں انشاء اللہ جواب دینے کی کوشش کروں گا۔" حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس قدر نرم لہجے میں فرمایا کہ آپ عجز و انکسار کا پیکر نظر آ رہے تھے۔

"ایک شادی شدہ شخص ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مسئلے کا آغاز کیا۔ "وہ شخص اچانک گھر سے غائب ہو جاتا ہے اور پھر ایک طویل عرصے تک اس کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ بالآخر شخص مذکورہ کی بیوی مایوس ہو جاتی ہے

اور یہ تصور کر لیتی ہے کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔ اس صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد دوسرا نکاح کر لیتی ہے۔ دن گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس عورت کے اولاد ہو جاتی ہے۔ اتنے میں پہلا شوہر بھی آ جاتا ہے۔ دونوں مرد انکار کر دیتے ہیں کہ بچہ ان کا نہیں ہے۔ اس طرح عورت کی زندگی بدکاری کے الزام کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ اس عورت کو کیا کرنا چاہئے؟'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے پوری تفصیل کے ساتھ مسئلہ بیان کیا اور خاموش ہو کر حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا یہ واقعہ ہو چکا ہے؟'' حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دینے سے پہلے اس مسئلے کی بنیادی صورت جاننا چاہی۔

''یہ واقعہ ابھی رونما تو نہیں ہوا' لیکن علماء کو پہلے سے ایسے مسائل کے لئے تیار رہنا چاہئے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بصد احترام عرض کیا۔

''جو واقعہ ابھی ظہور پذیر ہی نہیں ہوا ہے' اس کے بارے میں مجھ سے کچھ دریافت نہ کریں۔'' حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''اور پوچھنا ہے تو تفسیر قرآن کے بارے میں پوچھئے۔''

جواب میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی۔

''اس نے کہا جو اللہ کی کتاب کا علم رکھتا تھا کہ میں آپ کی پلک جھپکنے سے قبل اسے (ملکہ بلقیس کے تخت کو) حاضر کر دوں گا۔''

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کے جواب سے پہلے ضروری ہے کہ اس آیت کا پورا پس منظر بیان کر دیا جائے تاکہ قارئین کو صورت حال کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ آیت، خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی کے ایک خاص واقعے کی طرف نشان دہی کرتی ہے۔ اس واقعے کی تفصیل اس طرح ہے کہ۔ ''جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا جائزہ لیا تو فرمانے لگے۔'' کیا وجہ ہے کہ میں ہدہد (پرندے) کو موجود نہیں پاتا۔ کیا واقعی وہ غائب ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کو سخت عذاب میں ڈالوں گا یا پھر اسے ذبح کر دوں گا۔ یا پھر وہ میرے سامنے اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ بیان کرے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہدہد نے حاضر ہو کر کہا۔ ''میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے سے علم نہیں تھا۔ میں سبا کی ایک یقینی خبر لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے جو اہل سبا پر حکومت کرتی ہے اور اسے سب کچھ حاصل ہے اور وہ ایک عظیم الشان تخت رکھتی ہے۔ میں نے اسے اس حال میں پایا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کی پرستش کرتی ہے اور اس کے سامنے سربسجود رہتی ہے اور شیطان نے ان کے کاموں کو اچھا دکھا کر انہیں صراط مستقیم سے ہٹا رکھا ہے' اس لئے اب وہ ہدایت نہیں پاتے۔ (تعجب ہے) کہ وہ اس اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو زمینوں اور آسمانوں کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور جو انسان ظاہر میں کرتا ہے اور جو چھپا کر کرتا ہے' اللہ ان سب کا جاننے والا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ پروردگار ہے' عرش عظیم کا۔''

ہدہد کا بیان سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ ''اب ہم دیکھتے ہیں کہ تو اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا۔ لے یہ میرا خط لے جا اور ان کی طرف ڈال دے۔ پھر ان کے پاس سے ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔''

ہد ہد حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم کے مطابق وہ خط پہنچا دیتا ہے۔
جیسے ہی ملکہ سبا (بلقیس) اس خط کو دیکھتی ہے ان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ ادا ہونے لگتے ہیں۔ اے درباریو! میرے پاس ایک خط ڈالا گیا ہے۔ یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس طرح ہے کہ اس اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ تم کو چاہئے کہ مجھ پر برتری کا اظہار نہ کرو اور میرے مقابلے میں قوت کا مظاہرہ نہ کرو اور چلے آؤ میرے پاس مسلمان ہو کر۔" پھر کہنے لگی۔" اے میری جماعت! مجھے میرے معاملے میں مشورہ دو کہ میں تمہارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔"
ان لوگوں نے جواب دیا۔" ہم بہت قوت والے اور سخت جنگ جو ہیں۔ آگے تیرے اختیار میں ہے۔ تو غور کر لے کہ (اس سلسلے میں) تیرا کیا حکم ہے؟"
(ملکہ نے) کہا۔" بادشاہ جب (فاتحانہ طور پر) کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب (تباہ) کرتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل وخوار کر دیتے ہیں اور یہ واقعہ ہے سلاطین ایسا ہی کرتے ہیں اور میں ان کی جانب کچھ تحفے بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں۔"
جب ملکہ سبا کا قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام کے درمیان میں پہنچا تو آپ نے فرمایا۔" کیا تم میری مالی اعانت کرنا چاہتے ہو۔ (جو یہ قیمتی تحائف لے کر آئے ہو) مجھے تمہاری یہ چیزیں نہیں چاہئیں۔ تم ہی اپنے ان تحفوں سے خوش ہوتے رہو۔" اتنا کہہ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے قاصد سے فرمایا۔" تو واپس جا (اگر میرے پیغام کا یہی جواب ہے) تو ہم ان پر آ پہنچتے ہیں۔ ایسا لشکر لے کر جن کا مقابلہ ان سے نہ ہو سکے گا اور ہم انہیں ذلیل کر کے ان کی بستیوں سے نکال دیں گے۔"
قاصد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا جواب سنایا تو ملکہ بلقیس نے فوراً ارادہ کر لیا کہ سلیمانؑ تک پہنچے۔
حضرت سلیمانؑ کو (ملکہ کے اس ارادے کا) علم ہوا تو آپ نے اہل دربار کو مخاطب کر کے فرمایا۔" اے میرے درباریو! تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کا تخت لے آئے۔ اس سے قبل کہ وہ فرمانبردار ہو کر یہاں پہنچے۔"
حضرت سلیمان علیہ السلام کی بات سن کر ایک دیو پیکر جن نے کہا۔" میں اس کو آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے لا سکتا ہوں اور مجھے یہ قدرت حاصل ہے اور میں اس کے بارے میں امین ہوں۔"
اور پھر جسے کتاب الٰہی کا علم تھا' اس نے کہا۔" میں آپ کی پلک جھپکتے ہی اسے حاضر کر سکتا ہوں۔" پھر جب سلیمانؑ نے پلک جھپکتے ہی اسے (ملکہ سبا کے تخت کو) حاضر پایا تو بے اختیار کہا کہ یہ میرے پروردگار کا فضل ہے۔
جس نے پلک جھپکتے ہی ملکہ سبا کے تخت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حضور پیش کر دیا تھا۔ وہ ایک آدم زاد تھا اور اس طرح قوم اجنہ پر نسل آدم کی برتری ثابت ہو گئی تھی۔ بیشتر مفسرین اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ آدم زاد حضرت آصف ابن برخیاہ تھے جو وزیر ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مقرب خاص بھی تھے۔ حضرت آصف ابن برخیاہ کو توریت' زبور اور اسمائے الٰہی کا خاص علم حاصل تھا جس کے زیر اثر آپ نے ملکہ سبا کے تخت کو پلک جھپکنے کی مہلت میں حاضر کر دیا تھا۔
اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ تلاوت کی تھی۔

اور جس کے پاس کتاب الٰہی کا علم تھا' اس نے کہا۔ " میں آپ کی پلک جھپکتے ہی اسے حاضر کردوں گا"

اس آیت کی تلاوت کرنے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے کہا تھا کہ آپ کے نزدیک قرآن کریم کی اس آیت کا کیا مفہوم ہے؟

اس واقعے کے سلسلے میں عام طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت آصف ابن برخیاہ اسم اعظم جانتے تھے اور اسی کی بے پناہ اور لازوال قوت کے سبب ملکہ سبا کے تخت کو اتنی برق رفتاری کے ساتھ دربار سلیمانی میں اٹھالائے تھے کہ آج اہل سائنس بھی حیران و پریشان نظر آتے ہیں۔

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی دیگر مفسرین کی طرح یہی جواب دیا کہ آصف ابن برخیاہ اسم اعظم جانتے تھے اور اسی کی قوت کو بروئے کار لا کر انہوں نے ملکہ سبا کے تخت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حضور پیش کردیا تھا۔

اہل مجلس حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ تفسیر سے مطمئن نظر آنے لگے مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوسرا سوال کیا۔ " حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اسم اعظم جانتے تھے؟"

" نہیں۔" حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے مختصراً جواب دیا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے عرض کیا۔ " ہر نبی یا رسول کے زمانے میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی دوسرا شخص نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے وزیر اعظم کو " اسم اعظم " سے آگہی حاصل ہو اور خود حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے ناواقف ہوں۔"

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی اس بات کا جواب نہیں دے سکے۔

(ویسے اللہ اپنی قدرت کے رازوں کو خود ہی بہتر جانتا ہے مگر یہ بات قرین قیاس ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام " اسم اعظم " کی حقیقت کو آصف ابن برخیاہ سے بہتر انداز میں جانتے تھے۔ اگر اللہ کا یہ برگزیدہ پیغمبر چاہتا تو خود بھی ایک اشارے سے ملکہ سبا کے تخت کو لا سکتا تھا لیکن مشیت الٰہی میں آصف ابن برخیاہ کی سرخروئی طے ہو چکی تھی اور قوم اجنہ پر یہ راز بھی آشکار کرنا تھا کہ کتاب مقدس کا ایک حرف تمام موجودہ قوتوں پر بھاری ہے۔)

اس سوال کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا۔ " آپ مومن ہیں؟"

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔ " ہاں! انشاء اللہ میں مومن ہوں۔"

(عام طور پر محدثین کا مسلک یہ ہے کہ جب وہ اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں تو انشاء اللہ کا کلمہ اپنی زبان سے ضرور ادا کرتے ہیں۔ ایک بار حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے بھی کسی نے یہی سوال کیا تھا کہ کیا آپ مومن ہیں؟ جواباً حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا تھا کہ انشاء اللہ میں مومن ہوں۔ سوال کرنے والے نے حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے دوبارہ پوچھا تھا کہ یہاں انشاء اللہ کہنے کا کیا موقع تھا؟ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ " انشاء اللہ اس لئے کہتا ہوں کہ میں اپنی زبان سے دعویٰ کروں مگر خدا کے نزدیک جھوٹا قرار نہ پاؤں۔") اسی بات کے پیش نظر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا تھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

جواب میں حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے مختلف بات کہی تھی۔ " میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقلید میں یہ کلمہ ادا کرتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن

کریم کی یہ آیت تلاوت کی تھی۔

"اور وہ ذات جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن وہ میری خطائیں معاف کر دے گا۔"

(علماء کے نزدیک اس آیت سے حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کا استدلال درست نہیں تھا کیوں کہ ایمان کا وجود علیحدہ شے ہے اور گناہوں کی بخشش ایک الگ بات۔)

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے عرض کیا۔" جب اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے ایمان کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ کیا آپ ایمان نہیں لائے تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا۔" بے شک! میں ایمان لایا ہوں۔" قرآن کریم سے یہ روشن دلیل پیش کرنے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے استاد گرامی سے کہا تھا کہ آپ نے اس معاملے میں حضرت ابراہیمؑ کی تقلید کیوں نہیں کی؟ یعنی برملا یہ کیوں نہیں کہا کہ بے شک! میں ایمان لایا ہوں۔

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہو گئے ......اور اہل مجلس حیرت و سکوت کے عالم میں بہت دیر تک حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھتے رہے۔

ہمارے خیال میں یہ کوئی عام مجلس مناظرہ نہیں تھی جس میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی شریک ہوئے تھے۔ اگر فی الواقع ایسا ہوتا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں اپنے استاد گرامی سے اس قسم کے سوالات نہ کرتے۔ وہ لاکھ ایک علمی مظاہرہ سہی مگر عام لوگوں کی نظر میں حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی خاموشی سے شکست کا پہلو نمایاں ہوتا تھا......اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے غیور و حساس شاگرد کبھی گوارانہ کرتے کہ غیر لوگوں کے درمیان ان کا استاد شرمندہ عاجز نظر آئے۔

یہ واقعہ ضرور پیش آیا ہو گا لیکن کسی مجلس درس میں ......تاریخ نویسوں نے تحقیق کیے بغیر ان باتوں کو عام محفل مناظرہ سے وابستہ کر کے ایک نیا رنگ دے دیا۔

ایک اور تاریخی مناظرہ

اسی زمانے میں منکرین خدا کی ایک جماعت بھی کوفے میں وارد ہو گئی تھی اور اس نے سطحی علم رکھنے والوں کو شدید ذہنی کشمکش سے دوچار کر دیا تھا۔ یہ لوگ "عقلیت پرستی" کے حامی تھے اور ہوش و خرد کی بنیاد پر خدا کا انکار کرتے تھے۔ اپنے نظریات کی تائید میں ان کے دلائل کچھ اس طرح تھے۔

ہمیں دماغ اس لئے دیا گیا ہے کہ ہم کائنات میں موجود ہر شے کا ادراک کریں۔ اب ہمیں ہمارا سرمایہ شعور یہی بتاتا ہے کہ اس کائنات میں خدا کا کوئی وجود نہیں۔ یہ کائنات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ ہمارے آباؤ اجداد سے پہلے بھی یہاں ہزاروں نسلیں آباد ہوئیں۔ مگر ان کے دور میں بھی دنیا کا یہی حال تھا۔ اسی طرح پہاڑ سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے۔ اسی طرح دریا بہتے تھے' جنگلات کا یہی انداز تھا' حیوانات اسی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور شمس و قمر اسی طرح طلوع و غروب کے مراحل سے گزرتے رہتے تھے۔ آئندہ بھی یہی ہو گا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

پوچھنے والے پوچھتے کہ" تمہارے آباؤ اجداد کہاں گئے؟ وہ اپنے مکانوں اور زمینوں کو خالی کیوں کر گئے؟"

کوئی دہریہ (منکر خدا) جواب دیتا۔ ''موت ایک ازلی قانون ہے۔ اس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک آفاقی اصول ہے کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے، وہ ایک مقررہ وقت پر فنا سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔''

کہنے والے کہتے کہ خالق کے بغیر کوئی تخلیق ممکن نہیں۔ پھر یہ سب کچھ عالم ظہور میں کس طرح آ گیا؟

دہریوں کی جماعت بیک زبان پکار اٹھتی۔ ''یہ سب کچھ ایک حادثے کے تحت ہو گیا ہے۔ اس کے بعد یہ عمل اسی طرح جاری رہے گا۔ انسان پیدا ہوں گے، مر جائیں گے...... حیوانات وجود میں آئیں گے اور پھر بے نمود ہو جائیں گے۔ ستارے اسی طرح اپنی روشنی تقسیم کرتے رہیں گے......اور ہواؤں کی تندی وخوش گواری اسی طرح برقرار رہے گی۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ دوبارہ کچھ نہیں ہو گا۔ اس نظام میں کسی دست غیب کی کارفرمائی نہیں ...... اور آئندہ بھی کوئی پوشیدہ ہاتھ اس ترتیب شدہ نظام میں خلل انداز نہیں ہو سکے گا۔''

کہنے والے کہتے ...... ''یہ عجیب وغریب اور عقل سے بالاتر نظام کس نے ترتیب دیا؟''

جواب میں پھر کسی دہریئے کی زبان بے لگام ہو جاتی۔ ''کوئی شے عقل سے بالاتر نہیں ہے۔ ہم کسی چیز کو عجیب تصور نہیں کرتے۔ یہ ترتیب خود بخود قائم ہو گئی ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔''

موجودہ دور میں بھی منکرین خدا اسی قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں کہ ایک مخصوص عمل ارتقاء سے گزر کر ہر شے وجود میں آئی ہے۔ اس کائنات کو نہ کسی نے بنایا ہے اور نہ کوئی ذات اسے بگاڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اب کچھ منکرین کی سوچ میں انقلاب وتغیر رونما ہو رہا ہے اور وہ کسی سپر پاور (عظیم غیبی طاقت) کی موجودگی کو محسوس کرنے لگے ہیں لیکن پھر بھی منکرین کا عام نظریہ یہی ہے کہ کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے اور یہ نظام روز وشب ہمیشہ برقرار رہے گا۔

سننے والوں میں علمائے کوفہ بھی شامل ہوتے۔ ان کی جانب سے بھی طاقتور دلائل پیش کئے جاتے مگر دہریوں کی جماعت فوراً ہی بحث کا نیا رنگ اختیار کر لیتی۔

منکرین خدا کی طرف سے کہا جاتا کہ ہم آنکھیں رکھتے ہیں۔ یہ آنکھیں ہمیں ہر شے کا نظارہ کراتی ہیں۔ ہم سیارگان کی روشنی کو دیکھتے ہیں۔ ہمارے سامنے رات کا اندھیرا نمودار ہوتا ہے۔ ہم رنگوں میں اختلاف کر سکتے ہیں کہ یہ سبز ہے اور یہ سرخ' یہ زرد ہے اور یہ نیلا' ہم پھولوں کو کھلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہمیں آگ بھڑکتی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ پھر ہم خدا کو کس لئے نہیں دیکھ سکتے؟

ایک دہریہ تقریر کر کے خاموش ہو جاتا۔ پھر دوسرا منکر خدا فوراً ہی اس کی تائید میں کہتا۔ ''خدا ہمیں اس لئے نظر نہیں آتا کہ وہ موجود ہی نہیں ہے۔ اگر موجود ہوتا تو ہمارے حلقۂ بصارت سے دور نہیں رہ سکتا۔''

اہل ایمان صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے نظریات کا دفاع کرتے کہ انسان کی بصارت محدود ہے اور خدا انسانی آنکھ کی روشنی سے بہت دور۔ اگر یہ روشنی لامحدود ہو جائے تب بھی کوئی آنکھ خدا کو نہیں دیکھ سکتی۔

گروہ منکرین میں سے کوئی شخص نیا بہانہ تراش لیتا۔ ''تم تو کہتے ہو کہ تمہارا خدا انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے پھر ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟''

اہل ایمان، دہریوں کی کج فہمی اور سرکشی سے بے زار ہو جاتے۔ ''ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ یہ خدا کی قربت ودوری کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال ہے۔ اگر خدا یہ کہتا ہے کہ وہ مخلوق

کے جسم وحواس اور فہم وادراک سے دور ہے تو پھر اسے ملائکہ اور اجنہ بھی نہیں پا سکتے۔ مگر جب وہ اپنی قربت کا اظہار کرتا ہے تو پھر شہ رگ کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔"

"تم احساسات کی بات کرتے ہو۔" جواب میں پھر کوئی دہریہ بول اٹھتا۔ "ہم پھولوں کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں آگ کی تپش اور ہواؤں کی خنکی کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ جب ہم کسی جذبہ کیف ونشاط سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم اس حالت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتے۔ کہیں درد اٹھتا ہے تو ہم اس کا احساس کر کے چیختے ہیں۔ صدمات کی شدت سے ہماری آنکھیں اشک برساتی ہیں۔ یہ سب عالم محسوسات کی باتیں ہیں۔ پھر ہم خدا کو اپنے قریب محسوس کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے کہ انسانی احساسات کسی شے کی موجودگی کی خبر دیتے ہیں۔ مگر جب کوئی موجود ہی نہ ہو تو پھر احساس کس چیز کا پتا دے گا؟"

غرض کئی دن تک یہ ہنگامہ انکار واقرار جاری رہا۔ اہل ایمان جن میں علماء بھی شامل تھے، منکرین خدا کی عقل کا ماتم کرتے رہے...... اور دہریوں کی جماعت جسے اپنے ہوش وخرد پر ناز تھا، وہ اہل ایمان کو فہم وادراک سے بیگانہ قرار دیتی رہی۔ پھر جب پورا کوفہ اس شور کی لپیٹ میں آ گیا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بھی خبر ہوئی۔ آپ کو اکثر ایسے بدعقیدہ اور گمراہ انسانوں سے سابقہ پڑتا ہی رہتا تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی مزاجی کیفیت یہ تھی کہ جب کوئی شخص تنہا اپنی ذات میں گمراہ ہوتا تو آپ اس سے بحث اور مناظرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کوئی ذکر بھی کرتا تو فرما دیتے کہ اگر خدا چاہے گا تو اسے ہدایت مل جائے گی...... مگر جب کسی شخص کی فتنہ انگیزیوں سے مسلمانوں کی اکثریت متاثر ہونے لگتی تو آپ پوری شدت اور توانائی کے ساتھ مناظرے کرتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بدعقیدگی سے باز آ جاتا اور لوگوں کے ذہن اس کے قائم کردہ طلسم سے آزاد ہو جاتے۔ تاریخ سے یہ تو پتا نہیں چلتا کہ وجود باری تعالیٰ سے انکار کرنے والا وہ ایک فرد تھا یا کوئی جماعت تھی۔ پھر بھی یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں ایک ایسا دہریہ بھی پایا جاتا تھا جس نے خدا کی موجودگی کے بارے میں بڑے بڑے علماء کے دلائل تسلیم نہیں کیے تھے۔

بالآخر جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو خبر ہوئی کہ اس شخص کی کج روی نے فتنے کی شکل اختیار کر لی ہے تو آپ تمام مصروفیت ترک کر کے بہ نفس نفیس اس منکر خدا کے پاس پہنچے اور فرمانے لگے۔ "اے شخص! آخر تجھے کس چیز نے اس فریب میں مبتلا کیا ہے کہ تو خدا کے وجود سے بھی انکار کر بیٹھا ہے۔"

اس منکر خدا نے جواب میں وہی دلائل پیش کیے جن کا اظہار وہ دوسرے علماء کے سامنے کر چکا تھا۔

"بفضل خدا میں تجھے تیرے نظریات سے باز رکھ سکتا ہوں۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔

"ہاں! میری بھی یہی خواہش ہے کہ خدا کا کوئی نام لیوا میری عقل کو عاجز کر دے۔" منکر خدا کے لہجے میں انتہائی غرور وتکبر کا رنگ نمایاں تھا۔ "میں کب سے اہل ایمان کی جماعت کو پکار رہا ہوں مگر آج تک کوئی ایک فرد بھی ہوش وخرد کی دنیا میں نہیں آیا۔ سب کے سب اپنے عقیدوں کے خول میں بند ہیں۔ اب تم آئے ہو تو مجھے قائل کر دو۔ میں اپنے نظریات سے تائب ہو جاؤں گا۔"

"میں تجھے اس گوشہ تنہائی میں بھی قائل کر سکتا ہوں مگر تیری بے راہ روی سے کچھ دوسرے لوگوں کے ذہنوں

میں بھی خلل پیدا ہوا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اہل کوفہ کے سامنے تیرے ساتھ مناظرے کا آغاز کروں۔"
حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ کوئی نمائش ذات نہیں تھی۔ دراصل اس خواہش کے پس پردہ وہی جذبہ کارفرما تھا کہ عوام الناس بھی اس مناظرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ان کی سماعتیں بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پیش کردہ دلائل سے آشنا ہو جائیں۔ اس طرح عام لوگوں کے دلوں میں جو وسوسے اور اندیشے پیدا ہو رہے تھے ان کا خاتمہ ہو جائے۔

بالآخر وہ دہریہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے سرعام مناظرہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ پھر کچھ دوسرے افراد کی موجودگی میں مناظرے کا دن اور وقت بھی مقرر کر دیا گیا۔

پھر یہ خبر کوفے میں عام ہو گئی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس دہریئے کے سوالات کا جواب دیں گے' جسے دیگر علماء اور فقہائے کوفہ اب تک مطمئن نہیں کر سکے ہیں۔ یہ خبر اہل شہر کے لئے بڑی عجیب خبر تھی۔ یہاں اس تاریخی پس منظر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شہرت اب عراق کی حدود سے نکل کر دیار حجاز تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کئی ائمہ کرام کے سامنے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ آپ "قرآن و حدیث" کی موجودگی میں اپنے قیاس و رائے سے کام نہیں لیتے لیکن پھر بھی دیگر مکتب فکر کے لوگ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو "صاحب قیاس" ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور ایک دہریئے کے درمیان مناظرہ ہونے والا ہے تو وہ بھی بے اختیار اس میدان کی طرف روانہ ہو گئے جہاں ان کے خیال میں ایک سرکش منکر خدا کو مطمئن کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اگر آج کا دور ہوتا تو ہم برملا کہہ دیتے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مخالفین آپ کی شکست کا تماشا دیکھنے جمع ہوئے تھے...... لیکن ہمیں اس خیال فاسد کو اپنے ذہنوں سے نکال دینا چاہئے کہ اگر وہ مخالف بھی تھے تو وسعت نظر اور کشادگی قلب کے ساتھ۔ اس میدان میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مخالفین کی موجودگی محض اس لئے تھی کہ وہ ایک عقلی مباحثے کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ معاذ اللہ! انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک منکر خدا کے سامنے شکست کھا جاتے اور اہل ایمان صرف اس لئے اپنی خوشی کا اظہار کرتے کہ وہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے اختلاف نظر رکھتے تھے۔

اس مناظرے کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی سے وابستہ اس قسم کے واقعات کو مخالفین "فرضی قصے" قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ماننے والوں نے جوش عقیدت میں کچھ ایسے واقعات بھی تراش لئے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ زیر نظر واقعے کے بارے میں بھی بعض تنگ نظر حضرات کی یہی رائے ہے۔ بہرحال مخالفین کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور تاریخ کا اپنا زاویہ۔

اس واقعے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس شخص کا بھی مختصر تعارف پیش کر دیں جس نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور ایک منکر خدا کے درمیان ہونے والے مناظرے کو تاریخی حقائق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ حضرت امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو رے کے مقام پر 1149ء میں پیدا ہوئے۔ امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کے والد محترم ضیاء الدین ابوالقاسم اپنے شہر کے نامور خطیب تھے۔ اس لئے امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کا لقب "ابن خطیب" ہو گیا۔ ادب اور دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ خوارزم چلے گئے۔ جہاں آپ نے

معتزلہ کے خلاف مسلسل مناظرے کئے اور انہیں ہر معرکے میں شکست دی مگر معتزلہ در پردہ اقتدار میں تھے۔ اس لئے ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں نے حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجتاً امام رازی رحمتہ اللہ علیہ ماوراء النہر پہنچے مگر وہاں بھی حالات سازگار نہیں تھے۔ ہر طرف سے مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مجبوراً آپ شہاب الدین غوری کے پاس پہنچے' جس نے آپ کے فضل و کمال کو دیکھ کر انعام و اکرام' اعزازات اور دولت کی بارش کر دی۔ 1148ء میں جب حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ بخارا کے ارادے سے ماوراء النہر جاتے ہوئے کچھ عرصے کے لئے سرخس میں ٹھہرے تو وہاں کے ایک طبیب نے آپ کے شایان شان استقبال کیا۔ اظہار تشکر کے طور پر حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے حکیم بوعلی سینا کی ایک کتاب کی شرح لکھی۔ جب بخارا میں حسب توقع آپ کو سرپرستی نہ مل سکی تو ہرات تشریف لے گئے۔ یہاں سلطان غیاث الدین غوری نے حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کو شاہی محل میں عوام کے لئے ایک مدرسہ کھولنے کی اجازت دے دی۔ سمرقند' ہندوستان اور دیگر مقامات کی سیاحت کے بعد آپ ہرات میں اقامت گزیں ہو گئے اور اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ یہیں گزارا۔ ہرات ہی میں حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کو "شیخ الاسلام" کا خطاب دیا گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کی ظاہری شان و شوکت اپنے عروج پر تھی۔ اس وقت تین سو سے زیادہ شاگرد آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کا آغاز تنگ دستی سے ہوا اور آخری عمر میں آپ کو بہت زیادہ خوش حالی میسر تھی۔ بے پناہ ذہانت' زبردست قوت حافظہ اور فکر کی رسائی نے انہیں ایک ایسا عالم بنا دیا تھا جسے وسط ایشیا میں غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ بہترین فلسفی اور خطیب ہونے کے ساتھ نہایت متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے اہل سنت کے مسلک کا دفاع کرتے ہوئے سخت مصائب برداشت کئے اور تنگ نظر لوگوں نے جہل کی بنیاد پر امام رحمتہ اللہ علیہ کو بہت آزار پہنچائے۔

معتزلہ اور دوسرے فرقے تو آپ کی جان تک کے دشمن ہو گئے تھے مگر امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی۔ آپ کے دشمن بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ امام رازی رحمتہ اللہ علیہ ایک بہت بڑے فلسفی اور علم کلام کے بے مثال ماہر تھے۔ آنے والے زمانے اس حد تک آپ کے زیر اثر تھے کہ حضرت امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے مرد جلیل بھی امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کو خراج عقیدت پیش کیے بغیر نہ رہ سکے۔ امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنی وصیت میں تحریر کیا تھا...... "میں نے علم کلام کے تمام طریقوں کو پرکھا اور فلسفے کے تمام اصولوں کو آزمایا لیکن مجھے کہیں بھی اطمینان قلب حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر سکون کی یہ دولت مجھے تلاوت قرآن میں ملی۔" حضرت امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کے علمی کارناموں میں ان کی تصنیف "تفسیر کبیر" سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی اس تفسیر میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور ایک منکر خدا کے مناظرے کا ذکر کیا ہے۔ اس تاریخی واقعے کا یہ مستند حوالہ پیش کرنے کے بعد ہم کوفے کے اس میدان کا رخ کرتے ہیں جہاں مقررہ وقت پر اہل شہر قطار در قطار جمع ہو رہے تھے۔ وہ دہریہ پہلے ہی وہاں موجود تھا اور بڑی بے چینی کے عالم میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تک اس کی عقل میں یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مناظرے کے لئے ایک عظیم الشان اجتماع کا اہتمام کیوں کیا ہے؟ اگرچہ حالات کا یہ پہلو اس کے لئے پریشان کن تھا' لیکن پھر بھی اسے ایک عجیب سی طمانیت

قلب حاصل تھی اور اس سکون کی بنیاد اس بات پر تھی کہ اب تک کوفے کے دیگر علماء اسے عقلی طور پر عاجز نہیں کر سکے تھے۔ "پھر ایک نوجوان اس کے مشکل ترین سوال کا جواب کس طرح دے گا؟" بہت دیر تک وہ منکر خدا اپنے خیالات میں الجھا رہا اور اس کی گمراہ عقل اسے نئے نئے انداز سے فریب دیتی رہی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ مقررہ ساعت میں ابھی کچھ لمحات باقی تھے۔ اس لئے ہجوم کی نگاہیں میدان کے اس دروازے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس مسند تک پہنچنا تھا جو علمائے کوفہ اور منکر خدا کے لئے آراستہ کی گئی تھی۔ بالآخر وہ مقررہ ساعت بھی گزر گئی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ابھی تک میدان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اہل کوفہ کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا۔ دہریئے کے چہرے پر اچانک ایسا رنگ ابھر آیا تھا جس سے اطمینان قلب کا اظہار ہوتا تھا۔

وقت کی گردش مزید تیز ہوگئی اور اہل شہر کی بے چینی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دیگر صفات میں پابندی وقت بھی ایک نمایاں خوبی تھی۔ اب تک جن لوگوں کو آپ سے واسطہ پڑ چکا تھا وہ بخوبی جانتے تھے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں وقت کی کیا اہمیت ہے۔ پھر یہ غیر معمولی تاخیر کیوں؟ اہل کوفہ کے چہروں پر پھیلا ہوا اضطراب پہلی نظر میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ بے قرار تھا اور ذہن میں ایک ہی سوال ابھر رہا تھا کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اب تک کیوں نہیں آئے؟

"وہ تمہارا نوجوان عالم کہاں ہے جو مجھے بھرے مجمع میں شکست دینا چاہتا ہے؟" انجام کار دہریہ بول پڑا۔ اس کا لہجہ استہزائیہ تھا اور ایک ایک حرف سے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے تحقیر کا اظہار ہو رہا تھا۔

"انہیں کوئی ضروری کام بھی ہو سکتا ہے۔" ہجوم سے بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔

"ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اچانک کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے اور وہ کسی بیماری میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں۔" آپ کے عقیدت مندوں نے بہ آواز بلند کہا۔ "وہ ایفائے عہد بھی کرنے والے ہیں اور وقت کے پابند بھی۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔" منکر خدا کے نزدیک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عدم موجودگی کی کوئی تاویل قابل قبول نہیں تھی۔ "وہ نوجوان مجھ سے مناظرہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اتنے بڑے مجمع کے سامنے آنے سے گریزاں ہے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے عقیدت مند دہریئے کی اس لاف زنی کا جواب دینا چاہتے تھے مگر ان کی زبانوں پر مہر سکوت لگ گئی تھی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا وعدے کے مطابق وقت پر نہ پہنچنا ہر اس شخص کے لئے باعث حیرت تھا جس نے علمی زندگی میں آپ کے طرز عمل کو قریب سے دیکھا تھا۔

اسی کشمکش میں کچھ اور وقت گزر گیا۔ منکر خدا کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ کوفی نوجوان اب مناظرے کے لئے سر میدان نہیں آئے گا۔ اس لئے اس کے چہرے پر فاتحانہ سکون کی علامات روشن ہو گئی تھیں، لیکن دوسرے لوگ شدید کرب میں مبتلا تھے۔ انہیں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی صحت و عافیت کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی اور دہریئے کی موجودگی کے سبب احساس ندامت بھی تھا۔ بالآخر جب لوگوں کا اضطراب اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ میدان کے ایک گوشے میں نمودار ہوئے۔ اہل ایمان کے ڈوبتے ہوئے دل ٹھہر گئے اور وہ منکر خدا پیچ و تاب کھانے لگا۔

جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قریب پہنچے تو دہریئے نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”یہ کسی عالم کی شان نہیں کہ وہ خود ہی ایک وقت مقرر کرے اور خود ہی اپنے الفاظ کا پاس نہ کرے۔ میرے ساتھ یہ سیکڑوں انسان بھی بہت دیر سے زحمتِ انتظار برداشت کر رہے ہیں۔ کیا یہ غیر اخلاقی حرکت نہیں؟“ دہریئے کے لہجے کی تندی بڑھتی جا رہی تھی۔ ”کیا خدا کے ماننے والے اس قدر غیر ذمے دار اور بے پروا ہوتے ہیں کہ انہیں کسی دوسرے کی تکلیف کا احساس بھی نہیں رہتا۔“

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ ہجوم کی بے چین نگاہیں آپ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تاخیر سے پہنچنے کا کوئی معقول عذر پیش کریں گے مگر آپ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو انسانی مجمع کے ساتھ وہ دہریہ بھی حیران رہ گیا۔

”اگر میں اس تاخیر کے سلسلے میں کچھ کہوں تو کیا تم میری بات پر یقین کر لو گے؟“

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ منکر خدا سے مخاطب تھے۔

”یہ عذر کی نوعیت پر منحصر ہے کہ وہ قابل قبول ہے یا نہیں؟“ دہریئے کا انداز گفتگو ناپسندیدہ تھا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔ ”اگر میں اپنی تاخیر کا یہ سبب بیان کروں کہ یہاں آنے سے پہلے میں ایک جنگل کی طرف نکل گیا تھا، تو کیا تم اس پر یقین کر لو گے؟“ اتنا کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہو گئے۔ آپ کے یہ الفاظ سنتے ہی انسانی ہجوم ساکت ہو گیا تھا اور منکر خدا کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

”پورا واقعہ بیان کرو۔ اس کے بعد تمہارے پیش کردہ عذر کے متعلق سوچوں گا۔“ دہریئے کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

”جب میں اس جنگل میں پہنچا تو میرے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔“ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ”میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک سرسبز و شاداب اور تناور درخت کھڑا تھا۔ اچانک اس درخت میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی اور وہ خود بخود کٹ کر زمین پر گر گیا۔“

”کسی انسانی ہاتھ کی مدد کے بغیر۔“ دہریہ یکا یک درمیان میں بول پڑا۔

”یہ بات آداب گفتگو کے خلاف ہے۔“ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”جب تک کہ ایک انسان اپنی بات مکمل نہ کر لے اس وقت تک دوسرے شخص کو اخلاقی طور پر مداخلت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔“

دہریئے کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھرے اور وہ خاموش ہو گیا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ”درخت کے زمین پر گرتے ہی میں نے دیکھا کہ وہ مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ پھر وہ ٹکڑے ہموار تختوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس کے بعد ان تختوں کو جنبش ہوئی اور وہ ایک ترتیب کے ساتھ جڑ گئے۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا' اب لکڑی کے تختوں نے ایک مکمل کشتی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ابھی میری چشم حیراں ان تغیرات کو سمجھنے بھی نہیں پائی تھی کہ وہ کشتی خود بخود اچھل کر دریا میں چلی گئی...... اور پھر وہ دریا کے دونوں اطراف میں کھڑے ہوئے مسافروں کے پاس آئی۔ یہاں تک کہ مسافروں کو ادھر ادھر لے جانے لگی اور دریا پار کرانے کے بعد ہر مسافر سے خود ہی کرایہ بھی وصول کرنے لگی۔“

اتنا کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ تمام چہروں پر شدید حیرت کے آثار نمایاں

تھے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ انہیں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس مشاہدے پر یقین نہیں آرہا تھا۔ پورے میدان کی فضاؤں پر ایک عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ خود وہ دہریہ بھی کچھ دیر غرق حیرت رہا اور پھر قہقہہ زنی کرنے لگا۔

''تمہاری یہ خندہ زنی مجلس علم کی سنجیدگی کے خلاف ہے۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دہریئے کی ہنسی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں میرے قہقہوں پر اعتراض ہے مگر خود اپنی کسی حرکت پر شرمندگی کا احساس نہیں۔'' اب منکر خدا کی ہنسی رک گئی تھی مگر لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''حاضرین گواہ ہیں کہ مجھ سے کوئی نازیبا حرکت سرزد نہیں ہوئی۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت تحمل سے فرمایا۔

''پہلے تو تم نے میرے علاوہ بے شمار لوگوں کا قیمتی وقت برباد کیا۔'' دہریہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر طعنہ زنی کر رہا تھا۔ ''پھر تاخیر سے آنے پر ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے ایک بے سروپا قصہ سنانا شروع کر دیا جس کا حقیقت سے برائے نام بھی تعلق نہیں۔''

''میں تو اپنا مشاہدہ بیان کر رہا ہوں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

''یہ مشاہدہ نہیں' بینائی کا ضعف ہے' خلل دماغ ہے۔'' دہریئے کے لہجے کی تلخی اب غصے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ''یہ محض ایک جھوٹ ہے۔ اول و آخر جھوٹ۔''

''اہل کوفہ میرے معاملات سے پوری طرح باخبر ہیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا صبر اور اطمینان قابل دید تھا۔ '' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی پرجلال آواز میدان میں گونج رہی تھی۔ حاضرین کے ہونٹوں پر بدستور سکوت تھا اور ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن ہر شخص اپنی جگہ کھڑے یا بیٹھے شدید اضطراب کے عالم میں پہلو بدل رہا تھا۔ لوگوں کو اس مناظرے کے انجام کا انتظار تھا کہ وہ دہریہ غالب رہتا ہے یا حسب سابق حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بے مثال ذہانت اسے عاجز کر دیتی ہے۔

''تم اپنے آپ کو فقیہ کہتے ہو۔'' دہریئے کی آواز غصے کے سبب معمول سے زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ ''تمہیں مسلمانوں کی امامت کا بھی دعویٰ ہے مگر ایک طرف تم وقت کی پابندی کے قائل نہیں اور دوسری طرف صریحاً جھوٹ بول رہے ہو۔''

''میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میرے مشاہدے پر جھوٹ کا الزام کیوں عائد کیا جا رہا ہے؟'' منکر خدا کی ناشائستگی کے باوجود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شیریں کلامی برقرار تھی۔

''یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک درخت خود بخود کٹ کر زمین پر گر گیا۔ پھر ایک ترتیب کے ساتھ کشتی تیار ہو گئی اور آخر میں اس نے مسافروں کو دریا عبور کرانے کے بعد ان سے کرایہ بھی وصول کرنا شروع کر دیا۔ اگر یہ بدترین جھوٹ نہیں تو کیا ہے۔ دنیا کا کوئی فاتر العقل انسان ہی تمہارے بیان کردہ واقعے پر یقین کر سکتا ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ایک صحیح الدماغ بچے کو بھی اس پر اعتبار نہیں آ سکتا۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے دہریہ شدت گفتار سے کام لے رہا تھا۔

"ایک درخت کا کسی کشتی میں خود بخود تبدیل ہو جانا بہت معمولی بات ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "تمہارے دماغ میں تو اس سے کہیں زیادہ بڑے کام خود بخود انجام پاتے رہتے ہیں' زمین خود بخود وجود میں آ گئی ہے۔ آسمان خود بخود تشکیل پا گیا' شمس وقمر اور دیگر ستارے خود بخود ایک مقررہ رفتار کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ دلکش باغات' ہزاروں اقسام کے رنگین پھول' بے شمار پرندے اور لاتعداد چوپائے (جو آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تشکیلی نسبت نہیں رکھتے) یہ مختلف رنگ وعادات کے انسان اور کائنات کا یہ لامتناہی نظام خود بخود تکمیل پا گیا ہے۔ اگر تمہارے خیال میں کسی معمار کے بغیر ایک معمولی کشتی کا تیار ہو جانا جھوٹ ہے تو پھر میرے نزدیک دست خالق کے تعاون کے بغیر اتنی بڑی دنیا کا وجود میں آ جانا اس سے بھی بڑا جھوٹ ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے منکر خدا کے گرد اپنے منطق واستدلال کا حصار اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ فرار تو کجا وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حاضرین نے دیکھا کہ کل تک جو شخص حرف انکار کو ثابت کرنے کے لئے شعلہ بیانی سے کام لے رہا تھا۔ آج حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو اس کے ہونٹ جل گئے تھے اور زبان مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ منکر خدا کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اپنے جس عقیدے پر وہ تمام عمر نازاں رہا آج اسی عقیدے نے سیکڑوں انسانوں کے ہجوم میں اسے بے یار ومددگار چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے جس تصور کو متاع حیات سمجھتا تھا' آج وہی دولت ایک نوجوان فقیہ کے سامنے پتھروں کا ایک ڈھیر تھی۔

پھر سننے والوں نے سنا۔ دہریہ بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔ "نوجوان! خدا تیری عمر دراز کرے کہ تو نے مجھ جیسے گمراہ کو نشان منزل کا پتا دیا۔ میرے ذہن کی کجی دور کی اور مجھے وہ نکتہ سمجھایا جس کی تشریح سے بڑے بڑے علماء عاجز تھے۔"

حضرت امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ کے بقول اس دہریئے نے مناظرے میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے شکست کھائی اور پھر اپنے عقیدے سے تائب ہو کر مسلمان ہو گیا۔

اسی واقعے کو پروفیسر ابوزہرہ مصری نے دوسرے انداز میں تحریر کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کے الفاظ میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مناظرے کے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ آغاز طلب علم ہی سے آپ بحث ومباحثے کے دلدادہ تھے۔ اس وقت اسلامی فرقوں کا مرکز بصرہ تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اکثر بصرہ تشریف لے جاتے اور تمام فرقوں کے اکابر سے تبادلہ خیال کرتے۔ روایت ہے کہ اس نوعمری کے باوجود آپ بائیس فرقوں کے نامور علماء سے مناظرہ کر چکے تھے۔ اسی طرح ایک بار آپ نے دہریوں کی ایک جماعت سے مناظرہ کیا تھا۔ جب منکرین خدا اپنے اپنے دلائل پیش کر چکے تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے دہریوں کے گروہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اس شخص کے بارے میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے جو یہ کہے کہ اس نے مال ومتاع سے لبریز ایک کشتی دیکھی ہے۔ سمندروں کی لہریں اس کشتی سے ٹکراتی ہیں اور تندوتیز ہوائیں اسے مضطرب رکھتی ہیں۔ مگر پھر بھی وہ کسی ملاح اور محافظ کے بغیر سمندر کو چیرتی چلی جاری ہے۔ کیا انسانی عقل کے نزدیک یہ بات ممکن ہے؟"

جواب میں منکرین خدا کی وہ جماعت بے ساختہ پکار اٹھی۔ "یہ واقعہ ہی عقل وفہم کے خلاف ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش انسان ان بے سروپا باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا۔"

"اس طرح تو آپ نے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا اور اپنے تمام نظریات کی تردید کر دی۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ

اللہ علیہ نے فرمایا۔

دہریوں کی جماعت فوری طور پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دلیل کی گہرائی کو نہ سمجھ سکی اور اسی سرکشی کے انداز میں کہنے لگی۔ ''ایک مفروضہ کشتی کے واقعے سے ہمارے نظریات کس طرح باطل قرار پاتے ہیں۔''

''جب آپ لوگ کشتی کے محفوظ سفر کو کسی ملاح کے بغیر ممکن نہیں سمجھتے تو پھر اس قدر وسیع وعریض کائنات کسی خالق کے بغیر کس طرح تخلیق پا گئی اور اتنا پیچیدہ نظام کسی مدبر کے بغیر ایک خاص ترتیب کے ساتھ کیسے چل رہا ہے؟''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے دلائل کی وضاحت کی۔

اور دہریوں کے تمام فلسفے کی دھجیاں بکھر گئیں۔ اہل کوفہ نے دیکھا کہ وہ منکرین خدا نہ صرف خالق کائنات کے وجود کو تسلیم کر رہے تھے بلکہ اس کی وحدانیت اور پھر رسالت پر بھی ایمان لے آئے تھے۔

اس سلسلے میں یہ تحقیقی وضاحت ضروری ہے کہ بیشتر کتابوں میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور دہریوں کے درمیان مناظرے کا ذکر ملتا ہے' لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ اس مناظرے کا مرکز بصرہ تھا یا کوفہ؟ اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ بصرہ اس قسم کے مناظروں اور مباحث کا گڑھ تھا تو پھر دہریوں کی جماعت بھی بصرے ہی میں مقیم تھی۔ اس طرح واقعے کی صورت گری کچھ یوں ہوگی کہ منکرین خدا کی نعرہ زنی کا شور بلند ہوتے ہوتے کوفے تک بھی اس کی تیز لہریں پہنچی ہوں گی اور پھر اس فتنے کو دبانے کے لئے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خود بصرہ تشریف لے گئے ہوں گے اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہوگی تو پھر یہ مناظرہ کوفے کے کسی میدان میں منعقد ہوا ہوگا۔ مقام کے علاوہ میرے زیر مطالعہ کسی کتاب میں مناظرے کی تاریخ اور سن بھی درج نہیں۔ بجز اس کے کہ مناظرے کے وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ آزادانہ طور پر مسند درس پر جلوہ افروز نہیں ہوئے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس وقت آپ کے استاد گرامی حضرت امام حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ زندہ تھے۔ اسی بات کو پیش نظر رکھ کر 120ھ سے پہلے اس مناظرے کی تاریخ کا تعین کیا گیا ہے۔ لیکن اس تشریح کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ماننے والوں نے جوش عقیدت میں ایک فرضی مناظرے کا ذکر کر دیا ہے تاکہ اہل دنیا پر آپ کی بے پناہ ذہانت کا تاثر قائم ہو جائے۔ مخالفین اکثر یہی کہتے رہتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پیروکار آپ کے نام کے ساتھ کچھ ایسے واقعات بھی منسوب کر دیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک زیر نظر واقعہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بے مثال ذہانت کے تناظر میں اتنا بڑا واقعہ نہیں ہے کہ مخالفین اس کی صحت سے انکار کر دیں۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تو وہ ذکی وفہیم انسان تھے کہ اگر ایک ہی نشست میں تمام نابغۂ روزگار جمع ہو جاتے تب بھی ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی اس محفل میں سربلند نظر آتے۔ دہریوں کی جماعت کی شکست اور پھر ان تمام افراد کا ایمان لانا ایک تاریخی حقیقت ہے۔ یہ مناظرہ کوفے میں ہوا تھا یا بصرے میں' دہریوں کے مخاطب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی تھے۔ وہ گم کردہ راہ لوگ خدا کے انکار میں جس قدر دلائل رکھتے تھے، سب کے سب پوری توانائی کے ساتھ پیش کئے جاتے رہے۔ مگر جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی آواز بلند ہوئی تو پھر وہ فریب خوردہ گروہ آپ کی ایک دلیل کا بھی متحمل نہیں ہوسکا۔

منکرین خدا کی شکست کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شہرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کہنے والے کہہ رہے تھے کہ خدا نے اس کوفی نوجوان کے ذریعے عقائد کو منطق کی زبان بخشی ہے۔ جن کے دلوں میں ٹیڑھ نہیں تھی،

وہ اپنی عقل کو استعمال کئے بغیر خدائے واحد کی خلاقی اور رسالت کی حقانیت پر ایمان لے آئے تھے...... مگر جو ہوش و خرد کے سیلاب میں بہہ گئے تھے اور فلسفہ و منطق کا سہارا لے کر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے تھے' ان کے لئے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سامان موت کی حیثیت رکھتے تھے۔

فرار کے بہانے تراشنے والوں نے فہم و ادراک کی پناہ ڈھونڈی تھی اور اپنے افکار کو روشن خیالی کے پردوں میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ خوش تھے کہ ان کے دماغ مسلمانوں کے معبد میں نئے صنم آراستہ کریں گے اور پھر گمراہی کا ایک طویل دور شروع ہو جائے گا...... لیکن جب آنے والا آیا تو اس نے مفسدین کے بتان خیالی کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

کہنے والے کہتے تھے کہ ہمارے ذہن کشادہ ہیں اور ہم آگہی کا گرانبار ذخیرہ رکھتے ہیں ...... حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔ "تمہارے دماغوں میں بہنے والے فکر کے سرچشمے خشک ہو گئے ہیں اور تمہاری دولت محض جہل و بے خبری کی میراث ہے۔"

کہنے والے کہتے تھے کہ ہماری روشن آنکھیں افق کے پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں مگر ہمیں خدا نظر نہیں آتا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ثابت کیا کہ تم بینائی سے محروم ہو اور اتنی بصارت بھی نہیں رکھتے کہ اپنے سامنے کی چیزوں کو ہی دیکھ سکو۔

کہنے والے کہتے تھے کہ روایت کے خلاف جنبش کرنا حرام ہے ...... مگر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر اس دعوے کو جھٹلایا کہ جہاں جہاں خدا اور رسول ﷺ کے احکامات واضح ہیں وہاں خاموشی سے اپنی پیشانیوں کو جھکا دو...... اور جب تمہیں قرآن و حدیث سے کوئی مثال نہ ملے تو نئی راہیں تلاش کرو۔ یہ سرکشی نہیں' عین اطاعت ہے۔ یہ بدعت نہیں' عین عبادت ہے۔ خدا اپنی نشانیاں دکھانے کیلئے تمہیں غور و فکر کا حکم دیتا ہے اور رسالت مآب ﷺ تمہیں بشارت دیتے ہیں کہ تدبر مومن کی میراث ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اجتہاد کے اسی راستے پر گامزن تھے۔ آپ کے یہاں گہوارے سے قبر تک علم حاصل کرنے کی تڑپ تھی...... اور یہی تڑپ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کو در در لئے پھرتی تھی۔

صحیح زمانے اور تاریخ کا تو پتا نہیں چلتا مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' مشہور تابعی بزرگ حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس کی خدمت عالیہ میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ بعض حضرات کے نزدیک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس سے ملاقاتیں ایک عارضی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس گروہ کے لوگ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح دیگر سینکڑوں طالبان حدیث و فقہ حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس کی درس گاہ میں مسلسل حاضری دیتے تھے اور انہیں حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا، اس کے برعکس ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا معاملہ کچھ اور تھا تحقیق کرنے والی اس جماعت کا کہنا ہے کہ حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ ابن کاؤس کے حلقہ درس میں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور اگر کوئی حقیقت تھی تو بس اتنی کہ حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی عام حاضرین کی طرح شریک درس ہو جایا کرتے تھے۔ جہاں تک رشتہ خاص کا تعلق ہے تو بارگاہ نافع رحمتہ اللہ علیہ میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو کوئی قربت حاصل نہیں تھی۔

معترضین کی اس بات کو کسی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس کے ان شاگردوں کی فہرست میں شامل نہیں تھے جو ایک طویل مدت استاد کی خدمت میں گزارتے ہیں۔ ہم

نے اس کی بنیادی وجہ بھی بیان کی تھی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تاریخ آدم کے ان چند ذکی و فہیم انسانوں میں سے تھے جن پر خود ذہانت بھی ناز کرتی ہے اور جب یہ لوگ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو حرف آخر کہلاتے ہیں۔ ایسے نابغہ روزگار شخص کو ایک ظاہری رسم کی تکمیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر وہ چند لمحوں کے لئے بھی شریک درس ہوتا ہے تو پھر یہی لمحے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بے شمار محدثین عظام اور فقیہان کرام کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوتے تھے کہ ان بزرگوں کا عمل دیکھیں' طرز گفتار کا مشاہدہ کریں اور جائزہ لیں کہ ان کی نگاہ بلند انسانی زندگی کے مسائل کی گرہ کشائی کس طرح ہوتی ہے؟ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے یہ کام بہت آسان تھا کہ وہ کسی فقیہ یا محدث کی درس گاہ میں کچھ وقت گزاریں اور علم کے کسی مخصوص انداز کو اپنی ذات میں جذب کر کے رخصت ہو جائیں۔ پھر نئی درس گاہ کے دروازے پر دستک دیں' نئے استاد کے حضور شرف باریابی حاصل کریں اور دل و دماغ کو نئے زاویے سے روشن کر کے کسی تیسری بارگاہ علم کی جانب دیکھنے لگیں۔ اگر حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایسا نہ کرتے تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ مختصر سی زندگی میں چار ہزار استادان گرامی کے سامنے سر نیاز خم کرتے۔

اپنے اسی جذبہ علم سے بے قرار ہو کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس کے آستانے تک پہنچے تھے۔

صحیح تاریخ کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا مگر ایک اندازہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ 115ھ اور 117ھ کے درمیان حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس کی مجلس درس میں حاضر ہوئے تھے۔ عام طور پر یہ وہ زمانہ ہوتا تھا کہ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سعادت حج سے شرف یاب ہو کر مدینہ منورہ تشریف لے جاتے تھے۔ آپ کا دور شاگردی کتنا طویل ہے' اس کی تفصیل بھی مستند کتابوں میں محفوظ نہیں مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

غالباً یہ 116ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ دیار رسول ﷺ میں موجود تھے کہ ایک عجیب و غریب مسئلے نے تمام اہل مدینہ کو حیران کر دیا تھا۔

ذہانت کی ایک عجیب مثال

یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ اس زمانے کے لوگ اپنی عورتوں کو عجیب عجیب انداز سے طلاق دیا کرتے تھے یا پھر طلاق دینے کے بہانے تراشتے تھے۔ اگرچہ رسالت مآب ﷺ نے واضح طور پر فرمایا تھا کہ حلال کاموں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ فعل طلاق ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ طلاق کے سلسلے میں عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اپنے خسر سے ذاتی طور پر ناراض ہے تو بیوی پر یہ پابندی لگا دیتا کہ اگر وہ اس کی عدم موجودگی میں اپنے باپ کے گھر گئی تو اس کو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ یا اگر اس نے گھر سے باہر قدم نکالا تو سلسلہ نکاح سے خارج ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ کچھ مضحکہ خیز باتیں ایسی بھی ہوتی تھیں کہ جن پر عمل پیرا ہونے کے بعد بیوی رشتہ زوجیت سے محروم ہو جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات محفوظ ہیں' جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس حساس اور نازک تعلق کو محض ایک تماشا بنا دیا تھا۔

برصغیر میں بھی طلاق کے بعض واقعات اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب ہوتے ہیں مگر قدیم عربوں میں بیوی سے علیحدگی کے واقعات کچھ اس قدر ناقابل فہم ہیں کہ ان پر کسی داستان یا قصے کا گمان ہوتا ہے۔ زیرنظر واقعے کے بارے میں کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ اس کا تعلق مدینہ منورہ کے رہنے والے ایک شخص سے تھا اور کچھ مؤرخین اصرار کرتے ہیں کہ یہ واقعہ کوفے میں پیش آیا تھا۔ بہر حال تاریخی حقیقت کچھ بھی ہو، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا عجیب تھا۔

اس واقعے کی تفصیلات کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہیں کہ ایک مسلمان مرد اور عورت بظاہر خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک روز شوہر باہر سے آیا۔ سخت گرمی کے موسم میں اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ شوہر نے آتے ہی بیوی سے پانی طلب کیا۔ بیوی نے پیاس کی شدت کو دیکھ کر ایک بہت بڑے پیالے میں پانی لیا اور شوہر کی طرف بڑھنے لگی۔ اس دوران اچانک شوہر کی ذہنی رو بہک گئی۔ گزشتہ دنوں کی کوئی پوشیدہ تلخی ابھر آئی یا پھر کسی معمولی بات پر بھڑک کر شوہر نے پانی پینے سے انکار کر دیا۔

بیوی نے نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے تو میں آپ سے اس کی معافی طلب کروں گی، مگر اس وقت، تو پانی پی لیجئے کہ آپ شدت سے پیاس محسوس کر رہے ہیں۔"

شوہر نے بیوی کی التجا کو قابل التفات نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ اس کا غصہ اپنے عروج کو پہنچ گیا اور وہ مزید تلخ کلامی پر اتر آیا۔

بیوی نے مصلحت وقت، کو پیش نظر رکھتے ہوئے شوہر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ کسی طرح بھی پانی پینے پر آمادہ نہیں ہوا۔ مجبوراً بیوی پانی لے کر واپس جانے لگی تو شوہر نے انتہائی غضب ناک لہجے میں چیخ کر کہا۔

"میں اپنی پیاس بجھانے کے لئے ہرگز اس پانی کا استعمال نہیں کروں گا۔"

"اگر آپ کو خصوصاً اس پانی سے نفرت ہے یا مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے تو میں دوسرے پیالے میں پانی لے آتی ہوں۔" شوہر کا قہر ناک رویہ دیکھ کر بیوی نے ایک بار پھر مزید عاجزی کا مظاہرہ کیا۔

"میں اس پانی کو ہرگز نہیں پیوں گا۔" شوہر کا غصہ پہلے سے زیادہ بھڑک گیا تھا۔ "اگر میں اس پانی کا ایک قطرہ بھی اپنے حلق سے نیچے اتار دوں تو تجھے تین طلاق۔"

اب بیوی پر شوہر کے خوف ناک ارادے ظاہر ہو گئے تھے۔ وہ اس تباہ کار لمحے کو ٹالنے کے لئے چپ چاپ واپس جانے لگی تو شوہر نے پکار کر کہا۔ "اگر تو نے اس پانی کو پینے کی کوشش کی تو اس صورت میں بھی تجھ پر تین طلاق۔"

صورت حال مزید خوفناک رنگ اختیار کر گئی تھی۔ بیوی ٹھہر گئی اور رحم طلب نظروں سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ "آخر میں نے کیا قصور کیا ہے، کہ آپ اس جارحیت پر آمادہ نظر آ رہے ہیں۔ نہ خود اس پانی کو استعمال کرتے ہیں اور نہ مجھے پینے دیتے ہیں۔ خدا کے لئے میری حالت پر رحم کیجئے۔"

شوہر پر بیوی کے اس رقت آمیز لہجے کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ "اگر تو کسی دوسرے شخص کو یہ پانی پینے کے لئے دے تب بھی تجھ پر تین طلاق۔" شوہر بیوی کی نجات کے تمام راستے بند کرتا جا رہا تھا۔

"یہ ظلم ہے۔" بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ "سراسر ناانصافی ہے۔"

''اگر تو اس پانی کو زمین پر بہا دے تب بھی تجھ پر تین طلاق۔ شوہر نے بیوی کے لئے یہ آخری راہ بھی مسدود کر دی تھی۔

''پھر میں کیا کروں؟'' بیوی نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسی عجیب پابندیاں ہیں؟''

شوہر نے بیوی کی التجاؤں پر کوئی دھیان نہیں اور پھر آخری پابندی لگاتے ہوئے کہا۔ ''جب تک اس پانی کا وجود باقی ہے، تجھ سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ اگر تین دن تک یہ پانی اسی طرح برقرار رہا تب بھی تجھے طلاق واقع ہو جائے گی۔ جا! اب میری نظروں سے دور ہو جا۔''

وفادار اور شوہر پرست بیوی خاموشی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور پانی سے لبریز پیالے کو بڑی احتیاط کے ساتھ ایک گوشے میں رکھ دیا۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ شوہر کی تنبیہ کے مطابق پانی کا اگر ایک قطرہ بھی چھلک کر زمین پر گر گیا تو اسے طلاق واقع ہو جائے گی اور وہ کسی بھی حال میں شوہر کی جدائی برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھی۔

بیوی کے جانے کے بعد شوہر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے اپنے ہاتھ سے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ ایک مرد کی پیاس تو بجھ گئی تھی، مگر اس کے ذہن کی کجی نے ایک شریف النفس خاتون کو عجیب وغریب اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

شوہر اپنی بیوی کے گرد طلاق کا ایک ایسا جلال پھیلا کر مطمئن ہو گیا کہ جس کے پھندے کا ٹنا بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا۔ بالفرض اگر اس کا مقصد طلاق دینا نہیں تھا تو پھر وہ اپنی شریک حیات کو انتہائی بے رحمی کے انداز میں ذہنی تکلیف پہنچانا چاہتا تھا۔ بیوی کچھ دیر تک اس پیچیدہ صورت حال سے نجات پانے کی تدبیریں سوچتی رہی، مگر شوہر کا بچھایا ہوا دام خرد اتنا مضبوط تھا کہ اس سے باہر نکلنے کے لئے کم عقل عورت کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ بالآخر جب اس کے ذہن کی گھٹن حد سے زیادہ بڑھ گئی تو وہ اپنے ماں باپ کے پاس پہنچی اور شوہر کی شقاوت قلبی کا حال سنانے لگی۔ عورت کے ماں باپ اور دیگر رشتے دار بھی اس عجیب وغریب اذیت رسانی کا ماجرا سن کر کرب میں مبتلا ہو گئے پھر ایک عزیز کے کہنے پر عورت کے باپ نے علمائے وقت سے رجوع کیا۔

فقہ کے ماہرین نے اس صورت حال پر ہر زاویئے سے غور کیا، مگر جب کوئی حل نظر نہیں آیا تو علمائے وقت ان الفاظ میں معذرت کرنے لگے۔

''خدا اس انسان کو ہدایت دے کہ اس نے اپنی بیوی کی نجات کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا ہے۔ ہماری عقل عاجز ہے کہ ہم اس معصوم اور بے گناہ عورت کو طلاق کے سفاک پنجے سے کسی طرح رہائی دلائیں؟''

ایک عالم نے اس الجھے ہوئے مسئلے کا حل پیش کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ بھی عورت کو طلاق سے بچانے کے لئے ناکافی تھا۔ اس ماہر نے کہا تھا کہ اگر پانی کو مکان کی چھت پر ڈال دیا جائے تو زمین پر بہانے کی شرط ساقط ہو جائے گی اور اس طرح طلاق واقع نہ ہو گی۔

اس کے جواب میں ایک دوسرے عالم نے عجیب نکتہ پیدا کیا تھا۔ اس عالم کے خیال میں مکان کی چھت بھی اسی مٹی سے تعمیر ہوئی تھی جس کا تعلق زمین سے تھا۔ بالفرض اگر زمین اور مکان کی چھت کو بے تعلق ثابت کر بھی دیا جائے تو پانی بہنے کی شرط برقرار رہتی ہے۔ پیالے میں موجودہ پانی زمین پر بہے یا چھت پر، شوہر کی قائم کردہ شرائط میں سے ایک شرط باقی رہے گی اور اس طرح طلاق واقع ہو جائے گی۔

بہر حال مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہا اور عورت کا باپ ناکام و نامراد واپس لوٹ گیا۔ مجالس فقہ میں بھی اس کی بیٹی کے مسئلے کا حل موجود نہیں تھا اور فقہائے کرام بھی کیا کرتے؟ اس شاطر مرد نے چال ہی ایسی چلی تھی کہ بظاہر کسی اہل دانش کے پاس اس کا توڑ موجود نہیں تھا۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کریں

عورت کا پورا گھر سوگوار تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ بالآخر کسی شخص نے عورت کے مضطرب الحال باپ سے کہا کہ وہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کر کے اپنا مسئلہ بیان کرے۔ جواب میں عورت کے غمزدہ باپ نے پوچھا کہ ابوحنیفہ کون ہیں؟ بتانے والے نے بتایا کہ وہ ایک نوجوان فقیہ ہیں مگر خدا نے انہیں ایسا ذہن رسا بخشا ہے کہ وہ ان مسائل کا بھی کوئی حل پیش کر دیتے ہیں جو بظاہر انسانی عقل کی گرفت میں نہیں آتے۔ امید و بیم کی حالت میں گرفتار وہ غمزدہ باپ' انجام کار حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں پہنچا اور اپنی بیٹی کا مسئلہ آپ کے سامنے بیان کیا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک مسئلے کی نوعیت پر غور فرماتے رہے اور پھر اس دل شکستہ انسان سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

"اے شخص! آزردہ نہ ہو کہ تیری بیٹی کو کم سے کم اس مسئلے میں طلاق کی اذیت ناک صورتحال سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا۔ انسان کی عقل عیار کوئی بھی بہانہ تراش لے مگر جب خدا کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے شر سے بچانا چاہتا ہے تو پھر بے شمار تدبیریں پیدا کر دیتا ہے۔ کون ہے اس کائنات میں خدا سے بہتر تدبیر کرنے والا؟ یقیناً کوئی بھی نہیں۔"

یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس عورت کے باپ سے فرمایا۔ "گھر جاؤ اور اس پیالے کے نیچے ایک موٹے کپڑے کی چادر بچھا دو اور پھر پانی کو اتنے بڑے کپڑے میں جذب کر لو کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ رہے۔ جب وہ کپڑا پانی کی ایک ایک بوند اپنے اندر جذب کر لے تو اسے احتیاط کے ساتھ چھت پر لے جا کر کسی چیز کے سہارے دھوپ میں لٹکا دو۔ اگر پانی کے قطرے ٹپکنے کا امکان ہو تو اس کے نیچے ایک اور چادر تان دو۔ اس کے بعد بھی اگر اس بات کا احتمال باقی رہے کہ پانی اس چادر میں جذب نہ ہو سکے گا اور کوئی نہ کوئی قطرہ زمین تک پہنچ جائے گا تو پھر اس کے نیچے تیسری چادر لگا دو۔ اس طرح پانی کا کوئی قطرہ زمین تک نہیں پہنچ سکے گا۔ تیز ہوا اور سورج کی گرمی روشنی بھیگے ہوئے کپڑے کو کچھ دیر میں خشک کر دے گی اور اس طرح ایک معصوم عورت کو اس بدطینت مرد کے خوف ناک ارادے سے نجات مل جائے گی جو اپنے نفس کی سرکشی کو آسودہ کرنے کے لئے عجیب عجیب بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ علم سے اپنے مسئلے کا حل پا کر اس شخص کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو گئیں اور پھر وہ مجلس ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے اٹھا تو اس کی زبان پر یہ دعائیہ کلمات تھے۔

"امام! خدا آپ کا دامن حیات اپنی نعمتوں سے بھر دے کہ ہم جیسے پریشان حال لوگ تو آپ ہی کو دیکھ کر جیتے ہیں۔ ہمیں کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ علم کے کس درجے پر فائز ہیں مگر پھر بھی اتنا احساس ضرور ہے کہ آپ نہ ہوتے تو میرے اہل خانہ پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔"

ابھی وہ شخص حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شان میں مزید خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا تھا کہ آپ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فرمایا۔ ''اپنا زور بیان مجھ کم علم انسان پر ضائع نہ کر کہ تمام تعریفیں صرف اللہ کے لئے ہیں۔ قدرت کسی ایک شخص یا ایک قوم کی تابع نہیں بلکہ ہر ذرہ کائنات اس کی مرضی کا پابند ہے۔ وہ جب ارادہ کرتا ہے تو کوئی مسئلہ تشنہ نہیں رہتا۔ اگر تیری بیگناہ بیٹی کو طلاق سے بچانے کے لئے ابوحنیفہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا۔''

اس کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''لوگو! اپنی معاشرت کو تماشا نہ بناؤ۔ اگر تمہیں اپنی بیویوں سے شکایت ہے تو ان کی اصلاح حال پر توجہ دو۔ ان سے علیحدگی اختیار کرنے کے لئے نئے نئے بہانے نہ تراشو کہ خدا تمہارے دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔ نفاق و انتشار سے بچو کہ یہ انسان کو ہلاک کر دینے والا زہر ہے...... قصداً اس زہر کو نہ پیو کہ یہ مومن کے تدبر کے خلاف ہے۔''

وقت گزر گیا مگر جب اس واقعے کی گونج ہر طرف سنائی دینے لگی تو ایک دوسرے بزرگ فقیہ نے جذبہ عقیدت سے سرشار ہو کر کہا تھا۔ ''بے شک! روئے زمین پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذہین شخص موجود نہیں۔''



حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس کے علاوہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا نام بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں شامل تھا۔

مؤرخ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد رشید امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ مختلف فقہی مسائل پر گفتگو جاری تھی کہ اچانک حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تمہارے استاد ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہؓ کا یہ مسلک کیوں ترک کر دیا کہ باندی پر آزاد ہونے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے؟''

''اس کا سبب بھی آپ ہی کی بیان کردہ ایک روایت ہے۔'' حضرت امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ جواب دیا۔

''میری بیان کردہ روایت؟'' امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ کے جواب پر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو سخت تعجب تھا۔

''جی ہاں! آپ ہی نے میرے استاد گرامی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ جب بریرہؓ آزاد ہوئیں تو ان کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی بلکہ ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پہلے نکاح کو قائم رکھ سکتی ہیں اور اگر چاہیں تو اسے ختم کر سکتی ہیں۔'' امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک حضرت امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر بے اختیار ہو کے فرمایا۔ ''واللہ! ابوحنیفہ بہت ذہین انسان ہیں۔''

عبیداللہ بن عمر رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک بار میں حضرت اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں موجود تھا۔ دیگر

محدثین اور فقہا کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے باادب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص داخل ہوا۔

''امام! مجھے ایک مسئلہ درپیش ہے۔ آپ قول رسول ﷺ کی روشنی میں اس کا کوئی حل بتا دیجئے۔'' آنے والا حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب تھا۔

امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے اس شخص کو مسئلہ بیان کرنے کی اجازت دے دی۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اس مسئلے کی نوعیت پر غور کرتے رہے۔ اہل مجلس خاموش تھے اور در و دیوار پر سکوت طاری تھا۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے سے اضطرابی کیفیت نمایاں تھی جس سے اس بات کا صاف اظہار ہوتا تھا کہ آپ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

کچھ دیر بعد یہ سکوت ختم ہو گیا اور حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بہ آواز بلند فرما رہے تھے۔ ''اے شخص! مجھے اعتراف ہے کہ میں تیرے مسئلے کا حل پیش کرنے سے قاصر ہوں۔'' یہ کہہ کر آپ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھا۔ ''نعمان! اس مسئلے کے بارے میں تم ہی کچھ بیان کرو۔ میرا ذہن تو الجھ کر رہ گیا ہے۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر عرض کیا کہ اس کا جواب یہ ہے۔

''تمہارے پاس اس کی کوئی سند بھی ہے یا اپنے قیاس کی بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہو؟'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے دریافت کیا۔

''جی ہاں! میں اسی حدیث کی روشنی میں یہ حل پیش کر رہا ہوں جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی۔'' یہ کہہ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس حدیث رسول ﷺ کو دہرایا جسے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بارہا بیان کر چکے تھے۔

''خدایا!'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''نعمان! یہ حدیث تو مجھے اس وقت سے یاد ہے جب تم بچے تھے' مگر میں آج تک اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا۔'' پھر اہل مجلس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''آج یہ ثابت ہوا کہ ہم لوگ عطار ہیں اور ابوحنیفہ طبیب۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے اس جملے کا واضح مفہوم یہ تھا کہ ہم لوگ صرف دواؤں کے نام سے واقف ہیں مگر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ان کی تاثیر اور استعمال کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم و آگہی پر امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی گواہی ایک بڑی گواہی ہے۔ ایک ناقابل تنسیخ دعویٰ ہے اور ایک ایسا حرف اعتبار ہے جسے کوئی بھی منصف مزاج جھٹلا نہیں سکتا۔

جب بھی عرفان کی راہوں سے اہل دل کے قافلے گزریں گے۔ انہیں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی یہ پرجلال آواز سنائی دے گی کہ

''ہم لوگ عطار ہیں اور ابوحنیفہ طبیب۔''

اگرچہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی تھے' لیکن دیکھنے والوں نے بارہا ایسے مناظر دیکھے تھے' جن میں امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

''ابوحنیفہ بہت ذہین انسان ہیں۔ ہماری ہی بیان کردہ روایات سے وہ مفہوم اخذ کر لیتے ہیں کہ بعض اوقات ہم

خود اس مفہوم سے بے خبر رہتے ہیں۔ ان کی نظر چند لمحات میں مسائل کی گہرائی تک اتر جاتی ہے اور وہ سائل کو اس طرح جواب دیتے ہیں کہ اس کے ذہن میں شکوک وشبہات کا عکس تک ختم ہو جاتا ہے۔''

حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شان میں یہ ستائشی کلمات سن کر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے کچھ شاگرد شکایتاً کہا کرتے تھے۔

''وہ نوجوان فی الواقع اس عزت واحترام کا مستحق نہیں۔ یہ تو محض امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی کرم نوازی ہے جس کے سبب نعمان بن ثابت اہل علم کا مرکز نظر بن گیا ہے۔'' اعتراض کرنے والوں کی بات کا مفہوم یہ تھا کہ صرف اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے تعریفی کلمات نے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو مجالس علم میں درجہ اعتبار بخشا ہے ورنہ ریشمی کپڑے کا تاجر علم کے اس مقام پر فائز نہیں جس کی طرف حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر نشاندہی کی تھی۔

''ہم لوگ تو صرف عطار ہیں اور ابو حنیفہ طبیب۔''

آج ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ اس دور کے علمائے کرام حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے حسد کرتے تھے' مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ بعض محدثین اور فقہا نے اس سلسلے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ حسد کا جو مفہوم آج کے دور میں رائج ہے' اس کا اطلاق تابعین یا تبع تابعین کے زمانے پر نہیں ہونا چاہئے' کیونکہ حسد تو ایک ایسی بیماری ہے جس کے جراثیم صرف دنیا پرستوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک مفلس شخص ایک سرمایہ دار سے اس لئے حسد کرتا ہے کہ اسے آرام وآسائش میسر نہیں۔ ایک بدصورت انسان اپنے ہم جنس سے اس بات پر حسد کرسکتا ہے کہ اس کے مقابل کے چہرے کے نقش ونگار زیادہ دلکشی اور جاذبیت رکھتے ہیں۔ ادب وشعر میں ایک انسان دوسرے انسان سے حسد کرسکتا ہے۔ سیاست واقتدار کی کشمکش میں اس مرض کا پایا جانا عین فطری امر ہے مگر جہاں تک مذہبی علم کا تعلق ہے تو اس حوالے سے حسد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب ایک طالب علم مذہب کی آگہی حاصل کرنے کے لئے مکتب میں قدم رکھتا ہے تو اسے پہلا درس یہی دیا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی حاصل کر رہا ہے محض خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کے لئے حاصل کر رہا ہے۔ اس طالب علم کو پہلے ہی دن واضح طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ جس علم کی بنیاد نمود ونمائش پر ہو' وہ یکسر بے حقیقت ہے اور خدا کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ طالب علم پر یہ انکشاف بھی کر دیا جاتا ہے کہ کشادگی قلب کے بغیر کلام الٰہی اور قول رسول ﷺ کا عرفان حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہم مسلمانوں کے کسی بھی مکتب فکر کا جائزہ لیں' ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی استاد نے اپنے کسی شاگرد کو تعصب اور تنگ نظری کا درس دیا ہو۔

پھر بھی اگر تاریخ کے اوراق میں ایسے واقعات محفوظ ہوں جن سے انسانی حسد کی عکاسی ہوتی ہو تو یہ بڑی عجیب بات ہے۔ حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تمام عمر اسی کرب سے دوچار رہے۔ آپ نے مذہبی مسائل کو حل کرنے کے لئے روشن دلائل پیش کئے مگر لوگ یہی کہتے رہے کہ کوفے کا تاجر ''قیاس'' سے کام لیتا ہے۔ آپ نے قرآن وحدیث کی راہ میں جستجو کرنے والوں کو نئے انداز سے غور وفکر کی دعوت دی لیکن اس کے جواب میں کہا گیا کہ ریشمی کپڑے کا سوداگر اپنی ''رائے'' کی طرف بلاتا ہے۔ آپ وسعت نظر کی بات کرتے تھے اور لوگ کہتے تھے کہ ہمیں ہمارا حلقہ نگاہ کافی ہے۔ آخر میں جب کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا تو لوگ قومی عصبیت کا الزام عائد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے کہ ''ہم عرب ہیں اور علم ہماری میراث ہے۔ وہ عجمی ہے' اسے علم سے کیا نسبت؟''

یہی وہ اذیتیں ہیں جن سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا سینہ فگار رہا۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ تھا کہ کبھی کسی اہل علم سے بدگمانی نہیں کی اور کسی صاحب نظر کے لئے کبھی کوئی حرف ناپسندیدہ استعمال نہیں کیا۔

علامہ موفق رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مناقب'' میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اذیت و کرب کا اندازہ ہوتا ہے۔

علامہ موفق رحمتہ اللہ علیہ کے بقول ایک دن حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس آراستہ تھی کہ کسی شخص نے یہ عجیب و غریب سوال کیا۔

''امام رحمتہ اللہ علیہ! یہ بات مشہور ہے کہ دوسرے مکاتب فکر کے کچھ لوگ آپ سے حسد رکھتے ہیں' آخر اس بغض و عناد کی کیا وجہ ہے؟'' اس شخص نے ایک بڑا نازک مسئلہ چھیڑ دیا تھا جو لوگ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مزاج سے واقف تھے' انہیں بخوبی علم تھا کہ امام رحمتہ اللہ علیہ ہمیشہ ایسے موضوعات سے گریز کرتے تھے اور کسی حال میں اپنی ذات کو نمایاں کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس موقع پر بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے گریز اختیار کرنا چاہا۔

''اگر وہ حسد کرتے ہیں تو انہیں ان کے کاموں میں مشغول رہنے دو۔ میں اپنا کام کر رہا ہوں اور تمہیں میری نصیحت یہی ہے کہ تم بھی اپنا کام جاری رکھو۔ اپنی سماعتوں کے دروازے بند کر لو کہ ایسے کلمات سننے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنی آنکھیں بھی بند رکھو کہ ایسے مناظر دیکھنے سے بینائی میں خلل پڑتا ہے۔ جس نے مجھ سے حسد کیا' میں اس سے شکوہ نہیں کرتا۔ جس نے میرے لئے اپنے سینے میں بغض و عناد کی فصل بوئی' مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔ خدا ہم سب کو ہدایت دے کہ ہم اپنی ذات کے حصار سے نکل جائیں اور علم کو اس طرح حاصل کریں کے دنیاوی غرض کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی' مگر جب ذکر چھڑا تو آپ کے کچھ عزیز شاگرد بھی اس شخص کے ہم نوا ہو گئے۔

''یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ مخالفین کی جانب انگلی سے بھی اشارہ نہیں کرتے حالانکہ ان لوگوں نے اپنی زبانوں کو آپ کی برائیوں کے لئے وقف کر دیا ہے۔ معاذ اللہ! ہم آپ سے یہ درخواست نہیں کرتے کہ آپ بھی ان کے عیوب زور و شور سے بیان کریں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس حسد کی بنیادی وجہ ظاہر ہو جائے۔ آئندہ لکھی جانے والی تاریخ تو ان دشنام طرازیوں کو بھی رقم کرے گی جو آپ کے نام کے ساتھ منسوب کی گئی ہیں۔ مؤرخ اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ گستاخی و بے ادبی کے کتنے پتھر آپ کی سربلندیوں کی طرف آئے ہیں۔ مؤرخ ان حقیر الفاظ کو بھی کاغذ پر منتقل کرے گا جو ناحق آپ کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔ اس صورت میں اختلافات کو بھی ظاہر ہونا چاہئے جن کی حیثیت بہرحال عالمانہ ہے۔ اگر آپ نے اپنی بے مثال حوصلہ مندی کے سبب ضبط سخن سے کام لیا تو اگلے زمانے کے طالب علم بڑی مایوسی کا شکار ہو جائیں گے۔ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ دوسرے مکاتب فکر کے لوگ ان کے امام سے کیوں خفا رہتے تھے اور اختلاف کا وہ کون سا پہلو تھا جس نے بعض اہل علم کو یہاں تک مشتعل کر دیا تھا کہ ان کی زبانیں بے قابو ہو گئی تھیں اور وہ تنقید کے آداب کو بھی یکسر بھلا بیٹھے تھے؟''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خاموشی سے شاگردوں کی گفتگو سنتے رہے۔ واقعتاً یہ ایک خاص علمی مسئلہ تھا جو کچھ لوگوں کی بے احتیاطی کے سبب ذاتیات کے دائرے تک پہنچ گیا تھا' مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی فطرت بے

نیاز کے سہارے اس جذباتی مرحلے سے بھی باوقار انداز میں گزر جانا چاہتے تھے۔
بالآخر شاگردوں کا اصرار بڑھ گیا اور پھر شدید کرب کے عالم میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو کہنا پڑا۔
"خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔
اور خدا یہ بھی جانتا ہے کہ اہل علم تو کجا میں نے کسی عام انسان کو بھی حقیر الفاظ کے ساتھ یاد نہیں کیا۔
اس کے باوجود لوگوں نے مجھ سے حسد کیا۔ ہر چند کہ میں اس سلوک کا مستحق نہیں تھا مگر پھر بھی میرے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا۔
تم جانتے ہو کہ اہل مکہ نے مجھ سے بغض کیا؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حاضرین مجلس سے مخاطب تھے۔
(واضح رہے کہ علامہ موفق رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی روایت میں بغض کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح اہل علم نے اس طرح کی ہے کہ حسد کا دوسرا نام بغض ہے یا پھر حسد ہی کو دوسرے الفاظ میں بغض کہتے ہیں۔)
"امام! خدا کی قسم ہم اس ذیل میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہمیں بتایئے کہ اہل مکہ کو آپ سے کیا شکایت تھی؟"
"اہل مکہ مجھ سے اس لئے اختلاف رکھتے تھے کہ میں بعض مدنی آیات کے ذریعے مکی آیات کو منسوخ قرار دیتا تھا۔"
یہ فہم قرآن کا مسئلہ ہے جو کسی بھی دور میں یکسانیت اختیار نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم ان تمام لوگوں کے لئے آخری ہدایت نامہ ہے جو قیامت تک اس زمین پر سانس لیں گے۔ ہر آنے والا زمانہ گزشتہ عہد سے مختلف ہوگا۔ اس لئے لوگ اپنے مسائل اور ذہن کے مطابق خدا کی آخری کتاب سے رجوع کریں گے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا' مگر اہل مکہ آپ سے خفا ہو گئے تھے۔ غور کرنے پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس بیان میں ایک یہ نکتہ بھی پوشیدہ نظر آتا ہے کہ شاید اہل مکہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ ان کی زمین پر نازل ہونے والی آیات قرآنی کو ان آیات کے ذریعے منسوخ قرار دیا جائے جو ارض مدینہ پر نازل ہوئی تھیں۔ اگرچہ یہ قیاس آرائی ہے مگر اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ زمین کے رشتے سے بہت زیادہ جذباتی واقع ہوتے ہیں۔ ممکن ہے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی دل آزاری اسی مخصوص گروہ نے کی ہو جو قرآن کریم کو بھی (معاذ اللہ) حدود مکہ کا پابند کر دینا چاہتا تھا۔
"اور اہل مدینہ کو مجھ سے یہ شکایت تھی کہ میں نکسیر پھوٹنے سے وضو کے ساقط ہو جانے کا فتویٰ دیتا تھا اور اس نماز کو صحیح قرار نہیں دیتا تھا جو ایسی حالت میں ادا کی گئی ہو۔
اور اہل بصرہ اس لئے میرے مخالف تھے کہ میں ان کے ایجاد کردہ "مسئلہ قدر" کو رد کرتا تھا۔"

فرقہ معتزلہ (قدریہ) کا تفصیلی بیان

"قدر" کے نظریئے پر ایمان رکھنے والوں کو "قدریہ" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک مشہور فرقہ ہے جس نے آگے چل کر "معتزلہ" کا لقب اختیار کر لیا تھا اور علمائے اسلام پر اس قدر مظالم ڈھائے تھے کہ آج بھی ایک حساس مسلمان ماضی کے ان واقعات کو پڑھ کر لرز جاتا ہے۔ فرقہ "قدریہ" یا "معتزلہ" کب پیدا ہوا، اس کے بارے میں مختلف تاریخی روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ہے کہ سب سے پہلے غیلان دمشقی نے تقدیر کا انکار کیا تھا اور

غیلان دمشقی وہ شخص ہے جو سوسن نامی ایک عیسائی عالم سے متاثر تھا۔ سوسن عقیدتاً عیسائی تھا مگر اس نے مسلمانوں میں انتشار اور ابتری پھیلانے کے لئے' منافقانہ طور پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ مجمع عام میں علی الاعلان اپنے آپ کو ایک انتہا پسند مسلمان کی حیثیت سے پیش کرتا تھا' مگر در پردہ فتنہ خیزی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد سوسن نے مسلمانوں میں ان لوگوں کی تلاش شروع کی جو آسانی کے ساتھ اس کا آلۂ کار بن سکتے تھے۔ اس کام کے لئے اس نے غیلان دمشقی کا انتخاب کیا۔ یہ ایک عالم و فاضل انسان تھا' مگر کسی دشواری کے بغیر سوسن کے بچھائے ہوئے دام میں آ گیا۔ غیلان دمشقی شاید مسلمانوں میں پہلا شخص تھا جس نے ''تقدیر'' کا انکار کیا۔ وہ ان احادیث کو تسلیم نہیں کرتا تھا جن میں واضح طور پر یہ کہا گیا کہ تخلیق کائنات سے پہلے اللہ نے سب کچھ لوح محفوظ میں تحریر کر دیا تھا۔ جب غیلان دمشقی ذہنی خلل کا شکار ہوا تو وہ برسر مجلس کہنے لگا کہ کائنات کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ نے کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جس میں قیامت تک پیش آنے والے واقعات درج ہوں۔ غیلان دمشقی یہ بھی کہا کرتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہو گا' وہ سب کچھ اللہ کے علم اور لوح محفوظ کے مطابق ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ جب غیلان دمشقی کھل کر مسلمانوں میں اس نظریئے کی تبلیغ کرنے لگا تو سوسن اپنی تحریک کی ابتدائی کامیابی سے سرشار ہو کر واپس چلا گیا۔ وہ اپنے ہم مذہبوں میں بیٹھ کر کہا کرتا تھا۔ ''میں نے مسلمانوں کے عقائد کی زمین میں شک کا بیج بو دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بیج سے ایک درخت پھوٹے گا اور پھر وہ دن بھی ضرور آئے گا جب یہ درخت توانائی حاصل کر لے گا پھر اس کی بے شمار شاخیں ہوں گی۔ ہر شاخ میں خوش نما اور لذیذ پھل آئیں گے جنہیں دیکھ کر بہت سے مسلمان درخت کی طرف بڑھیں گے۔ اس کے سائے میں آرام کریں گے اور آخر میں ان پھلوں کو کھانے کی کوشش کریں گے جو اپنی تاثیر میں کسی زہر سے بھی زیادہ خوفناک ہیں۔''

فرقہ قدریہ (معتزلہ) کے بارے میں دوسری روایت یہ ہے کہ اس نظریئے نے خلافت بنو امیہ کے زمانے میں عروج و ترقی کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ لوگ جو فارسی الاصل تھے اور جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا یا پھر وہ لوگ جو نسل در نسل یہودی چلے آتے تھے مگر کسی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے' اپنے بنیادی نظریات کو مکمل طور پر فراموش نہیں کر سکے تھے۔ وہ بظاہر اسلامی عقائد سے متاثر بھی تھے اور ان پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کی روحوں میں باپ دادا کے عقائد کا شور سنائی دیتا تھا اور پھر یہی شور انہیں اس حد تک اکساتا تھا کہ ان کے موجودہ عقائد بھی متزلزل ہو جاتے تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی خلافت تک یہ گروہ اپنے خول سے باہر نہ آ سکا مگر جیسے ہی حضرت امام حسنؓ، حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے تو مسلمانوں کی اس مخصوص جماعت نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کر دیا۔

ابوالحسن طرائفی اپنی کتاب میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ ''ان لوگوں نے اپنے فرقے کا نام معتزلہ رکھا اور سیاسیات زمانہ سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔ پہلے یہ لوگ دربار خلافت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے' مگر اچانک ان کی دلچسپیوں کا محور بدل گیا۔ یہ لوگ یا تو اپنے گھروں میں محصور ہو گئے یا پھر مسجدیں ان کے قیام کا مرکز بن گئیں۔ اس فرقے (معتزلہ یا قدریہ) کے اکابر کہا کرتے تھے ''اب ہمیں دنیا کی کسی شے سے سروکار نہیں۔ ہم صرف عبادت اور علم سے غرض رکھتے ہیں۔''

اس سلسلے میں تیسری مشہور روایت یہ ہے کہ واصل بن عطا اس فرقے کا بانی اول تھا یا پھر ان لوگوں میں نمایاں

حیثیت رکھتا تھا جنہوں نے اس نظریئے کی پرورش کی تھی۔ واصل بن عطا ایک بہت بڑا ادیب تھا اور مناظرے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ آغاز کار میں یہ شخص حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ بلکہ بیشتر مؤرخین نے بطور سند یہ بات کہی ہے کہ واصل بن عطا، حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کا شاگرد تھا۔

پھر ایک دن واصل بن عطا نے حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ کلمہ شہادت پڑھنے کے باوجود گناہ کبیرہ کا مرتکب انسان مومن ہے یا کافر؟

حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔ ''اگر کوئی شخص دل کے ساتھ زبان سے بھی خدا کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی حقانیت کا اعلان کرتا ہے تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونے کے باوجود وہ شخص میرے نزدیک مسلمان ہے۔''

اگرچہ اس سے پہلے واصل بن عطا، حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے تمام نظریات سے اتفاق رکھتا تھا' لیکن جب گناہ کبیرہ کے ارتکاب کا مسئلہ اٹھا تو واصل بن عطا نے اپنے استاد گرامی کے سامنے سرکشی اختیار کی اور نہایت گستاخانہ لہجے میں کہنے لگا۔

''آپ نظریہ ایمان کے سلسلے میں کتنے ہی دلائل پیش کریں' مگر میں کہتا ہوں کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا شخص مسلمان نہیں ہے بلکہ وہ کفر وایمان کی درمیانی منزل میں ہے۔''

کہنے والے کہتے ہیں کہ واصل بن عطا اور حضرت امام بصری رحمتہ اللہ علیہ کے درمیان یہ پہلا اختلاف تھا' ممکن ہے کہ یہ روایت درست ہو مگر واصل بن عطا کی شدت گفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے علم کی بنیاد پر اختلاف نہیں کر رہا تھا۔ اگر اس واقعے کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ پہلو واضح نظر آتا ہے کہ وہ اپنے عقائد کو پوشیدہ رکھ کر حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس میں داخل ہوتا تھا اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی یہ موقع آیا اس کے ذہن اور دل کی تمام کدورتیں ابھر کر سامنے آ گئیں۔

پھر واصل بن عطا' حضرت امام بصری رحمتہ اللہ علیہ سے الگ ہو گیا اور اس نے اپنا علیحدہ حلقہ قائم کر کے اسی مسجد میں درس دینا شروع کر دیا۔

پہلے واصل بن عطا کے نظریات کو لوگوں نے حیرت سے سنا۔ اہل بصرہ کو اس کی باتیں عجیب معلوم ہوئیں' مگر جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ تھا وہ آہستہ آہستہ نئے عقائد سے متاثر ہونے لگے۔ اگرچہ واصل بن عطا کی تقاریر عام لوگوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھیں' لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے چند افراد نے نہایت ذوق وشوق سے اس کی مجلسوں میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔

فرقہ ''قدریہ'' یا ''معتزلہ'' کے بارے میں چوتھی روایت یہ ہے کہ اس کے فروغ میں درپردہ بہت سے افراد نے حصہ لیا۔

معتزلہ نے اپنے عقائد کے اظہار کے لئے پانچ اصول وضع کئے تھے۔ جب تک کوئی شخص ان پانچ اصولوں پر سختی سے کاربند نہیں ہوتا تھا، اسے فرقے میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ معتزلہ کے یہ پانچ اصول ''اصول خمسہ'' کہلاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان اصولوں میں سے کسی ایک اصول کو بھی جھٹلاتا تھا تو یہ لوگ بے دریغ اسے اپنے دائرے سے خارج کر دیا کرتے تھے۔

معتزلہ کے یہ پانچ اصول اس طرح ہیں (1) توحید (2) عدل (3) وعدہ اور وعید (4) کفر و اسلام کی درمیانی منزل کا اقرار (5) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ معتزلہ نے یہ پانچ اصول' اہل سنت کے چھ اصولوں کے جواب میں تراشے تھے۔

اہل سنت کے چھ مشہور اصول ایمان یہ ہیں (1) اللہ پر ایمان (2) رسول کریم ﷺ اور دیگر انبیا پر ایمان (3) خدا کی آخری کتاب قرآن کریم اور دیگر آسمانی کتابوں پر ایمان۔ جن میں توریت' زبور اور انجیل کے علاوہ دوسرے آسمانی صحائف بھی شامل ہیں۔ (4) اللہ کے فرشتوں پر ایمان (اس شرط کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوم یہود' خدا کے سب سے مقرب فرشتے جبریل امینؑ سے نہ صرف شدید نفرت کرتی ہے بلکہ ان کی آسمانی حیثیت کو بھی تسلیم نہیں کرتی (5) آخرت پر ایمان' یعنی ایک روز موجود کائنات تباہ ہو جائے گی اور تمام نسل انسانی اپنے اعمال ناموں کے ساتھ خدا کے روبرو حاضر کی جائے گی (6) ایمان بالقدر یعنی تقدیر الٰہی پر ایمان۔

معتزلہ نے اہل سنت کے ان چھ اصول ایمان کے جواب میں اپنے پانچ اصول ایجاد کیے جو بظاہر بے ضرر سے معلوم ہوتے ہیں' مگر جب ہمارے محدثین و فقہا نے ان کی تشریحات کیں اور معتزلہ کی سوچ پر پڑے ہوئے دلکش نقاب کو ہٹایا تو عام مسلمان کو اندازہ ہوا کہ یہ نیا تراشا ہوا عقیدہ کس قدر خوفناک تھا۔

اب ہم معتزلہ کے ایک ایک اصول کی مکمل تشریح کریں گے تاکہ ہمارے قارئین ان فتنوں سے باخبر ہو سکیں جو تقریباً ہر دور میں زیر زمین پرورش پاتے رہے ہیں اور جب ان کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہیں تو ایسے افکار و نظریات نے ملت اسلامیہ میں کیسا ہولناک انتشار پیدا کیا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری رحمتہ اللہ علیہ نے معتزلہ کے پہلے اصول "توحید" کی اس طرح تشریح کی ہے۔

امام اشعری کہتے ہیں کہ معتزلہ کے نزدیک خدا ایک ہے۔ نہ وہ جسم رکھتا ہے اور نہ شکل وصورت...... اس میں خون بھی نہیں' گوشت بھی نہیں...... نہ اس کا کوئی رنگ ہے اور نہ ذائقہ...... اس کا طول بھی نہیں' عرض بھی نہیں...... نہ وہ متحرک ہے اور نہ ساکن...... نہ اس کا کوئی دایاں ہے نہ بایاں' نہ آگے ہے نہ پیچھا...... اوپر بھی نہیں اور نیچے بھی نہیں ...... کوئی مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور نہ اس پر زمانہ حاوی ہو سکتا ہے...... وہ جدا بھی نہیں ہے اور ملا ہوا بھی نہیں ہے...... نہ وہ کسی میں حلول کر سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی حلول ہو سکتا ہے...... اسے ناپا بھی نہیں جا سکتا اور وہ مختلف سمتوں میں سمایا ہوا بھی نہیں ہے...... نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا...... تقدیریں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں...... پردے اسے چھپا نہیں سکتے...... وہ بشری حواس کے ادراک سے بالاتر ہے...... اسے انسانوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور وہ مخلوق سے کسی طرح بھی مماثلت نہیں رکھتا...... نہ اس پر آفات کا نزول ہو سکتا ہے اور نہ مصائب اسے گھیر سکتے ہیں...... ہر وہ بات جو تصور میں آ سکتی ہے اور ہر وہ تصور جو وہم میں آ سکتا ہے اس کی مشابہت سے خدا کی ذات ماوراء ہے...... وہ اول بھی ہے اور سابق بھی...... وہ مخلوقات سے قبل موجود تھا' وہ عالم ہے' قادر ہے اور زندہ ہے...... نہ اسے کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کوئی عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے...... سماعت اگر سننا چاہے تو اسے سن نہیں سکتی...... وہ دوسری مخلوقات کی طرح عالم' قادر اور زندہ نہیں ہے...... صرف وہی قدیم ہے' اس کے علاوہ کوئی قدیم نہیں ہے...... صرف وہی معبود ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے...... نہ کوئی اس کے اقتدار میں شریک ہے اور نہ کوئی اس کا وزیر ہے...... اس کی مرضی کی تکمیل میں کوئی اس کا مددگار نہیں...... اس نے جو چاہا پیدا کیا' اس نے کوئی چیز مثال دیکھ کر

پیدا نہیں کی ...... کسی چیز کا پیدا کرنا اس کے لئے نہ آسان ہے اور نہ دشوار ...... نہ اسے کوئی نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان ...... وہ سرور ولذت سے بیگانہ ہے ...... وہ اذیت عالم سے نا آشنا ہے ...... نہ اس پر فنا طاری ہو سکتی ہے اور نہ اس میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی یا کمی آ سکتی ہے ...... نہ اس کے یہاں مجبوری ہے اور نہ بے چارگی ...... وہ عورت سے بے نیاز ہے، نہ اس کی بیوی ہے نہ اولاد۔"

معتزلہ کے اس عقیدے کی وضاحت کرنے کے بعد امام ابو الحسن اشعری رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جن حضرات کو "کتاب وسنت" کی بصیرت حاصل ہے، ان سے یہ راز پوشیدہ نہیں کہ معتزلہ کے نظریہ توحید میں "حق و باطل" دونوں کی آمیزش ہے۔ وہ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ "اللہ یہ بھی نہیں ہے اور اللہ وہ بھی نہیں" ...... ان کے نظریات سے اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ آخر اللہ ہے کیا؟ جب تک اللہ کی صفات اور کمالات کا مکمل اظہار نہ ہو، اس وقت تک توحید کا یہ عقیدہ خام ہے ...... اور عقیدے کی یہ خامی اللہ کی بارگاہ جلال میں بے ادبی تصور کی جائے گی۔

اسلام کا صحیح نظریہ توحید تو وہی ہے جس کی وضاحت کے لئے تمام انبیا اور رسول دنیا میں تشریف لائے۔ پھر مسلمانوں میں اس نظریئے کا حقیقی مفہوم جاننے والی پہلی جماعت صحابہ کرام کی تھی۔ رسالت مآب ﷺ کے بعد ان نفوس قدسیہ کا عمل ہمارے لئے آخری دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم مزید تاریخی سفر طے کرنا چاہیں تو پھر تابعین اور تبع تابعین کے افکار ہمارے لئے حجت ہیں۔ جب ان معتبر ہستیوں نے خدا کی "جسمانیت" اور "حدود" کی بحث نہیں چھیڑی تو پھر معتزلہ بھی ایسے نازک موضوعات پر سوچنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس فرقے کے بانیوں اور فروغ دینے والوں نے نہ صرف خدا کی "جسمانیت" اور "حدود" کا ذکر چھیڑا بلکہ اس قدر تفصیلی مناظرے کئے کہ عام مسلمان کا ذہن بھی منتشر ہو گیا۔

آج کم فہم اہل ایمان جب معتزلہ کے نظریہ توحید کا سطحی مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک بڑا سوالیہ نشان ابھر آتا ہے کہ آخر اس میں کیا خرابی تھی، جس کی نفی کرنے کے لئے حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین اسلام کو اپنی جان تک سے گزر جانا پڑا۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ جب دنیا کے شر پسند اسلامی عقائد پر پہلی ضرب لگاتے ہیں تو نہایت پیچیدہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔ چند کتابوں کا علم رکھنے والوں کی تو حیثیت ہی کیا ہے، بعض اہل نظر بھی ان کے فریب سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مثال کے طور پر خدا نے اپنی خلاقی اور واحدنیت کے اظہار کے لئے سورہ "اخلاص" کی یہ آیات نازل کیں۔

"کہو کہ اللہ ایک ہے، وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے، نہ اس کا کوئی باپ ہے اور نہ وہ کسی کا باپ ہے۔"

اس آیت مقدسہ میں "باپ" کے لفظ پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ لوگ خالق ومخلوق کے فرق کو واضح طور پر سمجھ لیں۔ حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امتیں ان جلیل القدر پیغمبروں کو "خدا کا بیٹا" کہہ کر پکار چکی تھیں۔ اس لئے سخت لہجے میں تنبیہ کی گئی کہ اللہ ایسے تمام رشتوں سے ماورا ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو تہمتیں تراشی گئیں، ان سے نسل آدم کو بچانے کے لئے یہ آیت کافی تھی کہ "نہ اس کا کوئی باپ ہے اور نہ وہ کسی کا باپ ہے۔" مگر معتزلہ نے مسلمانوں کے ذہن کو الجھانے کے لئے آیات مقدسہ کی تفسیر عجیب وغریب انداز میں کی۔ ان فتنہ گروں نے کہا کہ "اللہ عورت سے بے نیاز ہے۔ اس کی کوئی بیوی نہیں۔" یہ جملہ بظاہر سادہ اور بے ضرر ہے مگر جب ہم اللہ کے نام کے ساتھ "عورت اور بیوی" کے مادی الفاظ استعمال کرتے ہیں تو دماغوں میں

انتشار پیدا ہوتا ہے اور انسان خوانخواہ ایسی بحث میں الجھ جاتا ہے جس کا کوئی حاصل نہیں۔

معتزلہ یہی تو چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے پرسکون ذہنوں کے گوشے گوشے سے ''عقل'' اور'' مادیت'' کا شور بلند ہونے لگے' پھر وہ عقائد پر دوسری ضرب لگائیں اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پیہم ضربات لگاتے رہیں۔ اللہ کی ''جسمانیت'' کا ذکر اور پھر اس کی سمت متعین کرنے کے لئے طویل مباحث کا آغاز اسی خوفناک منصوبے کا ایک حصہ تھا جو غیر مسلم طاقتیں ہزار ہا پردوں کے پیچھے ترتیب دے رہی تھیں۔

معتزلہ اپنے اسی نظریئے کی بنیاد پر قیامت کے دن'' دیدار خداوندی'' سے انکار کرتے تھے' کیونکہ دیدار کے لئے اللہ کی ''جسمانیت'' اور'' سمت'' ضروری ہے۔ یہاں معتزلہ سے فاش غلطی ہوئی کہ وہ ایک ایسی شے کی جستجو میں راستے سے بھٹک گئے جس کی نہ انہیں ضرورت تھی اور نہ ادراک تھا۔ انسان کسی حد تک اپنی موجودہ زندگی ہی کو سمجھ سکتا ہے۔ اسے پتا نہیں کہ موت کے بعد دوسری زندگی کا آغاز کس طرح ہوگا؟ اس ذیل میں جس قدر احادیث پائی جاتی ہیں انہیں من وعن تسلیم کرلیا جائے۔ روز جزا کی کیفیات کا عملی ادراک اس وقت تک نہیں ہوسکتا' جب تک وہ انسانی جسم پر وارد نہ ہوجائیں۔ خدا نے اپنے پسندیدہ بندوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں سب سے بڑے انعام کے طور پر اپنے دیدار سے شرف یاب کرے گا۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ معتزلہ'' دیدار خداوندی'' سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود بھی بحیثیت انسان اس تجسس کے اسیر تھے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے خدا کو بے نقاب دیکھیں۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی محبوب ترین شے کو دیکھنے کے لئے ہمہ وقت شدید اضطراب میں مبتلا رہتا ہے جس ذات کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انبیائے کرام دنیا کی ہر ممکن آزمائش سے گزرے' جس کو راضی کرنے کیلئے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی۔ جس کی وحدانیت کے اقرار کے صلے میں اپنے جسم کے ٹکڑے کرالئے' بھڑکتی ہوئی آگ کو آغوش لالہ وگل سمجھا' تپتے ہوئے ریگزاروں کو ریشمی بستر قیاس کیا' افلاس اور فاقہ کشی کو شہنشاہیت پر ترجیح دی۔ آخر یہ سب کچھ کس لئے تھا؟ صرف اس لئے کہ خدا اپنے بندوں سے راضی ہو جائے۔ جب تسلیم ورضا کی یہ منزل طے ہوجائے گی تو پھر ایک ہی مرحلہ باقی رہ جائے گا کہ مخلوق اپنے خالق سے یہ التجا کرے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اب اگر رسالت مآب ﷺ اہل وفا کو یہ بشارت دیتے ہیں کہ اللہ انہیں اپنے دیدار سے سرفراز کرے گا تو معتزلہ کو اس بات پر شک کیوں ہے؟ عشق کا منطقی انجام تو یہی ہے کہ دوست سے اس کی جلوہ آرائی کی بھیک مانگے ...... اور دوست کے عطا وکرم کی بھی انتہا یہی ہے کہ وہ اپنے سوختہ جانوں کو حسن ازل کی ایک جھلک سے محروم نہ رکھے۔ سورہ'' یٰسین'' میں تو واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ

'' اس دن وہی ہوگا جو کچھ وہ چاہیں گے ......'' اور اس چاہت میں یقینی طور پر'' دیدار خداوندی'' بھی شامل ہے۔

اب اگر خدا اپنے بندوں سے دیدار کا وعدہ کرتا ہے تو معتزلہ اس اذیت میں کیوں مبتلا ہیں کہ دیدار کے لئے جسم ضروری ہے ...... اور خدا جسم نہیں رکھتا اس لئے دیدار بھی نہیں ہوگا۔ جب معتزلہ خدا کو قادر مطلق تسلیم کرتے ہیں تو

انہیں دیدار کے مسئلے میں بھی خدا کی اسی قدرت کو پیش نظر رکھنا چاہیے تھا۔ وہ جس طرح چاہے گا، ظاہر ہو جائے گا، اسے انسانی عقل کے مطابق کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوگی۔

معتزلہ اپنے اسی نظریئے کی بنیاد پر قرآن کو مخلوق سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک "صفت کلام" خدا کی صفت نہیں ہے۔ جب خدا بول نہیں سکتا تو پھر قرآن بھی اس کا کلام نہیں ہوسکتا۔ یہی وہ عقیدہ تھا جس کا سہارا لے کر اس گروہ نے "خلق قرآن" کا مسئلہ کھڑا کیا اور پھر حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ جیسے مرد جلیل کو وہ اذیتیں پہنچائی گئیں جنہیں پتھر بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

معتزلہ کا دوسرا اصول "عدل" ہے۔ مشہور مؤرخ مسعودی اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"معتزلہ کے خیال میں عدل کا مفہوم یہ ہے کہ خدا فساد کو پسند نہیں کرتا اور نہ بندوں کے افعال پیدا کرتا ہے۔ اللہ جس کام کا حکم دیتا ہے، اسے بجا لاتے ہیں اور جس سے منع کرتا ہے اس سے رک جاتے ہیں، یہ سب کچھ اسی قدرت کے باعث ہے جو اللہ نے بنی نوع آدم میں ودیعت کر رکھی ہے۔ خدا وہی حکم دیتا ہے جس کا ارادہ کرتا ہے...... اور اسی بات سے روکتا ہے جسے برا سمجھتا ہے۔ ہر نیکی جس کا اس نے حکم دیا، اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ہر وہ برائی اچھی نہیں جس سے اس نے روکا ہے۔ وہ بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا...... اور نہ ان سے وہ کام لینا چاہتا ہے جس کی وہ قدرت نہیں رکھتے۔ کوئی شخص بھی رزق کھولنے یا بند کرنے کی طاقت نہیں رکھتا...... بجز اس قدرت کے جو اللہ نے اپنے بندوں کو مرحمت کی ہے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے، جسے جب چاہتا ہے، دے دیتا ہے اور جب چاہتا ہے واپس لے لیتا ہے۔ وہ اگر چاہتا تو مخلوق کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا۔ اگر اس کی مرضی ہوتی تو لوگ کبھی کسی گناہ کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتے تھے۔ بے شک! وہ اس پر قادر تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اگر ایسا کرتا تو پھر بندوں کی آزمائش کس طرح ہوتی۔

دراصل معتزلہ کا یہ اصول عدم مسلمانوں کے ایک اور مشہور فرقے جبریہ کے نظریات کے جواب میں تھا۔ اس فرقے کا نظریہ تھا کہ انسان مجبور محض ہے جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو (معاذ اللہ) اس میں بھی خدا کا حکم اور مرضی شامل ہوتی ہے۔ فرقہ جبریہ، ملت اسلامیہ کے لئے کس قدر خوفناک تھا، اس کا اندازہ آپ کو مشہور صحابی رسول ﷺ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس خط سے ہوتا ہے جو آپ نے سرزمین شام کے "جبریہ" کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔

"تم دوسروں کو پرہیزگاری کا حکم دیتے ہو، حالانکہ صاحب تقویٰ لوگ تمہاری وجہ سے گمراہ ہو گئے، بظاہر تم لوگوں کو برائیوں سے روکتے ہو لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ گناہ گار تمہاری ہی وجہ سے رونما ہوئے...... اے جنگ جو اسلاف کے بیٹو اور اے ظالموں کی پشت پناہی کرنے والو! تمہارے دم سے بدکاروں کی مسجدیں آباد ہیں اور تمہارے شیطان آباؤ اجداد کا نام روشن ہے۔"

لہجے کی تلخی اور الفاظ کی نشتریت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جبریہ عقائد رکھنے والوں سے کس قدر نفرت کرتے تھے۔ آپ نے اپنے مکتوب میں اس فرقے کے لوگوں کو مزید تنبیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"تم سب خدا پر جھوٹ باندھنے والے ہو...... اور اپنے جرم علانیہ طور پر اس کی ذات سے منسوب کر دیتے ہو۔ تلواریں تمہارے گلے کا ہار ہیں اور خدا پر بہتان طرازی تمہاری شہادت ہے۔ کیا تم نے اسی پر اجماع کر لیا ہے اور

اسی کو اپنی توجیہات کا مرکز بنا لیا ہے۔ تمہیں ان لوگوں کی دوستی کا دعویٰ ہے جو نہ خدا کے مال کو چھوڑتے ہیں اور نہ اس کے شعائر کا احترام کرتے ہیں...... نہ بندگان خدا کے حقوق کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ مال یتیم سے پرہیز کرتے ہیں۔ تم نے خبیث ترین مخلوق کو خدا کا سب سے بڑا حق دے رکھا ہے اور اہل حق کی مدد سے جی چراتے ہو...... اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اہل حق ناکارہ ہو گئے اور پھر ان کی تعداد بھی گھٹ گئی۔ تم نے اہل باطل کی مدد کی اور وہ غالب آ گئے۔ اب بھی وقت ہے۔ میں تمہیں راہ راست کا پتا دیتا ہوں۔ خدا کی بارگاہ میں جھک جاؤ اور توبہ کر لو۔ خدا جھکنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس خط میں سختی کے ساتھ نظریہ جبریہ کی تردید کی گئی ہے...... کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ تم اپنے جرم علانیہ طور پر خدا کی جانب منسوب کر دیتے ہو...... اور یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

اس ذیل میں دوسرا تاریخی خط حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کا ہے جو آپ نے بصرہ کے "جبریوں" کے نام تحریر کیا تھا۔

حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے خط کی اہمیت یہ ہے کہ آپ نے فرقے کے لوگوں سے نہایت بے باک لہجے میں گفتگو کی تھی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ جبریہ عقائد رکھنے والوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

"جو شخص خدا اور قضا و قدر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے...... اور جو اپنے گناہوں کا بوجھ خدا پر ڈال دے وہ بھی کافر ہے۔ خدا کی اطاعت کسی مجبوری کے سبب نہیں کی جاتی اور نہ کسی سے مغلوب ہو کر اس کی نافرمانی کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان میں جو قدرت پائی جاتی ہے' وہ خدا ہی کی ودیعت کردہ ہے۔ اگر وہ نیک اعمال انجام دیں تو وہ ان کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا...... اور اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کریں تو خدا ان کے افعال میں دخل اندازی کر سکتا ہے مگر یہ اس وقت ممکن ہے جب اس کی مشیت کا تقاضا ہو۔ جب لوگ کچھ نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ خدا نے انہیں چھوڑ دیا ہے...... اگر خدا مخلوقات کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیتا تو پھر اس کا ثواب بھی ختم کر دیتا (اس صورت میں اجر کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ انسان خدا کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے) اور اگر وہ انسانوں کو جبراً گناہوں پر مجبور کر دیتا تو سزا کو بھی موقوف کر دیتا (جب انسان عالم جبر میں گناہ گارانہ زیست بسر کر رہا ہے تو وہ سزا کا مستحق بھی نہیں رہتا) اور اگر خدا انسانوں کو بیکار چھوڑ دیتا تو یہ اس کی عدم قدرت کی دلیل ہوتی۔ مخلوقات کے بارے میں اس کی ایک خاص حیثیت ہے' جسے خدا نے انسانوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ اگر وہ نیکی کے راستے پر چلیں تو یہ خدا کا احسان عظیم ہے اور اگر وہ گناہ کی روش اختیار کریں تو اس کی حجت ان پر تمام ہو جاتی ہے۔"

حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے اس خط کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحب زادے حضرت علی رحمتہ اللہ علیہ کی ایک روایت بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ علی رحمتہ اللہ علیہ بن عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

"ایک روز میں اپنے والد محترم کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ "ابن عباسؓ! یہاں ایک قوم ہے جس کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز خدا کے یہاں سے آئی ہے اور اسی نے جبراً انسانوں کو گناہ پر لگا رکھا ہے۔"

جواب میں میرے والد محترم نے فرمایا۔ "اگر مجھے پتا چل گیا کہ یہاں ایسا کوئی شخص موجود ہے تو میں یہاں تک اس کا گلا دباؤں گا کہ روح جسم کی قید سے آزاد ہو جائے گی۔"

پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "یہ نہ کہو کہ خدا نے انسانوں کو گناہ کے ارتکاب پر مجبور کیا ہے۔ کیونکہ اس نظریئے کا اظہار صریحاً کفر ہے اور یہ کہنا بھی درست نہیں کہ خدا اپنے بندوں کے اعمال سے بے خبر ہے۔ اس طرح خدا کی ذات پر بے خبری کی تہمت عائد ہوتی ہے' اس کے علام الغیوب ہونے پر حرف آتا ہے...... اور خدا ان تمام عیبوں سے پاک ہے۔"

"جبریہ" عقیدے کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ اس نظریئے کے اولین موجد یہودی تھے جنہوں نے ایک خاص منصوبے کے تحت کچھ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ عقیدہ منتقل کیا اور وہ عاقبت نا اندیش لوگ دنیوی مفادات کی لہر میں اس حد تک بہہ گئے کہ خود بھی ہلاک ہوئے اور بہت سے اہل ایمان کو بھی راندہ درگاہ بنا دیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نظریئے کا بانی جعد بن درہم تھا جس نے شام کے ایک یہودی سے یہ عقیدہ اخذ کیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جعد بن درہم نے ابان بن سمعان سے اس نظریئے کی تعلیم حاصل کی تھی ...... اور ابان بن سمعان کا استاد طالوت بن اعصم یہودی تھا۔ طالوت' لبید بن اعصم کا بھانجا تھا...... اور لبید بن اعصم وہ رسوائے زمانہ یہودی ہے جس نے اپنی بیٹی کے ذریعے رسالت مآب ﷺ پر جادو کرایا تھا۔ طالوت نہ صرف سرور کونین ﷺ کے زمانے میں موجود تھا بلکہ وہ صحابہ کرام کے عہد تک زندہ رہا۔ اس روایت کی روشنی میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فرقہ جبریہ کا آغاز پیغمبر اسلام کی حیات مقدس ہی میں ہو چکا تھا مگر اس فتنے کی پرورش کے لئے فضاء سازگار نہ تھی۔ مجبوراً یہ چند سینوں کے درمیان ہی گھٹ کر رہ گیا تھا۔ پھر جب صحابہ کرام دنیا سے رخصت ہو گئے تو یہودی فتنہ گر اپنے اپنے سوراخوں سے نکل آئے اور جن مومنوں کے ایمان میں ذرا بھی خلل تھا' انہیں بے دریغ ڈسنے لگے۔

جعد بن درہم سے یہ عقیدہ جہم بن صفوان کی طرف منتقل ہوا...... جہم بن صفوان نہایت ذہین وعیار انسان تھا۔ اس نے مناظروں میں بڑے بڑے علمائے اسلام کو بے دست و پا کر دیا تھا...... اور جب وہ ہوش وخرد کے اسی نشے میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے آیا تھا تو اسے شکست فاش ہوئی تھی (قارئین حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ او جہم بن صفوان کے درمیان ہونے والے مناظرے کی تفصیلات گذشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں)

فرقہ جبریہ کے مختصر تعارف کے بعد ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رخ کرتے ہیں۔ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ انسان مجبور محض ہے اس کے جواب میں "قدریہ" نے اعلان کیا کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں مختار و آزاد ہے۔ اپنے اس نظریئے کو درست ثابت کرنے کے لئے "قدریہ" نے اپنا اصول "عدل" ایجاد کیا۔

قدریہ (معتزلہ) کا تیسرا اصول "وعد" اور "وعید" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس انسان نے دنیا میں نیک زندگی بسر کی ہے اسے جزا ملے گی ...... اور جو شخص بدی کے راستے پر گامزن رہا ہے' اسے سزا دی جائے گی ...... اس کے علاوہ گناہ کبیرہ کے مرتکب انسان کی مغفرت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک وہ توبہ نہ کر لے۔

معتزلہ کے اس اصول کے پہلے حصے سے کسی بھی صحیح العقیدہ مسلمان کو اختلاف نہیں۔ ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ بروز حشر ہر شخص کو اس کی نیکیوں کا صلہ "جزا" کی شکل میں اور بدکاریوں کا بدلہ سزا کی صورت میں حاصل ہو گا......

اس اصول کے دوسرے حصے کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص سے گناہ کبیرہ سرزد ہوئے ہیں' وہ اس وقت تک

مغفرت کا مستحق نہ ہوگا جب تک وہ تائب نہ ہو جائے۔ اگر اس عالم میں اسے موت آ گئی تو وہ بخشش کا سزاوار نہیں ہے۔ معتزلہ کے اس اصول کے مطابق ایسے گناہ گار لوگ اللہ کی رحمت کاملہ کے امیدوار نہیں ہو سکتے۔ جبکہ قرآن و حدیث میں واضح طور پر یہ حوالے موجود ہیں کہ مشرک کے سوا خدا جسے چاہے معاف کر دے اور جس پر چاہے عذاب مسلط کر دے کیونکہ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ معتزلہ کے خیال میں اگر خدا ایسا کرتا ہے تو (معاذ اللہ) اس کا شمار ظالموں میں ہوگا۔

معتزلہ (قدریہ) کا چوتھا اصول ہے کفر و اسلام میں درمیانہ درجہ...... اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے واصل بن عطاء کہتا ہے۔ "ایمان نام ہے نیک عادتوں کا...... جب یہ نیک عادات و خصائل کسی شخص میں جمع ہو جاتے ہیں تو وہ مومن کہلاتا ہے...... اور مومن ایک توصیفی نام ہے۔ اس کے برعکس کسی فاسق و فاجر شخص میں نیک عادات کبھی جمع نہیں ہوتیں اس لئے وہ مومن کہلانے کا مستحق نہیں...... مگر ہم اسے علی الاعلان کافر بھی نہیں کہہ سکتے...... کیونکہ وہ کلمہ شہادت کا قائل ہے...... لیکن اس کے باوجود اگر کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو چکا ہو اور اس نے مرتے وقت توبہ بھی نہ کی ہو تو وہ دوزخ میں جائے گا اور ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلتا رہے گا......"

واصل بن عطا کا نظریہ ہے کہ آخرت میں صرف دو ہی فریق ہوں گے۔ ایک فریق جنت میں داخل ہوگا اور دوسرا دوزخ میں...... البتہ اس شخص کے ساتھ یہ رعایت کی جائے گی کہ اس کا عذاب کچھ کم کر دیا جائے گا اور اسے کافروں سے ایک درجہ اوپر رکھا جائے گا......"

اس سلسلے میں علمائے اسلام کا خیال ہے کہ واصل بن عطا نے خارجیوں کے مقابلے میں یہ نیا مذہبی نظریہ ایجاد کیا تھا۔ خارجی انتہا پسند تھے۔ اس لئے ایسے شخص کو بے دریغ کافر قرار دیدیا کرتے تھے۔ واصل بن عطا نے انتہا پسندی سے گریز کیا اور اپنے خیال میں اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو نہ کافر کہا نہ مومن...... مگر نتائج میں اس نے خارجیوں سے مکمل اتفاق کیا۔ خارجی بھی ایسے شخص کو "دائمی جہنمی" کہہ کر پکارتے تھے اور معتزلہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ اس شخص کا مقدر صرف آگ ہے جو اسے ہمیشہ جلاتی رہے گی۔
بعض معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو "ذمیوں اور کافروں" سے الگ کرنے کے لئے مسلم کہہ کر پکارا جا سکتا ہے۔

ابن ابی الحدید معتزلہ میں "شیخ" کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک مقام پر وہ اپنے نظریات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے اور نہ مسلم...... مگر ہم اس کے لئے "مسلم" کے لفظ کا استعمال جائز سمجھتے ہیں تا کہ اسے "ذمیوں" اور "بت پرستوں" سے ممتاز کیا جا سکے۔ پھر بھی اس شخص کے لئے "مسلم" کا لفظ بہت احتیاط سے استعمال کیا جائے گا تا کہ کسی پر یہ ظاہر نہ ہو کہ اس کی عزت کی جا رہی ہے...... معتزلہ کا یہ بڑا عجیب نظریہ تھا کہ ایسے انسانوں کے ساتھ دنیا میں محتاط سلوک کیا جائے مگر اس کے ساتھ ہی ان پر یہ فتویٰ بھی لگا دیا جائے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں شمار کیے جائیں گے۔

معتزلہ کا پانچواں اور آخری اصول "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہے...... اس اصول کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو دین کی دعوت دی جائے اور اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں۔ اگر تقریر کی ضرورت محسوس ہو تو زور و شور سے مناظروں کا اہتمام کیا جائے...... قلم درکار ہو تو پرجوش اور منطقی مضامین

تحریر کیے جائیں...... اگر طاقت اور سختی درکار ہو تو شمشیروں کو بے نیام کر لیا جائے۔ غرض صورت حال کا جو بھی تقاضا ہو اس سے گریز نہ کیا جائے۔

مختصراً یہ کہ قدریہ (معتزلہ) عقائد کے سلسلے میں عقلی دلائل پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ وہ اپنے تمام مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ پھر جس بات کو ان کی عقل تسلیم کرتی' وہ بھی اسے قبول کر لیتے۔ ورنہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر رد کر دیتے۔ انتہا یہ ہے کہ اس ذیل میں ''معتزلہ'' معتبر روایات کو بھی نہیں مانتے تھے۔

یہ لوگ زیادہ تر عراق اور فارس کے رہنے والے تھے۔ جہاں قدیم تہذیب وتمدن کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اگرچہ معتزلہ اسلام کا نغمہ سرمدی سن چکے تھے لیکن پھر بھی آتش پرستوں اور یہودیوں کی آوازوں سے اپنی سماعتوں کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ بالآخر جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مختلف آوازوں کے شور میں وہ آواز بھی گم ہو گئی جو اہل ایمان کو گمراہی کے راستوں پر چلنے سے روکتی تھی۔

معتزلہ کے گروہ میں غیر عربی عنصر بہت زیادہ شامل تھا۔ جس نے بعض اوقات قومی عصبیت سے کام لیتے ہوئے اسلامی حلقوں میں انتشار برپا کرنے کی کوشش کی۔

معتزلہ قدیم فلسفیوں کے افکار ونظریات سے بھی زیادہ متاثر تھے...... اس ذہنی وابستگی نے انہیں صراط مستقیم سے ہٹانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ معتزلہ یہود ونصاریٰ سے بھی گہرے روابط رکھتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے قدیم نظریات کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا۔ انجام کار یہود ونصاریٰ سے معتزلہ کی طویل ملاقاتیں اور قریبی صحبتیں رنگ لائیں اور پھر اسلام کے نام پر ایک نیا مذہب تراش لیا گیا۔

کچھ مسلمان دانشوروں کا خیال ہے کہ معتزلہ نے اسلام کے لئے دفاعی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ ان حضرات کی تحقیق کے مطابق اسلام میں غیر مذاہب کے بے شمار افراد شامل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں مجوسی' یہودی' صابی اور نصاریٰ وغیرہ نمایاں تھے۔ یہ لوگ بظاہر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے' مگر ان کے دل ودماغ سے سابقہ مذاہب کی یادیں محو نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں سے اکثر اپنے اپنے مذاہب کے عالم تھے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود سابقہ تعلیمات ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سر محفل تو کلمہ طیبہ کی گردان کرتے تھے' لیکن اپنی خفیہ مجلسوں میں ماضی کی طرف لوٹ جاتے تھے اور اپنے سابقہ مذہب کی تعریف وتوصیف میں انتہائی سرگرم نظر آتے تھے۔

ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ظاہری طور پر اسلام کے لئے بہت زیادہ گرم گفتار نظر آتے تھے' مگر ان کے دلوں میں کثافتیں اور کدورتیں اپنی پوری توانائی کے ساتھ زندہ تھیں۔ اہل نفاق کا یہ گروہ خلیفہ وقت کے ڈر سے اسلامی زہد وتقویٰ کا لباس پہنتا تھا' مگر خلوت حاصل ہوتے ہی اس قبا کو اتار پھینکتا تھا اور اپنے سابقہ مذہب کی انہی دھجیوں کو جسم پر سجا لیتا تھا جو اسلامی فتوحات اور گردش وقت کے سبب ہواؤں میں بکھر گئی تھیں۔

معتزلہ ان ہی فرقوں کے تعاقب میں تھے۔ وہ عقلی طور پر ایسے افراد سے مناظرے کر کے ان کی فکری قوتوں کو تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ اگرچہ معتزلہ خود بھی گمراہی کے راستے پر چل نکلے تھے' لیکن ان کا دعویٰ یہی تھا کہ وہ اسلام کے دشمنوں سے برسرپیکار ہیں۔

عباسی خلیفہ مہدی کے دور حکومت میں ایک شخص مقنع خراسانی مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اچانک افق سیاست پر

سودار ہوا تھا۔ مقنع کے عقائد بڑے عجیب تھے۔ وہ عمل تناسخ کا قائل تھا۔

(بے شمار ہندو آج بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی جسم سے روح کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع نہیں ہوتا۔ ایک بار جب کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اس کی روح کچھ عرصے کے لئے آسمانوں پر چلی جاتی ہے۔ اگر مرنے والے نے نیک زندگی بسر کی تھی تو اس روح کو کسی شریف بچے کے جسم میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس روح کو کسی خوبصورت پرندے یا اعلیٰ نسل جانور کے بدن میں داخل کر دیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنی پہلی زندگی میں سیاہ کار تھا تو اس کی روح کسی کتے' بلی یا سؤر کے قالب میں بھی داخل ہو سکتی ہے اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ روح پاک صاف نہیں ہو جاتی ...... ہندو پچھلے اور اگلے جنم کے قصے کو ''آواگوان'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ روحوں کی اسی گردش مدام کو عمل تناسخ بھی کہا جاتا ہے) ہندوؤں کا یہ عقیدہ بہت قدیم ہے۔ ممکن ہے مقنع خراسانی نے کسی ہندو جوگی یا رشی سے اس عقیدے کی تعلیم حاصل کی ہو۔ بہرحال وہ روحوں کے عمل تناسخ پر نہ صرف یقین رکھتا تھا بلکہ بہت دن تک در پردہ وہ اس نظریے کی تبلیغ بھی کرتا رہا تھا۔ پھر جب کم فہم مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مقنع خراسانی کے بچھائے ہوئے دام میں اسیر ہو گئی تو اس نے ماوراالنہر کا رخ کیا۔ مقنع کے ماننے والے ''زنادقہ'' کہلاتے تھے۔ مہدی جو طبعاً ایک شریف النفس خلیفہ تھا اور خود کو حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا شاگرد کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا' مقنع کی اس تحریک سے بے خبر نہ رہ سکا۔ بعض روایات گواہ ہیں کہ مہدی نے ''زنادقہ'' کا زور توڑنے کے لئے تلوار کا استعمال بھی کیا' مگر جب وہ مقنع خراسانی کے نظریات کو قتل نہ کر سکا تو اس نے معتزلہ کو ابھارا کہ وہ اپنے منطقی دلائل سے ''زنادقہ'' کو شکست دیں۔ خلیفہ مہدی نے تو یہ کام نیک نیتی سے کیا تھا' مگر اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ جس ہتھیار کو مقنع خراسانی کا گلا کاٹنے کے لئے استعمال کر رہا ہے' وہی ہتھیار پلٹ کر عام مسلمانوں کی گردنوں پر بھی مشق ستم کرے گا۔

دراصل معتزلہ کا ظہور بنوامیہ کے دور میں ہوا تھا۔ خلیفہ یزید بن عبدالملک کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ معتزلی عقائد رکھتا تھا۔ یزید بن عبدالملک کے علاوہ بعض دوسرے اموی خلفاء نے ان نظریات کو قبول تو نہیں کیا تھا' مگر وہ معتزلہ کی تبلیغ پر اعتراض بھی نہیں کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں معتزلہ محض علمی مباحث میں مشغول رہتے تھے اور شر انگیزی ان کا مقصد حیات نہیں تھا۔

پھر جب سیاسی بساط الٹ گئی اور بنو عباس منصب خلافت پر فائز ہو گئے تو معتزلہ نے کچھ خواب دیکھنا شروع کئے۔ خلیفہ منصور اپنے اقتدار کی جنگ میں الجھا ہوا تھا۔ اس لئے معتزلہ کی ریشہ دوانیوں کو سمجھنے سے قاصر رہا اور اگر سمجھتا بھی تھا تو اس کے خیال میں ایک مختصر سے گروہ میں وقت کے دھارے کو موڑنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ ممکن ہے منصور اور دیگر عباسی خلفاء کی نظروں سے معتزلہ کے خوفناک عزائم اوجھل ہو گئے ہوں' مگر حضرت امام مالک بن انسؒ کی مستقبل شناس نگاہوں نے ایک معمولی سے واقعے کے بعد ہی اندازہ کر لیا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں کیسے کیسے فتنے پرورش پا رہے ہیں۔

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن حضرت امام مالک بن انسؒ کی ایک مجلس درس میں ایک شخص نے اٹھ کر یہ عجیب سوال پوچھا تھا۔

''امام! قرآن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

جواب میں حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔ ”میرے خیال سے کیا ہوتا ہے؟ قرآن حکیم کی حقیقت تو وہی ہے جو خدا اور اس کے رسول ﷺ نے بیان کی ہے۔“

”میں اس حقیقت کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ اجنبی شخص کا طرز کلام الجھا ہوا تھا۔ ”میں قرآن حکیم کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔“

”میرے رائے کی حیثیت ہی کیا؟“ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے عجزو انکسار سے فرمایا۔ ”میں تو بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے والا ایک عام سا انسان ہوں۔“

کچھ دیر تک وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے کام لیتا رہا' مگر جب حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ ایک ہی جواب دیتے رہے تو بالآخر اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

”امام! مجھے بتائیں کہ قرآن قدیم ہے یا مخلوق؟“ (یہاں قدیم سے مراد قائم رہنے والا ہے اور مخلوق کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح دوسری اشیاء ایک دن ختم ہو جائیں گی (معاذ اللہ) قرآن بھی فنا ہو جائے گا۔)

بظاہر یہ ایک علمی سوال تھا' مگر حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی فراست نے اس سوال کے پس پردہ تمام فتنہ انگیزیوں کو ایک ہی لمحے میں محسوس کر لیا تھا۔ حاضرین مجلس سمجھ رہے تھے کہ امام اس عقلی مسئلے پر دلائل پیش کریں گے' مگر ان کی توقعات کے خلاف امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر شدید غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس دوران وہ شخص اپنے سوال کا جواب سنے بغیر مجلس سے اٹھ کر جا چکا تھا۔ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ پر شدید جذباتی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اس لئے آپ اس اجنبی کو باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکے تھے۔

پھر جب حضرت امام مالک بن انسؓ کی مزاجی کیفیت اعتدال پر آ گئی تو آپ نے بڑے کربناک لہجے میں فرمایا۔ ”لوگو! اس شخص نے مجھ سے بڑی عجیب بات پوچھی ہے۔ میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ وہ جب بھی تمہارے ہاتھ آ جائے تو اسے بلا جھجک قتل کر دینا۔ میری آنکھ دیکھ رہی ہے' اگر وہ زندہ بچ گیا تو بڑے فتنے برپا ہوں گے۔“

بعد میں لوگوں نے اس شخص کو تلاش کیا' مگر وہ مدینہ منورہ کی حدود سے نکل کر کہیں روپوش ہو چکا تھا۔ کچھ دن تک حاضرین مجلس کے ذہنوں میں یہ واقعہ تازہ رہا اور سماعتوں میں حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ گونجتے رہے لیکن وہ اس راز کو سمجھنے سے عاجز تھے کہ آخر حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھیں آنے والے وقت کے پردے پر کن تصویروں کو متحرک دیکھ رہی تھیں۔

پھر گردش روز و شب نے اس واقعے کے عکس کو اتنا دھندلا کر دیا کہ مدینے کے رہنے والوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے ان سے کیا کہا تھا؟ لیکن جب فتنہ خلق قرآن کے مسئلے میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ پر آفات و مصائب کا کوہ گراں ٹوٹ پڑا تھا' اس وقت اہل مدینہ کو حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ بہت یاد آئے تھے۔

اگرچہ سیاسی طور پر معتزلہ کو عباسی خلفاء مامون الرشید' معتصم اور واثق کے دور میں عروج حاصل ہوا تھا' لیکن علمی حیثیت سے ان کی جڑیں بنوامیہ کے آخری دور میں مضبوط ہونا شروع ہو گئی تھیں اور پھر منصور کے عہد میں یہ کمزور پودا ایک تناور درخت بن جانے کے آخری مرحلے میں تھا۔ اس بات کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ منصور بھی معتزلہ کے بعض اکابرین سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ اس گروہ میں عمرو بن عبید ایک شخص تھا' جسے ذاتی طور پر منصور بہت

وہ پسند کرتا تھا۔ روایت ہے کہ عمرو بن عبید ایک پرہیز گار انسان تھا۔ اس نے اپنے دوست بشار بن برد کے ساتھ مل مقنع خراسانی کے ماننے والے ''زنادقہ'' سے بڑی زبردست مناظراتی جنگ لڑی۔ پھر جب عمرو بن عبید کو معلوم ہوا کہ اس کا ساتھی بشار بھی زنادقہ کے گمراہ کن عقائد کا شکار ہو گیا ہے تو اس نے بشار کو بغداد سے جلاوطن کرا کے ہی لیا۔ غالباً منصور سے ایک قربت خاص کے سبب عمرو بن عبید کے لئے بشار کو معتوب بنا دینا بہت آسان کام تھا۔ بہر حال یہ معتبر روایت ہے کہ جب تک عمرو بن عبید زندہ رہا بشار بغداد واپس نہیں آیا۔

کہنے والے بہت آسانی سے یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ عمرو بن عبید ایک صاحب تقویٰ انسان تھا اور اہل بغداد کے سامنے بے داغ کردار رکھتا تھا۔ یہ بات بھی تسلیم کہ عمرو بن عبید نے مقنع خراسانی کے فتنے زنادقہ سے بڑی صبر آزما لڑائیاں لڑیں' مگر جہاں تک اس کے ذاتی نظریات کا تعلق ہے تو وہ نہ صرف معتزلہ کے اکابرین میں شمار ہوتا تھا بلکہ ان کے پانچوں اصولوں کو بھی دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتا تھا۔ اس صورت میں عمرو بن عبید صحیح العقیدہ مسلمان کس طرح قرار پایا اور جب عقیدہ ہی درست نہ ہو تو پھر لاکھوں سال کی عبادت و پرہیز گاری سے بھی کیا حاصل ہے۔ اردو زبان کے مشہور شاعر استاد ذوق کے بقول ؎

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

پھر بھی بعض تذکرہ نویسوں نے عمرو عبید کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا ولی تھا۔ جاحظ' عمرو بن عبید کے بارے میں لکھتا ہے۔

''محدثین و فقہا کے مقابلے میں عمرو بن عبید کی عبادت گزاری کافی ہے۔''

انتہا یہ ہے کہ جب عمرو بن عبید کا انتقال ہوا تو عباسی خلیفہ منصور نے نہایت پر اثر الفاظ میں اس کا مرثیہ لکھا۔ عمرو بن عبید کو مران کے مقام پر دفن کیا گیا۔ خلیفہ اسی خطہ زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''اے مران کے مقام پر' عمرو بن عبید کی قبر کی زیارت کو جانے والے! تجھ پر اللہ کی مہربانی ہو۔
وہاں ایسے شخص کی قبر ہے جو صاحب ایمان تھا' خدا ترس تھا' خدا کا بندہ تھا اور قرآن کا عاشق۔
جب لوگ دین میں شبہات پیدا کرنے لگتے تو عمرو بن عبید اپنے حجت و بیان سے ان کا فیصلہ کر دیتا۔
اگر یہ دنیا کسی مرد صالح کو باقی رکھ سکتی تو بے شک وہ ہمارے عمرو بن عبید کو باقی رکھتی۔''

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ عباسی خلیفہ منصور' عمرو بن عبید کی شخصیت سے کس قدر متاثر تھا۔ مؤرخ ابن کثیر نے عمرو بن عبید کی موت پر لکھے جانے والے مرثیے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ عمرو بن عبید اپنی پرہیز گاری اور بے نیازی کا رعب و جلال قائم رکھنے کے لئے منصور کے دیئے ہوئے عطیات قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کے اس انداز تغافل کو دیکھ کر منصور سمجھتا تھا کہ عمرو بن عبید ایک قلندر شخص ہے جو محض دین اسلام کی سربلندی کے لئے جاں سوزی سے کام لے رہا ہے۔ حقائق کی روشنی میں ہمارے نزدیک ابن کثیر کا یہ دعویٰ درست نہیں۔ اگر عطیات خلافت کا قبول نہ کرنا ہی زہد و تقویٰ کی دلیل ہے تو آپ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی قلندری کے بارے میں کیا کہیں گے! آپ نے منصور کی نوازشات بے پایاں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ پھر جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہوئے تو خلیفہ منصور نے آپ کی وفات پر مکمل مرثیہ لکھنا تو کجا' اظہار غم کے لئے

ایک شعر، ایک مصرع بھی تحریر نہیں کیا۔

ہمارے اس سوال کے جواب میں کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اختلافات کے سبب خلیفہ منصور، حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے ناراض تھا۔ اسی تنگی دل نے اسے مجبور کیا کہ وہ امام جلیل کے وصال پر خاموش رہے۔ ہمارے خیال میں منصور کی یہ خاموشی مجرمانہ تھی۔ دنیا میں جتنے کشادہ دل گزرے ہیں انہوں نے اپنے دشمنوں کی موت پر بھی آنسو بہائے ہیں اور نہایت اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اپنے حریفوں کی صفات کا بھی اعتراف کیا ہے۔ مگر جب ہم تاریخی حوالوں کے ذریعے منصور کے طرز عمل کو دیکھتے ہیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے اپنے دل میں بغض و کینہ رکھتا تھا۔ اس طرح عمرو بن عبید کے متعلق اس شخص کا دعویٰ کیسے معتبر ہو سکتا ہے جو دوسرے پارسا لوگوں سے حسد رکھتا ہو۔

اس صورت حال کے پیش نظر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یا تو عمرو بن عبید ایک زمانہ شناس آدمی تھا۔ وہ منصور کی خلافت کو جائز سمجھتا تھا اور در پردہ ہی سہی مگر عباسی خاندان کی شان میں رطب اللسان رہتا تھا۔ اس لئے جب عمرو بن عبید دنیا سے رخصت ہوا تو منصور نے چند اشعار کے ذریعے اس کا قرض اتار دیا۔ اگر ہماری یہ قیاس آرائی غلط ہے تو پھر تسلیم کرنا ہوگا کہ منصور بھی معتزلہ کے بچھائے ہوئے نظریاتی جال میں الجھ گیا تھا۔ مکمل طور پر نہیں تو کسی حد تک وہ عمرو بن عبید کے عقائد سے متاثر ہو چلا تھا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ تمام قبور کی عظمت کو فراموش کر کے وہ صرف عمرو بن عبید کی قبر کو برقرار رکھنے کے لئے زمین سے التجا کرے۔

عمرو بن عبید کے علاوہ جہم بن صفوان بھی معتزلہ کا آلۂ کار تھا۔ بظاہر تو جہم بن صفوان اپنے علیحدہ فرقے جہمیہ (جبریہ) کا بانی تھا اور قدریہ (معتزلہ) اس سے نفرت کرتے تھے، لیکن بعض امور میں دونوں کے نظریات یکساں تھے۔ جہم بن صفوان بھی علی الاعلان قرآن کریم کو مخلوق کہتا تھا اور معتزلہ بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ شروع میں جہم بن صفوان بھی معتزلہ کا ''معتبر دوست'' تھا مگر بے پناہ ذہین ہونے کے باعث جب اس نے کچھ اصولوں کے اضافے کے ساتھ اپنا نیا فرقہ تراش لیا اور لوگ تیزی سے اس کی طرف رجوع کرنے لگے تو معتزلہ نے اس بڑھتے ہوئے خطرے کا احساس کیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جہم بن صفوان اور معتزلہ کے درمیان شدید تصادم ہوا۔ پھر یہ کشاکش اس قدر بڑھی کہ جہم بن صفوان نے معتزلہ سے خفا ہو کر اپنا نیا مکتب فکر کھول لیا۔

اب معتزلہ جہم بن صفوان کے تعاقب میں تھے، مگر وہ علم کلام کی قوتوں کے سبب تمام معتزلہ پر اکیلا بھاری تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ''معتزلہ'' کسی ایک مناظرے میں بھی جہم بن صفوان کو شکست نہ دے سکے۔

جہم بن صفوان کے عقلی دلائل کی یہ کیفیت تھی کہ بڑے بڑے محدثین و فقہا حیران رہ جاتے تھے اور کسی سے بھی معتزلہ کے اس بازی گر کی لفاظی کا جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ جب وہ ہوش و خرد کے نام پر فتنے تراشتا تھا تو بے خبر مسلمانوں کے عقائد کی بنیادیں لرزنے لگتی تھیں اور جن کے ایمان راسخ تھے وہ جہم بن صفوان کو کافر و مردود تو قرار دے سکتے تھے، لیکن اسے عقل کی بنیاد پر عاجز کر دینے والا کوئی نہیں تھا۔

یہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی تھے جن کے سامنے جہم بن صفوان کے تمام عقلی بت ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ آپ نے ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک مخبوط الحواس شخص ہے جس کا فہم و ادراک سے کوئی تعلق نہیں، پھر جب جہم بن صفوان مجلس مناظرہ سے شکست کھا کر اٹھا تو اس کے قدم کانپ رہے تھے اور پورا بدن عرق

ندامت سے تر تھا۔ پھر دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہہ رہا تھا۔

"امام! میں آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوں گا۔"

جن لوگوں نے جہم بن صفوان کا یہ آخری مکالمہ سنا تھا، وہ انتظار کرتے رہے کہ جہم لوٹ کر آئے گا' مگر جانے والا گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔

کل جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ منطق کا شہنشاہ ہے' ہوش وخرد پر اس کی حکومت ہے اور دلائل اس کے غلام ہیں۔ اب وہی شخص شہر علم کا ایک اپاہج گداگر تھا جسے بھیک دیتے ہوئے بھی لوگ نفرت و کراہیت محسوس کرتے تھے۔

پھر کسی آنکھ نے نہیں دیکھا کہ جہم بن صفوان کسی مجلس مناظرہ میں داخل ہوا ہو یا کسی منبر پر کھڑے ہو کر اس نے تقریر کی ہو' یا اپنے گھر پر ہم عقیدہ لوگوں کا اجتماع کیا ہو۔ کسی نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جہم' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس مناظرہ سے اٹھ کر کدھر گیا۔ روایت ہے کہ بہت دن تک نیم وحشت کے عالم میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔

ایک روایت ہے کہ جہم بن صفوان چند سال بعد گوشہ گمنامی میں مر گیا۔ اسے آخری مناظرے میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے شکست کھانے کا بڑا قلق تھا۔ پھر یہی خلش بڑھتے بڑھتے ایک مستقل ناسور بن گئی تھی جس کی اذیت سے بے قرار ہو کر جہم ویرانوں میں نکل گیا تھا...... یہاں تک کہ اس مسلسل ذہنی عذاب نے جہم کی جان لے لی اور وہ اس طرح مرا کہ آج کوئی اس کی قبر کا نشان بتانے والا تک موجود نہیں۔

دوسری روایت ہے کہ جہم بن صفوان کو کسی شخص نے قتل کر دیا تھا۔ قاتل کون تھا اور قتل کی کیا وجہ تھی؟ اس راز پر بھی آج تک گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔

بظاہر جہم بن صفوان کی شکست سے معتزلہ بہت خوش تھے کہ اس طرح ان کا ایک طاقتور حریف گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا' مگر اس کے ساتھ ہی معتزلہ کو ایک نئے خطرے کی آہٹ بھی محسوس ہونے لگی تھی اور وہ خطرہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔

معتزلہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جس نوجوان کے سامنے جہم بن صفوان کا سرمایہ دلائل لٹ چکا ہو، وہ کوئی روایتی فقیہ نہیں ہو سکتا' اور پھر معتزلہ کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے۔ جہم بن صفوان کو مناظرات کے افق سے ہٹا دینے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قدریہ (معتزلہ) کی طرف متوجہ ہوئے جو انسان کو اپنے افعال میں مکمل بااختیار سمجھتے تھے اور تقدیر الٰہی کا صاف انکار کرتے تھے۔ عقل ان کے عقائد کی بنیاد تھی وہ ہوش وخرد کو اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم سے بھی مدد لیتے تھے کہ اعتدال کے راستے سے نہ ہٹ جائیں۔ انہیں حدیث کا زیادہ علم نہیں تھا اور وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ عقائد کے سلسلے میں قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی دلیل پیش کریں۔ اگر اہل نظر اندازہ کرنا چاہیں تو معتزلہ کی گمراہی کو سمجھنے کیلئے یہی بات کافی ہے کہ ان کے نزدیک حدیث کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت امام مالک بن انسؒ کسی معتزلی کی شہادت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد رشید حضرت امام محمد نے فرمایا اگر کوئی شخص اپنی لاعلمی کے سبب کسی

معتزلی کے پیچھے نماز پڑھ لے تو اسے دوبارہ نماز ادا کرنا چاہئے۔ حضرت امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کے اس فتوے کا مفہوم یہ تھا کہ معتزلہ کے عقائد رکھنے والے کسی شخص کی امامت میں نماز نہیں پڑھی جا سکتی اور جب کوئی شخص اس قابل نہ ٹھہرے کہ وہ عام مسلمانوں کی امامت کر سکے تو پھر اس کے ایمان کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد جلیلؒ امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا معتزلہ زندیق ہیں۔

جب حضرت امام مالک بن انس اس فرقے کو برداشت نہیں تھے تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی امکانی حد تک ان کے نظریات کو فروغ حاصل کرنے کے موقع فراہم کرتے۔

روایت ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ تقریباً بیس مرتبہ بصرہ تشریف لے گئے اور کبھی کبھی مسلسل ایک سال تک وہاں قیام فرمایا۔ اس دوران میں آپ نے تمام باطل فرقوں کے اکابر سے مناظرے کئے اور ان کی بچھائی ہوئی ایک ایک بساط عقل کو الٹ دیا۔ بغض و حسد کی اور بات ہے کہ لوگ حقائق کو تسلیم نہ کریں، مگر جہاں تک تاریخی شہادت کا سوال ہے تو کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مناظرے کے دوران کبھی کسی سے شکست کھائی ہو۔

معتزلہ کو اپنے علم کلام پر بہت ناز تھا، لیکن حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ان کا یہ طلسم پارہ پارہ کر دیا تھا اگرچہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کو "علم کلام" کے سائے سے بھی بچانا چاہتے تھے مگر خود آپ نے علم کلام سیکھا۔ پھر عقل سے عقل کا اور منطق کا جواب منطق سے دے کر معتزلہ کے قصر ہوش کو ڈھا دیا۔

یہی وجہ تھی کہ چند اہل بصرہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے نفرت کی حد تک حسد کرتے تھے۔



معتزلہ اور دیگر فرقوں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد ہم حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اسی بیان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب آپ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

"اہل بصرہ اس وجہ سے میرے مخالف تھے کہ میں نے ان کے معرکتہ الآرا نظریہ "قدر" کو مسترد کر دیا تھا۔

(یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان مناظروں کے سلسلے میں بعض معتزلہ نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے بڑا اذیت ناک سلوک کیا تھا اور آپ کو نازیبا کلمات کی آمیزش کے ساتھ پکارا تھا، مگر آپ نے کسی موقع پر اپنی زبان کو کسی ناشائستہ لفظ سے آلودہ نہیں ہونے دیا تھا۔)

اپنی زندگی کے اس اہم ترین راز کو منکشف کرنے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اہل مجلس سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔

"اہل شام نے میرے ساتھ بغض و حسد کو اس لئے روا رکھا کہ میں حضرت علیؓ کو حق پر سمجھتا تھا۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی رائے میں حضرت علیؓ بن ابی طالب نے جس قدر بھی جنگیں لڑیں، ان سب میں حضرت علیؓ حق بجانب تھے...... اس سلسلے میں دوسرے لوگ بے شمار تاویلات پیش کرتے تھے مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کبھی کسی توجیہ کو تسلیم نہیں کیا۔ آپ برملا کہا کرتے تھے۔ "حضرت علیؓ جس کے خلاف بھی برسر پیکار ہوئے، حق ہمیشہ آپ کی جانب رہا۔"

کچھ حضرات کہتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول حضرت علیؓ سے بے پناہ عقیدت کا نتیجہ ہے۔ بہر

حال ہم اس نزاعی مسئلے کو موضوع بحث نہیں بناتے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علیؓ کی محبت کے سبب اہل شام کی اکثریت نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ حاسدانہ سلوک کو نہ صرف جائز قرار دیا تھا بلکہ وہ لوگ قدم قدم پر اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے تھے۔

پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''اہل حدیث اس وجہ سے میرے دشمن ہو گئے کہ میں آل رسول ﷺ حضرت زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت جعفر صادق رحمتہ اللہ علیہ کی حمایت کرتا تھا۔''

یہ تو خود حضرت کی بیان کردہ روایت ہے' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ میں کتنے گروہ صرف اپنی ذاتی خواہش و غرض یا عقائد کے باعث آپ سے حسد کرتے تھے حالانکہ ان کے پاس حسد کرنے کی کوئی شرعی یا علمی دلیل نہیں تھی۔ اب ہم کچھ دوسری روایات بیان کریں گے کہ جن کا تعلق دیگر اکابرین علم سے ہے۔ ان تاریخی حقائق کا جائزہ لینے کے بعد اہل نظر کو اندازہ ہوگا کہ ایک ایسے شخص کو کس کس طرح بغض و حسد کا نشانہ بنایا گیا جو دین کی خدمت میں مخلص تھا اور مادی سرمائے کے ساتھ اپنا سرمایہ جان بھی اس راستے میں لٹا رہا تھا۔

اسی زمانے کے ایک مشہور فقیہہ حضرت یحییٰ بن آدم رحمتہ اللہ علیہ سے ایک شخص نے دریافت کیا۔

''قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اقوال پسند نہ تھے؟''

جواب میں حضرت یحییٰ بن آدم رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔ ''ایسی بات نہیں تھی۔ قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی رائے کو پسند تو کرتے تھے لیکن کئی جگہوں پر اختلاف بھی رکھتے تھے۔''

قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ وہ مرد بزرگ تھے کہ جب پہلی بار خلیفہ منصور نے منصب قضا پیش کیا تو آپ نے اپنا دامن بچانے کے لئے کہا۔

''امیر المومنین! میرا دماغ کمزور ہو چکا ہے اور حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ اس صورت میں مجھے لوگوں کے حالات و واقعات کس طرح یاد رہیں گے اور پھر میں کیوں کر صحیح فیصلہ کر سکوں گا۔''

جواب میں منصور نے سخت لہجہ اختیار کیا۔ ''ہم بہترین طبیبوں سے تمہارا علاج کرائیں گے۔ پھر تمہارا دماغ قوی ہو جائے گا۔'' یہ ایک صورت جبر تھی جس کی گرفت سے قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔

آخر آپ نے اس شرط کے ساتھ قاضی بننا منظور کر لیا۔ ''امیر المومنین! مجھے اس کی پروا نہیں ہو گی کہ میری عدالت میں کون آیا ہے؟ میں یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ آنے والے کا تعلق دربار خلافت سے ہے یا کسی تاریک اور اجڑے ہوئے مکان سے۔ میں بغیر کسی تفریق کے اپنا فیصلہ صادر کروں گا، خواہ وہ کسی کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

خلیفہ منصور ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ جب اس نے قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ کی نیم رضامندی دیکھی تو سیاست سے کام لیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ میرے اور میری اولاد کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتے ہیں۔''

قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ عباسی حکمران کی چال نہ سمجھ سکے اور منصور کے ظاہری الفاظ سے متاثر ہو کر منصب قضا قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ کچھ دن عدالت کی فضا پرسکون رہی اور قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ آزادانہ طور پر فیصلے کرتے رہے۔ مگر جلد ہی حالات بدل گئے اور بیشتر معاملات میں دربار خلافت کی جانب سے دخل اندازی ہونے لگی۔ قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مزاج و فطرت کی آزادی برقرار رکھنی چاہی مگر وقت گزر چکا تھا۔ اب اس

کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ مرد بے باک اپنے آپ کو وقت کے دھارے کے رخ پر بہنے کے لئے چھوڑ دے۔ قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ چپ چاپ مطلق العنانی کے سیلاب میں بہتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک روز غرق ہو گئے۔ اقتدار کے دامن سے وابستگی نے اس شخص کو ہلاک کر دیا' جو منصور کے دربار میں آنے سے پہلے پوری توانائیوں کے ساتھ زندہ تھا۔

قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ کے اس زوال کے بارے میں مشہور مؤرخ مسعودی لکھتا ہے۔ ''قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ کی تنخواہ کے لئے حکومت کی طرف سے ایک مہر شدہ کاغذ دیا جاتا تھا جسے لے کر قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ اس افسر کے پاس جایا کرتے تھے جو سرکاری ملازموں کی تنخواہیں تقسیم کیا کرتا تھا۔ ایک بار قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ اپنی تنخواہ لینے کے لئے منتظم کے پاس پہنچے۔ سرکاری افسر نے مہر شدہ کاغذ دیکھا اور قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ کو رقم ادا کر دی۔ قاضی صاحب نے رقم شمار کی تو وہ مقررہ تعداد سے کچھ کم تھی۔

''پوری رقم کی ادائیگی کرو۔'' قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''آخر یہ کمی کس حساب میں ہے؟''

''تمہیں کس چیز کا معاوضہ ادا کیا جائے۔'' منتظم افسر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''کیا تم نے حکومت کے ہاتھ کپڑا فروخت کیا ہے؟'' آج منتظم افسر بڑی عجیب باتیں کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا احساس نہیں رہا تھا کہ وہ عظیم فقیہ اور حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے والے محترم شخص سے غیر سنجیدہ گفتگو کر رہا ہے۔ تنخواہیں تقسیم کرنے والے ایک معمولی افسر کی یہ ناشائستہ حرکت اس درپردہ سازش کی نشاندہی کرتی ہے جو خلیفہ منصور نے علمائے وقت کے لئے تیار کی تھی۔

قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک منتظم افسر کی طرف دیکھتے رہے' پھر بڑے کربناک لہجے میں فرمانے لگے۔

''خدا کی قسم! میں نے نادر و نایاب کپڑے سے بھی زیادہ شے فروخت کی ہے۔ میں نے اپنا دین بیچا ہے۔ آج تجھ سے اسی کی قیمت وصول کر رہا ہوں۔''

ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ جیسے پرہیز گار انسان خلیفہ منصور کے چند سکوں کے عوض اپنا دین و مذہب فروخت کر دیں گے۔ یہ تو دنیا کا بدترین طنز ہے جو قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی بے کسی اور حکومت کی بے حسی پر کیا تھا۔ واضح رہے کہ قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ بخاری اور مسلم جیسی عظیم و جلیل کتابوں کے ثقہ راویوں میں سے ہیں۔ پھر وہ شخص ''دین فروش'' کس طرح ہو سکتا ہے۔ غالباً انہوں نے اپنی جرأت و بے باکی کے ختم ہو جانے اور منصور کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے کو ''دین فروشی'' سے تعبیر کیا تھا اور شاید اسی صورت حال نے قاضی شریک رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اقوال سے حسد کرنے کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔

حضرت قاضی ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ مشہور فقیہ تھے۔ خلیفہ منصور کے دور میں انہیں عہدہ قضا پیش کیا گیا۔ ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی ذہانت سے عباسی حکمران کے دربار میں اس قدر رسائی حاصل کر لی تھی کہ ان کا شمار بااثر افراد میں ہوتا تھا۔ دنیوی اقتدار حاصل کرنے کے باوجود ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ کا پس منظر کیا تھا' اس پر آئندہ بھی تفصیلی بحث ہو گی۔ فی الوقت ہمارا موضوع یہ ہے کہ کون کون لوگ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے حسد

رکھتے تھے۔

ایک بار کسی شخص نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کیا۔ ''امام! آپ کے بارے میں قاضی ابن ابی لیلیٰ کی کیا رائے ہے؟''

جواب میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''تم ابی لیلیٰ کی رائے معلوم کرتے ہو وہ میرے ساتھ اس سلوک کو جائز سمجھتے ہیں جو اپنی بلی کے ساتھ روا نہیں رکھتے۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بات کا مفہوم یہ تھا کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ کی نظر میں ایک بلی کی زیادہ حیثیت ہے۔ وہ کون اہل دل ہے جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس جملے سے آپ کے کرب کا اندازہ نہیں کرسکتا اور وہ کون اہل نظر ہے جس کی نگاہ سے ان الفاظ کی نشتریت پوشیدہ رہ سکتی ہے۔

ایک بار حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور ایک فقہی مسئلہ دریافت کرنے لگے۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اس مسئلے کو سمجھ نہیں سکے تو آپ نے نہایت اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اعتراف کرلیا۔ ''لوگو! میرے پاس تمہارے مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''پھر کس کے پاس ہے؟ ہم لوگ کہاں جائیں؟'' آنے والوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ابوحنیفہ کے حلقہ درس میں۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''وہ شخص تمہارا مسئلہ حل کردے گا جس سے تم حسد رکھتے ہو۔''

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے اس بیان کی روشنی میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ لوگ کس پیمانے پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے حسد رکھتے تھے۔ معتبر تاریخوں میں اسی قسم کے واقعات اتنی کثرت سے درج کئے گئے ہیں کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ان واقعات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوفے میں ایک شخص نعمان بن ثابت صرف اس لئے پیدا ہوا تھا کہ ایک عالم اس سے حسد کرے اور وہ ساری زندگی اپنی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتا رہے۔ یہاں تک کہ اپنے سینے میں اذیت و کرب کا طوفان چھپائے ہوئے ایک دن دنیا سے رخصت ہوجائے۔

اس قدر مستند حوالوں کے بعد اگر ہم یہ کہیں کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد بھی ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے حسد کرتے تھے تو یہ ایک جانبدار عمل ہرگز نہیں ہوگا۔ یہاں جانبداری کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ دوسرے مسلک اور نظریئے کے لوگ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ماننے والوں پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ان حضرات نے جوش عقیدت میں نئے نئے افسانے تراش لئے ہیں۔ ہم نے زیر نظر مضمون میں جہاں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان رقم کیا ہے وہاں دوسرے ائمہ کی تاریخی شہادتیں بھی پیش کی ہیں۔ انصاف اور دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم مندرجہ بالا تمام روایتوں کا جائزہ لیں اور پھر اندازہ کریں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ لوگوں کے کس حسد کا شکار تھے۔

اس کے باوجود خدا نے جن کے دلوں کو چراغ ظرف اور قندیل آگہی سے روشن کیا تھا، وہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ذہن کی رسائی کا اس طرح اعتراف کرتے تھے کہ مسلمانوں کے سوا کسی قوم کی تاریخ میں حوصلہ مندی کی ایسی روشن مثالیں نہیں ملتیں۔



خود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد محترم حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اہل طلب سے برملا کہا کرتے تھے۔

''ابوحنیفہ فقہ کے مشکل ترین مسائل کا حل پیش کر سکتے ہیں۔ وہ علم کی باریکیوں سے خوب واقف ہیں۔''

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اکثر لوگوں سے فرمایا کرتے تھے۔ ''اس مجلس والوں کے پاس چلے جاؤ جہاں ایک مسئلے کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ روز و شب گفتگو ہوتی ہے اور اس وقت تک جستجو جاری رہتی ہے جب تک مسئلے کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے۔ اس کے بعد وہ مجلس والے فتوے دیتے ہیں اور وہ مجلس ابوحنیفہ کی ہے۔''

ایک بار حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں کوفے کے چند بزرگوں کے علاوہ علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے ہمراہ تھے۔ علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ کو بزرگ ہونے کے علاوہ یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ جب حجاج کا یہ قافلہ مقام قادسیہ پر پہنچا تو ساتھیوں نے دیکھا کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اچانک غمزدہ نظر آنے لگے۔

''امام! کیا بات ہے؟ کہیں آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟'' ایک ہم سفر نے امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا۔

''میری طبیعت تو ٹھیک ہے مگر علی بن مسعر کہاں ہیں؟'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح دریافت کیا کہ آپ کے چہرے اور آواز سے شدید اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ہاں! علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ بھی قافلے کے ہمراہ ہیں۔'' دوسرے ساتھی نے جواب دیا۔

''انہیں فوراً تلاش کرو اور میرے پاس لے آؤ۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے اسی بے قرار لہجے میں فرمایا۔

علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ اس وقت قافلے سے کچھ دور چلے گئے تھے۔ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا حکم سنتے ہی ایک ہم سفر دوڑتا ہوا گیا اور انہیں امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بے چینی سے آگاہ کیا۔

علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ فوراً ہی تشریف لے آئے مگر اس حالت میں کہ ان کے چہرے سے بھی فکر کے آثار نمایاں تھے۔

''امام! آپ اتنے آزردہ کیوں ہیں! علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ نے آتے ہی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا۔'' علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ کے آتے ہی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ پرسکون نظر آنے لگے تھے۔'' تم اسی وقت کوفہ واپس چلے جاؤ اور ابوحنیفہ سے احکام حج کی تفصیلات تحریر کرا کے لے آؤ۔''

علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ کوفے کی جانب روانہ ہوئے اور پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا واقعہ بیان کیا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک سوچتے رہے شاید اس

تامل کی وجہ یہ تھی کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ آپ کے استاد تھے اور ایک شاگرد کی حیثیت سے آپ احکام حج کی تفصیلات تحریر کرتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے۔

پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے قلم اٹھایا اور اس فریضہ خاص کے ارکان کی تفصیلات لکھنے لگے اور جب آپ نے وہ کاغذات علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے کیے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا۔

"استاد گرامی سے عرض کر دینا کہ میں نے آپ کے حکم اور اپنے علم کے مطابق احکام حج کی تفصیلات رقم کر دی ہیں۔ خدا ہم سب کو ہدایت دے۔"

جب علی بن مسعر رحمتہ اللہ علیہ واپس پہنچے اور حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی تحریر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو اس طرح مطمئن ہو گئے جیسے مسافر کو بھرپور زادِ راہ میسر آ گیا ہو۔

اہل نظر غور کریں تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم پر حضرت اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت بڑی شہادت ہے۔

امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ

اگرچہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ خود بھی عظیم و جلیل فقیہ و محدث تھے اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد کا بھی درجہ رکھتے تھے لیکن جہاں تک اعتراف کا تعلق ہے تو بے شک امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا شمار دنیا کے ان گنے چنے افراد میں ہوتا ہے جن کا ظرف مثالی تھا اور جو اپنی کشادہ دلی کے سبب آسمانوں کی طرح وسیع و عریض تھے۔

ایک طرف جہاں ہم تاریخ سے ان لوگوں کے نام منتخب کرتے ہیں جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی جلالت علمی کے سبب آپ سے حسد رکھتے تھے، وہاں وہی تاریخ ہمیں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگوں سے بھی روشناس کراتی ہے جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عظمت پر اس زور و شور سے گواہی دیتے تھے کہ اہل طلب کو قرار آ جاتا تھا اور ظرف انسانی کی آبرو باقی رہ جاتی تھی۔

اب ہم اس حادثے کی تفصیلات پیش کریں گے جس نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی گھریلو زندگی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا۔

اب اسے اتفاق ہی کہا جائے کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اپنے علم کے اعتبار سے اس قدر دلکشی رکھتے تھے کہ ساری دنیا آپ کی طرف کھنچی چلی آتی تھی اور جہاں تک آپ کی جسمانی ساخت اور ظاہری شخصیت کا سوال تھا تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ ایک بے رنگ انسان تھے اور آپ کی ذات میں ذرا بھی کشش نہیں تھی۔ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں آپ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں جن کی وجہ سے امام رحمتہ اللہ علیہ "چندھے پن" کا شکار ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ کمزور پنڈلیوں نے بھی آپ کی ظاہری وضع قطع کو مجروح کیا تھا اور پھر جو کسر باقی رہ گئی تھی، اسے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازی نے تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ فطرتاً قلندر تھے۔ اس لئے آپ خلیفہ اور دیگر امرائے وقت کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی طرف سے بھی بالکل غافل ہو گئے تھے۔ لباس اور جسمانی آرائش کی طرف سے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی غفلت کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی الٹی عبا بھی پہن لیا کرتے تھے اور اکثر کپڑے اس قدر بوسیدہ

ہوتے تھے کہ ان کے دھاگے آپ کے پیروں میں لٹکتے رہتے تھے۔ مزید یہ کہ اگر کبھی کوئی عامل آپ کو دربار میں طلب کرتا تو اسی طرح بے نیازانہ چلے جاتے اور احساس تک نہ ہوتا۔ اگر کبھی کوئی دوست یا قریبی عزیز ٹوک دیتا تو مسکراتے ہوئے فرماتے۔

''میں اپنی ظاہری حالت سے بے خبر نہیں ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم لوگ میرے پاس کیوں آتے ہو؟ اگر میں عالم ہونے کے بجائے دکان دار ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص مجھ سے سودا خریدنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہ میرا علم ہی ہے جو تمہیں کھینچ کر میرے پاس لاتا ہے اور تم میری اس حالت کو برداشت کرنے پر مجبور نظر آتے ہو۔''

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے جس قدر غیر دلکش تھے، اس کے برعکس ان کی شریک حیات اتنی ہی حسین وجمیل خاتون تھیں۔ جسمانی ساخت کے پیش نظر' شوہر اور بیوی میں یہ بڑا اختلاف تھا۔ روز مرہ کی زندگی میں بعض مثالیں ایسی بھی نظر آتی ہیں کہ دلکش چہرہ رکھنے والی بیویوں نے اپنے بدصورت شوہروں کے ساتھ بہت مطمئن زندگی بسر کی ہے مگر بیشتر واقعات میں یہی پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے کہ دونوں کی شکل وصورت کا یہ تضاد ناخوشگواریاں پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی بڑی تلخ صورت حال سامنے آجاتی ہے۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی ازدواجی زندگی بھی ایسی ہی تلخیوں کا شکار تھی۔ آپ کی شریک حیات کو زندگی بھر اس حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکا کہ ان کا شوہر عالم اسلام میں کس مرتبہ بلند پر فائز ہے؟ اس کی چشم بے نیاز میں خلیفہ کی کوئی حیثیت ہے اور نہ امرائے وقت کی، وہ جب گھر سے نکلتا ہے تو بڑے بڑے متکبرین کی گردنوں میں خم نظر آنے لگتا ہے اور بے شمار طالبان علم اس طرح دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جیسے وہ مطلق العنان شہنشاہ ہے اور اس کے سامنے کاسہ لیسوں کی ایک فوج ایستادہ ہے۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بیوی اس شرف واعزاز پر جس قدر بھی نازاں ہوتیں' وہ کم تھا مگر انہوں نے زندگی میں ایک بار بھی اپنے شوہر کی اس لازوال خوبی کا اعتراف نہیں کیا بلکہ اعتراف تو کجا، احساس تک نہیں کیا۔

تمام معتبر مؤرخین نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نہایت جری و بے باک انسان تھے۔ کسی حاکم یا امیر کا تو ذکر ہی کیا، آپ خلیفہ وقت کو بھی کبھی خاطر میں نہیں لائے۔ امام رحمتہ اللہ علیہ جب بھی کسی اہل ثروت سے مخاطب ہوتے تو سننے والوں کو محسوس ہوتا جیسے کوئی شمشیر بے نیام ہو گئی اور امام رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے الفاظ نشتروں کی شکل میں برآمد ہو رہے ہوں۔ اس کے برخلاف آپ جب حلقہ یاراں میں تشریف فرما ہوتے تو یوں لگتا کہ روئے زمین پر امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ جیسا کوئی دوسرا شگفتہ مزاج شخص موجود نہ ہو۔ آپ کی شگفتہ مزاجی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ امام رحمتہ اللہ علیہ کی باتوں پر ظریفانہ یا مزاحیہ گفتگو کا گمان ہوتا تھا۔ الغرض اس شگفتہ مزاجی اور شوخ طبیعت کے باوجود حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بیوی' شوہر سے کبھی خوش نہیں رہیں۔ وہ بہت مبارک دن ہوتا تھا جب اس نیک خاتون کے ہونٹوں پر کوئی حرف شکایت نہ ہوتا۔ ورنہ روزانہ کی یہ کیفیت ہوتی کہ حالات انتہائی تلخ صورت اختیار کر لیتے اور فرصت کے اوقات میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو بھی گھر چھوڑنا پڑ جاتا۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ کچھ لوگ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے چند مسائل دریافت کرنے کے لئے آپ کے مکان پر تشریف لائے۔ امام رحمتہ اللہ علیہ اس وقت بہت تھکے ہوئے تھے اور آرام کرنا چاہتے تھے مگر جیسے ہی دروازے پر

دستک ہوئی' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ باہر تشریف لے آئے۔
دروازے پر چند افراد کو کھڑا دیکھ کر آپ نے دریافت فرمایا۔
''تم لوگ کون ہو اور میرے پاس کس مقصد سے آئے ہو؟''
آنے والوں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔''ہم حدیث وفقہ کے طالب علم ہیں اور آپ سے درس لینا چاہتے ہیں۔''
حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔''میں تمہیں ضرور درس دیتا مگر کسی اور وقت۔ فی الحال میرا ارادہ نہیں تھا کہ گھر سے باہر نکلوں اور اپنے آپ کو علمی مسائل میں الجھاؤں۔''
طالب علم خاموش کھڑے ہوئے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی گفتگو سن رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر امام کیا کہنا چاہتے ہیں؟
''اپنے پختہ ارادے کے باوجود میں گھر سے نکلنے اور تمہیں درس دینے پر مجبور ہوں۔''
حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے مختصر سے سکوت کے بعد فرمایا۔''میں گھر سے باہر قدم رکھنا نہیں چاہتا تھا' مگر اس سے مجبور ہوں جو میرے گھر کے اندر موجود ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ حلقہ درس میں تشریف لے گئے۔
(امام کا اشارہ اپنی بیوی کی طرف تھا۔ یقیناً اس وقت ایسے حالات پیدا ہو گئے ہوں گے کہ نہ چاہنے کے باوجود بھی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ گھر سے نکل کر چلے گئے) اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کس قدر ناخوشگوار فضا میں بسر ہو رہی تھی۔
کئی بار ایسے حالات بھی پیدا ہوئے کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے گھریلو مسائل کو سلجھانے کے لئے قریبی دوستوں کو ثالث بنایا تاکہ وہ آپ کی شریک حیات کو سمجھا سکیں مگر ان کوششوں کا بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے دوست آپ کی بیوی کو مختلف انداز میں اس بات کا احساس دلاتے رہے کہ ان کا شوہر ایک عظیم انسان ہے جس کے سامنے اکابرین وقت بھی سر جھکا کر بیٹھتے ہیں' لیکن شریک حیات پر ان باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ امام رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے سر جھکا کر بیٹھنا تو بہت دور کی بات ہے' بیوی اپنی زبان پر بھی قابو نہ رکھ سکیں۔ مختصر یہ کہ ازدواجی تلخیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا اور پھر ایسا خوف ناک لمحہ بھی آ گیا جب اس قریبی اور نازک رشتے کے ٹوٹ جانے کے خطرات پیدا ہو چلے تھے' بلکہ کچھ لوگوں کے نزدیک تو یہ رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا اور خود امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بھی سمجھ رہے تھے کہ اب اس تعلق کو ایک رات سے زیادہ برقرار نہیں رکھا جا سکے گا۔
حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے اس تلخ واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان برسوں سے جو چپقلش جاری تھی اس نے ایک دن خوفناک صورت اختیار کر لی۔ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے بہت کوشش کی کہ یہ غبار آلود فضا صاف ہو جائے مگر شریک حیات کے دل کی کدورت بڑھتی چلی گئی۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا' مگر بیوی کا مزاج برہم رہا۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے بہت پر لطف باتیں کیں' شوخ اور ظریفانہ جملے ادا کئے مگر خاتون خانہ کے غصے میں اضافہ ہوتا رہا۔ بدکلامی کی جو انتہا تھی اسے

چھولیا گیا اور جو گستاخی کا آخری نشان تھا اسے بھی عبور کرلیا گیا (واضح رہے کہ اس دور کے ازدواجی اختلافات کو موجودہ بے ہودگی کے آئینے میں نہ دیکھا جائے۔ اس وقت تو بیوی کا پلٹ کر شوہر کو جواب دینا بھی انتہائی بے ادبی میں شمار ہوتا تھا حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بیوی بھی اس لغزش کا شکار ہوگئی تھیں جو آپس کی نااتفاقی کے باوجود اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔)

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے مسلسل کئی دن تک بیوی کی اس گستاخی کو برداشت کیا' لیکن صورت حال میں اصلاح کی کوئی صورت ظاہر نہیں ہوئی۔ انجام کار ایک دن بیوی نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے گفتگو بند کردی۔ آپ مختلف بہانوں سے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کرتے مگر دوسری جانب مسلسل سکوت طاری تھا۔ پھر جب حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ عشاء کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لائے تو آپ نے تلخیوں کو کم کرنے کے لئے شریک حیات سے بات کی' لیکن وہاں چہرے پر نفرت آلود شکنوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی بیوی کے اس جارحانہ روّیے کو بھی نظر انداز کیا۔ انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ نے دوبارہ بات کی' لیکن بیوی کے ہونٹوں پر ایسی مہر سکوت تھی کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

بالآخر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے اعصاب جواب دے گئے اور آپ نے نہایت تندو تیز لہجے میں بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر آج رات تو نے مجھ سے گفتگو نہ کی تو تجھ پر تین طلاق۔''

فضا میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ گونجے اور بیوی کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس مسکراہٹ کا واضح مفہوم یہ تھا کہ بیوی کے دل میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ورنہ یہ تو وہ سنگین الفاظ ہیں کہ جنہیں ایک پتھر دل عورت بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ طلاق کا نام سنتے ہی صنف نازک چیخ اٹھتی ہے اور پھر اس کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ تعلق برقرار رہے' مگر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی شریک حیات کے لبوں کا تبسم اور چہرے کا سکون اس بات کی غمازی کررہا تھا کہ جیسے انہیں تمام عمر کی اذیت ناک کشمکش سے نجات مل گئی ہو اور ان کی زندگی کا سب سے پرسکون لمحہ طلاق کی شکل میں ابھر آیا ہو۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد بھی بہت دیر تک ناخوشگوار باتیں کیں کہ شاید ان سے متاثر ہوکر بیوی کے ہونٹوں کو جنبش ہو' مگر وہاں تو ساری گفتگو کے جواب میں بس ایک خاموشی ہی تھی یا پھر طمانیت سے لبریز مسکراہٹ۔

جب شریک حیات نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے مصنوعی غضب ناک لہجے کا کوئی جواب نہیں دیا تو آپ اپنے اس عمل پر شرمسار سے نظر آنے لگے۔ پھر یہ ندامت بڑھتے بڑھتے خوف کی شکل اختیار کرگئی۔ اگرچہ آپ خود بھی بیوی کے سنگدلانہ سلوک سے بیزار نظر آتے تھے' لیکن بچوں کے مستقبل کے تصور نے آپ کو پریشان کردیا۔ جب یہ واقعہ رونما ہوا تھا اس وقت امام رحمتہ اللہ علیہ کے بچے چھوٹے تھے اور چھوٹے بچوں کا اس طرح تقسیم ہوجانا ایک ایسا آزار تھا' جسے کسی باپ ہی کا دل محسوس کرسکتا ہے۔

طوفان گزر چکا تھا' مگر اس کے پیچھے بڑی تباہیوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے' ایسی تباہیاں جن کے نقصانات

ناقابل تلافی تھے اور بظاہر ان کا کوئی مداوا نظر نہیں آ رہا تھا۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ جو خود حدیث و فقہ میں درجہ اعتبار رکھتے تھے' اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر یہ رات اسی طرح گزر گئی اور بیوی کی خاموشی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو پھر آنے والی صبح اس آباد گھر میں کیسا انتشار اور کیسی بربادی لائے گی۔ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ جن کی ایک جنبش لب نے صدہا بے قراروں کو متاع سکون بخشی تھی۔ جن کی مجلس سے بے شمار پیاسے سیراب ہو کر اٹھے تھے' جن کی فراست مسائل کی گرہ کشا تھی اور جن کا شعور اندھیری شب کے مسافروں کے لئے چراغ راہ تھا۔ آج وہی امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ زندگی کے ایسے موڑ پر کھڑے تھے جہاں سے نکلنے والے تمام راستے اذیت و کرب کی طرف جاتے تھے۔ قدرت کا یہ کیسا عجیب نظام ہے کہ کبھی کبھی سورج بھی چیخ اٹھتا ہے کہ اسے روشنی چاہئے اور دریا بھی پکارنے لگتے ہیں کہ وہ پیاسا ہے۔ آج حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بھی وہی کیفیت تھی۔ زبان سے جو لفظ ادا ہو گئے تھے انہیں چھوٹے ہوئے تیروں کی مانند واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ امام کہنے کو تو خود مسیحا تھے مگر اس زہر کا تریاق آپ کے پاس نہیں تھا۔

طویل غور و فکر کے بعد بھی جب کوئی حل نظر نہ آیا تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اہل کوفہ اپنے اپنے گھروں میں محو خواب تھے اور انہیں خبر تک نہیں تھی کہ ان کا امام خود اپنی زندگی کے نازک ترین مسئلے سے دوچار تھا۔ اس وقت کوئی دیکھنے والا ہوتا تو دیکھتا کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے قدم کس اضطراب کے عالم میں اٹھ رہے تھے اور روشنی کا سفیر خود کسی روشنی کی تلاش میں تھا۔

بالآخر رات کی تاریکی میں امام رحمتہ اللہ علیہ کا یہ سفر ختم ہوا اور آپ ایک دروازے کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ چند لمحوں تک کچھ سوچنے کے بعد امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے دروازے پر دستک دی۔ تقریباً نصب شب کا وقت تھا' مگر صاحب خانہ حالت بیداری میں تھا۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو دوسری دستک کے بعد مزید زحمت انتظار نہیں کرنی پڑی۔ آنے والا دروازہ کھول کر باہر آ چکا تھا اور اس شخص سے ناوقت آنے کا سبب پوچھ رہا تھا جو شب کے اندھیروں میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔

"بھائی تم کون ہو اور تم پر کیا افتاد پڑی ہے؟" پوچھنے والے کے لہجے سے شدید اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔

"نعمان! یہ میں ہوں' سلیمان بن مہران (اعمش رحمتہ اللہ علیہ)"۔ امام رحمتہ اللہ علیہ نے بے قرار ہو کر فرمایا۔

"استاد گرامی آپ؟" پوچھنے والے کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ "خیریت تو ہے؟" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد محترم کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔

"نعمان! خیریت ہی تو نہیں ہے۔" حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا اور پھر کھڑے کھڑے پورا واقعہ سنا دیا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ اب اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی کہ میں یہ سنگین صورت حال' تمہارے گوش گزار کر دوں۔ تمہاری ذہانت نے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل کئے ہیں۔ آج تمہارے در پر تمہارا استاد بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر آیا ہے۔ نعمان! اس کا کوئی حل تلاش کرو ورنہ میری خانگی زندگی زیر و زبر ہو جائے گی اور بچے ناقابل بیان مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے اس طرز گفتگو پر حضرت ابوحنیفہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور آپ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''استادگرامی! میں کیا اور میرا ذہن کیا؟ یہ تو سب آپ کی بے مثال صحبتوں کا فیض ہے کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ کا دماغ روشن ہوا۔''

''نعمان! تمہارے انکسار سے حقیقت تبدیل نہیں ہو جائے گی۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

''خدا نے تمہیں وہ ذہن رسا بخشا ہے کہ خود مسائل بھی تمہارے سامنے پریشان نظر آتے ہیں' مگر اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ رات تیزی سے گزرتی جا رہی ہے اور میرا مسئلہ دم بدم الجھتا جا رہا ہے۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ چند لمحوں تک خاموش کھڑے رہے۔ پھر ایک مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوئے۔

''استادگرامی! آپ اس سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی آپ کا مسئلہ آپ کی مرضی کے مطابق حل ہو جائے گا۔''

''وہ کس طرح؟'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ یکایک پرجوش نظر آنے لگے تھے۔

''آپ خدا پر بھروسہ رکھیں اور اطمینان سے گھر تشریف لے جائیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس قدر پرسکون لہجے میں فرمایا جیسے یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو گیا ہو۔

''نعمان! کچھ وضاحت تو کرو۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر خوش تو ہو گئے تھے' مگر آپ کا اضطراب بدستور قائم تھا۔

''استادگرامی! آپ قدرت خدا کا مشاہدہ کریں کہ یہ مسئلہ باقی رہنے والا نہیں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ادب کے ساتھ کہا۔

''نعمان! اعمش (رحمتہ اللہ علیہ) کی تو ساری زندگی قدرت خدا ہی کے سہارے بسر ہوئی ہے۔ اس کے سوا میرا کون ہے؟'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا اور دوبارہ نہیں پوچھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس مسئلے کو کس طرح حل کریں گے۔ یہ ایک استاد کا اپنے شاگرد پر اعتماد تھا کہ زندگی کے خوفناک موڑ پر کھڑے ہونے کے باوجود کسی شک کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی سے گھر واپس چلے گئے۔

جیسے ہی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ تشریف لے گئے' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اہل خانہ کو مطلع کیا کہ وہ ایک ضروری کام سے باہر جا رہے ہیں۔

رات کی تاریکی میں خدا کے سوا کوئی دیکھنے والا نہیں تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے گھر سے نکلے اور تیز رفتاری کے ساتھ کوفے کی مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

کچھ دیر بعد آپ نے مؤذن کے مکان پر دستک دی۔ وہ شخص گہری نیند سویا ہوا تھا۔ بار بار دستک دینے کے بعد اس کی نیند ٹوٹی اور وہ باہر آیا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو باہر کھڑا دیکھ کر وہ بھی چند لمحوں کے لئے پریشان ہو گیا۔ ''امام رحمتہ اللہ علیہ آپ؟'' مؤذن کو شدید حیرت تھی۔

''بھائی! معاف کرنا' میں تمہاری پرسکون نیند میں خلل انداز ہوا۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

''امام رحمتہ اللہ علیہ! آپ مجھے شرمسار نہ کریں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا انکسار دیکھ کر مؤذن خود بھی ندامت محسوس کر رہا تھا۔ ''مجھے بتائیے کہ آپ نے اتنی رات کو کیوں زحمت کی؟ اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں تو یہ میری بڑی سعادت ہوگی۔''

''سعادت نہیں' یہ مجھ پر تمہارا احسان ہوگا۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''اس وقت مجھے تمہاری سخت ضرور محسوس ہو رہی ہے۔''

''حکم دیجئے۔'' مؤذن نے فرمانبرداری کے انداز میں کہا۔ وہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مقام سے بھی واقف تھا اور خود بھی آپ کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔

''میرے ساتھ مسجد چلو۔ وہاں پہنچ کر تمہیں بتاؤں گا کہ مجھے تمہاری کیوں ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔''

کچھ دیر میں مؤذن' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پیچھے پیچھے مسجد جا رہا تھا۔

مسجد میں داخل ہونے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مؤذن کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''آج تمہاری ذمے داری یہ ہے کہ صبح صادق سے پہلے فجر کی اذان اس زور وشور کے ساتھ دو کہ پورا کوفہ گونج اٹھے۔''

''کیا صبح صادق سے پہلے فجر کی اذان درست ہوگی؟'' مؤذن نے حیران ہو کے پوچھا۔ ''شرعی اعتبار سے اس عمل کا کیا درجہ ہوگا؟'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس مطالبے پر مؤذن کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔

''میں اس اذان کی شرعی حیثیت جانتا ہوں۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''آج تمہیں دو اذانیں دینی ہوں گی ایک اذان صبح صادق سے پہلے اور ایک مقررہ وقت پر۔''

مؤذن کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اپنے خیالات میں گم رہا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''امام! آخر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ آپ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟''

''بعض امور کی وضاحت ضروری نہیں ہوتی۔'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''کبھی کبھی انسان کو بڑی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں۔ آج ایسی ہی ایک مجبوری دامن کش ہے کہ میں تمہیں کچھ نہ بتاؤں اور تم خاموشی کے ساتھ میرے کہنے پر عمل کر ڈالو۔''

مؤذن چپ چاپ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بات سنتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر امام رحمتہ اللہ علیہ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ شریعت کا بے پناہ علم رکھنے والا صبح صادق سے پہلے فجر کی اذان کیوں دلوانا چاہتا ہے؟ مؤذن یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لئے اس نے سکوت اختیار کر لیا تھا۔

''اگر تم ایسا کرنے سے عاجز ہو تو پھر صبح کی اذان میں خود دوں گا۔'' مؤذن کو مسلسل خاموش پا کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''کچھ بھی ہو آج کوفے کی مسجد میں فجر کی اذان صبح صادق سے پہلے دی جائے گی۔'' یہ کہتے کہتے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بہت زیادہ پرجوش نظر آنے لگے تھے۔

امام رحمتہ اللہ علیہ کو اس سلسلے میں جذباتی دیکھ کر مؤذن اذان دینے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ ''اگر آپ کے نزدیک اس عمل کی وضاحت ضروری نہیں تو میں مزید اصرار نہیں کروں گا۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مؤذن کا شکریہ ادا کیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

بالآخر صبح صادق سے کوئی دو گھنٹے قبل حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مؤذن سے فرمایا۔

''اب تم اذان دو اور اس طرح کہ کوفے کے درو بام تمہاری بلند آواز سے گونج اٹھیں۔''

مؤذن نے وضو کیا اور پھر چند لمحوں بعد اس کی پرسوز صدا فضاؤں میں گونجنے لگی۔

''اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مؤذن کی آواز سن کر نہایت مطمئن نظر آ رہے تھے۔ وہ آج اپنے دل کی طاقت سے اذان دے رہا تھا۔

جب اذان ختم ہو گئی تو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ مسجد سے رخصت ہونے لگے۔ جاتے جاتے آپ نے مؤذن سے فرمایا۔ ''میں اس کرم نوازی پر تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔''

''امام رحمتہ اللہ علیہ! میں تو آپ کے خادموں میں سے ہوں۔'' مؤذن سرتاپا عجز و انکسار کی تصویر نظر آ رہا تھا۔

''تم نے میری خاطر اپنی نیند برباد کی ہے۔ اس لئے مجھ پر تمہارا شکریہ لازم تھا۔''

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مسجد سے باہر قدم رکھتے ہوئے فرمایا۔ ''اب تم دوسری اذان مقررہ وقت پر دینا۔'' یہ کہہ کر آپ رات کی تاریکی میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔

اب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے قدم حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے مکان کی طرف اٹھ رہے تھے۔

دوسری طرف یہ حال تھا کہ جیسے ہی اذان کی آواز گونجی، حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بیوی نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ آج تجھ جیسے بوڑھے بداخلاق سے میرا دامن پاک ہوا۔''

یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بیوی کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی کا عکس موجود تھا۔

اور حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ شدید اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے تھے اور بار بار فرما رہے تھے۔ ''کیا یہ سب کچھ ختم ہو گیا؟ ابوحنیفہ نے کہا تھا کہ وہ اس مسئلے کا حل تلاش کر لے گا میری قسمت میں یہی رقم تھا۔ افسوس! کہ کوئی کچھ نہیں کر سکا۔ بے شک، ہم مقدرات سے جنگ نہیں کر سکتے۔ دست قدرت نے لوح محفوظ میں جو کچھ تحریر کر دیا ہے، وہ زمین پر نازل ہو کر رہے گا۔ خدا ہمیں ہر بار گراں اٹھانے کی استقامت بخشے۔''

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ شدت غم سے سخت مضطرب تھے کہ اسی دوران دروازے پر دستک سنائی دی۔

امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بیوی سے علیحدگی کے صدمے کو فراموش کر کے بے تابانہ گھر سے باہر نکل آئے۔

پھر آپ نے دیکھا۔ دروازے پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کھڑے تھے۔

شاگرد کو اپنے سامنے پا کر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نہایت کربناک لہجے میں فرمانے لگے۔

''نعمان! سب کچھ ختم ہو گیا۔ جس واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے میں خوفزدہ رہتا تھا، وہ سامنے آ چکا۔ اب کوئی صورت باقی نہیں رہی۔''

کیا زوجہ محترمہ ابھی تک خاموش ہیں؟'' حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ادب کے ساتھ دریافت کیا۔

"کیا انہوں نے آپ سے کوئی گفتگو نہیں کی؟"

"اس نے وہی کہا جو میرے کان سننا نہیں چاہتے تھے۔" حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے شکستہ آواز میں فرمایا۔ "اس نے اذان کی آواز سنتے ہی خدا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آج تجھ بوڑھے بداخلاق سے میرا دامن پاک ہوا۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً کہا۔ "خدا کا احسان عظیم ہے کہ اس کے فضل و کرم سے ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ زوجہ محترمہ کا دامن کہاں پاک ہوا؟ یہ دامن تو زندگی کی آخری سانس تک آپ ہی کے دامن سے وابستہ رہے گا۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ چند لمحوں تک خاموشی سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی باتیں سنتے رہے۔ پھر شدید حیرت و استعجاب کے عالم میں فرمانے لگے۔

"نعمان! میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا۔ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

طلاق کی شرط یہ تھی کہ اگر آج کی رات زوجہ محترمہ نے آپ سے گفتگو نہیں کی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔

"ہاں! طلاق کی یہی شرط تھی۔" حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "فجر کی اذان ہوتے ہی رات ختم ہو چکی۔ اب اگر وہ مجھ سے بات بھی کرے تو کیا حاصل ہوتا ہے؟"

"ابھی رات کہاں گزری ہے۔" حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی رات ختم ہونے میں کافی وقت باقی ہے۔ میں نے مسجد کے مؤذن سے دو گھنٹے قبل اذان دلوا دی تھی۔ محض یہ سوچ کر کہ جیسے ہی زوجہ محترمہ اذان کی آواز سنیں گی، وہ جوش جذبات میں آپ سے ہم کلام ہونے کی کوشش کریں گی اور خداوند ذوالجلال کے فضل سے ایسا ہی ہوا۔ ابھی تو صبح صادق میں بہت دیر ہے۔ جب زوجہ محترمہ کی طرف سے گفتگو کا آغاز ہو چکا تو پھر طلاق کی شرط کہاں باقی رہی؟"

جیسے ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کی، حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بے اختیار ہو گئے اور اپنے شاگرد جلیل کو سینے سے لگا لیا۔ پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"نعمان! خدا تیری عمر دراز کرے کہ تیرے دم سے علم کی آبرو قائم ہے۔"

بعض کتابوں میں درج ہے کہ اس موقع پر بھی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا وہی مشہور قول دہرایا تھا جو تاریخ فقہ کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا ہے۔"

"ہم لوگ عطار ہیں اور ابوحنیفہ طبیب۔"

یہ واقعہ اہل نظر کے لئے بڑی نشانی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذہانت و فراست نے کیسے کیسے مسائل کو حل کیا ہے' بالفرض اگر ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نہ ہوتے یا اگر اس عالم پریشانی میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ آپ سے رابطہ قائم نہ کرتے تو ایک جلیل القدر محدث پر کیا قیامت گزر جاتی۔"



یہ ایک تنہا موقع نہیں تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم کا اعتراف کیا گیا تھا۔ تاریخ کے مطالعے کے دوران ہماری نگاہوں کے سامنے ایسے کئی واقعات روشن ہو جاتے ہیں۔ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی جلالت علمی پر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے گواہی دی تھی۔ ایسی گواہی جو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ جیسا قلندر ہی دے سکتا تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم بے کراں پر شہادتیں تو بے شمار ہیں مگر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی گواہی اس لئے اہم ہے کہ ایک تو آپ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی تھے۔ دوسرے یہ کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی گواہی اس شان کی گواہی تھی کہ جس میں خود آپ نے اپنی ذات کو کمتر قرار دے دیا تھا۔ یہ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ نازک مرحلہ ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے اپنی نفی کر دے۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے بارہا ایسا کیا تھا۔ سننے والے آپ کی رائے سن کر حیران رہ جاتے تھے۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے کہ جب حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بستر علالت پر دراز تھے اور علمائے کوفہ کے ساتھ امرائے شہر بھی آپ کی عیادت کو حاضر ہو رہے تھے۔

جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو معلوم ہوا کہ استاد گرامی بیمار ہیں تو آپ بھی امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔

بہت دیر تک شگفتہ لہجے میں باتیں کرتے رہے تاکہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا دل بہلتا رہے۔ پھر جب واپس جانے لگے تو حضور استاد نہایت عاجزی سے عرض کیا۔

"میں اتنی دیر تک آپ کے پاس بیٹھا رہا یقیناً میری یہ طویل نشست آپ پر گراں گزری ہوگی۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "آپ یہاں ہوں یا اپنے مکان پر' میرے لئے تو دونوں صورتوں میں بھاری ہوتے ہیں۔"

یہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عظمت کے اظہار کے لئے ایک بلیغ اشارہ ہے۔ ایک مستند اور بڑی گواہی ہے اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بن ابو عبدالرحمٰن بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی تھے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ فیض میں

ابن زید رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی تھی کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ جو کچھ بھی کہیں' وہ اسے نہ صرف ذہن نشیں کر لیں بلکہ استاد کے اقوال کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

بعض مؤرخین نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی حاضری اور سماعت درس کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ مجلس میں بے شمار شاگرد شریک ہوتے تھے مگر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے انہماک کا یہ عالم ہوتا تھا کہ آپ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر کے ایک ایک حرف کو اس طرح سنتے تھے جیسے اس وقت استاد کے ارشادات گرامی کے سوا دنیا میں کسی دوسری شے کا وجود ہی نہیں۔ یہ استغراق مثالی تھا اور اسی استغراق نے حضرت

ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا تمام علم حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات میں منتقل کر دیا تھا۔

جب ہم حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا اور اس غیر معمولی تاثر کی وجہ وہ صفات مشترکہ تھیں جو ہمیں دونوں بزرگوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

پہلی صفت بے پناہ ذہانت تھی جو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں قدم قدم پر جھلکتی ہے۔ یہی وجہ تھی ایک ذہین ترین استاد کے حضور وہی شاگرد غیر معمولی انہماک کا مظاہرہ کر سکتا ہے جو خود بھی اس عظیم دولت سے بہرہ مند ہو۔

ہم حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم میں شریک ہونے والے دیگر محدثین اور فقہا کی بات نہیں کرتے مگر یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ شاگردوں کے ہجوم میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی ایسے تنہا انسان تھے جو ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہیں استاد گرامی کے چہرے سے ہٹانا نہیں چاہتے تھے۔

دوسری مشترکہ صفت دونوں بزرگان فقہ میں یہ تھی کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرح حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر بھی ''قیاس ورائے'' کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ تو اس الزام تراشی کے سلسلے میں اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ آپ نے قیام عراق کے دوران اہل شہر سے کسی علمی موضوع پر گفتگو کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

کچھ یہی حال حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا تھا۔ جب لوگ آپ کی بلندی فکر کو نہ پہنچ سکے تو بے دریغ کہہ دیا گیا کہ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ قیاس ورائے سے کام لیتے ہیں۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرح معترضین سے بات کرنا نہیں چھوڑی لیکن مسلسل اس جستجو میں رہے کہ کسی نہ کسی عنوان لوگ آپ کے مطمح نظر کو سمجھ لیں اور پھر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی قیاس ورائے کی تہمت سے پاک ہو جائے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ آخر وہ کیا عوامل تھے جن سے متاثر ہو کر لوگ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر قیاس ورائے کا الزام عائد کرتے تھے۔ پہلے ہمیں اس صورت حال کو سمجھ لینا چاہئے کہ زمانہ قدیم سے عہد جدید تک علم دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے۔

علم کا پہلا انداز یہ ہے کہ شاگردوں نے جس طرح استادوں کی زبان سے سنا، اسے اپنے ذہنوں میں منتقل کر لیا۔ پھر جب وہ خود منصب استادی تک پہنچے تو جو کچھ بزرگوں سے سیکھا تھا، اسے نئی نسلوں میں من وعن منتقل کر دیا۔ اس قسم کے لوگ علم کے ''حافظ'' کہلاتے ہیں۔ یہ تمام حضرات اپنے طاقتور حافظے کے سبب ایک ایک قول، ایک ایک روایت اور ایک ایک واقعے کو ذہن نشین کر لیتے ہیں اور پھر جہاں جیسا موقع ملتا ہے' اس حفظ شدہ سرمائے کو طالب علموں کے درمیان تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

علم کا دوسرا انداز یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اپنے قوی حافظے کے باعث ماضی وحال کی تمام روایتوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ پھر خلوت عشق میں' عالم نیم شبی میں اور ساعت سحر گاہی میں ان ساری روایات پر غور وفکر کرتا ہے۔ قرآنی آیات کا مفہوم جو ایک عرصہ دراز سے رائج ہوتا ہے' اسے اپنے حالات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صرف حدیث رسول ﷺ کو حفظ ہی نہیں کرتا، ہمہ وقت اس کے مطالب ومعانی پر بھی غور کرتا ہے۔ اس جاں

سوزی کے بعد جب وہ شخص مروّجہ معانی سے ہٹ کر قرآن و حدیث کی آیات کا نیا مفہوم پیش کرتا ہے تو لوگ بے اختیار اس کے افکار پر قیاس ورائے کی تہمت عائد کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جس انسان پر قیاس کا الزام عائد کیا جا رہا ہے' وہ نہ صرف خود حافظ قرآن و سنت ہے بلکہ صحیح العقیدہ مسلمان بھی ہے۔ پھر وہ احکام قرآنی یا قول رسول ﷺ پر کس طرح اپنی ذاتی رائے کو ترجیح دے سکتا ہے؟

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بالاتفاق حافظ سنت تھے مگر جب آپ کسی حدیث رسول ﷺ کے معنی پر نئے انداز سے غور و فکر کرتے تو قیاس ورائے کے الزام سے نوازے جاتے تھے اور اس تہمت زنی کی بنیادی وجہ وہی تھی کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا علم روایتی علم نہیں تھا۔ خدا نے آپ کی عقل میں ایک گوشہ اجتہادٗ ایک نیا زاویۂ فکر بھی پوشیدہ رکھا تھا۔ جب بھی وہ گوشہ اجتہاد یا زاویہ فکر لوگوں کے سامنے روشن ہوتا تھا تو روایتی علم رکھنے والے حضرات جذباتی انداز میں بھڑک اٹھتے تھے۔

یہی کیفیت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی تھی کہ فکر و نظر کی بلندی نے آپ کو بھی "قیاس" کی تہمت سے نوازا تھا۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ دونوں فکری اور اجتہادی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جب بارگاہ استاد میں حاضر ہوتے' دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے فرمودات میں کھو جاتے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ میں تیسری صفت مشترک وہ قلندری تھی جس نے دونوں بزرگوں کو دربار خلافت سے بہت دور کر دیا تھا۔ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ برسر مجلس اپنے استاد گرامی کی شان بے نیازی دیکھتے تو پھر یہ کسی طرح ممکن تھا کہ آپ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ فطری طور پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امرائے وقت اور صاحبان اقتدار سے الگ تھلگ رہنے والے انسان تھے۔ پھر جب آپ نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی شکل میں ایک جیتا جاگتا قلندر دیکھا تو آپ کی فطری صلاحیتیں پوری توانائی کے ساتھ ابھر آئیں۔ عباسی حکمراں ابوالعباس سفاح کے عطیات کو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے جس بے دردی کے ساتھ ٹھکرایا تھا، اسے انسانی ذہن اتنی آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے دیگر طالبان حدیث و فقہ نے اس منظر کی شدت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس نہ کیا ہو لیکن حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دلوں پر یہ چوٹ یکساں پڑی تھی۔

اہل نظر نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ بن انسؓ کو چہرہ سیاہ کرنے کے بعد اطراف مدینہ میں گھمایا گیا مگر خلیفہ منصور انتہائی تشدد کے استعمال کے باوجود اپنی بات نہیں منوا سکا۔

پھر اہل نظر نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ حضرت امام سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی زندگی دربدری اور روپوشی میں بسر کی۔ وہ اذیتیں برداشت کیں کہ جنہیں سن کر پتھر بھی نم ہو جاتے ہیں' مگر کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے خلیفہ منصور کے حکم کے آگے اپنا سر جھکا دیا ہو۔ آخر یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ ہی کا مزاج قلندری تھا جس نے حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کی تربیت کی تھی اور انہیں بھی قلندر عظیم بنا دیا تھا۔

پھر اہل نظر نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بھی میدان آزمائش میں سرگرم سفر دیکھا۔ وہ کون سی قیمتی نذر تھی

جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو پیش نہیں کی گئی اور وہ کون سا عہدہ و منصب تھا جو خلیفہ منصور کی طرف سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے قدموں میں نہیں ڈالا گیا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ آپ کے قدم کسی ایک مقام پر بھی نہیں لڑکھڑائے۔ وہ محلات شاہی میں آراستہ پھولوں کے راستے ہوں' قتل کی خونیں زمین ہو یا زنداں کا ڈراؤنا سناٹا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ان تینوں راستوں پر یکساں انداز میں محو خرام رہے اور یہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا عطیہ خاص تھا کہ خود بھی اہل ثروت و اقتدار سے بے نیاز رہے اور شاگردوں کو بھی یہی درس دیا کہ

"اقتدار دنیا ہیچ ہے۔ اسے حاصل کرنے والے ہلاک ہو جاتے ہیں اور باقی رہ جانے والا وہی علم ہے جو صرف خدا کی رضا کے لئے حاصل کیا گیا ہو۔"

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کا فیضان نظر

جن مردان جلیل نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کو تعمیر کیا، ان میں حضرت ایوب بن ابی تیمیہ سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی شامل ہے۔

مذہب اسلام نے ایک عالم کی شخصیت کا جو معیار قائم کیا ہے۔ وہ صرف تاریخ انسانیت میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس تک پہنچنا ایک کار دشوار بھی ہے۔ اگر ہم اس معیار کا مختصر جائزہ لیں تو علمائے اسلام کے کردار کے تین نقوش روشن ہو جاتے ہیں' اگر ان میں سے کوئی نقش بھی دھندلا رہ جاتا ہے تو عالم کی شخصیت کا دائرہ مکمل نہیں ہوتا۔

یہ تین نقوش اس طرح ہیں کہ انسان صرف خدا کے لئے علم حاصل کرے۔ اس نقش کی تشریح یہ ہے کہ جو علم محض رضائے خداوندی کے لئے حاصل کیا جائے گا، اس میں اول و آخر صداقت باقی رہ جائے گی اور تمام دنیاوی آلائشیں یکسر ختم ہو جائیں گی۔

دوسرے نقش کی تفصیل اس طرح ہے کہ فلاح علم کے ساتھ زہد و تقویٰ کی موجودگی ضروری ہے۔ اگر کسی عالم کی شخصیت کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو بالآخر اس کے علم کی حدیں دنیا پرستی کی منزل سے مل جاتی ہیں اور پھر یہ دنیا پرستی خود اس عالم کی ذاتی حیثیت کو بھی تباہ کر دیتی ہے اور اس حلقہ انسانیت کو بھی ہلاکت میں ڈال دیتی ہے جہاں جہاں بے کردار علم کی آواز پہنچتی ہے۔ اس دعوے کی سب سے روشن دلیل موجودہ سائنسی علم ہے جو نہ خدا کی خوشنودی کے لئے حاصل کیا گیا ہے اور نہ خالصتاً انسانی فلاح و بہبود کے لئے سیکھا گیا ہے۔ موجودہ علم کی بنیاد صرف انسان کی اپنی ذات ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص قوم۔ نتیجتاً جدید علم کی افادیت کم ہے اور تباہ کاری بہت زیادہ۔

ایک عالم کے لئے خدا کی رضا اور زہد و تقویٰ کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دنیوی جاہ و حشم سے بے نیاز ہو جائے اور مادی اقتدار کی نفی کر دے۔

یہ تینوں خوبیاں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کے کردار میں اس طرح نمایاں تھیں' جیسے سورج طلوع ہونے کے بعد تیز اور چمکیلی دھوپ۔ ایسی دھوپ کہ جس کی موجودگی پر ایک اندھا شخص بھی گواہی دے۔

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کے کردار کی انہی ضیاء باریوں سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کسب نور کیا تھا اور یہی وہ تربیت خاص تھی جس نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عظیم و جلیل شخصیت کی تعمیر کی تھی۔

تمام عقیدت مند اور سارے مخالفین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا اٹھنے والا ہر مضطرب قدم اس علم کے راستے میں تھا جو صرف خدا کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے گہرا تعصب رکھنے والے افراد بھی بہ زور و شور گواہی دیتے ہیں کہ نعمان رحمتہ اللہ علیہ بن ثابت زہد و تقویٰ کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھے۔

اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ پہلو بھی اس زندہ حقیقت کی مانند ہے' جسے صدیوں کے حسد کا غبار دھندلا نہ سکا اور دشمنی کا بدترین سیلاب بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ دے سکا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کا یہ رخ امرائے وقت سے مسلسل بے نیازی ہے۔

اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ جب حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ با آواز بلند یہ بات کہتے ہیں کہ

"مجھے اس دنیا میں میرا بیٹا بکر سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اس کے باوجود مجھے اپنے ہاتھوں سے اسے دفن کرنا پسند ہے' لیکن یہ گوارہ نہیں کہ ہشام بن عبدالملک یا کوئی دوسرا خلیفہ میرے مکان پر آئے۔"

جو شخص خلیفہ وقت کی ملاقات پر اپنے بیٹے کی موت کو ترجیح دے' اس کی بے نیازی اور غیرت نفس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟

پھر جس کا اتالیق اقتدار کی نفی اس طرح کرتا ہو، اس کے شاگرد کی بے نیازی کا کیا عالم ہوگا؟

ہم تاریخ سے ایک سوال منتخب کرتے ہیں اور پھر تاریخ ہی سے اس کا جواب پیش کرتے ہیں۔

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کا محترم وجود تاریخی حیثیت رکھتا ہے ان کے کردار اور ان کی تعلیمات کو بھی گردش روز و شب نے اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے۔ پھر ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس مرد جلیلؒ کی تابناک شخصیت کا عکس کس شاگرد کی ذات پر نمایاں ہوا۔

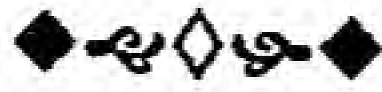
بے شک! وہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہی تھے کہ جب حدیث و فقہ کے اس مکتب عظیم سے فیضیاب ہو کر اٹھے تو آپ کے دل و دماغ علم کے رموز و نکات سے روشن تھے اور کردار میں وہ قلندرانہ انداز پیدا ہو گیا تھا' جو اپنی ذات کو بچانے کے لئے دنیا کے ہر اقتدار اور زمانے کی ہر طاقت کو جھٹلا دیتا ہے۔

اور یہ حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کا فیضان نظر تھا جس نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دل و دماغ کو روشن کرنے کے ساتھ آپ کے کردار و عمل کو بھی آراستہ کیا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کا نام نامی بھی نمایاں ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ 110ھ سے لے کر 113ھ کے درمیان حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے بے پناہ علم سے اکتساب فیض کیا۔ حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت کے جو اثرات براہ راست حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر مرتب ہوئے وہ طلب علم میں مستقل سرگرداں رہنا تھا۔

جس طرح حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے' جب تک کہ کسی شہر کا سارا علم آپ کے ذہن میں منتقل نہ ہو جائے' بالکل اسی طرح حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی مضطرب رہتے تھے۔ یہاں کہ ایک ایک کوچہ' ایک ایک قریہ' ایک ایک گوشہ زمین آپ کے قدموں کے نیچے ہوتا تھا مگر پھر بھی آپ کے علم کی پیاس نہیں بجھتی تھی۔



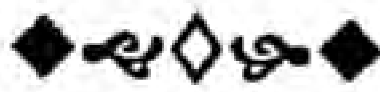
حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا نام بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

بعض روایات میں درج ہے کہ وہ حضرت عون بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ تھے جن سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اکتساب فیض کیا۔



حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں ایک نام حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں بعض روایتوں سے اتنا تو پتا چلتا ہے کہ آپ بھی حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم میں شریک ہوتے تھے مگر اس مدت خاص کا اندازہ نہیں ہوتا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ سے کتنے عرصے تک اکتساب علم کیا۔ پھر بھی یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں کثرت عبادت و تلاوت کا جو شوق نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اسے جلا بخشنے میں حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کی شب بیداری اور تلاوت قرآن کا بھی ہاتھ ہے۔ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ عبادت و ریاضت' کثرت تلاوت اور شب بیداری میں ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی آنکھوں سے حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ کی گریہ وزاری دیکھی ہے' شب کے سناٹے میں ہچکیوں کے ساتھ اپنی مغفرت کے لئے دعائیں مانگتے دیکھا ہے۔ نتیجتاً حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں بھی یہ اوصاف نمایاں ہو گئے تھے۔ آپ جب آئندہ حضرت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عبادت و ریاضت کا ذکر پڑھیں گے تو کچھ مقامات پر پہنچ کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ یہ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کی صفات ہی کا عکس ہے جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ذات میں روشن ہو گیا ہے۔



حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں ایک تابناک شخصیت حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔

جب حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہوا اس وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر چھبیس سال یا زیادہ سے زیادہ اٹھائیس سال تھی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے تحصیل علم کے آغاز کے متعلق پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ نے بیس یا اکیس سال کی عمر میں حضرت حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ کا رخ کیا تھا۔ اس طرح یہ آپ کے شوق علم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے علم سے فیضیاب ہونے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ہر سال حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جاتے تھے تو آپ دربار رسول ﷺ میں بھی حاضری دیتے تھے اور یہ شہر مقدس حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا مستقل مسکن تھا۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم میں حاضر ہوتے تھے۔ چونکہ یہ قیام مختصر ہوتا تھا اس لئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ طویل عرصے

تک حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ سے وابستہ نہیں رہ سکتے تھا اور سیکھنے والا دنیا کا ذہین ترین طالب علم تھا۔ خلوص اور جاں سوزی کی اس منزل میں وقت کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تڑپ نہ ہو تو صدیاں بھی بے سود۔ اور خلش ہو تو لمحات بھی بار آور۔ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے درمیان بھی یہی ایک رشتہ تھا جس نے ساعتوں میں برسوں کا سفر طے کرا دیا تھا۔

تحقیق کی روشنی میں کہنے والے کہتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ جلال میں چار پانچ مرتبہ ہی حاضری دے سکے ہوں گے مگر اہل نظر کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لمحات شرف مختصر سہی لیکن حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لئے یہ اعزاز کافی ہے کہ آپ خاندان ابوبکرؓ کے ایک ایسے محترم وارث کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے تھے جسے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ' جیسا مرد مجدد بھی اپنا محبوب سمجھتا تھا۔



یہ بڑی عجیب سعادت ہے کہ ایک طرف حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت صدیق اکبرؓ کے عظیم وارث حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی شاگردی کا اعزاز حاصل ہے تو دوسری طرف حضرت عمر فاروقؓ کے عظیم وارث حضرت سالم بن عبد اللہؓ آپ کے استاد گرامی تھے۔ ایک ہی وقت میں دو ایسے خانوادوں سے علم حاصل کرنا' جن سے خدا راضی ہو گیا تھا، خوش قسمتی کی ایک علامت ہے کہ جس کی وضاحت کے لئے ذخیرہ الفاظ کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ بس یہ بارش کرم تھی جس پر برسنا تھی، برس گئی۔



حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی کی طویل فہرست میں حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت محمد بن اسحٰق رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عبد الرحمٰن بن مہدی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت کیع بن جراح رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت یحیٰ سعید القطان رحمتہ اللہ علیہ جیسے مردان جلیل شامل تھے لیکن آپ کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ایک ربط خاص تھا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جب بھی مجلس درس میں تشریف لاتے' حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر محبت و شناسائی کا عجیب رنگ ابھر آتا اور یہ رنگ اس قدر نمایاں ہوتا کہ دیگر حاضرین مجلس بھی حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کی قلبی کیفیات سے آگاہ ہو جاتے۔

پھر جب درس شروع ہوتا تو حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کی نظریں مستقل حضرت امام حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر مرکوز رہتیں۔ لوگ اس التفات خاص کا سبب دریافت کرتے تو حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ بے اختیار ہو کر فرماتے۔

"ابوحنیفہ غیر معمولی ذہین انسان ہیں۔ فہم و ادراک میں وہ دوسرے لوگوں سے بلند تر ہیں۔ میں بار بار ان کی طرف اس لئے دیکھتا ہوں کہ علم کا مستقبل ابوحنیفہ سے وابستہ ہے۔"

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ستائش کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کبھی آپ کے سامنے تعریف نہیں کرتے تھے۔ غیر موجودگی میں جب بھی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر آتا تو امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ آپ کی اس قدر تعریف کرتے کہ دوسرے شاگردوں کو نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی ذات پر رشک آنے لگتا۔ یا کچھ تنگ دل لوگ حسد کا شکار ہو جاتے۔

ایک مرتبہ بر سر مجلس حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر آیا اور پوچھنے والے نے پوچھا کہ علم میں نعمان بن ثابت کا کیا مقام ہے؟

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے کسی تامل کے بغیر فرمایا۔ "جس طرح میں جانتا ہوں کہ میری آنکھوں کے سامنے آفتاب روشن ہے' اسی یقین کے ساتھ میں یہ بات بھی کہہ سکتا ہوں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور علم ہم نشین ہیں۔" (یعنی جس محفل میں ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بیٹھتے ہیں وہاں علم بھی موجود ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے گہرے روابط رکھتے ہیں۔)

مسلمانوں کے ایک حلقے میں یہ بدگمانی اس قدر رواج پا گئی ہے کہ علم حدیث میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا کوئی مقام نہیں۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ روایت حدیث میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ضعیف تھے۔ یہ ایک طویل بحث ہے' جسے ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے فقہی مقام سے گزرنے کے بعد چھیڑا جائے گا۔ فی الحال حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک واقعے کا ذکر ناگزیر ہے۔

مشہور محدث اور حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے استاد محترم حضرت یحییٰ بن معین رحمتہ اللہ علیہ سے کسی شخص نے سوال کیا کہ آپ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟

حضرت یحییٰ بن معین رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا۔ "میرے" نزدیک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم پر یہ شہادت کافی ہے کہ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں حدیث و روایت کی اجازت دی ہے اور شعبہ رحمتہ اللہ علیہ آخر شعبہ رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔"

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم حدیث پر دو عظیم محدثین کی شہادت کافی ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا وصال 150 ھ میں ہوا اور حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ 160 ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ وہ پہلے بزرگ ہیں جو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی آخری سانس تک حیات رہے۔ اس طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ سے ایک طویل عرصے تک اکتساب فیض کیا ہوگا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کب تک حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس میں شریک ہوتے رہے لیکن جہاں تک تحصیل علم کا تعلق ہے تو بیشتر مستند تاریخیں گواہ ہیں کہ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے چند سال بعد ہی حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے فرما دیا تھا۔

"نعمان! اب تم حدیث بھی روایت کر سکتے ہو اور فتویٰ بھی دے سکتے ہو۔"

"یہ کامیابی کی بڑی عجیب مثال ہے کہ ایک طرف کچھ لوگوں کو نصف صدی گزارنے کے بعد بھی بارگاہ شعبہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت حدیث کی اجازت نہیں ملتی اور دوسری طرف حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو تحصیل علم کے آغاز

رحمتہ اللہ علیہ سے روایت حدیث کی اجازت نہیں ملتی اور دوسری طرف حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو تحصیل علم کے آغاز ہی میں یہ اعزاز حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اس واقعے کے بعد کس دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا حافظہ بھی دیگر طالب علموں کے حافظوں پر غالب تھا اور فہم وفراست بھی دیگر افراد کی فہم وفراست سے بلند ترتھی۔ اگر پھر بھی کوئی شخص ان حقائق کو تسلیم کرنے سے گریز اختیار کرتا ہے تو اس کے دل ودماغ کے تمام دریچے بند ہو چکے ہیں۔ اگر ان سے روشنی کی ایک کرن بھی پھوٹنے لگے تو وہ بے اختیار اس بات کا اعتراف کرلے گا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ عظیم نہیں، عظیم تر تھے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استادان گرامی میں ایک تابناک نام حضرت حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

حضرت حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ فقہ کے عظیم امام حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ اور حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ ایک ہی سال پیدا ہوئے تھے۔

محمد بن سعد رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں ایک کام کی غرض سے عبداللہ بن ادریس رحمتہ اللہ علیہ کے ہمراہ روانہ ہوا۔ جب ہم لوگ ''شہارسوج کندہ'' کے محلے میں پہنچے تو حضرت عبداللہ بن ادریس رحمتہ اللہ علیہ ایک مکان کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ کس کی قیام گاہ ہے؟''

میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو عبداللہ بن ادریس رحمتہ اللہ علیہ فرمانے لگے۔ ''یہ مکان حضرت حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ آزاد زندگی بسر کرنے سے پہلے ''کندہ'' کے غلام تھے اور حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے ہم عمر تھے۔''

عبدالرزاق بن معمر رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کے اصحاب (شاگردوں) میں حضرت حکم بن عتیبہ جیسے اہل علم داخل تھے۔

مشہور عالم ابواسرائیل رحمتہ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ میں حضرت حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ کے مقام کمال سے ناآشنا تھا۔ مگر اس دن ہم پر یہ راز فاش ہوا کہ ہمارے درمیان ایک عظیم محدث وفقیہ موجود ہے۔

جس روز حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہوا۔ جب امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس کوئی شخص اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوتا تو آپ فرماتے کہ اپنے مسئلے کا حل حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کرو۔''

حضرت حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال 115ھ میں ہوا اور آپ شہر کوفہ میں آسودہ خاک ہوئے۔

وہ ہشام بن عبدالملک کی خلافت کا زمانہ تھا۔

حضرت حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ ثقہ مؤرخ، بڑے فقیہ اور بلند مرتبہ عالم تھے۔ آپ کے علم وفضل پر حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ کی گواہی ایک بڑی گواہی ہے۔

چار ہزار اساتذہ

ابوحفص کبیر نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کم از کم چار ہزار اشخاص سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس دعوے پر تبصرہ کرتے ہوئے شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

کی ہیں، دنیا کی اور قوم میں اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ ہم متعدد شخصیتوں کے نام بتا سکتے ہیں جن کے شیوخ حدیث چار ہزار سے کم نہ تھے اور ایسے تو بہت گزرے ہیں جن کے اساتذہ ہزار سے زیادہ تھے۔ علامہ سخاوی نے ''فتح المغیث'' میں ان لوگوں کے نام بھی گنائے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت یہ دعویٰ محدثانہ اصول پر ثابت نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام رحمتہ اللہ علیہ نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی ہے اور اس کا خود محدثین کو بھی اعتراف ہے۔''

علامہ ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں جہاں ان کے شیوخ حدیث کے نام لکھے گئے ہیں وہاں آخر میں لکھ دیا ہے ''خلق کثیر۔''

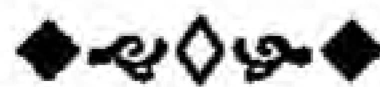
حافظ ابوالمحاسن شافعی نے ''عقود الجمان'' میں تین سو انیس اشخاص کے نام بقید نسب لکھے ہیں۔

علامہ شامی نے شرح ''درمختار'' میں لکھا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے چار ہزار اساتذہ تھے۔ ایک بار ''حنفیہ'' اور ''شافعیہ'' میں مناظرہ ہوا کہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ افضل ہیں یا امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ؟ پھر جب دونوں ائمہ کرام کے اساتذہ کا شمار کیا گیا تو حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے اسی اساتذہ شمار میں آئے اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے چار ہزار۔

اساتذہ کی کثیر تعداد سے یقیناً امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شدید طلب علم کا اظہار ہوتا ہے مگر شبلی نعمانی کے بقول امام رحمتہ اللہ علیہ کے لئے یہ بات اس قدر فخر کا باعث نہیں جتنا کہ ان کی احتیاط اور تحقیق ہے۔

خداوند ذوالجلال نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس غیر معمولی صفت سے سرفراز فرمایا تھا کہ آپ علم کی تلاش میں ہزاروں شیوخ کے آستانوں پر حاضر ہوئے مگر احتیاط اور تحقیق کے تقاضوں سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ اپنے دماغ کو روشن کرنے کے لئے آپ نے ہر قسم کا علم سیکھا اور ہر عقیدے کے اساتذہ سے ملاقات کی...... مگر جب علم کی وراثت منتقل کرنے کا وقت آیا تو آپ نے وہی علم تقسیم کیا جو مخلوق خدا کے لئے زیادہ مفید تھا...... حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں یہ اہم ترین نکتہ ہے جس کی تفہیم کے بغیر امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کو سمجھنا دشوار ہے۔

ہمیں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اساتذہ کے جس قدر تفصیلی حالات مل سکے انہیں اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ حسن نیت کے سہارے خدا کے بھروسے پر یہ تحقیق جاری ہے۔ اگر ''مشکل کشائے عالم'' چاہے گا تو ہم پر مزید تحقیق کے دروازے کھل جائیں گے اور باقی اساتذہ کے علمی کارنامے آئندہ کتاب میں درج کر دیئے جائیں گے۔



حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد گرامی حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ کمال پر اٹھارہ سال تک دست بستہ کھڑے رہے۔ پھر کچھ دیر کے لئے زندگی کے افق پر وہ تاریکی چھا گئی جو انسانوں کے ساتھ ہر ذی روح کا مقدر ہے۔

120ھ میں حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی سانسوں کا شمار ختم ہو گیا...... اور اسلامی فقہ کا ایک عظیم محسن ذہن آدم کے ریگ زاروں کو سرسبز و شاداب کرنے کے بعد خود زیر خاک سو گیا۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رحمتہ اللہ علیہ کے فقہ کا دارومدار صرف امام حماد

رحمتہ اللہ علیہ پر تھا۔ نتیجتاً ان کی موت سے کوفے کے در و بام تاریک ہو گئے۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی وراثت میں ایک لائق فرزند چھوڑا تھا۔ لوگوں نے عقیدتاً اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ بن حماد رحمتہ اللہ علیہ کو امام کا جانشین بنا دیا...... مگر اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ اس بار گراں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا فطری میلان ''لغت اور ادب'' کی طرف تھا۔ اس لئے چند ماہ بعد ہی اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ مسند درس کو چھوڑ کر نیچے اتر آئے اور اپنے والد محترم کے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے آپ کو اس منصب کے لائق نہیں سمجھتا۔ آپ حضرات کسی دوسرے شخص کا انتخاب کر لیں۔''

بعض روایات کے مطابق امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شریک ہونے والوں نے اسماعیل بن حماد رحمتہ اللہ علیہ کو جانشینی کے منصب کے لئے ناپسندیدہ قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی تمام تر روایات غیر معتبر ہیں۔ اسماعیل بن حماد رحمتہ اللہ علیہ ایک حساس اور ذمے دار انسان تھے۔

جب آپ ایک عظیم درس گاہ کی ضروریات پوری نہ کر سکے تو خود ہی اس منصب سے دستبردار ہو گئے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی لازم ہے کہ اسماعیل بن حماد رحمتہ اللہ علیہ علمی اعتبار سے اپنے والد کی جانشینی کے دعوے دار نہیں تھے۔ دیگر اکابرین علم کے بے حد اصرار پر آپ نے یہ منصب قبول کیا تھا...... اور پھر خود ہی اپنی ذات کا مکمل محاسبہ کرنے کے بعد مسند درس سے اتر کر عام لوگوں کی قطار میں شامل ہو گئے۔

ایک بار پھر جانشینی کا مسئلہ پوری شدت کے ساتھ ابھر آیا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد اور عقیدت مند ایک دن کے لئے بھی مسند درس کو خالی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجتاً عام لوگوں نے اتفاق رائے کے ساتھ موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ کو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا جانشین منتخب کر لیا۔ موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں عمر اور تجربے کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ وہ فقہ کے بڑے ماہر نہ تھے لیکن اکثر بزرگوں کی صحبتوں سے فیضاب ہوئے تھے۔ اس لئے لوگوں کے ذہنوں پر ان کا ایک خاص اثر تھا۔

کچھ عرصے تک موسیٰ بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ کی وجہ سے درس کی مجلسیں روشن رہیں۔ پھر جب وہ حج کو تشریف لے گئے تو تمام بزرگوں نے متفقہ طور پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ مسند درس پر جلوہ افروز ہو کر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی علمی روایت کو زندہ کریں۔

اہل علم کے اصرار پر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہو گئے تھے اور آپ بار بار اس مسند فقہ کی طرف دیکھتے تھے جس کا سلسلہ بالآخر رسالت مآب ﷺ کے صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تک پہنچ جاتا تھا۔ اسلاف کی جلالت کردار و علم سے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ آپ نے مسند درس پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

علامہ شبلی نعمانی کے بقول انسانی جذبات و احساسات کی حالتیں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو جوانی ہی میں استادی کی مسند پر بیٹھنے کی آرزو تھی...... یا اب یہ حال ہے کہ لوگ اس منصب عظیم کو قبول کرنے کے لئے درخواست کر رہے ہیں اور آپ خود کو ذمے داریوں کی ادائیگی سے معذور سمجھ کر مسلسل انکار کر رہے ہیں۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی روش انکار زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ یہاں تک کہ لوگوں کا اصرار غالب آ گیا اور حماد بن ابی سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کی مسند پر وہ شخص نمودار ہوا جس کے متعلق امام فرمایا کرتے تھے۔

''ابوحنیفہ نے مجھے خالی کر دیا......''

اگرچہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مجبوراً امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی جانشینی کا منصب قبول کر لیا تھا' لیکن پھر بھی آپ کا دل مطمئن نہیں تھا۔ حافظ ابوالمحاسن نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ عجیب وغریب خواب دیکھا کہ آپ پیغمبر اسلام ﷺ کی قبر مبارک کھود رہے ہیں۔

خواب اس قدر لرزہ خیز تھا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پر دہشت طاری ہو گئی۔ آپ نے اپنے طور پر خواب کی یہ تعبیر اخذ کی کہ یہ میری نااہلی کی طرف اشارہ ہے...... اور میں اس لائق نہیں ہوں کہ مسند فقہ پر بیٹھ کر تدریس کے فرائض ادا کر سکوں۔ معتبر روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ خواب دیکھنے کے بعد بہت دن تک شدید اضطراب میں مبتلا رہے۔ پھر ایک روز حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے خواب کی تعبیر پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس خواب کا دیکھنے والا مردہ علم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔''

مذکورہ تعبیر کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اطمینان قلب میسر آیا اور آپ نے پوری دلجمعی کے ساتھ درس تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس خواب کا ذکر تمام محدثین اور مؤرخین نے کیا ہے کہ' لیکن حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی تعبیر گوئی کا واقعہ درست نہیں۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ 120ھ میں مسند درس پر جلوہ نما ہوئے تھے اور حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ دس سال پہلے 110ھ میں انتقال فرما چکے تھے۔ اس طرح تاریخی حقائق کی روشنی میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے خواب کی تعبیر پیش کرنے والے کوئی دوسرے بزرگ تھے۔

بہرحال اس اہم ترین واقعے کے بعد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے پہلا درس دیا اور اہل مجلس یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے علم کا سمندر موجزن تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے سکوت اور کم گوئی کے لئے مشہور تھے مگر جب آپ لب کشا ہوئے تو ہر طرف سے حکمت ومعرفت کے چشمے ابل پڑے۔ چند روز میں وہ شہرت ہوئی کہ اکثر درس گاہیں ٹوٹ کر حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شامل ہو گئیں۔



حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے اساتذہ

اور

دیگر اکابرین اسلام کے تفصیلی حالات

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تو آپ سے پہلے صرف پانچ حضرات ایمان لا چکے تھے۔ جب ابن مسعودؓ نے رسالت کی گواہی دی تو آپ کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ زبان سے کلمہ طیبہ کی ادائیگی کے ساتھ ہی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسالت مآب ﷺ سے تعلیم قرآن کی درخواست کی۔ آپ نے قرآن کریم کی ستر سورتیں سرور کونین ﷺ سے حفظ کیں۔ ابن مسعودؓ پہلے شخص ہیں' جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے حرم میں قرآن کریم سنایا۔ اس وقت آپ سورۂ رحمٰن کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اس موقع پر کفارانِ قریش نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک کیا۔ یہ منکرین خدا ابن مسعودؓ کے چہرہ مبارک پر شدید ضربیں لگاتے جاتے تھے' مگر آپ کی قرأت جاری تھی۔ جب سرکشوں کا وہ گروہ چلا گیا تو کسی شخص نے عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے اس واقعے پر اپنی دلی تکلیف کا اظہار کیا، جواباً اس صحابی جلیل نے فرمایا۔

"وہ سننا چاہیں تو میں دوبارہ سنانے کو آمادہ ہوں۔ اب کفار سے زیادہ دنیا کی کوئی چیز میری نظروں میں حقیر نہیں۔"

اسلام سے شرف یاب ہونے کے بعد ہی رسالت مآب ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنی خدمت کے لئے مخصوص فرما لیا تھا۔ آپ کو عام اجازت تھی کہ پردہ اٹھا کر بارگاہ سرور کونین ﷺ میں حاضر ہو جائیں۔ اگر اس وقت رازدارانہ گفتگو ہو رہی ہے تو وہ بھی سنیں' مگر جب روک دیئے جائیں تو رک جائیں اور باہر چلے جائیں۔ یہ ابن مسعودؓ کو رسول کریم ﷺ کے دراقدس سے عطائے خاص تھی۔ یہ ایک منفرد اعزاز تھا جس پر آپ ہمیشہ نازاں رہتے تھے۔

جب حضور اکرم ﷺ اپنے حجرہ مبارک سے باہر تشریف لاتے تو عبداللہ بن مسعودؓ غلاموں کی طرح آگے بڑھ کر آپ کو نعلین (جوتے) پہناتے۔ پھر عصا لے کر دائیں جانب آگے آگے چلتے مجلس کے قریب پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے نعلین اتارتے اور بغل میں رکھ لیتے۔ پھر عصا پیش کرتے۔ رسالت مآب ﷺ کی واپسی کے وقت بھی ابن مسعودؓ کا یہی عمل ہوتا۔

وضو کے وقت مسواک پیش کرتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں "صاحب النعلین و السواک والسواد" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے القاب تھے۔ یعنی نعلین' مسواک اور راز کے محافظ۔ سفر میں رسالت مآب ﷺ کا بستر

مبارک طہارت کا پانی، مسواک اور نعلین حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تحویل میں رہتے تھے۔ مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جب یمن سے مدینہ منور پہنچے تو کثرت باریابی دیکھ کر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور آپ کی والدہ محترمہ کو بھی اہل بیت میں شمار کرنے لگے تھے۔

ابن مسعودؓ نے دوبار ہجرت کی۔ ایک بار حبشہ اور دوسری بار مدینہ منورہ۔ آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ تمام غزوات (جنگوں) میں شریک ہوئے اور عبداللہ بن مسعودؓ کے اس شرف کو کوئی بھی اہل ایمان قیامت تک فراموش نہیں کر سکتا کہ آپ نے ابوجہل کا سرخود اس کی تلوار سے کاٹا۔ پھر یہی تلوار آپ کو بطور صلہ عطا ہوئی۔ ابن مسعودؓ جسمانی اعتبار سے لاغر ونحیف تھے۔ جب ایک موقع پر آپ کی کمزور پنڈلیاں دیکھ کر صحابہ کرامؓ ہنس پڑے تو سرور کونین ﷺ نے فرمایا۔

"قیامت کے دن میزان میں، عبداللہؓ احد پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری ہوں گے۔"

اسی حدیث کو دوسری روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک پاؤں "جبل احد" سے زیادہ بھاری ہوگا۔ آپ کو آپ کی زندگی ہی میں رسالت مآب ﷺ نے جنت کی بشارت دی۔

سرور کائنات ﷺ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن حکیم سنا کرتے تھے۔ حیات مبارک کے آخری سال میں جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دوبارہ آپ کو قرآن کریم سنایا تو عبداللہ بن مسعودؓ بھی حاضر تھے۔

رسالت مآب ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ "جسے یہ بات محبوب ہو کہ قرآن کو اسی تازگی سے پڑھے جس طرح وہ نازل ہوا ہے تو اسے چاہئے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں پڑھے۔"

سرور کونین ﷺ نے ایک بار یہ بھی ارشاد فرمایا۔ "عبداللہ بن مسعودؓ کی ہدایت اور حکم کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔"

جن چار صحابہ کرامؓ سے قرآن حکیم سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سرفہرست عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ باقی تین افراد میں حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت سالمؓ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اللہ کے قریب ہونا بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ آپ حافظ قرآن تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ سیرت اور شان و وقار میں آپ محمد مصطفیٰ ﷺ سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔

"طبقات ابن سعد" کی ایک روایت کے مطابق، ابی اسحاق رحمتہ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا۔

"میں نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے اور میں سوائے عبداللہ بن مسعودؓ کے آپ کا اہل کسی کو نہیں دیکھتا۔"

حضرت علیؓ کی ایک روایت کے مطابق رسول کریم ﷺ نے فرمایا ...... "اگر میں مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کے علاوہ کسی اور کو امیر بناتا تو وہ عبداللہ بن مسعودؓ ہوتے۔"

شقیق رحمتہ اللہ علیہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت حذیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حسن سیرت اور میانہ روی میں حضور اکرم ﷺ کے مشابہ سب سے زیادہ عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں حضرت عمار بن یاسرؓ کو امیر کوفہ اور عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم بنا کر بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی امیر المومنینؓ نے اہل کوفہ کو لکھا۔ "میں تمہارے پاس ایسے دو اصحاب کو بھیجتا ہوں جو اشراف صحابہ رضی اللہ

عنہم سے بھی ہیں اور اہل بدر سے بھی۔ ان کی اطاعت کرو اور حکم مانو۔ خدا کی قسم! میں نے اپنے اوپر ایثار کر کے عبداللہ بن مسعودؓ کو تمہارے پاس بھیجا ہے (حضرت عمر فاروقؓ کی اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کو کسی طرح بھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جدائی گوارا نہ تھی۔ صرف اہل کوفہ کی خاطر آپ نے اس اذیت فراق کو برداشت کیا)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ "یہ علم سے بھرا ہوا ایک ظرف (برتن) ہیں۔" حضرت عمرؓ نے اپنا یہ قول تین بار دہرایا۔ یہاں تک کہ بے شمار لوگوں نے خلیفہ ثانی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ سنے اور عبداللہ بن مسعودؓ کی عظمت کا احساس کیا۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بھی مشہور ہے۔ باب العلمؓ نے فرمایا۔ "عبداللہ بن مسعودؓ نے قرآن حکیم پڑھ کر جو کچھ اس میں حلال تھا، اسے حلال کہا اور جو کچھ حرام تھا، اسے حرام قرار دیا۔"

حبہ بن جوبن رحمتہ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ذکر آیا تو حاضرین نے ان کی بہت تعریف کی۔ کہنے والوں نے برملا کہا۔

"امیر المومنین! ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ خوش اخلاق، ان سے زیادہ نرم تعلیم والا ان سے زیادہ اچھا ہم نشیں اور ان سے زیادہ سخت متقی کسی کو نہیں دیکھا۔"

جواباً حضرت علیؓ نے فرمایا...... "میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ کیا تم لوگوں نے یہ باتیں صدق دل سے کہی ہیں؟"

حاضرین نے عرض کیا...... "خدا ہمارے حالات بہتر جانتا ہے۔ ہماری زبانوں اور دلوں میں پوری ہم آہنگی ہے۔"

حضرت علیؓ نے بے اختیار ہو کر فرمایا...... "اے اللہ! میں تجھے گواہ بناتا ہوں...... اے اللہ! میں بھی ان کے حق میں یہی کہتا ہوں یا اس سے زیادہ جوان لوگوں نے کہا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سفید اور عمدہ لباس پہنتے تھے' خوشبو بہت لگاتے تھے۔ آپ کی یہ عادت اتنی عجیب تھی کہ رات کے اندھیرے میں بھی عطر کی مہک سے پہچان لئے جاتے تھے۔

وہ 32ھ کا الم انگیز سال تھا کہ جب علم کا یہ خورشید ضیا بار خاک مدینہ میں روپوش ہو گیا۔ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں دفن کئے گئے۔

جب مشہور صحابی حضرت ابو درداؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کے انتقال کی خبر سنی تو اشکبار آنکھوں کے ساتھ فرمایا۔ "وہ اپنے پیچھے اپنا کوئی مثل نہیں چھوڑ گئے۔"

انتقال کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی عمر ساٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ بعض مورخین کے خیال میں وفات کے وقت آپ کی عمر ستر سال کے قریب تھی۔

قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رات میں دفن کئے گئے۔

ثعلبہ بن ابی مالکؓ کہتے ہیں جب میں دوسرے دن قبرستان میں گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قبر کو اس حالت میں پایا کہ اس پر پانی چھڑکا ہوا تھا۔

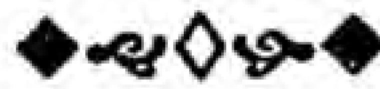


ابن مسعودؓ بہت کم احادیث بیان کیا کرتے تھے۔ اگر کبھی ایسی کوئی مجبوری پیش آجاتی تو حدیث کے الفاظ میں سخت احتیاط کرتے تھے۔ جس وقت آپ کی زبان سے "قال رسول اللہ ﷺ" ادا ہوتا تو خوف سے پورا جسم کانپنے لگتا۔ پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرماتے۔ "کثرت روایت کا نام علم نہیں بلکہ خدا سے ڈرنے کو علم کہتے ہیں۔"

حضرت عمرو بن میمون رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میں ایک سال تک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر رہا۔ آپ نے ایک دن بھی رسالت مآب ﷺ سے حدیث روایت نہیں کی۔ انتہا یہ ہے کہ آپ کی زبان سے "قال رسول اللہ ﷺ" کے الفاظ تک نہ سنے۔ صرف ایک بار حدیث بیان کی مگر جیسے ہی آپ کی زبان پر قال رسول اللہ ﷺ جاری ہوا، شدید اضطراب میں مبتلا ہو گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا...... "انشاء اللہ! اس سے زیادہ یا اس کے قریب یا اس سے کم......"

علقمہ بن قیس رحمتہ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر پنجشنبے کو نماز کیلئے رات بھر کھڑے رہتے تھے۔ میں نے انہیں کسی رات یہ کہتے نہیں سنا کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا...... سوائے ایک بار کے...... راوی نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف دیکھا تو آپ عصا کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ پھر عصا کی طرف دیکھا تو وہ کانپ رہا تھا۔

اور جہاں تک علم فقہ کا تعلق ہے تو امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ برملا کہا کرتے تھے "اصحاب رسول اللہ ﷺ میں، ہمارے استاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بڑھ کر کوئی فقیہ نہیں تھا۔"



حضرت امام محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ

امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کے والد محترم سیرین رحمتہ اللہ علیہ عراق کے باشندے تھے۔ ایک معرکے میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیئے گئے۔ بعد میں مشہور صحابی حضرت انس (امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے والد گرامی) نے بیس ہزار درم میں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

حضرت سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی شادی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی جو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی باندی تھیں' لیکن پھر بھی اس شان کی مالک تھیں کہ جب نکاح کا وقت آیا تو رسالت مآب ﷺ کی تین ازواج مطہرات نے آپ کو دلہن بنایا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی تقریب نکاح میں اٹھارہ بدری صحابہ بھی شریک تھے جن میں حضرت ابی بن کعبؓ بھی شامل ہیں۔ آراستگی کے بعد امہات المومنینؓ، حضرت صفیہؓ کے لئے دعائیں مانگتی رہیں۔ ادھر مردانہ مجلس میں حضرت ابی بن کعبؓ دعا مانگ رہے تھے اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آمین کہہ رہے تھے۔

ان ہی محترم خاتون کے بطن سے امام محمد رحمتہ اللہ علیہ 33ھ میں پیدا ہوئے۔ محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ فارس میں ایک عرصہ دراز تک حضرت انسؓ کے ساتھ کاتب کی حیثیت سے رہے۔ نتیجتاً انہیں خادم رسول سے علمی استفادے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ حضرت انسؓ کے علاوہ امام محمد رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سلیمان بن عامرؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کی علمی مجالس اور روایات سے فیض یاب ہوئے۔ ان بزرگوں کی خصوصی توجہ اور حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے شوق بے پناہ نے انہیں علم کا پیکر بنا دیا۔ ایک مقام پر حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ تحریر کرتے ہیں۔

"ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ فقیہ تھے' علم کثیر رکھنے والے تھے...... روایت حدیث میں ثقہ تھے...... خواب کی تعبیر میں علامہ تھے...... اور زہد و تقویٰ میں امام تھے"۔

حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ عام اسلامی علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ علامہ نووی رحمتہ اللہ علیہ کے بقول وہ تفسیر کے بھی امام تھے۔

روایت حدیث میں محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے ثقہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ جب ہشام بن حسان نے ابن

سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے ایک روایت نقل کی تو علی الاعلان کہا۔

"مجھ سے یہ روایت اس شخص نے بیان کی ہے جو ان تمام انسانوں میں سب سے زیادہ سچا ہے جنہیں میں نے دیکھا ہے۔"

ابن مدینی رحمتہ اللہ علیہ کہتے تھے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے حقیقی شاگرد صرف چھ ہیں...... حضرت سعید بن میسب رحمتہ اللہ علیہ' ابوسلمہ رحمتہ اللہ علیہ' الاعرج رحمتہ اللہ علیہ' ابوصالح رحمتہ اللہ علیہ' ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ اور طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں......"میں نے دنیا میں ان جیسے انسان نہیں دیکھے۔ عراق میں محمد سیرین رحمتہ اللہ علیہ...... حجاز میں قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ...... اور شام میں رجاء بن حیات رحمتہ اللہ علیہ۔"

حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ آپ کم علم لوگوں سے حدیث کا اخذ کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر امام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"علم دین ہے۔ علم حاصل کرنے سے قبل اس شخص کو خوب اچھی طرح پرکھ لو جس سے تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کو تلقین فرماتے تھے کہ ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے خوان علم سے فائدہ اٹھائیں۔

علامہ ابن سعد رحمتہ اللہ علیہ' حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ' امام نووی رحمتہ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمتہ اللہ علیہ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو بڑا فقیہ سمجھتے ہیں۔

مورق عجلی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں......"میں نے ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ کوئی پاکباز فقیہ نہیں دیکھا۔"

ابن حبان رحمتہ اللہ علیہ نے محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو "فقیہ فاضل" قرار دیا ہے۔

حدیث کی طرح فقہ میں بھی آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جن امور کے متعلق ذرا سا بھی شبہ ہوتا تھا ان کے بارے میں فتویٰ نہیں دیتے تھے۔

"طبقات ابن سعد رحمتہ اللہ علیہ" کی ایک روایت کے مطابق جب کوئی شخص محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے فقہ کا مسئلہ پوچھتا تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا اور حالت غیر ہو جاتی۔

فقہی کمالات کے سبب حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو قضا (عدالت) کے معاملات میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی لیکن اس کے باوجود آپ "عہدہ قضا" سے گھبراتے تھے۔ ایک بار محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تو آپ فرار کی حالت میں شام چلے گئے اور پھر وہاں سے مدینہ پہنچ گئے۔

امام محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ آپ کی ذات اہل اسلام کے لئے ایک مثال بن گئی تھی۔ حضرت ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ گزر اوقات کے لئے تجارت کیا کرتے تھے مگر ایک بار آپ کو شک ہو گیا تو تجارت بھی چھوڑ دی، اپنی پرہیزگاری کی کیفیت کے بارے میں خود بیان فرماتے ہیں۔"میں خواب اور بیداری' دونوں حالتوں میں اپنی بیوی کے سوا کبھی کسی عورت کے قریب نہیں گیا۔ اگر خواب میں کسی عورت کو دیکھتا ہوں تو فوراً خیال آتا ہے کہ یہ عورت میرے لئے حلال نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی فوراً اپنی نگاہ پھیر لیتا ہوں۔"

اس احتیاط اور پرہیزگاری کے باعث محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو بعض اوقات شدید مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے تھے لیکن آپ اس صورت حال سے کبھی خائف نہیں ہوئے تھے۔ ایک بار امام محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے زیتون کے تیل کی ایک مشک چالیس ہزار درہم میں خریدی۔ اتفاقاً اس میں سے ایک مرا ہوا چوہا نکل آیا۔ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے اس خیال سے کہ ممکن ہے چوہا "کولہو" میں پڑا ہوا ہو، پوری مشک پھنکوا دی مگر چونکہ اسے خرید چکے تھے اس لئے تیل والے نے فوری طور پر پوری قیمت طلب کی۔ زیتون کا تیل تجارتی مقصد سے خریدا گیا تھا اور قیمت کی ادائیگی قسطوں میں طے پائی تھی مگر تیل بیچنے والے نے آپ پر اعتبار نہیں کیا اور مکمل ادائیگی کا مطالبہ کرنے لگا۔ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے کچھ رقم اسی وقت ادا کر دی اور باقی کے لئے مناسب وقت کا وعدہ کر لیا۔ خرید و فروخت کی یہ شرائط پہلے سے طے پا چکی تھیں لیکن تیل کے تاجر نے اتنے بڑے نقصان کے بعد امام رحمتہ اللہ علیہ کی کسی بات پر یقین نہیں کیا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو زنداں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس تکلیف دہ منظر کو دیکھ کر وہ لوگ لرز گئے جو آپ کے مقام سے واقف تھے لیکن حضرت ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ یہی فرماتے رہے۔

"اصول اصول ہے...... اور جرم جرم ہے۔"

بالآخر یہی کہتے کہتے امام رحمتہ اللہ علیہ پس دیوار زنداں چلے گئے۔

قید خانے کا داروغہ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے انتہائی عاجزی کے ساتھ عرض کیا۔

امام! میں مجبور ہوں مگر آپ کی خاطر اتنا کر سکتا ہوں کہ رات کے وقت زنداں کا دروازہ کھول دوں تا کہ آپ اپنے بیوی بچوں کے پاس چلے جائیں اور صبح سے پہلے واپس تشریف لے آئیں۔"

"محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ داروغہ زنداں کی عرضداشت سن کر برہم ہو گئے اور غضب ناک لہجے میں فرمانے لگے۔

"تم نے اپنے فرض منصبی سے خیانت کی ہے مگر میں اس خیانت میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔"

یہی وہ خوف خدا تھا جس نے ہر قدم پر محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی دستگیری کی۔

ہشام بن حسان رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں...... "ایک بار ہم لوگ محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں ہم نے انہیں دیکھا کہ وہ دن کو ہنستے اور رات کو روتے تھے۔"

عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ عام مسلمانوں کے متعلق تو بہت پر امید تھے لیکن خود اپنی ذات کی نسبت بہت شدید اور سخت تھے۔

ابو قلابہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں...... "محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی طرح کون نیزے کی دھار پر سوار ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔"

امام رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے موت کا ذکر ہوتا تھا تو آخرت کے خوف کے سبب اس سے اس قدر متاثر ہوتے تھے جیسے آپ کے ایک ایک عضو پر موت طاری ہو گئی ہو۔

ابو قلابہ رحمتہ اللہ علیہ کا ایک اور قول ہے کہ تم محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو جس طرح چاہو آزما کر دیکھ لو۔ تم

دیکھو گے کہ وہ تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار اور سب سے زیادہ ضبط نفس کرنے والے ہیں۔

حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی شان جلالت یہ تھی کہ امراء آپ کے پاس ''نذر و ہدیہ'' بھیجتے تھے مگر امام رحمتہ اللہ علیہ انہیں قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک بار حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ جیسے خلیفہ راشد نے محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ اور حسن بصری کو کچھ ''ہدایا'' بھیجے۔ امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں قبول کر لیا مگر محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے ایک ایک چیز واپس کر دی۔

حدیث میں ''اہل اللہ'' کی یہ علامت بیان کی گئی ہے کہ انہیں دیکھتے ہی خدا یاد آ جائے۔

ابوعوانہ رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں ...... ''میں نے محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا ہے کہ جب وہ بازار سے گزرتے تھے تو لوگ ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے اللہ کا ذکر کرنے لگتے تھے۔

ابن عماد حنبلی رحمتہ اللہ علیہ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں ...... ''جب محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کسی مکان میں تشریف لے جاتے تو وہاں کوئی شخص ایسا نہ ہوتا تھا جو انہیں دیکھ کر اللہ کا ذکر شروع نہ کر دیتا ہو۔''

ابن قتیبہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو ''علم اور عبادت'' میں کمال کا درجہ حاصل تھا۔

امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ خواب کی تعبیر کا بے پناہ علم رکھتے تھے۔ یہ ایک ایسی صلاحیت تھی کہ ''علم تعبیر'' میں روئے زمین پر آپ کا کوئی دوسرا ثانی موجود نہیں تھا۔ امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ اپنے کمال کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''میں نے ایک بار حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے خواب کی تعبیر سکھا دیجئے۔ جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ ''اپنا منہ کھول۔'' میں نے فوراً ہی پیغمبر خدا کے حکم پر عمل کیا۔ حضرت یوسفؑ نے آگے بڑھ کر میرے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔ اس واقعے کے بعد سے میں خواب کی تعبیر بیان کرنے لگا جو خدا کے فضل سے حرف بہ حرف درست ثابت ہوتی ہے۔''

ایک دن ایک شخص ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا...... ''امام! کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے طاقتور پرندہ اترا اور ایک درخت پر بیٹھ کر پھول چننے لگا۔ پھر وہ اڑا اور آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔''

خواب سن کر حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ پھر آپ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا...... ''تیرا خواب علماء کی موت کی طرف اشارہ ہے۔''

ابھی مشکل سے دو چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ مشہور محدث امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ پھر تین ماہ بعد خود امام محمد سیرین رحمتہ اللہ علیہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ستر سال تھی۔

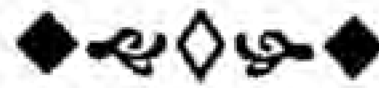
امام رحمتہ اللہ علیہ نے ایک عرب خاتون سے شادی کی تھی جن کے بطن سے اولاد کثیر پیدا ہوئی مگر عبداللہ بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے سوا تمام بچوں کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔

اس کتاب کے ابتدائی حصے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے جس خواب کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے تعبیر دیتے ہوئے فرمایا تھا...... ''صاحب خواب قرآن و سنت کے علم کو زندہ کرے گا۔''

تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے وہ خواب حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ

کے انتقال کے بعد 120ھ میں دیکھا تھا...... اور حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ 110ھ میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس لئے امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے اس مخصوص خواب کی تعبیر کا تعلق حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے نہیں۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال کے وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی عمر تیس سال تھی...... مگر کسی کتاب میں یہ حوالہ موجود نہیں ہے کہ آپ نے امام محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے علمی استفادہ کیا تھا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے انتہائی کم عمری میں دور دراز مقامات کے سفر کئے تھے بے شمار محدثین اور فقہا کے دربار علم میں حاضری دی تھی، پھر آپ محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ تک کیوں نہ پہنچ سکے؟ اگرچہ کوفے سے بصرہ کچھ اتنا دور بھی نہیں تھا۔ یہ اسلامی تاریخ فقہ کا ایک اہم سوال ہے' جس کا جواب کتابوں میں نہیں ملتا...... مگر جن لوگوں کو حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی طلب علم کی شدت کا اندازہ ہے وہ قیاس کر سکتے ہیں کہ ان کی آنکھیں حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت سے ضرور روشن ہوئی ہوں گی۔ درس و تدریس کا سلسلہ نہ سہی لیکن امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی ملاقاتوں سے ضرور شرف یاب ہوئے ہونگے۔ یہ حسن ظن ہے...... اور کیسا عجیب حسن ظن ہے؟ ایسا ہونا ہی چاہئے کہ کبھی کبھی مصنف کا قلم سامنے کے واقعات کو بھی نظر انداز کر جاتا ہے۔ یہ کوئی سیاست یا تعصب نہیں" انسانی ذہن کی نارسائی ہے۔



حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بن ابی سلیمان

حضرت امام حماد بن ابی سلیمان مشہور تابعی تھے اور رسالت مآب ﷺ کے خادم خاص حضرت انسؓ سے حدیث روایت کرتے تھے۔ آپ کے والد کا نام مسلم بن زیاد تھا اور کنیت ابی سلیمان تھی۔ ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ بن موسیٰ اشعریؒ کے غلام تھے۔ مسلم بن زیاد کا شمار کوفے کے امیر وکبیر لوگوں میں ہوتا تھا...... مگر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ ایک صاحب ثروت خاندان کے فرد ہوتے ہوئے بھی سیم وزر کے انبار سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بات امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے اہل خاندان کو گراں گزری کہ رئیس کوفہ کا فرزند فقہا کی کفش برداری کرے اور ان لوگوں کی گھریلو خدمات انجام دے جو اپنی معاشی حیثیت کے اعتبار سے مفلوک الحال سمجھے جاتے تھے۔

ایک دن امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے والد مسلم بن زیاد نے اپنے بیٹے کو زمانے کے نشیب وفراز سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اہل کوفہ حکومت وقت کی نظر میں پہلے بھی معتوب تھے اور اب یہ قہرناکیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ تم آخر وقت کے بگڑتے ہوئے تیور کو کیوں نہیں پہچانتے؟ تمہیں فقہا کے حلقوں میں کیا ملے گا؟ انسان کو سر بلند ہونے کے لئے معاشی وسائل درکار ہوتے ہیں اور یہ اسباب تمہارے بزرگ تمہیں پہلے ہی فراہم کر چکے ہیں۔ اگر تم درس گاہوں میں عزت وسرخروئی تلاش کر رہے ہو تو یہ تمہارا خیال خام ہے۔ حقیقی عزت وہی ہے' جو تمہارے خاندان کا موروثی سرمایہ ہے۔ ہمارے سر اٹھے ہوئے ہیں اور گردنیں بلند ہیں۔ انہیں کسی فقیہ کے آستانے پر جھکانے کی کوششیں ترک کردو۔“ مسلم بن زیاد اپنے فرزند سے اسی لہجے میں گفتگو کر رہے تھے جو ماضی بعید کے اہل سرمایہ کا مزاج تھا۔ جو آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی جس کے بدلنے کے امکانات نظر نہیں آتے۔

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے والد محترم کی طویل گفتگو سنی مگر آپ کے دل میں ایک لفظ بھی نہ اتر سکا۔

”میرے نزدیک ایک محدث، ایک فقیہ اور ایک عالم ہی رئیس شہر ہے۔ میں اس دولت کا امین بننا نہیں چاہتا جسے قزاق لوٹ لیں تو انسان کاسہ گدائی ہاتھ میں لے کر پھرتا رہے اور پھر اسے اپنے مسائل کا کوئی حل نظر نہ آئے۔ میں اس دولت کی جستجو میں ہوں جو ایک بار حاصل ہو جائے تو پھر روز محشر تک خرچ کرنے کے باوجود اس میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔“ حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا لہجہ نیاز مندانہ تھا' لیکن آپ نے والد گرامی کی بات ماننے سے صریحاً انکار کر دیا تھا۔

مسلم بن زیاد نے اپنے بیٹے کی حد سے بڑھی ہوئی ضد کو سرکشی تصور کیا اور پھر یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ اسے وقت سب کچھ سمجھا دے گا۔

اس تلخ مکالمے کے بعد امام حماد رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ ایک زمانے تک حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ احترام استاد کا یہ حال تھا کہ حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے اس طرح دست بستہ کھڑے رہتے تھے جیسے کوئی نہایت فرمانبردار غلام اپنے آقا کے روبرو حاضر ہو۔ دیکھنے والوں کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ نوجوان شہر کوفہ کا رئیس زادہ ہے جو نہایت معمولی لباس میں حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کا ملازم معلوم ہوتا ہے۔ اس دوران اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم بن زیاد اور امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے یا پھر ان میں پہلی جیسی شدت باقی نہیں رہی تھی۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ نے امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو ایک درہم کا گوشت لانے کے لئے بازار بھیجا۔ حماد رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ میں حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ کی زنبیل تھی اور آپ خدمت استاد کے تصور سے سرشار بازار کی طرف جا رہے تھے کہ اتفاقاً مسلم بن زیاد کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ امیرانہ شان کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے۔ حماد رحمتہ اللہ علیہ کو فقیرانہ حالت میں دیکھا تو گھوڑے کی لگامیں کھینچیں اور نیچے اتر آئے۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ تھوڑے فاصلے پر تھے اور اس طرح چل رہے تھے کہ آپ کو اپنے گردوپیش کا بھی ہوش نہیں تھا۔

"حماد!" مسلم بن زیاد کی بلند و غضب ناک آواز ابھری۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ چلتے چلتے رک گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو والد محترم سامنے کھڑے تھے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" مسلم بن زیاد نے اپنے بیٹے سے اس طرح پوچھا کہ ان کے لہجے میں دنیا بھر کی تلخی سما گئی تھی۔

"بازار۔" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے مختصر جواب دیا لیکن آپ کا لہجہ دھیما اور باپ کے احترام و ادب سے لبریز تھا۔

"بازار میں تمہیں کیا کام ہے؟" مسلم بن زیاد کی سخت گیری لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"استاد گرامی کی ضرورت کا کچھ سامان لینا ہے۔" حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے آہستگی سے کہا۔

"تم نے اپنا حلیہ دیکھا ہے؟" مسلم بن زیاد نے بیٹے کی ظاہری حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیسا ایک طالب علم کا لباس ہونا چاہئے' ویسی ہی قبا میرے بدن پر بھی موجود ہے۔"

پیرہن کی شکستگی کے باوجود امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے میں وہی شان بے نیازی تھی' جو شاہان وقت کو بھی میسر نہیں آتی۔

"تمہارے جسم پر جو لباس موجود ہے اس کا رنگ گداگرانہ ہے۔ تم اپنی قبا کی ظاہری حالت سے ایک بھکاری معلوم ہوتے ہو۔ رئیس کوفہ کے فرزند نظر نہیں آتے۔" مسلم بن زیاد کا غصہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ "افسوس! تم نے تنگ دست فقیہوں کے حلقے میں پہنچ کر خاندانی وقار کو نیلام کر دیا۔" یہ کہہ کر مسلم بن زیاد آگے بڑھے اور اپنے بیٹے

حماد رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھوں سے حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کی زنبیل چھین لی۔ بے شک! وہ ایک مفلس انسان کی زنبیل تھی۔ مسلم بن زیاد جیسے سرگشتہ خمار دولت انسان کی نظر میں اس کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی۔ امیر کوفہ نے زنبیل پر ایک تحقیر آمیز نگاہ ڈالی اور اسے بہت دور پھینک دیا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ بے قرار ہو کر اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھے مگر مسلم بن زیاد کی تیز آواز سن کر رک گئے۔ "آج تک میں نے تمہیں رئیس کوفہ کے لہجے میں پکارا مگر اب میں باپ کی زبان میں حکم دیتا ہوں کہ تم ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ کی درس گاہ میں نہیں جاؤ گے۔"

حضرت امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ آپ احترام استاد سے بھی واقف تھے اور باپ کے اس درجہ بلند سے بھی جو خدا نے بنی نوع انسان کے لئے واضح طور پر قائم کر دیا تھا۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا کرب ناقابل بیان تھا۔ آپ حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کا دامن بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے اور باپ کی نافرمانی کے مرتکب بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ بالآخر امام حماد رحمتہ اللہ علیہ مجبور کر دیئے گئے اور پھر آبائی مکان میں واپس جا کر اس طرح محصور ہو گئے جیسے کوئی قیدی زندان وقت میں اپنی زیست بسر کر رہا ہو۔ ایک شدید اذیت تھی جس نے حماد رحمتہ اللہ علیہ کا صبر و سکون غارت کر دیا تھا' مگر آپ ایک بار بھی والد محترم کے سامنے حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔

تاریخ سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ درس سے دور رہ کر کتنا وقت گزارا لیکن اس حقیقت کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ جب امام حماد رحمتہ اللہ علیہ اپنے والد محترم کے کہنے پر گوشہ نشیں ہو گئے تھے' ان ہی دنوں حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے کیا رخصت ہوئے' کوفے کی مسند فقہ بھی ویران ہو گئی۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ پہلے دل گرفتہ تھے، استاد گرامی کے وصال کے بعد مزید بجھ کر رہ گئے۔

حماد رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں ایک شعلہ نہاں تھا اور آنکھیں اشک ریز تھیں کہ انہیں دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ رات کا وقت تھا۔ اچانک مسلم بن زیاد کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چراغ لے کر باہر نکلے کہ آنے والوں کو روشنی میں پہچان سکیں۔ مسلم بن زیاد نے ایک انسانی ہجوم کو اپنے گھر کے سامنے دیکھا۔

"آپ کون ہیں اور کس لئے آئے ہیں؟" مسلم بن زیاد کی بارعب آواز گونجی۔

"بزرگ! آپ کون ہیں؟" ہجوم میں سے ایک شخص کی آواز ابھری۔ "کیا یہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا مکان نہیں ہے؟"

"میں رئیس کوفہ مسلم بن زیاد ہوں۔ حماد میرا ہی فرزند ہے۔" لہجے میں وہی شان امارت تھی۔

"ہم طالبان حدیث ہیں۔ ہمیں کسی رئیس سے کوئی غرض نہیں۔" دوسرے شخص نے بیباکانہ انداز میں کہا۔ "ہم تو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں کہ ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے بعد وہی ہمارے امیر ہیں۔" کہنے والے کا لہجہ مؤدبانہ تھا' مگر اس کے ایک ایک لفظ سے مسلم بن زیاد کے مادی عروج کی نفی ہو رہی تھی۔

آج پہلی بار رئیس کوفہ کو اپنی بے مائیگی کا احساس ہوا تھا۔ مسلم بن زیاد خاموشی سے واپس آئے اور شکستہ لہجے میں بیٹے سے کہنے لگے۔ "جاؤ! دروازے پر ایک ہجوم تمہارا منتظر ہے۔ بے شک! تمہیں یہ مقام ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ کی زنبیل ہی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔"

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کا حلقۂ درس ان تاریک دنوں میں بھی روشن تھا' جب حجاج بن یوسف کی سفاکیاں اور ولید

بن عبد الملک کی جفا کاریاں عروج پر تھیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ موروثی طور پر نہایت آسودہ حال اور دولت مند انسان تھے۔ اس لئے آپ حکومت وقت کی نوازشات سے بے نیاز ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ اشاعت علم میں مصروف تھے۔ یہ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے گداز قلب اور حسن نیت ہی کا صلہ تھا کہ آپ کی درس گاہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے آفتاب معرفت طلوع ہوئے۔

مشہور بزرگ جامع بن شداد رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس حماد رحمتہ اللہ علیہ کو تختیوں پر لکھتے ہوئے دیکھا۔ آپ بار بار کہہ رہے تھے۔

''میں اس کے ذریعے دنیا نہیں چاہتا۔'' (یعنی علم دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ نہیں بناتا) مغیرہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو ہم نے ان کے جنازے کے پیچھے امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا۔ ہم ان کے پاس آئے اور حلال وحرام کے بارے میں پوچھا تو کوئی نئی چیز معلوم نہ ہو سکی۔ فرائض کے متعلق دریافت کیا تو انہیں بہت زیادہ باخبر پایا۔ پھر ہم حماد رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچے اور ان سے فرائض کے متعلق سوالات کئے مگر حماد رحمتہ اللہ علیہ کے علم میں زیادہ گہرائی نہیں تھی۔

ہاں! وہ حلال وحرام کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے ہم فرائض کا علم اعمش سے اور حلال وحرام کا علم حماد رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل کرتے تھے۔

مغیرہ رحمتہ اللہ علیہ ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ ہم نے ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا۔ ''آپ کے بعد ہم لوگ دین کے مسائل کس سے پوچھیں؟''

ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا...... ''حماد سے......''

مالک بن مغول رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حماد رحمتہ اللہ علیہ کو زرد پیرہن اور ایک چادر میں لپٹے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا۔

اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ بن حماد رحمتہ اللہ علیہ کی بیٹی فرماتی تھیں...... ''میں نے اپنے دادا حماد رحمتہ اللہ علیہ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں اور ان کے آنسو کتاب الٰہی کے اوراق میں جذب ہو رہے ہیں۔''

امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی میں علمی کمالات کے علاوہ دیگر صفات بھی جمع ہو گئی تھیں۔ آپ رمضان المبارک کے مہینے میں روزانہ پچاس آدمیوں کو افطار کے ساتھ کھانا کھلاتے تھے اور عید کے دن ان میں سے ہر شخص کو عمدہ قسم کا لباس اور سو درہم دے کر رخصت کرتے تھے۔ امام حماد رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''میں امام حماد رحمتہ اللہ علیہ سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک بار امام رحمتہ اللہ علیہ سفر پر جا رہے تھے کہ ان کے گھوڑے کی زین ٹوٹ گئی۔ جب ایک موچی زین کی مرمت کر چکا تو امام حماد رحمتہ اللہ علیہ نے اس کار گزاری کے عوض اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی پیش کی اور اس سے معذرت چاہی۔'' انکسار اور فیاضی کی یہ اعلیٰ ترین مثال امام حماد رحمتہ اللہ علیہ ہی پیش کر سکتے تھے۔''



حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ

حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ 27ھ میں جند کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام اسلم تھا۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ میسرہ بن خیثم کے غلام تھے۔ یہ حضرت عثمان غنیؓ کا عہد خلافت تھا۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی ابتدائی تربیت مکہ معظمہ میں ہوئی۔

حضرت عطا بن ابی رباح نسلاً حبشی تھے اور ہیئت کے اعتبار سے ایک بدشکل انسان تھے۔ رنگ بہت زیادہ سیاہ تھا۔ جسم پر ہمیشہ رعشے کی کیفیت طاری رہتی تھی، آنکھوں میں کجی تھی، پاؤں میں لنگ موجود تھا اور آخر میں بینائی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ اگر ظاہری طور پر دیکھا جائے تو حضرت عطاء کی شخصیت میں تمام جسمانی عیوب نظر آتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی گردن میں طوق غلامی بھی موجود تھا' مگر قدرت کی اس نوازش بے پایاں کا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ علم و فضل کے سبب حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی بدصورتی حسن لازوال میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور غلامی اس شہنشاہیت میں ڈھل گئی تھی جو حشر کے دن تک ایک لمحے کے لئے بھی آمادہ زوال نہ ہو گی۔

مشہور محدث حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک بار سلیمان بن ہشام نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا اب بھی مکے میں کوئی بڑا عالم موجود ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "ایک مکے پر کیا منحصر ہے، اس جیسا علم رکھنے والا تو پورے جزیرۃ العرب میں بھی نظر نہیں آتا۔"

سلیمان بن ہشام نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "آخر وہ شخص کون ہے؟"

میں نے جواباً کہا۔ "وہ عالم و فاضل انسان حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔"

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی شان میں اس طرح رطب اللسان ہوئے۔ تابعین میں حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ کوئی حدیث پر عمل کرنے والا نہیں تھا۔"

علامہ ابن سعد کا قول ہے کہ اہل مکہ کے مفتی صرف دو بزرگ تھے۔ ایک مجاہد رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے عطا رحمتہ اللہ علیہ مگر عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ مجاہد رحمتہ اللہ علیہ پر بھی سبقت لے گئے تھے۔

ویسے تو حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ فقہ کی تمام جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے مگر خصوصیت کے ساتھ مسائل حج کے بڑے عالم تھے۔ اسلم منقری کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ابوجعفر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک عطا بن ابی رباح

رحمتہ اللہ علیہ جاتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر ابو جعفر بے اختیار کہنے لگے۔

''اب روئے زمین پر کوئی شخص عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ مناسک حج کا علم رکھنے والا نہیں ہے۔''

انتہا یہ ہے کہ خلفائے وقت بھی مناسک حج کی تعلیم کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک بار خلیفہ سلیمان بن عبدالملک' حضرت عطا کی مجلس علم میں حاضر ہوا اور آپ نے اسے مناسک حج کی تعلیم دی۔

خود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے ارکان حج سے فارغ ہونے کے بعد خط بنوانا چاہا۔ اتفاق سے کچھ دیر بعد مجھے ایک حجام مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا اجرت لو گے؟''

حجام نے جواباً کہا۔ ''تم خط بنوالو عبادات میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔''

حجام کی بات نے مجھے متاثر کیا اور میں قبلے سے ذرا مڑ کر بیٹھ گیا۔

حجام نے فوراً کہا۔ ''قبلہ رو ہو کر بیٹھو۔'' اس کا لہجہ بہت نرم مگر اثر انگیز تھا۔

پھر میں نے چاہا کہ حجام سر کے بائیں جانب سے خط بنانے کا آغاز کرے لیکن اس نے کہا کہ سر کا دایاں حصہ میری طرف کرو۔

پھر اس نے اپنے کام کا آغاز کر دیا' مگر میں خاموش رہا۔ میرے ہونٹوں پر مہر سکوت دیکھ کر حجام بولا۔ ''تکبیر کہو۔'' جواباً میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

فراغت پانے کے بعد میں نے چاہا کہ اٹھ کر چلا جاؤں تو حجام نے درمیان میں مداخلت کی۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا۔ ''اپنی قیام گاہ پر۔''

حجام کہنے لگا۔ ''پہلے دو رکعتیں پڑھ لو۔ پھر چلے جانا۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اس کے طرز عمل پر حیران رہ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ اس شخص نے ضرور کسی عالم سے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ آخر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو میں نے اس سے دریافت کیا کہ تمہیں یہ سب کچھ کہاں سے حاصل ہوا ہے؟

جواب میں حجام نے کہا۔ ''میں ایک عام انسان ہوں۔ مجھے کسی چیز کا بھی علم نہیں۔ میں آج تک کسی عالم کی درس گاہ میں بھی نہیں گیا ہوں' مگر میں نے اپنی آنکھوں سے حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔''

فقہ میں حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی وسعت نظر کا یہ حال تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے صحابی جلیل آپ کے علم پر گواہی دیتے تھے۔ مشہور و مستند روایت ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ مکہ تشریف لاتے تو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مختلف مسائل دریافت کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تمام سوالوں کے جوابات دے کر اہل طلب کو مطمئن کر دیتے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے۔

''تم لوگ میرے لئے مسائل جمع کر رکھتے ہو حالانکہ تمہارے پاس عطا ابن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ موجود ہیں۔''

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ خود بھی ایک بلند پایہ فقیہ تھے مگر جب حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر آتا تھا تو کسی تکلف کے بغیر بڑے والہانہ انداز میں فرماتے تھے۔

''جہاں تک فتویٰ دینے کا تعلق ہے تو عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ تمام اہل مکہ سے سبقت لے گئے ہیں۔''

ابراہیم بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے حج کے زمانے میں خلفائے بنوامیہ کی طرف سے ایک اعلان خاص جاری کیا جاتا تھا۔ اس اعلان کے مطابق حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے سوا کسی دوسرے فقیہ کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی فرمایا کرتے تھے۔

''اہل مکہ! تم میرے قریب جمع ہو جاتے ہو حالانکہ تمہارے پاس عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ موجود ہیں۔''

محمد بن عبداللہ دیباج رحمتہ اللہ علیہ کہتے تھے۔ ''میں نے عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ سے بہتر کوئی مفتی نہیں دیکھا۔ ان کی مجلس ذکر الٰہی کی مجلس ہوتی تھی۔ ان سے جو بات بھی پوچھی جاتی تھی' اس کا جواب بہت عمدہ طریقے سے دیتے تھے۔''

اس وسعت علم اور نظر کی گہرائی کے باوجود حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ اس بات کا جواب نہیں دیتے تھے جو آپ کے دائرہ علم میں نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا موقع آ جاتا تھا کہ اگر آپ چاہتے تو اہل مجلس کے سامنے اپنی رائے پیش کر سکتے تھے' لیکن حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ عبدالعزیز بن رفیع رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے جواباً فرمایا۔

''میں نہیں جانتا کہ اس بات کا کیا مفہوم ہے؟ واللہ! میں تمہارے مسئلے کا حل پیش کرنے سے عاجز ہوں۔''

''حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر اہل مجلس نے بیک زبان کہا۔ ''تو پھر کیا آپ اس سلسلے میں اپنی رائے نہیں دیں گے؟''

یہ سن کر کچھ دیر تک حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ خاموش رہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ ''مجھے اپنے اللہ سے شرم آتی ہے کہ زمین پر میری رائے کی اطاعت کی جائے۔''

پھر بھی اگر کبھی اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنا پڑتا تو برملا کہہ دیتے۔ ''لوگو! غور سے سن لو کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔''

حضرت ابن جریج رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عطا رحمتہ اللہ علیہ کوئی مسئلہ بیان کرتے تو میں پوچھتا۔ ''یہ علم ہے یا آپ کی رائے ہے؟'' اگر وہ کسی صحابی کی تقلید ہوتی تو فرماتے کہ یہ علم ہے اور اگر قیاس ہوتا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ میری رائے ہے۔

اور جہاں تک حدیث رسول ﷺ کا تعلق ہے تو حضرت امام محمد باقر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ ''جہاں تک ہو سکے عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی حدیثیں سنو۔'' حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ علم حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا' حضرت امیر معاویہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عقیلؓ بن ابی طالب' حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے

حدیث کی سماعت کی تھی۔

حدیث کے سماع اور درس کے وقت آپ کی مجلس علم کے عجیب آداب ہوتے تھے۔۔۔ اور روایت حدیث کے دوران کوئی شخص غلطی سے بول پڑتا تو حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا اور کبھی کبھی آپ سخت جلال میں نظر آنے لگتے۔

حضرت معاذ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے حدیث رسول ﷺ بیان کرنی شروع کی۔ تمام اہل مجلس سر جھکائے...... دست بستہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک دوسرے شخص نے روایت حدیث کرنے والے کو ٹوک دیا۔

حضرت عطا ابی بن رباح رحمتہ اللہ علیہ سماعت حدیث کے دوران اس گستاخانہ مداخلت کو برداشت نہیں کر سکے۔ چہرہ جلال سے تمتما اٹھا اور آپ شدید عالم طیش میں فرمانے لگے۔

"یہ کیسے اخلاق ہیں...... اور یہ کیسی طبیعتیں ہیں؟ خدا کی قسم! اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص مجھ سے حدیث بیان کرتا ہے۔ اگرچہ میں اس حدیث کا اس سے زیادہ علم رکھتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے وہ حدیث خود مجھی سے سنی ہو لیکن پھر بھی خاموش رہتا ہوں اور اس شخص پر یہ ظاہر کرتا ہوں کہ جیسے میں نے یہ حدیث اس سے قبل کسی سے سنی ہی نہیں۔"

حضرت سلمہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے صرف تین اشخاص ایسے دیکھے ہیں جنہوں نے محض اللہ کی خوشنودی کے لئے علم حاصل کیا ہے۔ طاؤس رحمتہ اللہ علیہ مجاہد رحمتہ اللہ علیہ اور عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ۔"

حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ غیر معمولی ذہانت وفراست کے مالک تھے۔ ایک بار مشہور محدث حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ اپنی مجلس میں منافقت کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے منافق کی تین علامتیں بتائیں۔ پہلی یہ کہ جھوٹ بولے۔ دوسری یہ کہ امانت میں خیانت کرے...... اور تیسری یہ کہ اگر کسی سے وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں اس وقت حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ بھی موجود تھے...... حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر سن کر آپ نے فرمایا۔ "یہ تینوں عادتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں موجود تھیں۔ انہوں نے جھوٹ بات کہی' امانت میں خیانت کی اور وعدہ کر کے خلاف ورزی کی لیکن اس کے باوجود اللہ نے ان کی نسل میں نبی پیدا کیا۔"

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے عطا رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر بے اختیار فرمایا۔ "ہر صاحب علم کے اوپر ایک اور علم والا موجود رہتا ہے۔"

علم وفضل کے علاوہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نہایت عابد و زاہد انسان تھے۔ آپ کے کردار کی بلندی دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ کو تو یہاں تک کہنا پڑا کہ...... "خدا کی قسم! میں تمام روئے زمین کے لوگوں کا ایمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایمان کے' اور تمام اہل مکہ کا ایمان حضرت عطا بن رباح رحمتہ اللہ علیہ کے ایمان کے برابر نہیں دیکھتا......"

حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ اپنے والدین کے انتقال کے بعد جب تک زندہ رہے' روزانہ ان کی طرف سے مسکینوں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے رہے۔ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ بیس سال تک مسجد کا فرش

آپ کا بستر رہا۔ تہجد کی نماز میں دوسو یا اس سے زیادہ آیات قرآنی کی تلاوت کرتے تھے۔ ابومعاویہ مغربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سجدے کے نشانات حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ کی دونوں آنکھوں کے درمیان دیکھے ہیں۔
مستقل طور پر مکہ معظمہ میں رہتے تھے۔ اس لئے ہر سال سعادت حج سے شرف یاب ہوتے تھے۔ ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں ستر حج کیے۔

حج عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ 115ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر اٹھاسی سال تھی۔ دیار مکہ آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ حضرت میمون رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کی وفات کی خبر سنی تو رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"آج دنیا سے وہ شخص اٹھ گیا جس کے بعد زمین پر اس کا کوئی مثل موجود نہیں ہے۔"



حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا خاندانی نام سلیمان تھا اور ابو محمد کنیت تھی۔ آپ کے والد محترم مہران نسلی اعتبار سے عجمی تھے۔ آپ کا آبائی وطن طبرستان تھا۔ قبیلہ بنو کاہل کے غلام تھے اور اسی نسبت سے "کاہلی" کہلاتے تھے۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا یوم پیدائش بھی تاریخی لحاظ سے ایک خون رنگ حیثیت رکھتا تھا۔ جس روز حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا، اسی دن حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ 10 محرم 60ھ کو "دنباوند" میں پیدا ہوئے۔ دنباوند "رے" کا ایک علاقہ ہے۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے والد مہران ترک سکونت کر کے کوفے میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کا یہ گوشہ تحقیق طلب ہے کہ آپ نے بھی اپنی زندگی کا کچھ حصہ عملی طور پر غلامی میں گزارا ہے یا پیدائش کے وقت آپ کے والد آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہر حال حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا تعلق ایک غلام خاندان سے تھا مگر آپ فطرتاً ایک شہنشاہ سے بھی زیادہ حریت پسند تھے۔ لوگ آپ کو غلام زادہ کہہ کر سنگ زنی کرتے تھے مگر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے کہنے والوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اگر کبھی کسی شخص نے برسر محفل طنز سے کام لیا تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بڑی بے باکی کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔

"خدا نے کسی بچے کو غلام پیدا نہیں کیا۔ یہ سب وحشیانہ رسمیں انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ عنقریب میرا خدا ایسی تمام رسموں کو تباہ کر دے گا اور بنی نوع آدم کی گردنیں طوق غلامی سے نجات پا جائیں گی۔"

کبھی آپ کا جوش گفتار انتہا کو پہنچ جاتا اور بہ آواز بلند فرمانے لگتے۔ "جسم کی غلامی کو غلامی نہیں کہتے۔ دل، روح اور ذہن کی غلامی ہی حقیقی غلامی ہے اور میرے خدا نے میرے دل کو بھی آزاد بنایا ہے اور میری روح کو بھی زنجیروں کی پہنچ سے دور رکھا ہے۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا یہی جذبہ حریت تھا جس نے آپ کو اپنے آباؤ اجداد کی غلامی پر کبھی شرمسار نہیں ہونے دیا اور اسی شوق آزادی نے آپ کو علم کی طرف متوجہ کیا۔ اس وقت سرزمین کوفہ علم و فن کا ایسا گہوارہ تھا کہ جہاں عالم اسلام کے بڑے بڑے محدثین و فقہا جمع ہو گئے تھے۔ علم کے سلسلے میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے ذوق طلب کا یہ حال تھا کہ کم سنی کے باوجود دیگر بچوں کی مانند کھیل کود کی طرف دھیان نہیں دیتے تھے۔ کتابوں میں اس طرح گم رہتے کہ اکثر آپ کو کھانے تک کا خیال نہ رہتا تھا اور اس وقت چونکتے جب مادر گرامی یاد دلاتیں کہ

کھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ فطری ذہانت اور دیوانگی کی حدوں کو چھونے والی طلب علم نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو نوعمری ہی میں علمائے کوفہ کا مرکز نظر بنا دیا تھا۔

حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو ''شیخ الاسلام'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ بن یونس رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ ''ہم نے اور ہمارے پیشرو لوگوں نے اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا مثل کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔''

مشہور محدث اور حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے استاد گرامی حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ ''امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کتاب اللہ کے بڑے قاری' احادیث کے بڑے حافظ اور علم فرائض کے بڑے ماہر تھے۔''

حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ کے بقول' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اسلام کے ''علامہ'' تھے اور آپ کو تمام مذہبی علوم میں یکساں کمال حاصل تھا۔

ابن مدینی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ محمد مصطفےٰ ﷺ کی امت میں چھ بزرگوں نے علم کو محفوظ رکھا ہے۔ مکے میں عمرو بن دینار رحمتہ اللہ علیہ نے۔ مدینے میں امام زہری رحمتہ اللہ علیہ نے۔ بصرے میں قتادہ رحمتہ اللہ علیہ اور یحیٰ بن ابی کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے اور کوفے میں ابواسحٰق اور اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے۔

یوں تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ تمام اسلامی علوم میں امامت کا درجہ رکھتے تھے مگر قرآن کریم سے آپ کو اس قدر عشق تھا کہ اس کیفیت کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ مشہور محدث حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ جب کبھی امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر کرتے تو آپ کی زبان مبارک سے یہی ایک لفظ ادا ہوتا۔ ''قرآن۔ قرآن''

عمرو بن علی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ سچ بولنے کی وجہ سے لوگ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو ''قرآن'' کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو قرآنی علوم کا سردار قرار دیتے تھے۔

ہشیم رحمتہ اللہ علیہ نے بارہا اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''میں نے کوفے میں اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ بہتر قرأت کرنے والا نہیں دیکھا۔''

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ دیگر علوم کے ساتھ قرآن کریم کا درس بڑے ذوق و شوق سے دیتے تھے۔ حضرت طلحہ بن مصرف رحمتہ اللہ علیہ نے آپ سے ہی قرآن مقدس کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر آخری عمر میں ضعف و ناتوانی کے سبب امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے درس قرآن ترک کر دیا تھا۔ فہم قرآن کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے اپنے قرآن لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی قرأت کے مطابق اصلاح کرتے جاتے تھے۔ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔

علم حدیث میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے مرتبے کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے محدثین نے آپ کو ثقہ تسلیم کیا ہے۔ حضرت یحیٰ بن معین رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت جریر رحمتہ اللہ علیہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے کوئی حدیث روایت کرتے تھے تو بعد میں فرمایا کرتے تھے۔ ''یہ شاہی خلعت ہے۔''

حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ حدیث رسول ﷺ کے سلسلے میں اہل عراق کے علم کے قائل نہیں تھے۔ اسحاق

ابن رشد رحمتہ اللہ علیہ نے امام زہری رحمتہ اللہ علیہ سے ایک بار کہا کہ کوفے میں ایک غلام زادہ ہے جو چار ہزار احادیث بیان کرتا ہے۔"

"چار ہزار احادیث؟" حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھر آئے تھے۔"اسحٰق! یہ کس طرح ممکن ہے؟ کہیں تمہارا حافظہ تو تمہیں فریب نہیں دے رہا؟"

"نہیں، امام! مجھ سے سننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔" اسحٰق ابن رشد رحمتہ اللہ علیہ نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا۔"بنو کاہل کا وہ غلام بطور دعویٰ یہ بات کہتا ہے کہ اسے رسالت مآب ﷺ کی چار ہزار احادیث یاد ہیں۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اس کی اسناد ثقہ ہیں اور روایات نہایت معتبر ہیں۔"

حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ اسحٰق ابن رشد کی گفتگو سن کر خاموش ہو گئے۔ چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے آپ کو اسحٰق رحمتہ اللہ علیہ کی فراہم کردہ معلومات پر یقین نہ ہو۔

حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کو خاموش دیکھ کر اسحٰق ابن رشد رحمتہ اللہ علیہ دوبارہ کہنے لگے۔" امام! اگر آپ فرمائیں تو میں اس کا کچھ حصہ آپ کے سامنے پیش کروں۔"

"یقیناً لاؤ۔ میں اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہوں۔" حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ بہت مضطرب نظر آ رہے تھے۔

دوسرے دن اسحٰق ابن رشد رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں کچھ کاغذات پیش کیے۔ یہ ان احادیث کا قلمی مسودہ تھا جو امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے تھے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے مسودے کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر جیسے جیسے روایات کو پڑھتے جاتے تھے' حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ بے ساختہ پکار اٹھے۔

"خدا کی قسم! یہ علم ہے کہ جس کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ یہ کسی کے پاس بھی نہیں ہوگا۔"

مشہور محدث امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔"مجھے حدیث میں کسی نے اتنی شفا نہیں دی جس قدر اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے بخشی ہے۔"

ایک بار کسی جگہ حضرت قاسم بن عبد الرحمٰن اور دوسرے محدثین جمع تھے کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ ادھر سے گزرے۔ آپ کو دیکھ کر قاسم بن عبد الرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔"یہ امام اعمش ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔"

مشہور بزرگ حضرت ابوبکر بن عیاش رحمتہ اللہ علیہ برملا فرماتے تھے۔"اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت اعمش رحمتہ اللہ علیہ سید المحدثین ہیں۔"

امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ احادیث کی کثرت روایت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔"تم جب حدیث رسول ﷺ سننے کے لئے کسی کے پاس جاتے ہو تو اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتے ہو۔ خدا کی قسم! یہ لوگ انسانوں کے درمیان شر پیدا کرنے والے ہیں۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ قرآن و حدیث کے ساتھ فقہ کے بھی زبردست عالم تھے۔ مشہور محدث حضرت

سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ "حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ چار چیزوں میں اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھ گئے۔ ان میں فرائض کا علم بھی شامل ہے۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی عظمت پر یہ بڑی گواہی ہے کہ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم وجلیل محدثین کا شمار آپ کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔

یہی وہ علم وفضل تھا جس نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو حد سے زیادہ خود دار وقناعت پسند بنا دیا تھا۔ اگر چہ دنیا کے مطابق غلام زادے تھے لیکن مجلس اعمش رحمتہ اللہ علیہ میں بڑے سے بڑا حکمراں بھی ایک گدا گر معلوم ہوتا تھا۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے بقول

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی

امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو کھانے کے لئے روٹی تک میسر نہیں تھی' لیکن اس کے باوجود آپ کی مجلس میں سلاطین وامراء' فقیروں کی مانند نظر آتے تھے۔

عیسیٰ بن یونس کا بیان ہے۔ "اگر چہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ مفلس وضرورت مند تھے' لیکن آپ نے کبھی کسی صاحب ثروت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ فرمانروائے وقت بھی آپ کی نظر میں سب سے زیادہ حقیر تھا۔"

اہل دنیا نے اپنے نظریات اور پسند و ناپسند کے مطابق تاریخ کے ساتھ بڑا مذاق کیا ہے لیکن پھر بھی گردش روزگار نے اس واقعے کو اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے۔ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے فقر وقناعت اور بے نیازی کے واقعات اس قدر شہرت پا گئے تھے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالمالک کے کانوں تک بھی یہ خبریں پہنچ گئیں۔ ایک دن اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا۔

"آخر یہ کون شخص ہے جو اس قدر بے نیازی کے مظاہرے کرتا ہے؟"

ہونا تو چاہئے تھا کہ اہل دربار ایک محدث وفقیہ کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے مگر خلیفہ کے مصاحبوں نے عجیب روش اختیار کی۔ کہنے والوں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "قبیلہ بنو کاہل کا ایک غلام ہے۔ علم و فضل کا دعویٰ کرتا ہے مگر بھوک اور احتیاج نے اس کے دماغ کو پراگندہ کر دیا ہے۔ افلاس ومحرومی کے سبب امراء کی دولت اور اقتدار سے حسد کرتا ہے۔"

کسی دوسرے درباری نے خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نیا لہجہ اختیار کیا۔

"یہ سب ناقابل فہم باتیں ہیں۔ بے بنیاد داستانیں ہیں جو بے سبب شہرت پا گئی ہیں۔ ابھی وہ شخص دور آزمائش سے نہیں گزرا ہے۔ اگر کبھی کسی امتحان میں مبتلا ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ اس کا یہ طنطنہ برقرار نہیں رہے گا۔"

اہل دربار حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کر رہے تھے اور خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی پیشانی شکن آلود ہوتی جارہی تھی۔ اس نے کئی اکابر علماء سے ملاقاتیں کی تھیں' مگر پہلی بار ایک ایسے محدث وفقیہ کے بارے میں سنا تھا جو اپنی ذات میں بڑا قلندر تھا۔

بالآخر ہشام بن عبدالملک کے ذہن نے نئی کروٹ لی۔ اس نے درباری محرر کو طلب کیا اور حضرت امام اعمش

رحمتہ اللہ علیہ کے نام ایک خط تحریر کرنے کا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد جب محرر کا قلم رکا تو صفحہ قرطاس پر یہ عبارت درج ہو چکی تھی۔

''امیر المومنین ہشام بن عبد الملک کی طرف سے سلیمان بن مہران (اعمش رحمتہ اللہ علیہ) کے نام۔

''تمہیں لازم ہے کہ فوری طور پر حضرت عثمان غنیؓ کے فضائل اور حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے عیوب لکھ کر بھیج دو۔''

ہشام بن عبد الملک نے ایک محدث وفقیہ کو آزمانے کے لئے بڑا خوف ناک منصوبہ تیار کیا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ یہ ایک ہولناک آزمائش تھی جس سے گزرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہو جائے اور اس کا لباس شعلوں کے اثر سے محفوظ رہے۔

بہر حال ہشام بن عبد الملک کا خط لے کر درباری قاصد کوفے پہنچا اور لوگوں سے پوچھنے لگا کہ سلیمان بن مہران کون ہیں اور کہاں ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ اہل کوفہ نے امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا پتا بتا دیا۔ جب قاصد عظیم وجلیل محدث کی بارگاہ علم میں داخل ہوا تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کو درس دے رہے تھے۔ قاصد نے دیکھا کہ آپ کا لباس بوسیدہ ہے' جسم فاقوں کی کثرت سے کمزور ہو چکا ہے' لیکن چہرے پر جلال معرفت کی ایسی آگ روشن ہے جسے دیکھتے ہی اہل دنیا کی آنکھیں جل اٹھیں۔ قاصد بھی امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے جلال سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر وہ کانپتے قدموں سے آگے بڑھا اور سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے نظر اٹھا کر قاصد کی طرف دیکھا۔ آپ کے چہرے پر ناگواری کا رنگ نمایاں تھا۔ ''کیا تمہیں آداب مجلس کا علم نہیں؟''

''میں امیر المومنین کا حکم نامہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' قاصد نے لکنت زدہ آواز میں کہا۔

''کیا تو نہیں دیکھتا کہ میں اہل طلب کو اس ذات مقدس کا فرمان سنا رہا ہوں جو سلطانوں کا سلطان اور شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ جس کے دربار میں امیر المومنین کی حیثیت بھی ایک غلام سے زیادہ نہیں۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اس وقت حدیث رسول ﷺ کا درس دے رہے تھے۔

مجبوراً قاصد بھی اسی فرش خاک پر بیٹھ گیا جہاں دیگر طالب علم بیٹھے ہوئے تھے۔

جب درس ختم ہوا تو امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ قاصد سے مخاطب ہوئے۔ ''اب تم بتاؤ کہ امیر المومنین کو مجھ سے کیا کام ہے جب کہ میں ان سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔'' حضرت! اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا طرز کلام بے باکانہ تھا جسے سن کر اہل مجلس کے چہروں کے رنگ بدل گئے تھے اور انہیں پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ ان کا امام دربار خلافت سے آنے والے کے ساتھ کس طرح گفتگو کرتا ہے؟

''یہ ایک حکم خاص ہے جس پر فوراً عمل پیرا ہونے کے لئے کہا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر قاصد نے حضرت اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی طرف ایک کاغذ بڑھایا' جس پر مہر خلافت روشن تھی۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اکثر اہل دنیا کو دیکھا گیا تھا کہ خلیفہ وقت کے فرمان کو پہلے سر پر رکھتے تھے اور پھر اسے اپنے ہونٹوں کا بوسہ دے کر اس طرح پڑھتے تھے جیسے وہ

دربار خلافت میں بہ نفس نفیس موجود ہوں اور جلال حکمرانی سے ان کی سانسیں تک رکی جا رہی ہوں۔ علماء سے ایسی حرکات تو سرزد نہیں ہوتی تھیں۔ پھر بھی فرمان خلافت کو بڑے ادب سے کھولتے تھے اور اس کے ایک ایک حرف کو رک رک کر پڑھتے تھے کہ اس طرح خلیفہ کے احترام کا اظہار ہو جائے' مگر جب قاصد نے ہشام بن عبدالملک کا خط حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے کیا تو آپ نے اس طرح اپنا ہاتھ بڑھایا جیسے کسی ناگوار عمل پر مجبور کیا جا رہا ہو۔

پھر اہل مجلس نے دیکھا' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے فرمان خاص کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لئے امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا چہرہ پرسکون رہا مگر پھر فوراً آپ کی ظاہری حالت میں نمایاں تغیر نظر آنے لگا۔ اہل مجلس نے اپنے اپنے اندازوں سے سمجھ لیا کہ ہشام بن عبدالملک کا فرمان کسی ناخوشگوار واقعے کی طرف اشارہ کر رہا ہے' جیسے جیسے امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ خلیفہ کے مکتوب کو پڑھتے جاتے تھے' آپ کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے ہشام بن عبدالملک کے فرمان کا آخری حرف بھی پڑھ لیا تو بڑے تلخ انداز میں شاگردوں سے مخاطب ہوئے۔

''تم میں سے کوئی شخص اٹھ کر دیکھے کہ باہر کوئی بکری تو موجود نہیں۔'' حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی گفتگو سن کر پوری مجلس پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ''اگر قریب ہی کوئی بکری نہ ملے تو پھر اسے تلاش کر کے میرے پاس لاؤ۔''

کسی کو خبر نہیں تھی کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کیا چاہتے ہیں اور آپ کو ایک بکری کی جستجو کیوں ہے اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا فرمان خاص پڑھ کر آپ پر یہ ردعمل کس لئے ظاہر ہوا تھا؟

امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا حکم سنتے ہی ایک شاگرد مجلس درس سے اٹھ کر بکری کی تلاش میں چلا گیا اور دیگر حاضرین دم بخود بیٹھے رہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حضور امام رحمتہ اللہ علیہ لب کشائی کر سکے۔

پھر اہل مجلس نے دیکھا کہ حضرت اعمش رحمتہ اللہ علیہ ہشام بن عبدالملک کے قاصد سے اس طرح مخاطب تھے۔ ''تمہیں امیرالمومنین کے فرمان کا جواب حاصل کرنے کے لئے کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔''

قاصد خود بھی حیران و پریشان تھا۔ مجبوراً خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جو اپنی ظاہری حالت سے افلاس زدہ نظر آتا تھا مگر اس کی بے نیازی اور انداز تغافل، آمران وقت سے بڑھ کر تھا۔ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے خلیفہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا وہ نہایت تحقیر آمیز تھا' لیکن قاصد میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک مرد قلندر کی بارگاہ میں اپنے ہونٹوں کو جنبش دے سکے۔

کچھ دیر بعد اہل مجلس نے دیکھا کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا ایک شاگرد ایک بکری کو کھینچتا ہوا مجلس درس میں داخل ہو رہا ہے' عجیب منظر تھا۔ حاضرین کی سانسیں تک رک گئی تھیں۔ کسی شخص نے آج تک امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا یہ حیران کن طرز نہیں دیکھا تھا۔

''اسے میرے نزدیک لے آؤ۔'' امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے شاگرد کو حکم دیا۔

جب وہ شخص بکری کو لے کر امام کے قریب پہنچا تو حضرت اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے ہشام بن عبدالملک کا فرمان خاص بکری کے منہ میں رکھ دیا۔ اہل مجلس کو محسوس ہوا جیسے نبض کائنات تھم گئی ہو۔

حاضرین نے امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازیاں بارہا دیکھی تھیں' مگر اس بار آپ کا انداز ہی کچھ اور تھا

کہاں وہ جماعت جو خلیفہ وقت کے مکتوب کو آنکھوں سے لگاتی تھی اور کہاں یہ مرد قلندر کہ ایک مطلق العنان حکمران کے خط کو اس قدر بے حقیقت ثابت کر رہا تھا۔

ہشام بن عبدالملک کا قاصد شدید حیرت و استعجاب کے عالم میں خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔

بالآخر جب بکری نے ہشام کے خط کو چبا کر پارہ پارہ کر دیا تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے قاصد کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اب تم واپس جاؤ۔ میرے نزدیک تمہارے امیر المومنین کے فرمان کا یہی مناسب جواب ہے۔"

قاصد، امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی گرمی گفتار کا متحمل نہیں ہو سکا۔ اس کے اعصاب پر اس قدر دہشت غالب آ گئی کہ وہ اقتدار کا نمائندہ ہونے کے باوجود کانپنے لگا۔

"امام! آپ کو خدا کا واسطہ، اپنے قلم سے کچھ نہ کچھ تحریر کر دیجئے۔" شدت خوف سے قاصد کا لہجہ رقت آمیز ہو گیا تھا۔

"مجھے جو کچھ کہنا تھا، وقت کی پیشانی پر لکھ دیا۔ اگر تمہارا امیر فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث اس تحریر کو نہیں پڑھ سکتا تو تم اسے زبانی بتا دینا کہ میں نے کیا لکھا؟" حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے سے شدید نفرت و بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مجھے جو کچھ پڑھنا تھا، میں نے اس طرح پڑھ لیا کہ ایک ایک حرف آخری سانس تک میرے ذہن پر نقش رہے گا۔" قاصد کے لہجے کی رقت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیا ہشام سمجھتا ہے کہ میں حضرت علیؓ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کر سکتا ہوں۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے غضب ناک ہو کر فرمایا۔ "خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دل میں یہ حسرت لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔"

"امام جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں۔ پھر بھی میری حالت پر رحم فرمائیے۔ اگر میں آپ کا جواب لئے بغیر خالی ہاتھ چلا گیا تو ہشام مجھے قتل کرا دے گا۔" موت کے احساس سے قاصد کا پورا جسم لرز رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے ایک نظر قاصد کی طرف دیکھا اور پھر آپ کو اس کی حالت زار پر رحم آ گیا۔

"کاغذ اور قلم لاؤ۔" حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی پر جلال آواز گونجی۔ آپ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک شاگرد سے فرما رہے تھے۔

پھر اہل مجلس نے دیکھا کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کاغذ پر یہ عبارت تحریر کر رہے تھے۔

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔"

"واضح رہے کہ اگر حضرت عثمان غنیؓ کی ذات میں تمام دنیا کی خوبیاں جمع ہو جائیں تب بھی تجھے ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور یہ حقیقت بھی تجھ پر آشکار ہو جانا چاہئے کہ اگر (معاذ اللہ) حضرت علیؓ بن ابی طالب کی ذات میں سارے عالم کی برائیاں جمع ہو جائیں تو ان سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

اس صورت میں تجھے لازم ہے کہ اپنے نفس کی خبر لے۔"

قاصد جواب لے کر رخصت ہو گیا۔ چلتے وقت اس نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا شکریہ ادا کیا کہ آپ کے تحریر کردہ خط نے اس کی جان بچالی ورنہ وہ بے موت مارا جاتا۔

بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ جب قاصد، امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا جواب لے کر ہشام بن عبدالملک کے دربار میں پہنچا تو خاندان بنوامیہ کے اس حکمران نے بے قرار ہو کر قاصد کے ہاتھ سے خط لے لیا اور شدید اضطراب کے عالم میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی تحریر پڑھنے لگا۔ پھر جب وہ آخری سطر تک پہنچا تو اہل دربار نے دیکھا کہ چند لمحوں کے لئے ہشام بن عبدالملک کے چہرے کا رنگ مسخ ہو گیا ہے۔ آج خلیفہ وقت کے ساتھ اہل دربار نے بھی اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ ایک محدث و فقیہ کے قلم میں شمشیر اقتدار سے زیادہ کاٹ ہے۔

زیر نظر واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ میں کس قدر جرأت گفتار تھی اور آپ کی بے باکی کا انداز کیا تھا؟ علامہ اقبال نے ایک موقع پر کہا ہے ؎

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے آپ کا جسم بھی آزاد تھا اور دل بھی ؎

نہ ایمائے خواہش نہ اظہار مطلب
مرے منہ کو اہل کرم دیکھتے ہیں

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو بھی کسی سے کوئی غرض تھی نہ طمع' اس لئے آپ اپنی رائے کے اظہار میں بہت زیادہ سخت نظر آتے تھے۔ مشہور بزرگ حضرت ابوبکر بن عیاش رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک بار میں چند محدثین کی خدمت میں حاضر ہوا پھر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس تک پہنچا۔ مجھے دیکھ کر آپ نے دریافت کیا۔

"تم نے کس کس سے ملاقات کی اور کہاں کہاں ہو کر آئے ہو؟"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کے سوال کے جواب میں' میں نے فرداً فرداً ایک ایک محدث کا نام لیا۔

امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے کسی کے بارے میں کہا کہ۔ "وہ تو پھٹا ہوا طبل ہے۔"

کسی کے متعلق فرمایا۔ "وہ تو اڑنے والا پرندہ ہے۔"

کسی کی ذات پر اس طرح تبصرہ کیا کہ وہ تو ایک دف کی مانند ہے۔ غالباً اسی بے باکی کے سبب کچھ لوگ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو تند مزاج کہتے تھے۔ لہجے کی اس تلخی کے باوجود حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی فطرت میں ایک عجیب شگفتگی پائی جاتی تھی۔ علامہ ابن خلکان رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بڑے خوش مزاج اور ظریف انسان تھے۔

ایک بار حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ اور آپ کی بیوی میں کچھ رنجش ہو گئی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ نے ثالثی کے طور پر اپنے ایک دوست کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ ذہانت و تدبر کے ساتھ مسئلے کا کوئی ایسا حل پیش کر دے' جس سے خاتون خانہ مطمئن ہو جائیں۔

دوست بہت خوش تھا کہ آج وہ اپنے امام رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر وہ آیا اور حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی شریک حیات سے کہنے لگا۔ "آپ اپنے شوہر کی آنکھوں کے چندھے پن اور ان کی کمزور پنڈلیوں کے بدنما ہونے کی طرف نہ دیکھیں، بلکہ اس پر غور کریں کہ وہ حدیث وفقہ کے کتنے بڑے امام ہیں اور علمائے اسلام میں ان کی کیا شان ہے؟"

معاملہ کس حد تک درست ہوا، اس کے بارے میں تو تاریخ نویسوں نے کوئی بات تحریر نہیں کی ہے البتہ اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ جب وہ دوست اٹھ کر باہر جانے لگا تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بھی اس کے ساتھ ساتھ تشریف لائے۔ مکان سے نکلتے ہی دوست نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے کہا۔

"اب تو آپ مطمئن ہیں کہ میں نے آپ کی بھرپور وکالت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد سے آپ کی زوجہ کے دل میں کوئی کدورت نہیں رہے گی اور آئندہ وہ جھگڑا کرنے کے بجائے حد سے زیادہ آپ کا احترام کریں گی۔"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک اپنے دوست کی باتیں سنتے رہے۔ وہ اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے اس نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔

جب وہ خاموش ہو گیا تو حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت شگفتہ لہجے میں فرمایا۔ "خدا تجھے رسوا کرے، تو نے میری بیوی کو تو دوسرے عیب بھی بتا دیئے۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے اس کی نظر میرے ان نقائص پر نہ جاتی ہو۔"

ایک بار حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم آراستہ تھی کہ اتنے میں داؤد بن عمر داخل ہوا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ نسلی اعتبار سے داؤد بن عمر جولاہا تھا۔ جب امام رحمتہ اللہ علیہ کا درس ختم ہو گیا تو حاضرین اپنے اپنے مسائل کے پیش نظر حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سے سوالات کرنے لگے! امام رحمتہ اللہ علیہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ایک ایک شخص کی بات کا جواب دیتے رہے۔ اسی دوران موقع پا کر داؤد بن عمر بھی بول اٹھا۔

"امام! اگر کوئی جولاہا نماز کی امامت کرے تو اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے داؤد بن عمر کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ "اگر کسی جولاہے کے پیچھے نماز بے وضو پڑھی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

جیسے ہی امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، تمام اہل مجلس کے ہونٹوں پر واضح تبسم ابھر آیا۔ امام رحمتہ اللہ علیہ کے اس دلچسپ جواب پر بعض حضرات ہنسنا چاہتے تھے، مگر امام رحمتہ اللہ علیہ کا ادب مانع تھا اس لئے وہ لوگ بھی صرف مسکرا کر رہ گئے۔

مؤرخ خطیب بغدادی نے ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ بڑی فصیح و بلیغ گفتگو کرتے تھے۔

فقر وقناعت کی وجہ سے امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ لباس میں کبھی کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔

مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "ایک بار ہم نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آپ نے پوستین الٹی پہن رکھی تھی۔ اور جو قبا آپ کے جسم پر موجود تھی۔ بوسیدگی کے باعث اس کے

دھاگے پیروں میں لٹک رہے تھے۔ امام رحمتہ اللہ علیہ نے خود ہی اہل مجلس کی نظروں کو محسوس کر لیا اور پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر میں نے علم حاصل نہ کیا ہوتا تو لوگ پھر بھی میرے پاس آتے۔ میں بخوبی اس راز سے واقف ہوں کہ ادھر کوئی جھانکتا تک نہیں۔ اگر عالم کے بجائے میں ایک بقال ہوتا تو لوگ مجھ سے سودا خریدتے ہوئے کراہیت محسوس کرتے۔''

ایک بار گورنر عیسیٰ بن موسیٰ نے حکم دیا کہ تمام قاری حضرات کو سرکار کی طرف سے عطیات دیئے جائیں۔ نتیجتاً شہر کوفہ کے بہترین قاری ایوان میں جمع ہوئے۔ ان لوگوں میں حضرت ابن شبرمہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت قاضی ابن ابی لیلیٰ رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگ بھی موجود تھے۔ ان کے جسم بہترین لباسوں اور لمبی قباؤں سے آراستہ تھے۔ اتنے میں حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ داخل ہوئے تو اہل دربار اس عظیم محدث وفقیہ کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ آپ کی رفتار میں عجیب شان بے نیازی تھی اور لباس کا یہ حال تھا کہ چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو بہ مشکل تمام آپ کی نصف پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے ایوان میں داخل ہوتے ہی گورنر عیسیٰ بن موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہاں ابن ابی لیلیٰ بھی ہیں اور ابن شبرمہ بھی موجود ہیں۔ تم مجھے ان لمبی لمبی دیواروں سے نجات دو۔'' (غالباً امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا اشارہ ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ رحمتہ اللہ علیہ کی لمبی قباؤں کی طرف تھا یا پھر ان کے منصب کی طرف کہ یہ دونوں بزرگ قاضی کے عہدوں پر فائز تھے۔)

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی بات سن کر اہل دربار پر سکتہ طاری ہو گیا۔ خود گورنر عیسیٰ کا یہ حال تھا کہ جواب دینے کے لئے موزوں الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ پھر ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد اپنے ملازمین سے کہنے لگا۔ ''تم فوراً تمام قاری حضرات کے عطیات کا بندوبست کر دو۔ سچ تو یہ ہے کہ امام اعمش کے سوا میرے پاس کوئی قاری آیا ہی نہیں۔'' اہل نظر عیسیٰ کے الفاظ کی گہرائی کو محسوس کریں۔ اس سے بہتر اور کیا خراج تحسین ہو سکتا تھا کہ حاکم نے دوسرے بزرگوں کی موجودگی میں صرف امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی قرأت کو تسلیم کیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرأت میں اس وقت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا کوئی دوسرا ثانی موجود نہیں تھا۔

بالآخر 147ھ میں علم کا یہ خورشید ضیا بار اپنی ظاہری روشنی سے محروم ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے جسم کو تہہ خاک اتار دیا مگر وہ اپنے پیچھے علم و کردار کا جو سرمایہ عظیم چھوڑ گیا ہے اسے قیامت تک روشن و تابناک زندگی حاصل رہے گی۔ ایسی زندگی جو ہمہ وقت متحرک ہے اور جس کی حرارت سے لاکھوں مردہ دلوں میں نئی روح پھونکی جاتی رہے گی۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ سلاطین وقت کے دربار میں نہایت بے باک نظر آتے تھے مگر ذاتی زندگی میں آپ خود کو اس قدر حقیر سمجھتے تھے کہ موجودہ عہد کا کوئی شخص اس عجز و انکسار کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو آپ نے اپنے چند عزیز و اقارب اور دوستوں کو بڑی عجیب وصیت کی تھی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ نے کہا تھا۔

''جب میں مر جاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع نہ کرنا اور مجھے میرے رب کے پاس لے جا کر دفن کر دینا۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ لوگ میرے جنازے میں شریک ہوں۔''

امام رحمتہ اللہ علیہ کی وصیت اپنی جگہ مگر جب آپ نے عالم خاکی کو الوداع کہا تو لوگ چیختے ہوئے اپنے گھروں

سے نکل آئے تھے۔ وہ کونسی آنکھ تھی جو امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی موت پر اشک ریز نہیں تھی۔ وہ کون سے ہونٹ تھے جن سے شور فغاں بلند نہیں ہو رہا تھا اور وہ کون سا سینہ تھا جس میں آتش فراق کا دھواں نہیں بھر گیا تھا۔

خریبی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ صاحب سنت تھے۔ وہ جس دن دنیا سے رخصت ہوئے اس کے بعد انہوں نے کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو ان سے زیادہ عبادت گزار ہو۔

حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ ''امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ علم نافع اور عمل صالح دونوں میں سردار تھے۔''

جب یحییٰ قطان رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر کیا تو فرمانے لگے۔ ''وہ بڑے عابد و زاہد تھے۔ نماز با جماعت کے پابند تھے اور ہمیشہ صف اول میں رہتے تھے۔''

وکیع رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ نے ستر سال تک کسی وقت کی نماز تو کجا' تکبیر تحریمہ بھی ترک نہیں ہونے دی۔ یہ ایک مسلمان کے ذوق نماز کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

عیسیٰ بن یونس رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ہمارے زمانے نے اعمش رحمتہ اللہ علیہ جیسا کوئی دوسرا انسان نہیں دیکھا۔

یہی وہ مرد جلیل ہے جس کی بارگاہ علم میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی حاضر ہوئے تھے۔ اپنی آنکھوں سے اس قلندر کے عمل کو دیکھتے جس کی نظروں میں شاہان وقت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اپنے کانوں سے اس عظیم انسان کی بیان کردہ روایات سنتے' جنہیں پڑھ کر حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ بھی حیران رہ گئے تھے۔

تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں کتنا عرصہ گزارا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کوفے میں قیام پذیر ہونے کے سبب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو یہ رعایت حاصل تھی کہ جس وقت بھی ضرورت محسوس ہوتی حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس میں چلے جاتے اور اپنے دل و دماغ کو اس عظیم محدث کی گفتگو سے روشن کر لیتے' جو اپنی مثال آپ تھا۔



حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ

اگر ہم اس عظیم محدث کی شخصیت پر صرف دو حوالے دے کر خاموش ہو جائیں تو اہل نظر بہ آسانی سمجھ لیں گے کہ قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کس مرد جلیل کا نام ہے۔

آپ کی ذات گرامی کا پہلا حوالہ یہ ہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ امیر المومنین حضرت صدیق اکبرؓ کے پوتے تھے۔ آپ کے والد محترم کا نام حضرت محمدؓ بن ابی بکرؓ تھا۔ اور دوسری نسبت خاص یہ ہے کہ آپ کی تربیت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی آغوش محبت میں ہوئی تھی۔

خود حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ شب عرفہ کو ہمارے بال منڈواتی تھیں اور ہمارا حلقہ بنا کر ہمیں مسجد بھیجتی تھیں اور پھر دوسرے دن ہمارے پاس قربانی کرتی تھیں۔

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی جلالت علمی پر یہ گواہی کافی ہے کہ آپ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے مردان جلیل سے احادیث رسول ﷺ کی سماعت کی۔

مشہور محدث حضرت یحییٰ سعید انصاری رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا۔ ”حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کون تھے؟“ اس شخص کی مراد یہ تھی کہ علم حدیث وفقہ میں حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا کیا مقام ہے۔

اس شخص کی بات سن کر حضرت یحییٰ بن سعید انصاری رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے پر عقیدت کا ایک خاص رنگ ابھر آیا اور پھر آپ نہایت باادب ہو کر بیٹھے۔ اس کے بعد فرمایا۔ ”ہم نے مدینہ رسول ﷺ میں ایسا کوئی شخص نہیں پایا جسے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ پر فضیلت دی جا سکے۔“

حضرت یحییٰ بن انصاری رحمتہ اللہ علیہ ہی کا ایک اور قول ہے۔ آپ نے کسی شخص کے سوال کے جواب میں حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے سیرت و کردار اور فضل و کمال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

”وہ فقہ کے معتبر امام تھے۔ زہد و تقویٰ میں ان کا مقام بلند تھا اور وہ زیادہ حدیث بیان کرنے والے تھے۔“

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ حدیث رسول ﷺ کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ روایت کرتے تھے۔

دیار رسول ﷺ کے عظیم فقیہ حضرت ابو الزناد رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ سے بڑھ کر فقہ اور حدیث کا کوئی عالم نہیں پایا۔

حضرت ابوالزناد رحمتہ اللہ علیہ کے والد محترم کا بیان ہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ ظاہری امور کے سوا کسی اور بات کا جواب نہیں دیتے تھے۔

مشہور محدث سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں فرماتے تھے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔

حضرت عبید اللہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ قرآن کریم کی تفسیر بیان نہیں کرتے تھے۔ صرف الفاظ کے ظاہری مفہوم کی وضاحت فرماتے تھے۔

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ جب کسی سائل کو جواب دیتے یا کسی مسئلے کا حل پیش کرتے تو صاف صاف کہہ دیتے کہ یہ میری رائے ہے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ حق ہے۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ "مجھے اس مشورے کی طرف کسی نے مجبور نہیں کیا اور نہ میں اس کے کسی حصے میں شامل ہوں۔"

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ آدمی پر جو کچھ اللہ نے فرض کیا ہے اس کے جاننے کے بعد شخص کا جاہل رہنا، اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسی بات کہے جس کا اسے علم نہ ہو۔

حضرت عمران بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک بار ایک جماعت تقدیر کا ذکر کر رہی تھی۔ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا اس طرف سے گزر ہوا تو آپ ٹھہر گئے اور ان لوگوں کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ "تم بھی اس امر سے باز رہو جس سے اللہ باز رہا۔" (مطلب یہ تھا کہ ان رازوں کو فاش کرنے کی جستجو میں نہ رہو جن پر خود اللہ نے پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر وہ ان باتوں کو انسان کے حق میں بہتر سمجھتا تو تمہاری کوششوں سے پہلے ہی انہیں ظاہر کر دیتا۔)

حضرت عکرمہ بن عمار رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جو لوگ "قدریہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے، حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے کبھی انہیں پسند نہیں کیا بلکہ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے کہ آپ ان لوگوں پر لعنت بھیجتے تھے۔"

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ حدیث رسول ﷺ کے سلسلے میں بہت زیادہ حساس اور محتاط تھے۔ عبداللہ بن علا رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ "ایک بار میں نے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ مجھے احادیث لکھوا دیں۔"

جواب میں حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت سختی کے ساتھ گریز کیا۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو فرمانے لگے۔ "حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں احادیث کی کثرت ہوگئی تو ایک دن امیر المومنین نے حکم دیا کہ احادیث کے مسودے آپ کے پاس لائے جائیں۔ جب لوگ تحریر شدہ احادیث لے کر حضرت عمرؓ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے ان تمام مسودوں کو جلانے کا حکم دیا اور پھر فرمایا۔ "یہ اہل کتاب کی نقالی ہے۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے عبداللہ بن علا رحمتہ اللہ علیہ کو حدیث رسول ﷺ کے لکھنے سے منع کر دیا۔

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نماز عشاء کے بعد حدیث بیان فرماتے تھے۔ آپ جس مقام پر بیٹھ کر حدیث بیان فرماتے تھے وہ جگہ رسالت مآب ﷺ کے روضہ اطہر اور منبر کے درمیان واقع تھی اور حضرت عمرؓ کی قبر کے عین سامنے تھی۔

جس طرح اللہ نے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو علم و فضل میں غنی بنا دیا تھا اسی طرح آپ کو دل کی شہنشاہی بھی بخشی تھی۔ آپ نہایت خود دار اور صابر و شاکر انسان تھے۔ غربت و افلاس کے باوجود آپ کوئی نذر قبول نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار آپ کے ایک عزیز عمر بن عبید اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے لئے ایک ایک ہزار دینار بھیجے جب وہ شخص...... مذکورہ رقم لے کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس پہنچا تو وہ غسل کر رہے تھے۔ غسل کے بعد آپ نے دینار کی تھیلی قبول کر لی اور فرمایا۔ "یہ صلہ رحم ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ہے۔"

اس کے بعد وہ شخص حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اگرچہ اس وقت حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو اس رقم کی شدید ضرورت تھی لیکن آپ کی غیرت نفس نے اس گراں قدر تحفے کو قبول نہیں کیا جس میں بھیجنے والے کی بے پناہ عقیدت اور محبت شامل تھی۔

جب وہ شخص واپس جانے لگا تو حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میری طرف سے عمر بن عبید اللہ رحمتہ اللہ علیہ کو سلام کہنا۔ خدا انہیں جزائے خیر دے۔ اگر مجھے ضرورت ہوتی تو میں ان کی یہ نذر قبول کر لیتا۔"

بعد میں آپ کی بیوی نے یہ کہہ کر وہ رقم قبول کر لی۔ "اگر قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ' عمر بن عبید اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے چچا کے بیٹے ہیں تو میں بھی ان کی پھوپھی کی لڑکی ہوں۔" واضح رہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی شادی آپ کے خاندان ہی میں ہوئی تھی۔

پھر جب قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے شریک حیات کے سامنے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ بس اتنا فرمایا۔ "ہر شخص کی اپنی ضرورت ہے۔ مجھے اس بات کا خیال نہیں رہا تھا۔"

آپ کے شاگرد حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ "میں نے قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو سبز رنگ کی ٹوپی اور سابری چادر استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہے جس پر زعفران سے رنگین دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔" حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ ہی سے روایت ہے کہ حضرت قاسم رحمتہ اللہ علیہ بن محمد نہایت پرہیز گار انسان تھے۔ اگر انہیں ذرا بھی شک ہو جاتا تو وہ دینار و درہم کا انبار بھی چھوڑ دیتے۔

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ زہد و تقویٰ کی اس منزل پر تھے جہاں ظاہر پرستی کا ایک ایک نقش فنا ہو جاتا ہے اور باطن کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ آپ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص آپ کی کسی نیکی کی تعریف کرے۔ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کچھ دن تقسیم زکوٰۃ کے منتظم بھی رہے تھے۔ ایک دن کسی مجلس میں آپ کی انتظامی صلاحیت زیر بحث تھی۔ اس مجلس میں آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ کسی شخص نے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے انتظام پر اعتراض کیا تو حضرت عبدالرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ خاموش نہ رہ سکے۔ آپ نے شدید اضطراب کے عالم میں فرمایا۔

"اے شخص! تو اس انسان کے بارے میں کہہ رہا ہے جس نے زکوٰۃ میں سے کبھی اپنے لئے ایک کھجور بھی حاصل نہیں کی۔"

جب اسی واقعے کی اطلاع حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو ہوئی تو آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن کو بلایا اور تنبیہ کے انداز میں فرمایا۔"اے میرے بیٹے! تم نے جو کچھ کہا اپنی معلومات کے مطابق کہا۔" اس بات سے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ انسان کو پوری آگاہی کے بغیر کوئی بات نہیں کہنا چاہیے۔ کیا خبر کہ جو دعویٰ کیا جا رہا ہے وہ درست نہ ہو۔ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا یہ طرزِ عمل انکسار سے بھی آگے کی چیز ہے جسے ہم کوئی نام نہیں دے سکتے۔ انکسار یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی تعریف کرے تو وہ اپنی ذات کے بارے میں ستائشی الفاظ سن کر رسماً کہے کہ میں کس قابل ہوں؟ یا میں اس تعریف کا مستحق نہیں ہوں۔ مگر حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے تو اپنے اس عمل ہی کی صحت سے انکار کر دیا تھا اور اپنے بیٹے کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ان کا باپ بے قصور نہیں ہے اور آئندہ ایسا کوئی دعویٰ نہ کریں کہ جس پر بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔

ورنہ حقیقت تو یہی تھی کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے زکوٰۃ کی تقسیم سے اپنے لئے کبھی ایک کھجور بھی حاصل نہیں کی۔ اگرچہ وہ حصول کا حق بھی رکھتے تھے اور اس بات پر قادر بھی تھے لیکن صدیق اکبرؓ کے پوتے کا یہی منصب تھا کہ وہ مال و اسباب کے انبار کو دیکھتا رہے اور جب تمام ضرورت مند لوگ آسودہ ہو کر چلے جائیں تو بڑے سرگوشیانہ انداز میں اپنے دادا کی تقلید کرتے ہوئے کہے۔

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسول ﷺ بس

یہ تاریخ اسلام کا وہ عظیم الشان اور منفرد واقعہ ہے کہ جب رسالت مآب ﷺ نے ایک جہاد کی تیاری سے قبل اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم لوگ حسب توفیق خدا کی راہ میں اپنا مال و متاع پیش کرو۔ اس حکم کو سنتے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اپنا اپنا سرمایہ پیغمبر اسلام کے مقدس قدموں میں لا کر رکھ دیا تھا۔ دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی کہ کسی مسلمان نے اپنی پاؤ دولت نذر خدا کر دی تھی اور کسی نے اپنا نصف مال عجز و انکسار کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔ وہاں کسی کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ہر شخص مخلص تھا اور خدا کی راہ میں تحفہ جان پیش کر دینے والا تھا۔ مگر جب صدیق اکبرؓ اپنے سرمایہ کے ساتھ حاضر ہوئے تو گھر میں نہ کوئی دینار باقی تھا اور نہ ضرورت کی کوئی چیز؟ چشم نبوت اس راز سے آگاہ تھی کہ صدیق اکبرؓ نذرانہ جاں اور نذرانہ مال دونوں کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں آئے ہیں۔ اہل ایمان میں یہ سب سے بڑی قربانی تھی۔ خود صدیق اکبرؓ نے اس راز کو چھپا لیا تھا مگر سرور کونین ﷺ نے اہل ایمان پر ظاہر کر دیا کہ صدیق اکبرؓ اس طرح نہیں آئے ہیں جس طرح تم سمجھ رہے ہو۔ ان کی آمد دوسرے جاں نثاروں سے مختلف ہے۔ مرضی خدا بھی یہی تھی کہ صدیقؓ کی نیت کو اہل زمانہ پر آشکار کر دیا جائے۔

بالآخر رسالت مآب ﷺ نے اپنے رفیق سے پوچھ ہی لیا۔ "صدیقؓ! کیا لائے ہو؟" "آقا" کا سوال سن کر آنے والے کا سر ندامت سے جھک گیا۔ "غلام جانتا ہے کہ جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ آقا کے شایانِ شان نہیں۔" سرور کونین ﷺ نے دوبارہ پوچھا۔ "اہل خانہ کے لئے بھی کچھ چھوڑ آئے ہو؟" غلام کی گردن کچھ اور خم ہو گئی۔ لرزتی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ "ان لوگوں کے لئے صرف خدا اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ آیا ہوں۔"

پوتا اپنے دادا کے منصب کو تو نہیں پہنچ سکتا تھا' مگر اس حوالے سے یہ تو کہہ سکتا تھا کہ اسے خدا اور اس کا رسول ﷺ کافی ہیں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے لئے محمد مصطفےٰ ﷺ کا عشق کافی تھا۔ اسی لئے اپنے فرزند عبدالرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ سے فرما رہے تھے کہ تم جو کچھ کہتے ہو اپنے علم کے مطابق کہتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارا باپ کیا کرتا رہا ہے؟ ایک لمحے کے لئے اہل نظر غور کریں۔ نیکی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ ایک شخص اپنے عمل کو پوشیدہ رکھنے کے لئے بیٹے کے دعوے کو جھٹلا دیتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی یہ کیسی بے نیازی تھی؟ کیسا ضبط نفس تھا کہ ایک طرف اپنے بہترین اعمال کو چھپاتے تھے اور دوسری طرف ان کے ذکر کو بھی ناپسند کرتے تھے۔

ستر بہتر سال کی عمر میں حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی بینائی اس حد تک کمزور ہو گئی تھی کہ کسی شخص کو قریب ہونے کے باوجود بھی پہچان نہیں سکتے تھے۔ اگر کوئی اپنا نام لے کر تعارف کراتا تو فوراً پہچان جاتے۔ اس کے علاوہ جسمانی نقاہت بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی مگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق اس ناتوانی کے عالم میں مسجد تک پیدل جایا کرتے تھے۔

پھر جب اعضا نے جواب دے دیا تو بستر پر دراز ہو گئے۔ اسی دوران آپ نے اپنی وصیت تحریر کرائی۔ کاتب نے لکھا۔

''یہ وہ عبارت ہے جس کی قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے وصیت کی، جو گواہی دیتے ہیں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں ہے۔''

جب حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو وصیت پڑھ کر سنائی گئی اور کاتب نے ابتدائی جملے اپنی زبان سے ادا کئے تو آپ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اگر آج سے پہلے ہم اس کے گواہ نہیں تھے تو پھر ہماری بدنصیبی میں کوئی شک نہیں ہے۔''

یہ تھا اس مرد جلیل کی تابناک شخصیت کا مختصر سا خاکہ۔ بالفرض اگر ہم ان تمام واقعات اور شہادتوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو پھر تنہا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے وہ الفاظ کافی ہیں جنہیں صدیوں کا غبار بھی آج تک دھندلا نہیں کر سکا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے سیرت و کردار اور علم و فضل پر سب سے بڑی گواہی اسلام کے پانچویں اور آخری خلیفہ راشد نے پیش کی تھی۔

خاندان بنوامیہ کی آبرو رکھنے والے اس عظیم و جلیل خلیفہ نے فرمایا تھا۔ ''اگر مجھے ذرا بھی اختیار ہوتا تو میں اپنے بعد قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو خلیفہ نامزد کر دیتا۔''

بہت ممکن تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ' حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے لئے راہیں ہموار کرتے اور اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنا دیتے مگر سیاست کی ریشہ دوانیوں اور وقت کی سازشوں نے آپ کو اتنی مہلت نہ دی۔ پھر بھی تاریخ کے سینے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی یہ آرزو قیامت تک محفوظ رہے گی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی آرزو کوئی عام آرزو نہیں تھی۔ اس آرزو نے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کے اس پہلو کو بھی روشن کر دیا ہے کہ آپ خلافت کے بارگراں کو بھی اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ علم و فضل' سیرت و کردار اور انتظامی استعداد۔ اتنی خوبیاں کبھی کبھی اور کسی کسی انسان کی ذات میں بیک وقت جمع

ہوتی ہیں۔ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ بھی ایسے ہی جامع الصفات انسان تھے جو صدیوں کی گردش فلک کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی وصیت کا دوسرا حصہ اس طرح تھا۔ ''جب میری آنکھیں بند ہو جائیں اور تم لوگ میرے جسم کو زیر خاک رکھ دو تو پھر مجھے فراموش کر دینا مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص قبر پر میری تعریف کرے۔''

غالباً یہ عرب کی قدیم رسم تھی کہ جب کوئی شخص دنیا سے گزر جاتا تھا تو عزیز و اقارب اور دوست قبر پر کھڑے ہو کر مرنے والے کے اوصاف بیان کرتے تھے۔ یا پھر حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی وصیت میں یہ بات شامل کر دی تھی کہ موت کے بعد آپ کی تعریف کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت رہی ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ انتہائی شدت کے ساتھ اپنی تعریف کو ناپسند کرتے تھے۔ اب اس سے زیادہ احتیاط کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے وصیت نامہ تحریر کرا کے امکان کے آخری دروازے کو بھی بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر لوگ اسے سمجھنا چاہیں تو اپنی ذات سے بے نیازی کی یہ بڑی عجیب مثال ہے۔ ورنہ ایسے سنگین وقت میں اتنی نازک باتوں کا کسے ہوش ہوتا ہے۔

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے وصیت نامے میں آخری ہدایت یہ تھی کہ آپ کو نیا کفن نہ دیا جائے۔ جب آپ کے فرزند حضرت عبدالرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ نے وضاحت چاہی تو فرمایا۔ ''مجھے انہی کپڑوں میں دفن کر دینا جنہیں پہن کر میں نماز ادا کرتا تھا۔ میرے اسی کرتے، اسی تہبند اور اسی چادر کو میرا کفن بنا دینا۔''

''کیا آپ مرنے کے بعد دو کپڑے پسند نہیں کرتے؟'' حضرت عبدالرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ کی مراد نئے کفن سے تھی۔

''نہیں میرے بیٹے! ہرگز نہیں۔'' حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے بزرگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی اسی طرح تین کپڑوں میں دفن کیا گیا تھا۔ تم بھی اسی رسم کو زندہ رکھنا کہ مردہ شخص کے مقابلے میں ایک زندہ انسان نئے کپڑے کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔''

پھر حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو نیند آ گئی۔ تمام عمر جاگتے ہوئے گزری تھی مگر کسی نے آخری وقت تک آپ کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں دیکھے۔ نسل صدیق رحمتہ اللہ علیہ کے اس عظیم وارث نے ہر صلے اور جزا سے بے نیاز ہو کر مخلوق خدا کے درمیان نصف صدی سے زیادہ علم کی دولت لٹائی اور 106ھ میں اپنے رب کی وحدانیت و کبریائی پر گواہی دیتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال 108ھ میں ہوا۔

حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے ''قدید'' میں اپنی آخری سانسیں شمار کیں اور ''مشلل'' میں دفن کئے گئے۔ یہ مقام ''قدید'' سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔



حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ

حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے تھے اور فاروق اعظمؓ کے پوتے۔ حضرت عبداللہ کے بارے میں مشہور تھا کہ آپ حضرت عمرؓ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے اور جب لوگ حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھتے تو بے اختیار کہہ اٹھتے تھے کہ حیرت انگیز طور پر آپ عبداللہ بن عمرؓ کے مشابہ ہیں۔ اس طرح کہا جاتا ہے کہ جو لوگ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد کہا کرتے تھے کہ اب اس صورت کو ہم کہاں دیکھیں گے، وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتے تھے کہ ابھی اس زمین پر فاروقؓ کا عکس موجود ہے۔ پھر جب چند صحابہؓ جو اپنی طویل العمری کے سبب حیات تھے' حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کا چہرہ دیکھ کر فرماتے تھے۔ ''خدا کا شکر ہے کہ ابھی دیار رسول ﷺ میں عمرؓ کی جھلک دیکھنے کو مل جاتی ہے'' مختصر یہ کہ دیگر صفات علیہ کے علاوہ حضرت سالم بن عبداللہ کی شکل میں اس مرد جری کا عکس بھی نظر آتا تھا جس کے بارے میں رسالت مآب ﷺ کا فرمان مقدس ہے کہ

''عمرؓ کے ہیبت وجلال سے ابلیس رجیم (شیطان) بھی فرار ہو جاتا ہے۔''

حضرت سالم بن عبداللہ کی ظاہری شخصیت یہ تھی کہ آپ کے دراز قامت اور چہرے کے نقش و نگار میں ایسی وجاہت تھی کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

حضرت خالد بن ابی بکرؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ کو بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنے دیکھا ہے۔ خالد رحمتہ اللہ علیہ ہی کی دوسری روایت ہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی حالانکہ اس وقت آپ احرام میں تھے۔

محمد بن جلال رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ کو دیکھا ہے۔ آپ مکمل طور پر اپنی مونچھیں نہیں کترتے تھے (جیسا کہ ہم اکثر حضرات کو دیکھتے ہیں کہ داڑھی کے بال اور اپنی مونچھوں کو کترنے کے بجائے مونڈ دیتے ہیں۔)

محمد بن ہلال رحمتہ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضرت سالم بن عبداللہ اپنی داڑھی کو ہلکی مہندی سے رنگتے تھے۔ یہاں تک کہ ریش مبارک زرد نظر آنے لگتی تھی۔ مگر کچھ دوسری روایات موجود ہیں کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ مہندی نہیں لگاتے تھے۔

بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ ہم نے ہمیشہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو سر اور داڑھی کے سفید بالوں

میں دیکھا۔ ممکن ہے کبھی آپ نے برگ حنا سے ریش مبارک کو زرد رنگ دے دیا ہو جو شریعت کے مطابق ہے۔ اور اسی شکل میں محمد بن ہلال رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھ لیا ہو۔ بہر حال ان روایات کی کثرت ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ مہندی نہیں لگاتے تھے' اس کے علاوہ یہ معتبر روایت بھی موجود ہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے زندگی بھر خضاب نہیں لگایا۔ لباس کے متعلق خالد بن ابی بکرؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے سر پر سفید ٹوپی بھی دیکھی ہے اور سفید عمامہ بھی۔ آپ اپنے عمامے کا ایک بالشت سے زیادہ حصہ پیچھے کی جانب لٹکاتے تھے۔

امام وار رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے جسم پر کتان کا کرتا دیکھا جو آگ کی طرح سرخ تھا۔

داؤد بن سنان رحمتہ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا۔ آپ اتنا طویل کرتا پہنے ہوئے تھے کہ نصف پنڈلیاں ڈھکی ہوئی تھیں۔

حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ اپنے والد محترم حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے زمانے میں ارغوانی (سرخ) چار جامہ زیب تن کرتے تھے۔

خالد بن ابی بکر کا بیان ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس طرح بھی دیکھا کہ آپ حالت احرام میں اکثر اپنی پشت دھوپ میں رکھتے تھے۔

محمد بن ہلال رحمتہ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو مکے کے راستے پر دیکھا۔ آپ حالت احرام میں تھے اور تلبیہ (لبیک لبیک) کہہ رہے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ پشت کھولے ہوئے اور اپنی چادر رانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آپ کی پشت کی کھال تمازت سے ادھڑ گئی ہے۔

خالد بن ابی بکرؓ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس حالت میں بھی دیکھا کہ اگر کبھی آپ کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جاتا تو آپ ایک ہی جوتا پہنے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتے۔ جب اس سلسلے میں کچھ کہا جاتا تو فرماتے کہ اس سے مجھے کیا نقصان پہنچا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ اپنے ہاتھ سے جوتا درست کر لیتے اور کھجور کی چھال سے تسمہ بنا لیتے۔

خالد بن ابی بکر سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس وقت ہم بچے تھے۔ جب حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ گھر میں تشریف لاتے اور ہمیں کھیلتا ہوا دیکھتے تو تمام بچوں کو اپنی چادر کے کونے سے مارتے (دراصل یہ ایک تنبیہ ہوتی تھی ورنہ ایک چادر کے کونے سے کسی بچے کے جسم پر کیا چوٹ لگ سکتی ہے۔)

خالد بن ابی بکر رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہو جاتا اور یوم عید کا سورج طلوع ہوتا تو حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نماز عید سے پہلے ہی صدقہ فطر کی کھجوریں لے جاتے اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔

عبیداللہ عمر بن حفص رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی طرح قرآن کی تفسیر نہیں کرتے تھے۔

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا' حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور حضرت سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ سے حدیث رسول ﷺ کی روایت کرتے تھے۔

ایک بار حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کپڑا خریدنے گئے۔ ابو عبدالملک بن مروان کہتے ہیں۔ میں نے آپ کی آمد کو اپنے لئے خوش نصیبی تصور کیا اور حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ کے سامنے کپڑا پھیلا دیا۔

کپڑا دیکھ کر حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا" اسے ٹھیک ٹھیک ناپو۔"

بالآخر جب وہ کپڑا ناپا گیا تو اتفاق سے کچھ کم نکلا۔ اس پر حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ٹھہرے لہجے میں فرمایا۔" تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ یہ پورا سات گز ہے۔ کیا تمہیں اپنے الفاظ یاد نہیں رہے؟"

جواباً میں نے عرض کیا:" ہم لوگ اس کا اسی طرح ایک نام رکھ لیتے ہیں۔"

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے کپڑا چھوڑ دیا اور یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے کہ اس طرح تو جھوٹ ہو جاتا ہے۔"

ابو عبدالملک بن مروان کا بیان ہے کہ جب حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ تشریف لائے تھے اور ہم سے گفتگو کی تھی تو آپ کے لہجے سے نرمی اور شیرینی جھلک رہی تھی مگر جب آپ نے یہ کہا کہ یہ جھوٹ ہے، تو اس وقت آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اور لہجے سے بھی تلخی نمایاں ہو گئی تھی اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کسی بھی حال میں جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

آپ کی غذا اتنی سادہ تھی کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ یوم عرفہ میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو صرف دو کپڑوں میں دیکھا لیکن آپ جسمانی اعتبار سے توانا نظر آ رہے تھے۔

ہشام بن عبدالملک کو حیرت ہوئی کہ اپنے ظاہری لباس سے مفلس نظر آنے والا شخص اس قدر صحت مند کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر اپنے اس تجسس کو دور کرنے کے لئے ہشام بن عبدالملک نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا۔

" اے ابو عمر تمہاری غذا کیا ہے؟" واضح رہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی کنیت ابو عمر تھی۔

جواب میں حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔" صرف روٹی اور روغن زیتون۔"

ہشام بن عبدالملک کو ایک بار پھر حیرت ہوئی اور اس نے اسی عالم تحیر میں پوچھا۔" ابو عمر! روٹی اور روغن زیتون سے تمہاری طبیعت کیسے بھر جاتی ہے؟" دراصل ہشام بن عبدالملک کو حیرت اس بات پر تھی کہ ایک شخص صرف روغن زیتون سے کس طرح روٹی کھاتا ہے اور اگر کھاتا ہے تو مستقل استعمال کیسے کرتا ہے؟ جبکہ دو چار دن میں کھانے کی یکسانیت سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت سادہ الفاظ میں خلیفہ وقت کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔" میں اس میں خمیر کر دیتا ہوں جب بہت زیادہ بھوک لگنے لگتی ہے تو کھا لیتا ہوں۔"

اس واقعے سے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے ضبط نفس کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دنیوی نعمتیں موجود ہوتے ہوئے بھی آپ غذا کی لذتوں سے اجتناب فرماتے تھے۔

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ عقائد کے سلسلے میں اتنے سخت تھے کہ اپنے خیالات کے اظہار میں کسی تکلف اور رعایت سے کام نہیں لیتے تھے۔ آپ اظہار رائے میں اس قدر آزاد تھے کہ آپ کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر آپ کی رائے اور افکار سے کوئی شخص خفا ہو جاتا تو آپ اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ اپنے عقائد کے سلسلے میں آپ کی جان پر بھی بن جائے گی تو چہرے پر جھجک یا خوف کا عکس تک نہ ابھرتا اور آپ پہلے سے زیادہ پرجوش لہجے میں تقریر کرتے۔

جب ''قدریہ'' فرقے کا آغاز ہوا تو علمائے وقت نے ان لوگوں کے خیالات پر سخت نکتہ چینی کی' لیکن اپنے لہجے کے اعتدال اور توازن کو برقرار رکھا۔ مگر جب کسی شخص نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ یہ عقیدہ رکھنے والے لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

پوچھنے والے کا خیال تھا کہ آپ بھی دیگر علمائے کرام کی طرح متوازن جواب دیں گے جس سے قدریہ فرقے کی نفی بھی ہو جائے اور رائے دینے والے کے الفاظ میں اعتدال بھی برقرار رہے۔ مگر جب مجلس میں حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی آواز بلند ہوئی تو سننے والے حیران رہ گئے۔

آپ سخت ناگوار لہجے میں فرما رہے تھے۔ ''میں قدریہ پہ لعنت بھیجتا ہوں۔''

پھر فرمایا۔ ''میں ان لوگوں پر اس وقت تک لعنت بھیجتا رہوں گا، جب تک وہ لوگ تقدیر کے خیر و شر پر ایمان نہ لے آئیں (یعنی یہ نہ کہیں کہ بھلائی اور برائی سب اللہ ہی کی طرف سے ہے) اس روایت کو عکرمہ بن عمار رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کیا۔

عکرمہ بن عمار رحمتہ اللہ علیہ ہی کی ایک روایت اور ہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ داستانیں بیان کرنے والوں اور قصہ گو حضرات سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ نہ کبھی آپ ان لوگوں کے پاس جاتے تھے اور نہ انہیں اجازت تھی کہ آپ کی مجلس میں وہ داخل ہو سکیں۔

اسی طرح حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ ''شعبدہ بازوں'' سے بھی نفرت کرتے تھے۔ عطاف بن خالد بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں موجود تھا۔ اچانک کچھ لوگ مجلس میں داخل ہوئے۔ آنے والوں کے ساتھ جوان لڑکوں کے علاوہ ایک نوعمر لڑکا بھی تھا۔

جب وہ مجلس میں داخل ہوئے تو حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا درس روک دیا اور آنے والوں سے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو اور یہاں کس مقصد سے آئے ہو۔ تمہاری آمد کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں علم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور تم طلب علم کے ارادے سے میرے پاس نہیں آئے ہو۔''

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے سوال کے جواب میں آنے والوں نے کہا۔ ''ہم آپ کے پاس ایک ایسے لڑکے کو لائے ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا حیرت انگیز عمل پیش کرتا ہے جسے دیکھ کر ہماری بصارت حیران رہ جاتی ہے اور عقل کو عاجزی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔''

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے نوواردوں کی طرف دیکھا۔ تمام لڑکے خاموش کھڑے تھے۔ مگر جو

سب سے کم عمر تھا، اس کے چہرے پر بختی نظر آرہی تھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکا قطار سے چند قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی تہہ سے ایک دھاگا کھینچا۔ پھر اس دھاگے کو کاٹ کر کئی ٹکڑوں میں منتقل کر دیا۔ دیگر اہل مجلس کے ساتھ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نہایت خاموشی سے لڑکے کے پراسرار عمل کو دیکھ رہے تھے۔

یکا یک لڑکے کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور اس نے دھاگے کے ٹکڑوں کو اپنی دو انگلیوں کے درمیان جمع کر لیا۔ پھر لڑکے نے دو تین مرتبہ اپنی انگلیوں پر پھونک ماری۔ اس کے بعد اس نے دھاگے کو کھینچا تو وہ بالکل درست تھا۔ ٹکڑے آپس میں جڑ گئے تھے اور دھاگا اپنی طوالت میں مکمل نظر آرہا تھا۔

اہل مجلس اس لڑکے کی شعبدہ بازی پر حیران ہو کر مختلف قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ چند لمحوں تک حاضرین کی گفتگو سنتے رہے۔ پھر اچانک آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا اور لوگوں کو مخاطب کر کے شعلہ بار لہجے میں فرمانے لگے۔

''اگر مجھے اس معاملے میں ذرا بھی اختیار ہوتا تو میں اس لڑکے کو پھانسی پر چڑھا دیتا۔''

پھر نہایت تنفر آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''اسے میری مجلس سے نکال دو۔''

جب وہ لوگ جانے لگے تو حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا۔ ''جس طرح میں نے اسے اپنی مجلس سے نکال دیا ہے تم بھی اس شعبدہ باز کو اپنے حلقے سے نکال دو اور اس کے کرتب کی یادوں کو اپنے ذہنوں سے کھرچ دو ورنہ بڑا خلل واقع ہوگا اور بڑے فتنے پیدا ہوں گے۔''

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ اظہار رائے کے سلسلے میں اتنے ہی بے باک تھے کہ اگر آپ کی جان بھی خطرے میں پڑ جاتی تو آپ حق بات کہنے سے باز نہیں رہتے۔ عطا بن سائب رحمتہ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ایک بار حجاج بن یوسف مدینے آیا اور اس نے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو طلب کیا۔

آپ تشریف لے گئے تو اس نے ایک تلوار آپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سالم! یہاں مدینے میں ایک شخص ہے جس نے بڑے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے ہاتھوں تہہ تیغ کیا جائے۔''

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک دم بخود کھڑے رہے۔ آپ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ جب آپ کے ہاتھوں بلا سبب کسی انسان کی زندگی کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ حجاج بن یوسف کی سفاکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی بے گناہ شخص شمشیر اقتدار کی زد میں نہ ہو۔ اس لئے حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اتمام حجت کے طور پر حجاج سے پوچھا۔ ''کیا وہ شخص کافر ہے؟''

''نہیں! اس کا تعلق جماعت کفار سے نہیں۔'' حجاج نے وضاحت کی مگر وجہ قتل اب بھی پردہ راز میں تھی۔

تو پھر کیا وہ مسلمان ہے؟'' حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوسرا سوال کیا۔

''سالم! تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' حجاج بن یوسف حضرت سالم بن عبداللہ کے استفسارات سے کچھ جھنجھلا سا گیا تھا۔ ''وہ شخص مسلمان ہے لیکن بہرحال تم ہی اسے قتل کرو گے۔'' اب حجاج کے ارادے ظاہر ہو چکے تھے۔

''میں ایک مسلمان کو کس طرح قتل کر سکتا ہوں؟'' حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ حیرت و پریشانی کے

عالم میں حجاج بن یوسف کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''وہ مسلمان ضرور ہے لیکن ہمارے پاس اس کے قتل کا شرعی جواز موجود ہے۔'' حجاج بن یوسف کے لہجے سے تلخی جھلکنے لگی تھی۔ ''بس اب تم جاؤ اسے قتل کر دو۔''

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ' حجاج کے جواب سے مطمئن نہیں ہو سکے تھے مگر پھر بھی آپ شمشیر بکف وہاں سے نکل کر اس شخص کی تلاش میں چلے گئے جس کے قتل کا حکم ایک عامل کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔

راستے بھر آپ شدید اذیت میں مبتلا رہے اور بار بار زیر لب اپنے خدا کو پکارتے رہے۔

''اے قادر مطلق! میں یہ کس آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا۔ حق کی طرف میری رہنمائی کر اور پھر مجھے اس راہ پر قائم رکھ کہ تیرے سوا میرا کوئی کارساز نہیں کوئی دستگیر اور مشکل کشا نہیں۔''

آخر کچھ دیر کی جستجو کے بعد مطلوبہ شخص ہاتھ آ گیا۔ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ اس کے قریب پہنچے اور فرمایا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا مگر حجاج بن یوسف کا حکم ہے کہ میں تجھے قتل کر دوں۔''

وہ شخص نہ صرف حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے واقف تھا بلکہ اسے آپ کے مرتبہ و مقام سے بھی آگاہی حاصل تھی۔ جب اس نے آپ کی زبانی اپنی موت کا فرمان سنا تو ہراساں ہوا اور نہ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ نہایت مطمئن انداز میں کھڑا رہا اور پھر مؤدب لہجے میں کہنے لگا۔ ''آپ جس کام سے تشریف لائے ہیں اسے تکمیل تک پہنچایئے۔ میرا سر حاضر ہے۔''

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ اس شخص کی طمانیت سے بہت متاثر ہوئے۔ پھر فرمانے لگے۔ ''میں آنکھیں بند کر کے حجاج کے حکم پر عمل نہیں کر سکتا مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کیا تم مسلمان ہو؟''

''ہاں! میں مسلمان ہوں مگر آپ کسی تاخیر کے بغیر اس حکم پر عمل کیجئے جو بہت دیر پہلے جاری کیا جا چکا ہے۔''

اس شخص کے چہرے پر اب بھی کسی گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نمایاں نہیں تھے۔

''کیا تم نے آج نماز فجر ادا کی ہے؟'' حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس شخص سے ایک اور سوال کیا۔

''ہاں! میں صبح کی نماز ادا کر چکا ہوں لیکن آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔'' فرض سے مراد اس شخص کی یہ تھی کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ' حجاج بن یوسف کا حکم بجا لائیں۔

''یہ فرض میرا نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر حضرت سالم بن عبداللہ واپس جانے لگے۔

''آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے مجھے چھوڑ کیوں دیا؟'' وہ شخص شدید حیرت کے عالم میں حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے ان کی واپسی کا سبب دریافت کرنے لگا۔

''میں اس کی وجہ حجاج ہی کے روبرو بیان کروں گا۔ یہ کہہ کر حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ تیز قدموں سے واپس چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ حجاج بن یوسف، حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے تعمیل حکم کے بارے میں کچھ معلوم کرتا' آپ نے تلوار اس کے سامنے پھینک دی۔ یہ ایک ایسا غیر متوقع اور بے اختیار عمل تھا کہ حجاج بن یوسف اور دیگر تمام حاضرین حیرت زدہ ہو گئے۔

''سالم! تم نے اسے قتل کر دیا؟'' حجاج بن یوسف نے تلوار کی طرف دیکھا جس پر بظاہر انسانی خون کی ایک

چھینٹ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''نہیں! میں اسے قتل نہیں کر سکا'' حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے لہجے سے ندامت کے بجائے عجیب سی بے نیازی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیا وہ تمہارے ہاتھ نہیں آ سکا؟'' ابھی تک حجاج بن یوسف کی حیرت و تجسس برقرار تھا۔

''نہیں یہ بات نہیں۔'' حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''وہ میرے ہاتھ بھی آیا تھا اور میری تلوار کی زد پر بھی تھا لیکن اس کے باوجود میں اسے قتل نہیں کر سکا۔''

''ایسا کیوں ہوا؟'' اب اقتدار کی رعونت بیدار ہو چکی تھی۔ ''کیا آپ جیسا فقیہ حکم عدولی کا مفہوم نہیں سمجھتا؟'' حجاج کے چہرے پر کبر و غرور کے ساتھ فطری سفاکی اور تشدد پسندی کی ایک علامت روشن ہو گئی تھی۔

''میں حکم اور نافرمانی دونوں کے مفہوم سے بخوبی واقف ہوں لیکن ایک مسلمان پر میری تلوار بے نیام نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کے قتل کا حکم مجھے دیا گیا تھا وہ عقیدتاً مسلمان بھی ہے اور اس نے آج نماز فجر بھی ادا کی ہے۔''

''اس کے نماز فجر ادا کرنے سے میرا حکم کس طرح ساقط ہو جاتا ہے؟'' ظلم و استبداد کے سفیر کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی تھی اور چہرہ جوش غضب سے سرخ ہو گیا تھا۔

قہر و گناہ کا نمائندہ اپنے حقیقی لباس میں ظاہر ہو چکا تھا۔ مگر حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے اطمینان اور بے نیازی میں سرمو بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

جواب میں آپ نے اللہ کی کبریائی بیان کی پھر سرور کونین ﷺ پر درود بھیجا' اس کے بعد رسالت مآب ﷺ کی یہ حدیث بہ آواز بلند بیان فرمائی۔

''جس نے نماز فجر ادا کی وہ اللہ کی ذمے داری میں ہے۔'' یعنی وہ شخص خدا کی امان میں ہے۔

جب حجاج بن یوسف سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو لہجہ بدل کر کہنے لگا۔ ''ہم اسے نماز فجر کی بنیاد پر قتل نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ شخص ان لوگوں میں سے ہے' جنہوں نے شہادت عثمانؓ پر قاتلوں کی مدد کی تھی۔''

حجاج بن یوسف کا خیال تھا کہ اس شخص کے قتل کا یہ جواز حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کو خاموش کر دے گا مگر اس وقت در و دیوار پر سناٹا طاری ہو گیا اور اہل مجلس کے چہرے اتر گئے' جب آل عمرؓ کے اس عظیم فرزند نے پکار کر کہا۔

''یہاں مجھ سے زیادہ عثمانؓ سے محبت کرنے والا کون ہے؟''

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ جواب سن کر حجاج بن یوسف ساکت ہو گیا اور آپ ایک رفتار قلندرانہ کے ساتھ حلقۂ سفاک سے نکل کر اپنے مکان پر واپس تشریف لے آئے۔

گھر پہنچ کر والد محترم سے ملاقات ہوئی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیٹے کے چہرے پر تلخی اور ناگواری کے تاثرات دیکھے تو بے قرار ہو گئے۔

''فرزند! تجھے تو یہ حقیقت معلوم ہے کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی تیرے چہرے پر رنج و الم کا کوئی عکس دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے بتا کہ ایسا کونسا واقعہ پیش آیا ہے جس نے تیرے چہرے سے شگفتگی چھین کر تیری روشن صورت کو غبار آلود کر دیا ہے۔'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی فراست سے سمجھ چکے تھے کہ آج کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے

ورنہ حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ تو وہ انسان تھے کہ ہجوم مصائب میں بھی مسکرانا آپ کی ایک عادت خاص تھی۔
والد گرامی کو مضطرب دیکھ کر حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سنبھل گئے۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ ایک درد مند باپ گزر جانے والے سانحے کے بارے میں سن کر فکر مند ہو جائے۔ اس لئے آپ نے جھوٹ بولے بغیر واقعے کی مبہم تفصیل پیش کر دی۔

''کوئی پریشان کن بات نہیں ہے۔ بس یہی کہ کچھ لوگ فقہ کے مسائل کا علم نہیں رکھتے لیکن پھر بھی اپنے جہل کے باعث اس طرح بحث کرتے ہیں کہ جیسے ان کا علم حرف آخر ہے۔ آج ایک ایسے ہی بے علم انسان سے میرا سابقہ پڑ گیا تھا۔ اس نے دل و دماغ کو اتنا مکدر کر دیا کہ میرے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ مجھے افسوس بھی ہے اور ندامت بھی کہ میری وجہ سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔''

بیٹے کی زبانی یہ وضاحت سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ مطمئن ہو گئے اور حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کو اس طرح نصیحت فرمانے لگے۔

''فرزند! اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آ جائے تو بہت دانشمندی اور احتیاط کے ساتھ اپنا دامن بچانا چاہئے۔ تم کسی کے فطری جہل کو دور نہیں کر سکتے لیکن اسے احساس دلائے بغیر تمہیں گریز اختیار کر لینا چاہئے۔'' اتنا کہہ کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ چلے گئے۔

بظاہر یہ بات ختم ہو گئی تھی مگر حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ جانتے تھے کہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔
مدینے کا کوئی نہ کوئی شخص عبداللہ بن عمرؓ کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دے گا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کہنے والوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہہ دیا کہ آج تو آپ کا بیٹا موت کے منہ میں سے واپس آیا ہے۔

یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک بار پھر مضطرب ہو گئے۔ پھر آپ نے ان لوگوں سے واقعے کی تفصیل معلوم کی۔

سنانے والوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حرف بہ حرف وہ واقعہ سنا دیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کچھ دیر نہایت خاموشی سے لوگوں کے بیانات سنتے رہے۔ پھر ان لوگوں سے دریافت کرنے لگے کہ سالم رحمتہ اللہ علیہ نے حجاج کے روبرو کیا جوابات دیئے تھے۔

لوگوں نے حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کے جوابات دہرائے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے چہرے پر خوشی کے ایسے رنگ نمایاں ہو گئے جیسے آپ کا بیٹا ایک لشکر عظیم سے تنہا برسرپیکار تھا اور پھر اس نے نہ صرف اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کر لی تھی بلکہ انہیں یہاں تک تسخیر کر لیا تھا کہ وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش تک نہ دے سکے تھے۔

''خدا سالم رحمتہ اللہ علیہ کی عمر دراز کرے۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔'' اب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی تمام فکر و پریشانی دور ہو چکی تھی۔ ''اسے علم و ذہانت اسی دن کے لئے دیئے گئے تھے۔ اگر آج کا دن خاموشی سے گزر جاتا تو پھر اس کا علم بھی ضائع ہو جاتا۔''

پھر اپنی زبان مبارک سے یہ تاریخی جملے ادا فرمائے۔ ''سالم عقلمند ہے۔ بے شک! سالم عقلمند ہے۔ اس نے اپنے علم اور اپنی ذات کو ہلاکت سے بچا لیا۔''

اس واقعے کے علاوہ اور بھی بے شمار واقعات ہیں جنہیں سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ شدت جذبات سے بے قرار ہو جاتے تھے اور بر سر مجلس اپنے عظیم فرزند کی تعریف وستائش کرتے تھے۔ پھر یہ بات تمام اہل مدینہ کو معلوم ہو گئی تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے صاحب زادے حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایسی محبت جو اس وقت پورے عرب میں ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

آپ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی محبت کی شدت کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دوسرے لوگ آپ کا یہ جذبہ دیکھ کر جل اٹھتے تھے۔ (یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی محبت خود غرض نہیں تھی کہ آپ بیٹے کے ہر جائز و ناجائز کام کی تصدیق کر دیتے' بالفرض اگر کبھی حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے کوئی کوتاہی سرزد ہو جاتی تو آپ بے حد غمزدہ نظر آنے لگتے اور بیٹے کو سمجھاتے کہ آئندہ محتاط رہیں ورنہ یہ بے راہ روی انہیں صراط مستقیم سے بہت دور لے جائے گی۔ مختصراً یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کبھی اپنے بیٹے کی کسی کوتاہی کی پردہ پوشی نہیں کی' لیکن آپ کی بے مثال محبت اپنی جگہ تھی۔ اگر سالم رحمتہ اللہ علیہ کو اداس دیکھتے تو خود ان سے زیادہ اداس ہو جاتے۔ اگر کبھی سالم رحمتہ اللہ علیہ کے سر میں درد ہوتا تو یہی درد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اپنے دل میں محسوس ہوتا۔ آپ کی یہی وہ محبت تھی جو بعض کم نظر اور بے حس انسانوں کی نظر میں اعتراض وتنقید کا ہدف بن گئی تھی۔

بعض روایات سے تو یہاں تک پتا چلتا ہے کہ اس محبت کو بنیاد بنا کر کچھ لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی دل آزاری پر اتر آتے تھے۔ پھر یہ قبیح اور اذیت ناک رسم شروع ہو گئی تھی کہ لوگ حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کی محبت پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ملامت کرنے لگے تھے۔

جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ لوگوں کی یہ دل شکن باتیں سنتے تو سوگوار ہو جاتے اور ان لوگوں کے حق میں دعا فرماتے کہ اے خدا! ان لوگوں کو ہدایت دے۔ ان کے سنگلاخ دلوں کو نرم کر دے کہ محبتیں ان کے سینوں میں اپنا ٹھکانہ بنا سکیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ان کے دل صحرا ہو جائیں گے اور پھر یہ عہد جاہلیت کی طرح ایک دوسرے کا خون بہانے لگیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی دعا اپنی جگہ اور لوگوں کی تنگ دلی اپنی جگہ۔ جن لوگوں نے ملامت کی وہ بری رسم تراشی تھی، اس میں کمی آنے کے بجائے روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا گیا اور پھر ایک دن آپ بے اختیار ہو کر فرمانے لگے۔

''لوگ مجھے سالم کے بارے میں ملامت کرتے ہیں اور میں انہیں ملامت کرتا ہوں۔ سالم ایسے ہیں جیسے میری آنکھ اور ناک کی درمیانی کھال''۔ پھر وہ عظیم انسان بستر علالت پر دراز ہو گیا جس کی محبت میں لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے صحابی جلیل کو ملامت کرتے تھے۔ تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ آخری دنوں میں آپ کو کیا مرض تھا اور بیماری کتنی طویل تھی؟ عبدالحکیم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کی وفات آخر ذالحجہ 106ھ میں ہوئی۔ اس روایت سے ایک اور سند بھی فراہم ہو جاتی ہے کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال 106ھ میں نہیں ہوا تھا بلکہ آپ اس وقت زندہ تھے اور حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند حضرت جعفر رحمتہ اللہ علیہ کو ایک خاص ہدایت بھی کی تھی۔

الغرض جب اس محدث جلیل' فقیہ عظیم اور مرد جری کے وصال کی خبر عام ہوئی تو لوگوں نے اپنے گھروں کو کھلا

چھوڑ دیا اور اس شخص کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے باہر نکل آئے جسے آج کے بعد دوبارہ نہیں دیکھا جا سکے گا۔ اس وقت اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک بھی مدینے میں موجود تھا۔ وہ خود چل کر حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے مکان تک آیا اور جب اس نے انسانی ہجوم دیکھا تو اپنا اندازہ ظاہر کیا کہ سالم رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ اس مقام پر ادا نہیں کی جا سکے گی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ لوگوں کی کثرت کے سبب حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ ''بقیع'' میں ادا کی گئی۔

اور جب حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے کو قبر میں اتارا گیا تو بیشمار سوگوار اور شکستہ آوازیں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔

''بے شک! سالم رحمتہ اللہ علیہ کا پیکر خاکی مٹی میں مل گیا مگر ان کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کو کبھی زوال نہیں ہو گا۔ فنا کے طاقتور ہاتھ ان کے پیکر صفات کو کبھی نہ چھوڑ سکیں گے۔ آج وہ صرف ہمارے دماغوں اور دلوں میں زندہ ہیں مگر آنے والی صدیاں ہماری ہی طرح ان کی زندگی پر گواہی دیں گی۔''

تاریخ میں یہ روایت محفوظ ہے کہ ہشام بن عبدالملک بھی حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ میں شریک ہوا تھا۔ مگر جب اس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا تو اپنے ماتحت عامل ہشام بن ابراہیم کو حکم دیا کہ ان لوگوں میں سے چار ہزار آدمی جہاد کے لئے منتخب کر لئے جائیں۔ ہشام بن عبدالملک کے حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ پھر جب چار ہزار آدمی جہاد کے لئے منتخب ہو گئے تو ہشام بن عبدالملک نے اس سال کا نام ''عام الاربعہ آلاف'' رکھ دیا۔ جس کا مطلب ہے ''سال چار ہزار'' یہ نام ان چار ہزار مجاہدوں کے انتخاب کی نسبت سے رکھا گیا تھا جو حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے تھے۔

پھر ایک طویل عرصے تک یہ رسم جاری رہی جب مجاہدین گرمائی لشکر میں داخل ہوتے تو چار ہزار آدمی مدینے سے ساحلوں کی طرف روانہ ہو جاتے اور اس وقت تک وہیں رہتے جب تک گرمائی لشکر اپنے مقام پر واپس نہیں چلا جاتا۔

اس بات کی تحقیق نہیں ہو سکی کہ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے میں شریک ہوئے تھے یا نہیں البتہ اتنا ضرور ثابت ہے کہ حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال سے پہلے ہی حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اس طرح ممکن ہے کہ آپ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے میں شریک نہ ہو سکے ہوں۔ پھر بھی یہ روایت اپنی تمام تر صداقت کے ساتھ موجود ہے کہ جب حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہوئے تو شدت غم سے مجبور ہو کر آپ کے صاحب زادے حضرت جعفر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی چادر اتار دی اور صرف کرتا پہنے ہوئے جنازے کے ساتھ روانہ ہوئے۔

جب کسی شخص نے حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت جعفر بن سالم رحمتہ اللہ علیہ اس حال میں قبرستان جا رہے ہیں تو آپ نے ایک شخص کو یہ پیغام دے کر قبرستان کی جانب روانہ کیا۔

''جعفر! میں تمہارے غم میں شریک ہوں اور تم سے اس جانگداز سانحے پر تعزیت کرتا ہوں۔ تمہارا باپ تمہاری ہی طرح ہمیں بھی عزیز تھا۔ وہ اہل ایمان کے لئے ایک روشنی تھی جو آج بجھ گئی۔ وہ کونسی آنکھ ہے جو اس روشنی کے بجھ

جانے سے افسردہ وملول نہیں ہوگی۔ فرزند! ہم بھی سالم رحمتہ اللہ علیہ کی جدائی میں بہت مضطرب ہیں مگر تمہیں اسی صبر کا مظاہرہ کرنا چاہئے جس کی تلقین تمہارا باپ ساری عمر کرتا رہا تھا اور جس نے قدم قدم پر اسی صبر وضبط کے عملی مظاہرے بھی کئے تھے۔ تمہیں لازم ہے کہ چادر اوڑھ لو اور اہل ایمان کی طرح لشکر کے ساتھ اپنے باپ کو قبر میں اتار دو۔"

جب وہ شخص حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا پیغام لے کر حضرت جعفر بن سالم رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو آپ نے کسی تاخیر کے بغیر چادر اپنے جسم پر ڈال لی اور پھر حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ کے قبر میں اتارے جانے تک ایک کوہ گراں کی مانند صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتے رہے۔

حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ بن انسؓ، حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کے کردار پر اس طرح گواہی پیش کرتے ہیں۔ "زہد وتقویٰ اور علم وفضل میں گزشتہ صالحین کے مشابہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے والد گرامی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نقش قدم پر چلتے تھے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔"

معتبر روایت سے ثابت ہے کہ جب حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کوفے کے مقامی فقہا سے فیضیاب ہو چکے تو آپ کو انتہائی شدت سے حدیث رسول ﷺ کی ضرورت کا احساس ہوا کہ اسکے بغیر تفہیم قرآن اور علم فقہ نامکمل ہے۔ اس احساس کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کوفے کی حدود سے باہر نکلے اور آپ نے دریار رسول ﷺ کا سفر اختیار کیا۔ تاریخی اعتبار سے مدینہ منورہ اور پھر مکہ معظمہ محدثین کرام کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ علم کی یہی پیاس حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ جلال تک لے کر آئی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک طویل تحقیق کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے تمام سفر 201ھ کے بعد شروع ہوئے۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی وفات تک حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بمشکل چار مرتبہ اس مرد جلیل کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں گے۔ یہاں بھی وہی مختصر ملاقات کا مسئلہ درپیش آتا ہے اور یہاں بھی جواب دینے والے وہی جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے ذہین شخص کے لئے یہ چند ملاقاتیں ہی کافی تھیں۔

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں شریک ہونے کے کئی بنیادی اسباب تھے۔ ایک یہ کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کا نسل عمرؓ سے نسبی رشتہ۔ آج کچھ لوگ نسبی رشتے کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سائنس نے بھی انسان میں پائی جانے والی موروثی عادتوں کو ثابت کر دیا ہے' جس طرح کچھ بیماریاں نسل در نسل اولاد میں منتقل ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح کچھ خاص عادات بھی خاندان کے وارثوں میں مسلسل پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ بات تواتر کے ساتھ دیکھی گئی ہے کہ اگر کسی خاندان کا مورث اعلیٰ شجاع ہے تو اولاد بھی کم وبیش اتنی ہی جراتمند ہوگی۔ اگرچہ بعض' مقامات پر یہ کلیہ غلط ثابت ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حد تک آنے والی نسلوں میں یہ اثرات باقی رہ جاتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ فطرتاً دنیا کے شجاع ترین انسان تھے اور آپ کی شجاعت پر یہ دلیل کافی ہے کہ جب غزوہ بدر کا آغاز ہوا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس جنگ میں قریش کی جانب سے قریش کے تمام قبائل شریک تھے مگر جب تحقیق کی گئی اور دور تک نظر دوڑائی گئی تو صرف عرب کا ایک ہی قبیلہ ایسا تھا جس کا کوئی فرد مسلمانوں کے خلاف صف آراء نہیں ہوا تھا اور وہ قبیلہ "عدی" تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا قبیلہ۔ حالانکہ دیگر کفار قبائل،

حضرت عمرؓ کے قبیلے "عدی" کی قومی غیرت کو للکار رہے تھے۔ لات و منات کی قسمیں دے رہے تھے مگر پھر بھی قبیلہ عدی کے کسی فرد کو جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ میدان جنگ کا رخ کرے۔ یہاں تک کہ کفاران قریش نے اس قبیلے کو بزدل اور کم ہمتی کے طعنے بھی دیئے لیکن وہ یہی کہتے رہے۔

"تاریخ کے دامن میں ہماری بزدلی کا کوئی واقعہ محفوظ نہیں اور چشم فلک نے عرصہ کارزار میں کبھی ہمارے فرار کا منظر نہیں دیکھا۔ آج بھی شریک جنگ ہونے کے لئے ہمارے دل بے قرار ہیں، روحیں مضطرب ہیں اور شوق خونریزی میں شمشیروں کے دم ان کے سینوں سے باہر ہیں مگر اس بدنصیبی کو کیا کریں کہ عمر بن خطابؓ نے ہمارے دست و بازو کاٹ دیئے ہیں۔ ہم موت کا سامنا کر سکتے ہیں لیکن عمرؓ کے مقابل نہیں ہو سکتے۔ پہلے اسے میدان سے ہٹا دو۔ پھر ہماری طرف دیکھو کہ قبیلہ عدی کے جنگجو بیٹوں نے نامردی کی قبا پہن لی ہے یا ان کی تلواریں کند ہو گئی ہیں۔"

اسی طرح ہم تاریخ اسلام میں حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی عظیم و جلیل شخصیت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر ان کی بے مثال شجاعت دیکھ کر اہل وفا کو قرار آ جاتا ہے، یہ اسد اللہ الغالب علیؓ ابن ابی طالب کی نسلی شجاعت ہی کا اثر تھا کہ حضرت امام حسینؓ نے خاک کربلا کو اپنے اور اہل بیت کے خون سے رنگین کر دیا۔ اگر یہ خاندانی شجاعت اور کردار دامن کش نہ ہوتا تو امام حسینؓ یزید کی بیعت کر کے دنیا کی بہترین مراعات حاصل کر سکتے تھے۔ دینار و درہم کی آب و تاب سے مرصع قبا پہننے کے بجائے خونیں کفن اوڑھ لینا' کوئی حادثاتی یا اضطراری عمل نہیں تھا۔ اس کے پس منظر میں ضبط ہوش کی تمام قوتیں کارفرما تھیں اور یہ قوتیں ایک خاص نسل اور ایک خاص تربیت کا ثمر تھیں۔

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ بھی اسی خاندان کے عظیم وارث تھے جو اپنے زہد و تقویٰ اور جرأت مندی کے سبب تاریخ اسلام کا روشن ترین باب ہے۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ علم کا خاندانی شجاعت اور روایت سے کیا تعلق ہے؟ اس ذیل میں مختصراً عرض ہے کہ مذہبی علم ایک مقدس امانت ہے اور یہ امانت اسی شخص کو منتقل کی جا سکتی ہے جو بار امانت اٹھانے کا اہل ہو۔ فطری شجاعت و مردانگی انسان کو نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اس کے برعکس کم ہمت لوگ اکثر خارزار حیات میں آبلہ پائی کے خوف سے لڑکھڑا جاتے ہیں اور علم کی امانت کے تقدس کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں تاریخ اسلام میں کچھ ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جو آزمائش کے وقت ثابت قدم نہیں رہے بلکہ دنیوی حرص و طمع سے مجبور ہو کر ان لوگوں نے متاع رسول ﷺ کو بھی بازار دنیا میں نیلام کر دیا۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ذاتی مفاد کی خاطر قرآن کریم کے معانی تک بدل ڈالے اور معاذ اللہ اس قدر احادیث تراش لیں کہ محدثین کرام کو صحیح قول رسول ﷺ تلاش کرنے کے لئے بعض اوقات اپنی جانیں بھی قربان کرنی پڑیں۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا بارگاہ سالم رحمتہ اللہ علیہ میں داخل ہونے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ محدث ہونے کے ساتھ عظیم فقیہ بھی تھے۔ مجلس سالم رحمتہ اللہ علیہ میں شریک ہونے کے بعد جہاں ایک طرف حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو سماعت حدیث کا شرف حاصل ہوا وہاں آپ نے اپنی آنکھوں سے وارث عمرؓ کو میدان حیات میں سرگرم عمل بھی دیکھا۔ یہاں آ کر آپ کو معلوم ہوا کہ ایک محدث و فقیہ' ایک جابر وقت حجاج بن یوسف سے کس طرح گفتگو کرتا ہے اور کس بے نیازی کے ساتھ اس کے غلط حکم کو ٹھکراتا ہے اور آپ پر یہ حقیقت بھی ظاہر ہوئی کہ امانت کیا ہے اور امانت کو دنیا کی کافرانہ ہواؤں سے بچانے کے لئے کس جذبہ جانفروشی کی ضرورت ہوتی

ہے......آپ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ علم و کردار' اور دنیوی جاہ و حشم ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے اور آپ پر یہ راز بھی فاش ہوا کہ جب تک کتابی حروف میں انسانی سیرت کا لہو شامل نہ ہو تو علم مردہ ہے یا پھر انتہائی ضعیف و ناتواں۔ بقول علامہ اقبال ؎

یا مردہ ہے یا نزع کے عالم میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

حضرت سالم بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے مختصر وقت میں اپنے ذہن کی روشنی، اپنے دل کی صفائی اور اپنے قدموں کی استقامت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو بخشی اور یہی وہ متاع بے بہا ہے' جسے حاصل کرنے کے بعد کوئی انسان درجہ امامت تک پہنچتا ہے۔



حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے والد محترم کا نام حجاج تھا۔ پہلے آپ ''شہر واسط'' میں رہتے تھے۔ پھر بصرہ منتقل ہو گئے اور آخری سانس تک اسی تاریخی شہر میں قیام پذیر رہے' حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے یعنی وہ لوگ جنہیں صرف تابعین کی صحبت میسر آئی اور صحابہ کرامؓ کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو روشن نہ کر سکے۔

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے خاص طور پر حضرت انس بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عمرو بن دینارؒ اور حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ سے اکتساب فیض کیا۔ ویسے اگر آپ کے اساتذہ کا شمار کیا جائے تو دیگر محدثین کے علاوہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پچاس سے بھی زیادہ شاگردوں سے علم حاصل کیا۔ کسی اختلاف کے بغیر حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ ایک عظیم محدث' ایک معتبر محقق اور ایک جلیل القدر امام تھے۔

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم پر ایک بڑی شہادت یہ ہے کہ حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت محمد بن اسحاق رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت وکیع بن جراح رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت یحییٰ سعید القطان رحمتہ اللہ علیہ جیسے اکابر آپ کی مجلس درس سے فیض یاب ہوئے' یہاں تک کہ خود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی حدیث میں آپ ہی کے شاگرد تھے۔

فقہ میں حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر جہاں تک علم حدیث کا تعلق ہے تو آپ کی امامت وجلالت' عرق ریزی' تحقیق وجستجو اور احتیاط پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

آپ کے بارے میں حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''شعبہ رحمتہ اللہ علیہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔''

ایک بار جب حضرت مسلم بن قتیبہ رحمتہ اللہ علیہ بصرہ تشریف لائے تو حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ بھی آپ سے ملاقات کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ جیسے ہی دونوں بزرگوں کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے رسم کے مطابق حضرت قتیبہ رحمتہ اللہ علیہ کی خیریت دریافت کی اور پھر آپ کی زبان سے جو دوسرا جملہ ادا ہوا وہ یہ تھا۔ ''ہمارے استاد شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کا کیا حال ہے؟''

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے کہ اگر امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نہ ہوتے تو اہل عراق علم حدیث سے بیگانہ رہتے۔

حضرت حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ "جب کسی حدیث کے بیان کرنے میں شعبہ رحمتہ اللہ علیہ میرے ہم نوا ہوں تو مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کون میری مخالفت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ شعبہ رحمتہ اللہ علیہ صرف ایک بار حدیث سننے کو کافی نہیں سمجھتے تھے اور جب شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کسی بات میں مجھ سے اختلاف کرتے ہیں تو میں اسے ترک کر دیتا ہوں۔"

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ اس مرد جلیل کی بارگاہ کمال میں اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ "شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں ان جیسا محدث کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔ آپ کو سرمایہ حدیث سے بہت بڑا حصہ عطا ہوا تھا۔ امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے کوفے کے تیس ایسے بلند پایہ علماء سے احادیث روایت کیں جن سے سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے روایت نہیں کی تھی۔"

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ ہی کا دوسرا قول ہے کہ شعبہ رحمتہ اللہ علیہ علم حدیث کے سلسلے میں تنہا ایک امت کے برابر تھے۔

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ بے پناہ قوت حافظہ کے مالک تھے۔ آپ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ کبھی کسی شخص نے امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ میں کتاب نہیں دیکھی۔

اس غیر معمولی قوت حافظہ کے باوجود رسالت مآب ﷺ کے اقوال مقدسہ کے بارے میں حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ جب تک کسی حدیث کو بیس مرتبہ نہیں سن لیتے تھے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ طلب حدیث میں اس قدر غرق رہتے تھے کہ آپ نے زندگی بھر کوئی کام نہیں کیا اور ایک زمانہ وہ بھی تھا جب حصول علم کی خاطر امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی والدہ کا طشت سات دینار میں فروخت کر دیا تھا۔

حافظ ذہبی نے امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ نے اپنی کمائی سے روزی حاصل نہیں کی اور تمام عمر فکر معاش سے آزاد رہے۔

اس معاشی آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ امرائے عراق کے دست نگر تھے یا مملکت اسلامیہ کے دوسرے صاحبان ثروت آپ کی مالی امداد کرتے تھے' جہاں تک امراء اور وزراء سے تعلق رکھنے کا سوال ہے تو حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ ایک خوددار انسان تھے۔ کبھی کسی اہل اقتدار کی طرف حرص و طمع کے ساتھ نہیں دیکھا۔ دراصل امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کی معاشی آزادی آپ کے دو بھائیوں "حماد" اور "بشار" کی مرہون منت تھی۔ یہ دونوں بھائی صرافے کا کام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ سے اس قدر محبت تھی کہ انہوں نے برملا کہہ دیا تھا۔

"آپ صرف "طلب حدیث" اور "درس حدیث" سے تعلق رکھیں۔ اس طرف مڑ کر نہ دیکھیں کہ آپ کی دنیوی ضروریات کس طرح تکمیل پائیں گی۔"

یہ کوئی زبانی دعویٰ نہیں تھا۔ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے دونوں بھائیوں نے آخری عمر تک اپنے الفاظ کی آبرو برقرار رکھی۔ یہاں تک کہ امام رحمتہ اللہ علیہ کے بیوی بچوں کی بھی بھرپور کفالت کی۔

اگرچہ امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کی ساری زندگی اطمینان و آسودگی میں گزری لیکن آخری عمر میں آپ بہت زیادہ حساس ہو گئے تھے اکثر اپنے شاگردوں کو مخاطب کر کے فرماتے تھے۔

''خبردار! معاش کے سلسلے میں میری طرح نہ ہو جانا۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ میں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ غلط تھا۔ میری روش ہرگز قابل تقلید نہیں۔ میرا کیا ہے کہ میں تو اپنے بھائیوں کے سینے کا بوجھ بن کے رہ گیا ہوں۔''

امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ احساس و اعتراف اپنی جگہ مگر علم سیکھنا اور پھر دوسروں کو سکھانا ایک مستقل کاروبار حیات ہے۔ شاید اسی لئے حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے حلقہ درس میں قدم رکھنے والے ہر شاگرد سے صاف صاف کہہ دیا کرتے تھے۔

''جو طلب حدیث میں اپنے گھر سے نکلا وہ فقر و فاقے میں مبتلا ہوا۔''

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ یہ باتیں اس لئے نہیں کرتے تھے کہ آنے والے طالب علموں کی ہمت شکنی ہو بلکہ آپ اپنے شاگردوں کو ان حقائق سے آگاہ کرتے تھے جن سے طالبان حدیث کو آئندہ زندگی میں سابقہ پڑ سکتا تھا۔

یہ بڑا عجیب اتفاق ہے کہ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ 83ھ میں پیدا ہوئے اور ستتر (77) سال گزارنے کے بعد 160ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس کے برعکس آپ کے شاگرد حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ 80ھ میں زندگی کے افق پر طلوع ہوئے اور فقہ کا یہ خورشید ضیا بار 150ھ میں غروب ہوا۔ اس طرح سن و سال کی روشنی میں حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے تین سال چھوٹے تھے لیکن یہ کیسی زندہ حقیقت ہے کہ علم کے سلسلے میں عمر کا پیمانہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے چھوٹے ہونے کے باوجود جلالت کے اس مقام پر فائز تھے جہاں صدیوں جیسی طویل عمر رکھنے والا انسان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

جب حضرت امام سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر ملی تو آپ نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''لوگو! تم مجھے شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کی موت کی اطلاع دیتے ہو مگر میں تمہیں یہ جانگداز خبر دیتا ہوں کہ شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ فن حدیث بھی مر گیا۔''



حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ

آپ کا خاندانی نام عبداللہ تھا۔ گردش وقت نے آپ کو بھی زنجیر غلامی پہنا دی تھی۔ آپ عبداللہ بن دادہ کے غلام تھے۔ ایک عمر اسی طرح بسر کرنے کے بعد آپ نے وہ لمحات بھی دیکھے جب آپ پر خدا کا کرم نازل ہوا اور زنجیر غلامی کٹ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ بصرے کے رہنے والے تھے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تاریک دور غلامی آپ کے ذہن کے اجالے بھی چھین لیتا مگر جسے روز ازل میں ہدایت وعلم کی روشنی بخشی گئی ہو اس پر چند روزہ اسیری اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ آزاد ہوتے ہی آپ نے بصرے کی درس گاہوں کا رخ کیا۔ اس وقت جو بھی اکابر علماء وہاں موجود تھے' حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے ان کے آگے دامن طلب پھیلایا۔

وہ بڑے کشادہ دل اور کریم النفس لوگ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا ذوق طلب دیکھا اور پھر آپ کے پھیلے ہوئے دامن کو دولت علم سے بھر دیا۔

جب آپ علم کے اس مرکز سے خوشہ چینی کر چکے تو آتش شوق مزید بھڑک اٹھی۔ علم کی آگ اس قدر تیز تھی کہ اس نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو ایک مقام پر چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ پھر آپ بصرے کی حدود سے باہر نکلے اور مملکت اسلامیہ میں جہاں جہاں علم کے ذخائر موجود تھے' وہاں وہاں آپ کے مضطرب قدم پہنچے۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ معاشی اعتبار سے کوئی آسودہ حال شخص نہیں تھے کہ آسانی کے ساتھ اتنے طویل سفر اختیار کرتے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اہل دل اندازہ کر سکتے ہیں کہ طلب علم میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے کیسے کیسے مصائب برداشت کئے ہوں گے مگر وہ غلام زادہ جسے ایک دن ''تاجدار علم'' بننا تھا' کسی خارزار میں تھک کر نہیں بیٹھا اور نہ کبھی اس نے پیروں کے آبلوں کی طرف دیکھا۔ بس ایک شوق سفر تھا جو آپ کو کوچہ بہ کوچہ اور شہر در شہر کھینچے لئے جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے طلب علم کی دھندلی سی عکاسی اردو زبان کے اس شعر سے کی جاسکتی ہے ۔

ٹھہر کے تلووں سے کانٹے نکالنے والے
یہ ہوش ہے تو جنوں کامیاب کیا ہو گا

اور پھر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا جنون کامیاب ہو گیا۔ مملکت اسلامیہ میں ''احادیث'' کے جتنے

بڑے مراکز تھے' حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ وہاں اس طرح پہنچے کہ چہرۂ روشن پر راستے کا گرد و غبار تھا' پائے استقامت لہولہان تھے اور لباس عزم تار تار تھا۔ مگر آپ نے نہ کسی دنیا دار سے رفوگری کی خواہش کی اور نہ کسی اہل ثروت سے زخم افلاس کا مرہم طلب کیا۔ یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اپنے دامن رحمت میں چھپا لیا اور پھر ''رحمت اللعالمین ﷺ'' کے اقوال مقدسہ کا سب سے بڑا محافظ بنا دیا۔

اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ کثرت طلب اور شدت جستجو کے سبب حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے پاس احادیث کا ایسا نادر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا جو اس وقت کسی دوسرے طالب حدیث کے پاس نہیں تھا۔

ابن مدائنی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے پاس اس قدر عمدہ اسانید جمع ہو گئی تھیں جو ان کے کسی دوسرے ساتھی کے پاس نہیں تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے مدینہ منورہ میں حضرت قاسم رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ سے' بصرے میں حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے' کوفے میں حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت امام ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ سے' مکہ معظمہ میں حضرت عطا ابن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مجاہد رحمتہ اللہ علیہ سے اور شام میں حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت رجا بن حیات رحمتہ اللہ علیہ سے سماعت حدیث کی تھی۔

اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ہشام بن زید رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ سے بھی فیضیاب ہوئے۔ اسی کثرت علم نے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین کو حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے گرد جمع کر دیا تھا۔

حضرت امام سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''میں نے ایوب رحمتہ اللہ علیہ' یونس رحمتہ اللہ علیہ' تیمی رحمتہ اللہ علیہ اور عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ جیسے علماء کسی ایک شہر میں یکجا نہیں دیکھے۔''

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ بے اختیار فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ' ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ اور یونس رحمتہ اللہ علیہ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

مشہور امام حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ عراق میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ سنت کو جاننے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔

ہشام بن حسان رحمتہ اللہ علیہ کہتے تھے۔ ''میری دونوں آنکھوں نے عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی مثل کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔''

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد اور ''علم حدیث کے امیر المومنین'' حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ نے اس مرد جلیل کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

علامہ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جن جن لوگوں کا تذکرہ سنا تھا' ملاقات کے بعد انہیں ان کی شہرت سے کمتر پایا۔ سوائے عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ' سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ اور حیات رحمتہ اللہ علیہ کے۔ ان تینوں میں بھی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ میں ان کے آستانہ عالیہ پر ہمہ وقت حاضر رہنا چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں ہمیشہ کے لئے حضرت عبداللہ

بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے دامن سے وابستہ ہو جاؤں اور آپ کے دامن کو اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک کہ مجھے موت نہ آ جائے۔

ابن حبان رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو انتہائی ثقہ بزرگوں میں شمار کرتے ہیں۔

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ مجھ سے کوئی روایت بیان کریں اور فرمائیں کہ میرا گمان ہے اور میں نے اس طرح سنا ہے، تو مجھے یہ بات زیادہ عزیز ہے بہ نسبت اس کے کہ میں اس روایت کو کسی دوسرے ثقہ بزرگ سے سنوں۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ مجھے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا گمان دوسرے کے یقین سے زیادہ محبوب ہے۔

عثمان البتی رحمتہ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ کسی بیٹے کی گواہی اس کے باپ کے حق میں جائز نہیں لیکن عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ عثمان البتی رحمتہ اللہ علیہ کے بیان کی روشنی میں بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کس قدر معتبر اور صادق القول تھے۔

اس فضل و کمال اور درجہ اعتبار کے باوجود حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ روایت حدیث میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے عام راستوں سے گزرنا بھی بند کر دیا تھا۔

بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ جب تمام لوگ مجلس درس سے اٹھ کر چلے تو آپ نے بڑے کرب کے عالم میں مجھ سے فرمایا۔

"بھتیجے! لوگوں نے میرا راستہ بند کر دیا ہے۔ میں اپنی ضرورت کے لئے بھی گھر سے باہر آ جا نہیں سکتا۔"

بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ اس سے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی مراد یہ تھی کہ لوگ راستے چلتے آپ سے حدیثیں پوچھتے تھے اور آپ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ رسالت مآب ﷺ کے فرمان مقدس کو اس طرح راستہ چلتے بیان کریں۔ بالآخر اس احتیاط کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آپ نے اپنے مکان سے باہر نکلنا ہی ترک کر دیا تھا۔

پھر بھی اگر کبھی کسی ضروری کام سے باہر نکلنا ہوتا تو بڑی خاموشی کے ساتھ راستہ طے کرتے۔ اس دوران حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی کوشش یہی ہوتی کہ آپ پر کسی شخص کی نظر نہ پڑے اور آپ چپ چاپ گزر جائیں۔

ایک بار حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ گھر سے نکلے تو حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ بھی آپ کے ہمراہ چلنے لگے۔ چند قدم فاصلہ طے کرنے کے بعد حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ اس خیال سے احتراماً پیچھے ہو گئے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کوئی حدیث بیان فرمائیں گے۔

آپ نے حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا مطلب سمجھ لیا اور پھر اچانک رک کر دریافت کرنے لگے۔ "کیا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟"

حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ادب کے ساتھ کہا۔ "کوئی خاص کام تو نہیں ہے، بس یوں ہی آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔"

محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا جواب سن کر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "کوئی کام نہیں ہے تو

پھر تم واپس چلے جاؤ"

واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے خود بھی حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے سماعت حدیث کی ہے۔

اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور بڑے ذوق وشوق سے انہیں احادیث رسول ﷺ سنایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ روایت حدیث کے سلسلے میں بہت سخت گیر نظر آتے تھے۔ جب آپ حدیث سناتے اور محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کہہ دیتے کہ کیا عمدہ ہے' تو روایت جاری رکھتے اور اگر محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ خاموش رہتے تو آپ بھی چپ ہو جاتے اور مزید کوئی حدیث نہ سناتے۔

حدیث روایت کرتے وقت حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی عجیب حالت ہو جاتی تھی۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی اندوہناک صدمے سے دوچار ہو کر آنکھیں اشک ریز ہو گئی ہیں اور جسم پر شدت غم کے سبب لرزہ طاری ہے۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ پر اس کیفیت طاری ہو جانے کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب یہ تھا کہ جب آپ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے تو سرور کونین ﷺ سے بے پناہ اور لازوال عقیدت کے سبب یہ تھا کہ کہیں انسانی حافظے نے ساتھ نہ چھوڑ دیا ہو اور آپ نے سہواً حدیث مقدس کے الفاظ میں کمی بیشی نہ کر دی ہو۔ پھر خوف اور رقت اس قدر شدت اختیار کر لیتے تھے کہ حاضرین مجلس کو آپ کی حالت دیکھ کر رحم آنے لگتا تھا۔

اگرچہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ بہت کم روایت بیان کرتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ یہی وہ بارگاہ علم ہے جہاں سے حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ جیسے مردان جلیل تربیت پا کر اٹھے اور پھر ہمیشہ کے لئے تاریخ کا ایک ایسا روشن باب بن گئے جسے علیحدہ کر دیا جائے تو یہ مقدس فن نا تمام رہ جائے گا۔

علم وفضل کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا کردار بھی عام مسلمانوں کے لئے مشعل راہ تھا۔ یہاں تک کہ دنیائے اسلام کے انتہائی متقی اور پارسا حضرات بھی اس زاہد شب زندہ دار کو فراموش کر کے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو کبھی کسی سے مذاق کرتے' شعر پڑھتے اور جھگڑتے نہیں دیکھا۔ وہ دنیوی معاملات میں قطعاً نہیں الجھتے تھے اور انہیں ہمیشہ اپنے کام سے کام رہتا تھا۔

حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ نے 110ھ میں وفات پائی تھی۔ امام رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ روئے زمین پر سب سے زیادہ عبادت کرنے والوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن قرہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ہم ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی تک ان کے زہد وتقویٰ پر حیرت کرتے تھے اور برملا کہا کرتے تھے کہ خدا نے ایسے عبادت گزار بندے پیدا کیے ہیں مگر جب امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے اٹھ گئے اور ہم حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی طرف متوجہ ہوئے تو حیران رہ گئے۔ پھر کچھ دن بعد تو یہ عالم ہو گیا کہ حضرت عبداللہ

بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی ریاضت دیکھ کر ہم امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کو فراموش کر بیٹھے۔

حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد تو سب لوگ برابر ہو گئے (حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ کے بیان کا مفہوم یہ ہے کہ ابن عون رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ کی دو ایسی روشن نشانیاں تھیں کہ ان شخصیات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کی جماعت میں امتیاز کیا جا سکتا تھا مگر جب یہ دونوں بزرگ دنیا سے اٹھ گئے تو اب کیا کسی میں تفریق کی جائے۔ سبھی یکساں اور برابر نظر آتے ہیں۔ اگر اہل نظر غور کریں تو حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ کا پیش کردہ خراج تحسین اپنے اختصار کے باوجود انتہائی جامع اور منفرد ہے)

ابن حبان رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ عبادت و ریاضت میں منفرد مقام رکھتے تھے۔ عشق کی حد تک سنت کی پابندی کرتے تھے۔ ارباب بدعت پر ان جیسا تشدد کرنے والا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ فضل و کمال کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانے کے سردار تھے۔

بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ دوسرے موقع پر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی ذمہ داریوں کا بہت زیادہ احساس تھا۔ اکثر فرماتے تھے۔ "میں کسی نہ کسی طرح علم کی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں ورنہ بروز حشر بڑی ندامت کا سامنا ہوگا۔"

ابن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا ایک اور قول ہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے کبھی سچی یا جھوٹی قسم نہیں کھائی۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پاک اور صاف عقائد کے سختی کے ساتھ پابند تھے اور ان میں کسی نئے خیال کی آمیزش کو نفرت کی حدت تک ناپسند کرتے تھے۔

ایک بار حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ سے کسی شخص نے برسر مجلس سوال کیا کہ "فرقہ قدریہ" کی کیا حقیقت ہے؟

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی عجیب دلیل کے ساتھ اس سوال کا جواب دیا کہ اہل مجلس حیران رہ گئے۔ آپ نے فرمایا۔ "میری عمر اس عقیدے کی عمر سے زیادہ ہے جو عقیدہ سن و سال کے لحاظ سے مجھ سے چھوٹا ہو اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف دو شخصوں معبد اور سہونیہ کے علاوہ اسلاف میں سے کسی بزرگ کو اس قسم کی باتیں کرتے نہیں سنا۔ پھر میں تم لوگوں کو "فرقہ قدریہ" کے بارے میں کیا بتاؤں۔ میرے نزدیک اس قسم کے خیالات رکھنا شر ہے۔"

معتبر روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نظریہ قدر رکھنے والوں کو سلام تک کرنے کے روادار نہیں تھے۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ بڑی سختی کے ساتھ اوقات کی پابندی کیا کرتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ جتنا وقت بچتا تھا، اس کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتے اور بہت دیر تک ذکر الٰہی کرتے رہتے، یہاں تک کہ طلوع آفتاب ہو جاتا اور حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نماز اشراق

کے نوافل ادا کرتے۔ پھر اس کے بعد اپنے اصحاب (شاگردوں) کی طرف متوجہ ہو جاتے یعنی سلسلہ درس شروع ہو جاتا۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ "ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے (واضح رہے کہ آپ کا یہ معمول رمضان المبارک کے علاوہ ہوتا تھا) جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ غسل کر کے بہترین لباس زیب تن فرماتے' خوشبو لگاتے اور نماز جمعہ کے لئے نہ تو بہت پہلے جاتے اور نہ بالکل آخر میں بلکہ ہر کام میں فرمان رسول ﷺ کے مطابق اعتدال کو پیش نظر رکھتے تھے۔ جامع مسجد کبھی پیدل جاتے اور کبھی سواری پر۔ جمعے کے فرائض مسجد میں ادا کرتے تھے اور سنتیں اور نوافل گھر میں پڑھتے تھے۔

رمضان المبارک میں عبادت غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی تھی۔ آپ فرض نماز باجماعت ادا کر کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور باقی عبادت تنہائی میں کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی عبادت و ریاضت کا یہ معمول وفات تک جاری رہا۔

لہسن کے استعمال سے منہ میں ایک طرح کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے چونکہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کثرت سے ذکر الٰہی کرتے تھے' اس لئے آپ لہسن کے استعمال سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ اگر آپ کو کبھی کسی کھانے میں لہسن کا اثر محسوس ہو جاتا تھا تو اسے چکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا شمار حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردان خاص میں ہوتا تھا۔ آپ ابن محمد رحمتہ اللہ علیہ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ خود بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا بھی یہ حال تھا کہ ہمہ وقت اس کوشش میں مصروف رہتے کہ کسی نہ کسی طرح استاد گرامی کی خدمت کر سکیں مگر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ آپ اپنے ذاتی کاموں کے لئے دوسروں کو تکلیف دیں۔ پھر بھی بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ نے استاد کی بہت خوشامد کرنے کے بعد اپنی ایک باندی کو خدمت کے لئے مامور کر دیا تھا۔

شاگرد کا بے انتہا اصرار دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا اور پھر وہ کنیز آپ کی خدمت گزاری میں مصروف ہو گئی تھی۔ بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی اس باندی کا نام عینا تھا۔

ایک بار عینا نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے لئے کھانا تیار کیا۔ شاید اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ لہسن کے استعمال سے سخت اجتناب فرماتے ہیں، اس لئے عینا نے کھانے میں اتنا لہسن ڈال دیا کہ کوئی شخص کھائے بغیر اس کی بو کو محسوس کر سکے۔ بالآخر جب حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے کھانا لایا گیا تو آپ نے لہسن کی بو کو فوراً محسوس کر لیا۔ ایک نظر کنیز عینا کی طرف دیکھا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ' باندی کی اس حرکت سے طبیعت میں سخت گرانی محسوس کرنے لگے' مگر اس پر اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا۔ دوسری بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور آہستہ لہجے میں فرمایا۔

"اللہ تمہیں برکت دے۔ تم اس کھانے کو میرے پاس سے اٹھا کر لے جاؤ۔"

عینا کا بیان ہے کہ میں نے حضرت کے حکم سے مجبور ہو کر کھانا تو اٹھا لیا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پورے بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ میں کھانے کے برتن اٹھا کر مطبخ میں لے آئی مگر اس تپش میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی

جو میرے جسم کو جلائے ڈال رہی تھی۔ پھر یہ سوزش اس قدر بڑھ گئی کہ میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہاں تک کہ مجھے امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے مکان میں پناہ لینا پڑی۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ صورت جمال میں لوگوں سے ملا کرتے تھے۔ اگر کبھی آپ پر جلال کی ہلکی سی کیفیت طاری ہو جاتی تو پھر آپ کی ایک نگاہ کی تاب لانا بھی مشکل ہو جاتا۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ عجیب جامع الصفات انسان تھے۔ آپ کے کردار اور فضل و کمال کی جہتیں متعین کرنا ایک کار دشوار ہے۔ جب کوئی دیکھنے والا حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی جانب دیکھتا ہے تو وہ بیک وقت محدث جلیل بھی نظر آتے ہیں اور فقیہ عظیم بھی۔ وہ علم بے کنار کا بھی مظہر ہیں اور عمل غیر متزلزل کی بھی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ جب آپ مجلس علم میں لب کشا ہوتے تھے تو معرفت اور آگاہی کا سمندر موجزن نظر آتا تھا۔ پھر جب آپ اپنے خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریزہ ہوتے تھے تو اہل دنیا حیران رہ جاتے تھے کہ یہ کیسا سجدہ گزار ہے' کیسا عابد ہے اور کیسا زاہد۔

پھر جب خدا کی راہ میں جاں نثاری کا وقت آتا تھا تو دیکھنے والے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو جوش جہاد میں مضطرب پاتے تھے۔ اس خاص مقصد کے لئے آپ نے ایک اونٹنی پال رکھی تھی۔ علامہ ابن سعد نے اپنی مشہور کتاب ''طبقات'' میں تحریر کیا ہے کہ ایک بار مذہبی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اور ایک رومی کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ دونوں طرف سے شمشیریں بے نیام ہوئی تھیں اور ایک دوسرے نے جنگ کے دوران اپنے بہترین حربے استعمال کیے تھے۔ دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا یہ عظیم محدث و فقیہ اس رومی کی ضربات کی تاب نہ لا سکے گا جو فنون جنگ سے مہارت کی حد تک آشنا تھا۔

مگر جیسے جیسے جنگ شدت اختیار کرتی گئی، لوگوں کو اپنے اندازوں پر شبہ ہونے لگا۔ جو لوگ اس بات کے گواہ تھے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو ''قرطاس و قلم'' کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں آتا، وہ یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ حضرت ابن عون رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ نہ صرف شمشیر گراں بار کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں بلکہ فنون سپہ گری میں بھی مشاقی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ میدان میں بہت دیر تک تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی رہی۔ پھر لوگوں کو برق سی لہراتی نظر آئی۔ یکایک ایک انسانی چیخ بلند ہوئی۔ دیکھنے والوں نے سمجھ لیا کہ دونوں میں سے ایک حریف شکست کھا چکا ہے۔

پھر جب لوگوں کی آنکھوں کے سامنے سے غبار چھٹا تو رومی کافر اپنے خون میں نہا چکا تھا اور اس کی گردن جسم سے جدا ہو گئی تھی علم و ہوش کا کشور کشا' دست و پا کی جنگ میں فاتح ٹھہرا تھا۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ گفتار کے بھی غازی تھے اور کردار کے بھی۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حلقہ یاراں تو بڑی بات ہے' حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ تو عام لوگوں کے ساتھ بھی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص جو ابھی اٹھ کر گیا ہے' وہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا قریبی دوست یا عزیز ہے۔ پھر جب اسے معلوم ہوتا کہ وہ تو ایک عام ملاقاتی تھا تو دیکھنے والے کو شدید حیرت

ہوتی۔ پھر جب کوئی شخص حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ سے اس انداز ملاقات کے بارے میں پوچھ لیتا تو آپ بڑے پرسوز لہجے میں فرماتے۔

"ہمارے پاس لوگوں کو دینے کے لئے اور کیا ہے' علم کی روشنی یا ایک شگفتہ مسکراہٹ۔ اگر آنے والا علم کا طالب ہوتا ہے تو میں اسکے دامن میں حسب توفیق فکر و آگہی کا سرمایہ ڈال دیتا ہوں' اور جب وہ علم کی طلب نہیں رکھتا تو پھر میں اس کے لئے اپنا تبسم لٹا دیتا ہوں۔ پتا نہیں اس کے ذہن و دل پر تلخیوں کا کس قدر غبار ہوگا' میں تو یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ شاید اس طرح اس کے دل کا غبار کچھ ڈھل جائے یا پھر اس کی روح کا کچھ بوجھ کم ہو جائے۔"

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا یہ طرز عمل رسالت مآب ﷺ کی اس حدیث مبارک کے عین مطابق تھا جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ "اپنے بھائی کے لئے مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے حلم اور بردباری کا یہ حال تھا کہ وہ صفات انسانی میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

ایک بار آپ کے کسی غلام نے آپ کی اونٹنی کے چہرے پر کوئی وزنی چیز مار دی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اونٹنی کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اپنی اس اونٹنی سے بے حد محبت کرتے تھے۔ غالباً یہ وہی اونٹنی تھی جس پر بیٹھ کر آپ کئی بار جہاد میں شریک ہوئے تھے۔ جیسے ہی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو اونٹنی کے زخمی ہونے کی خبر ملی' آپ بے قرار ہو کر اسے دیکھنے کے لئے مجلس درس سے اٹھ گئے۔

پھر جب حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے خون میں نہائی ہوئی اونٹنی کو دیکھا تو آپ کے چہرے پر اذیت و کرب کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ شدید غصے کی کیفیت سے دو چار تھے اور یہ غصہ غلام کی جارحانہ حرکت پر تھا جس نے ایک معصوم جانور کو حد سے زیادہ تکلیف پہنچائی تھی۔

"غلام کہاں ہے؟" حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے اہل خانہ سے دریافت کیا۔ اس وقت آپ کے لہجے سے ناگواری اور غصے کی کیفیت صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

اہل خانہ نے بتایا کہ غلام اس وقت موجود نہیں ہے' کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے غلام خود ہی کوئی بہانہ تراش کر وہاں سے چلا گیا ہو اور اس نے سوچا ہو کہ جب حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا غصہ فرو ہو جائے گا تو وہ آپ کے سامنے آنے کی کوشش کرے گا۔

"جیسے ہی وہ کام ختم کر کے گھر آئے اسے میری مجلس میں بھیج دیا جائے۔" اتنا کہہ کر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ دوبارہ حلقہ درس میں تشریف لے آئے۔ طالبان حدیث وفقہ نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اسی انداز سے درس دے رہے تھے لیکن اس دوران کبھی کبھی آپ کے چہرۂ مبارک پر سوگواری کا ہلکا سا عکس ابھر آتا تھا۔

پھر جب غلام واپس آیا تو حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے اہل خانہ نے اسے مطلع کیا کہ وہ فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو۔

غلام جانتا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے اسے کس لئے طلب کیا ہے۔ وہ اپنی اضطراری حرکت

پر نادم تھا' لیکن یہ خیال بھی اس کے ذہن میں بار بار ابھرتا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اونٹنی کو زدوکوب کرنے کے سلسلے میں ضرور اسے سزا دیں گے۔ شرمندگی اسے روکتی تھی اور حکم کی طاقت اسے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس کی جانب کھینچتی تھی۔ بالآخر اسے جانا پڑا۔ وہ اول و آخر ایک غلام بھی تھا اور مجرم بھی۔

جس وقت غلام حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں جا رہا تھا' اسے ذہنی طور پر اتنی تقویت ضرور تھی کہ یہ کوئی سنگین معاملہ نہیں' صرف ایک جانور کی بات ہے' جسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے یا پھر سخت سست الفاظ کی ادائیگی کے بعد اس کے جرم کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

مگر جب وہ غلام حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس میں داخل ہوا تو پوری مجلس طلباء سے بھری ہوئی تھی۔ جیسے ہی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے غلام کو دروازے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو بلند آواز میں فرمایا۔

''وہیں رک جاؤ! میں تم سے کچھ اور نہیں کہتا' بس اتنا پوچھتا ہوں کہ کیا مارنے کے لئے اس ناقہ (اونٹنی) کا چہرہ ہی رہ گیا تھا۔ خدا تمہیں برکت دے میرے سامنے سے بھی چلے جاؤ اور میرے گھر سے بھی۔ آج سے تم آزاد ہو۔''

جیسے ہی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے' پوری مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ ایک اونٹنی کو زخمی کرنے کے جرم میں یہ عجیب و غریب سزا دیں گے۔

خود غلام کی یہ کیفیت تھی کہ شدت ندامت کے باعث وہ اپنے آپ کو دنیا کا حقیر ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ اسی صدمے کی وجہ سے وہ کچھ دیر تک دروازے میں جامد و ساکت کھڑا رہا۔ پھر جب حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے غلام کو اس طرح کھڑے ہوئے دیکھا تو دوبارہ فرمایا۔

''خدا تم پر اپنی رحمت نازل کرے۔ تم فوراً چلے جاؤ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

اس حکم کے بعد غلام حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس سے نکل کر چلا گیا' مگر اس طرح کہ اس کے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔ اگرچہ اب وہ آزادی کی بہترین نعمت سے سرفراز ہو چکا تھا۔ لیکن اسے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں گزرنے والا وہ دور غلامی یاد آ رہا تھا جو اپنی قیمت کے اعتبار سے ہزار آزادیوں پر بھاری تھا۔

پھر جب غلام چلا گیا تو حاضرین مجلس میں کسی شخص نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا۔ ''آپ اس واقعے کو درگزر بھی کر سکتے تھے۔ یہ تو آپ نے خود اپنا ہی نقصان کر لیا۔''

جواب میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''میں سود و زیاں کا کاروبار نہیں کرتا۔ جب تک وہ شخص یہاں موجود رہتا' اس وقت تک مجھے اونٹنی کا بہتا ہوا خون یاد آتا رہتا۔ ممکن ہے اس طرح غلام کے خلاف میرے دل میں کدورت یا نفرت پیدا ہو جاتی۔ اس لئے میں نے اس بنیاد ہی کو اکھاڑ پھینکا جو ان مہلک بیماریوں کا سبب بن سکتی ہے اور پھر جسے جانوروں کی تکلیف کا احساس تک نہ ہو وہ شخص میرے ساتھ کس طرح رہ سکتا ہے؟''

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے کردار کا یہ عجیب پہلو ہے کہ انسان تو انسان، آپ کسی جانور کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ آپ کے ضبط نفس کی اعلیٰ ترین مثال تھی کہ شدید جلال کے عالم

میں بھی مخاطب کو دعاؤں سے نوازتے تھے اور اذیت پہنچانے والوں کے دامن کو انعامات سے بھر دیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے ایک شاگرد بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ "میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک طویل عرصے تک رہ چکا ہوں۔ میں نے آپ کی بے شمار مجالس روز و شب میں شرکت کی ہے۔ میں نے آپ کے کردار کے ہر پہلو کو دیکھا ہے۔ اس قدر مشاہدے کے بعد میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ زبان پر قابو رکھنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ لونڈیوں اور غلاموں کا ذکر ہی کیا، حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ تو اپنی مرغیوں اور بکریوں تک کو بھی برا بھلا نہیں کہتے تھے۔ وہ سراپا ضبط تھے' حلاوت تھے' شیریں تھے اور نرم گفتار تھے۔"

بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ ہی کا دوسرا بیان ہے کہ جہاں تک لونڈیوں اور غلاموں کا تعلق ہے تو وہ بہرحال اپنے کہلاتے ہیں۔ ان سے دن رات کی قربتوں کا ایک خاص رشتہ ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ تو وہ انسان تھے جو اپنے دشمنوں کو بھی برا نہیں کہتے تھے۔

غلام خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے ایک عرب عورت سے شادی کر لی تھی۔ اگرچہ عرب عورت نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو آپ کی بلند شخصیت اور علمی صفات کی وجہ سے پسند کیا تھا لیکن بعض عرب حلقوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری تھی۔ ایک شخص بلال ابن بردتو قوم پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس قدر جارحیت پر اتر آیا تھا کہ اس نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی جان تک لینے کی کوشش کی تھی۔ اس حادثے میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی تو محفوظ رہی لیکن آپ شدید زخمی ہو گئے تھے۔

پھر جب بھی کسی محفل میں بلال ابن برد کا ذکر آتا تو آپ اس سفاک شخص کو اچھے القابات سے یاد کرتے۔ کسی ایک لمحے کے لئے بھی لوگوں نے نہیں دیکھا کہ اس دشمن جاں کا نام سن کر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے ماتھے پر کوئی شکن ابھری ہو' یا چہرے پر ناگواری کا کوئی ہلکا سا عکس نظر آیا ہو۔ آپ کے اس صبر و تحمل اور اعلیٰ ظرفی کو دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ انسان ہے یا اسلامی روایتوں کا کوہ سر بلند؟ اس کا دل ہے یا بحیرہ عرب کہ رنج والم اور اذیت و کرب کے دریا سمائے چلے جاتے ہیں اور اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اور ایک جابر و ستمگر انسان کی قوت برداشت میں بڑا فرق ہے۔ ظالم شخص فطرتاً بے حس ہوتا ہے' وہ اپنے اطراف میں پیش آنے والے کسی حادثے سے متاثر نہیں ہوتا اور لوگ اس کے آہنی اعصاب کی مثالیں پیش کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے افراد کی قوت برداشت حجت نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس کچھ لوگ فطرتاً رقیق القلب ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی دوسرے انسان کو آفات و مصائب کا شکار دیکھتے ہیں تو شدت درد سے بے قرار ہو اٹھتے ہیں، حالانکہ یہ درد ان کے جسم کے کسی حصے میں موجود نہیں ہوتا اور جب خود کسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس طرح دن گزارتے ہیں کہ کبھی کبھی اہل خانہ کو بھی پتا نہیں چلتا۔ نسل آدم کا یہی وہ گروہ ہے جس کے صبر و ضبط اور قوت برداشت کو مثالی کہا گیا ہے۔ دراصل یہی وہ گوشت پوست کے لوگ ہوتے ہیں جنکی استقامت دیکھ کر سنگ و آہن' بھی شرمسار نظر آنے لگتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اسی قبیل کے ممتاز ترین فرد تھے جو دوسروں کے غم میں سب سے پہلے شریک ہوتے ہیں لیکن اپنے غم

میں کسی کی شرکت گوارہ نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی اس اعلیٰ ظرفی اور قوت برداشت کو دیکھ کر لوگوں نے آپ سے برسر مجلس کہا۔ ''آج بھی ہماری آنکھوں میں اس وقت کے مناظر موجود ہیں جب بلال ابن بردنے آپ کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا تھا مگر ایک آپ ہیں کہ اس کی برائی تک سننا گوارا نہیں کرتے۔''

جواب میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھو کہ ایک آدمی مظلوم ہوتا ہے لیکن جب وہی شخص ظلم کی شکایت کرتا ہے تو ظالم بن جاتا ہے' تم میں سے کوئی بھی بلال ابن برد کے بارے میں اتنا سخت نہیں ہے جتنا کہ میں ہوں لیکن پھر بھی اس کے ظلم کی شکایت کر کے ظالم نہیں بنوں گا۔''

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ ان خوش نصیب انسانوں میں سے تھے کہ جنہیں خدا نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت بھی عطا کیا تھا۔ نہایت وجیہہ شخص تھے کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ آپ کے مزاج میں بھی حد درجہ لطافت و نفاست تھی۔ نرم و باریک لباس پہنتے تھے اور خوشبو کا استعمال کثرت سے کرتے تھے۔ جب بھی کہیں تشریف لے جاتے تو پوری قبا پہن کر گھر سے نکلتے تھے۔

جس طرح حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی اپنے اندر ایک خاص انفرادیت رکھتی تھی اسی طرح آپ کی موت بھی لائق رشک تھی۔ زندگی میں حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ آپ گریہ وزاری کے ساتھ بہت طویل دعا مانگا کرتے تھے۔ آپ کی دعاؤں میں یہ خاص دعا بھی شامل تھی۔

نصف شب کے سناٹے میں جب انسانی بستیاں سو جاتی تھیں تو حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اپنے دونوں ہاتھ دراز کر دیا کرتے تھے۔ پھر رقت کے ساتھ فضاؤں میں یہ دعا لرزنے لگتی تھی۔

''اے پیکر نور! دنیا میں وہ کون سے آنکھ ہے جو تیرے جمال بے نقاب کی متحمل ہو سکتی ہے' جنہوں نے تجھے دیکھا' حقیقت میں وہ بھی تجھے نہیں دیکھ سکے اور دیکھتے بھی کس طرح کہ انسانی بصارت اور تیرے روئے پاک کے درمیان حد ادب قائم ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس کائنات کے خوش نصیب ترین لوگ تھے جو تیرے قریب رہے' جو تیرے جسم اطہر کی مقدس خوشبو سے اپنی روحوں کو مہکاتے تھے' جو تیری نوائے عرشیانہ سے اپنی خاکی سماعتوں کو شرف یاب کرتے تھے اور جو تیرے قدموں کے غبار کو اپنے چہروں پر مل کر خود بھی شعاع خورشید بن جاتے تھے۔ مگر یہ تیرا ادنیٰ ترین غلام عبداللہ بن عون کیا کرے کہ اسے زمانے کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ یہ کہاں جائے کہ تیرے دیدار کے بغیر اسے غلامی کی سند بھی میسر نہیں آ سکتی۔ اے مرکز نگاہ انبیا! اے محور آرزوئے ملائکہ! اے تمنائے دل عارفاں! اے مخزن دانش و آگہی! اے محافظ ناموس ابن آدم! اے رہنمائے بے راہ رواں! اے پناہ گاہ عاصیاں! میری طرف بھی ایک نظر۔ بے شک' میری آنکھ اس قابل نہیں مگر تو اپنی شان کریمانہ کا خیال کر اور میرے خوابوں کے صحرا پر ایک بار برس جا کہ میں بھی جی اٹھوں۔ اگر تیری چشم کرم میری جانب نہیں اٹھی تو پھر میں مردہ ہوں' مردوں کی طرح دنیا سے چلا جاؤں گا اور پھر حشر میں بھی مردوں ہی کی مانند اٹھایا جاؤں گا۔ اے سرچشمہ حیات ابدی! مجھے بھی زندگی کا ایک لمحہ دے کہ اس لمحے کے بغیر میرا وجود و عدم برابر ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی یہ دعا اس لئے تھی کہ آپ حالت خواب میں رسالت مآب ﷺ کے دیدار سے مشرف ہو جائیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو اسی طرح روتے ہوئے

ہزاروں راتیں گزر گئی تھیں۔ جب بھی سورج غروب ہوتا اور شب کی تاریکی پھیلتی' حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے سینہ سوزاں میں ایک ہی آرزو ئے ناتمام کروٹیں لینے لگتی کہ شاید آج رات نگاہ کرم اٹھے اور اس غلام زادے کو شرف یاب کر دے۔ مگر پھر صبح ہوتے ہی یہ شرار آرزو بجھنے لگتا۔

بے شمار روایتیں گواہ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی ہر رات کا آغاز تمنائے دیدار رسول ﷺ سے ہوتا تھا۔ نیند انسان کی فطری ضرورت ہے مگر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ اس لئے سوتے تھے کہ آقا خواب میں تشریف لائیں گے۔

کبھی کبھی فریاد کرتے تھے "بس ایک بار یہ ذرہ حقیر آفتاب رسالت کو دیکھ لے' پھر باد فنا اسے اڑا کر وادی مرگ میں لے جائے۔ اس کے بعد جی کر بھی کیا کروں گا؟"

بڑی عجیب چنگاری تھی جو روح کی گہرائیوں میں مسلسل سلگتی ہی رہتی تھی۔ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے مگر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کا گریہ نیم شب اس چنگاری کو پیہم بھڑکاتا رہتا تھا۔ علامہ اقبال کے بقول ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاراں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اور پھر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی تشنہ و مضطرب دعا باب اثر تک پہنچ ہی گئی۔ ایک رات آپ سوئے تو بے جان خوابوں کو حیات دوام بخش دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے رسالت مآب ﷺ کو اس طرح دیکھا کہ خورشید نبوت صد ہا حجاب کے اندر تھا' پھر بھی ایک کرن اس غلام زادے کو راضی کر گئی جو نصف صدی سے روشنی کی گزرگاہ میں نیم جاں پڑا تھا۔

جب سرور کونین ﷺ خواب میں واپس تشریف لے گئے تو فوراً ہی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھ کھل گئی۔ جس روز آپ نے یہ خواب دیکھا تھا اس رات چھت پر سوئے تھے۔ بیدار ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ پر ایسی وارفتگی طاری تھی کہ کسی شے کا ہوش نہیں تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ مسجد میں پہنچ کر سجدہ شکر بجا لائیں مگر کیفیت بے خودی نے آپ سے رفتار کا توازن چھین لیا تھا۔ چھت سے نیچے اترتے وقت قدم اس طرح لڑکھڑائے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ زمین پر گر پڑے اور پیروں میں اس قدر چوٹ آئی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔

دوسرے دن لوگوں کو خبر ہوئی تو سارا شہر ہی عیادت کے لئے مکان پر جمع ہو گیا۔ گلیاں اور کوچے بھر گئے اور شاہراہیں بند ہو گئیں۔ آپ نے اپنے شاگردوں کے ذریعے مشتاقان دید کو پیغام بھجوایا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ معمولی چوٹ ہے' جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے بظاہر بے قراروں کے ہجوم کو مطمئن کر دیا تھا اور لوگ یہ تسکین آمیز کلمات سن کر واپس بھی چلے گئے تھے مگر حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے سوا کون جانتا تھا کہ یہ کیسی چوٹ ہے اور یہ زخم کب بھرے گا۔

پھر جب ہزاروں انسانوں کا مجمع منتشر ہو گیا تو قریبی عزیزوں اور شاگردوں نے مشورہ دیا کہ ماہر طبیب کو بلا کر علاج شروع کیا جائے ورنہ زخموں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کچھ دیر تک اپنے غم گساروں کے مشورے سنتے رہے۔ آخر لوگ خاموش

ہوئے تو آپ نے اپنے تمام ہمدردوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
"یہ وہ زخم نہیں جو طبیبوں کے دیئے ہوئے مرہم سے بھر جائیں، اور اگر کوئی مجھے یہ یقین دلا بھی دے کہ ان زخموں کا اندمال ممکن ہے تو بھی وہ دوا استعمال نہیں کروں گا جو مجھے عارضی شفا بخش دے۔ میں اپنے رب کے حضور جانا چاہتا ہوں اور انہی رستے ہوئے زخموں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں کہ یہی زخم میری عمر گریزاں کا سرمایہ ہیں۔"
بالآخر یہی زخم حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی موت کا سبب بن گئے زخموں سے خون ٹپکتا رہا مگر آپ کے چہرے پر نہ کوئی کرب کی علامت ظاہر ہوئی اور نہ کسی انسان کی مسیحائی قبول کی۔
بکار بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ بیماری کے دوران شیر سے زیادہ بہادر اور شاکر نظر آتے تھے۔ آخری سانس تک قبلہ رو ہو کر خدا کا ذکر کرتے رہے' یہاں تک کہ 151ھ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔
جب حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کی خبر عام ہوئی تو شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ آپ کی جدائی کے غم میں ہر قلب چاک' ہر سینہ فگار اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔
حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ محراب میں رکھ کر پڑھائی گئی۔ مسجد کا ایک ایک گوشہ اور صحن نمازیوں سے بھر گیا تھا پھر جب جنازہ اٹھا تو خلقت کا اس قدر ہجوم تھا کہ سارے راستے تنگ ہو گئے تھے۔
حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ نے ترکے میں کوئی نقد رقم نہیں چھوڑی تھی۔ صرف دو مکان تھے۔ آپ بیماری کے دوران پانچویں حصے کی وصیت اپنے عزیزوں کے لئے کر گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ پر کسی شخص کا دس ہزار قرض موجود تھا۔
سب سے پہلے مکان فروخت کر کے وہ قرض ادا کیا گیا اور پھر اس وصیت کی تکمیل کر دی گئی۔
حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ رسالت مآب ﷺ سے جو والہانہ محبت رکھتے تھے، اس محبت نے نہ صرف آپ کو دیدار رسول ﷺ سے شرف یاب کیا بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے محدثین وفقہا کی طویل جماعت میں وہ منفرد اعزاز بخشا جو کسی کسی انسان کا مقصد بنتا ہے۔
اس ذیل میں معتبر روایات موجود ہیں کہ اسی زمانے کے چند بزرگوں نے جب سرور کونین ﷺ کو خواب میں دیکھا تو رسالت مآب ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا۔
"عبداللہ بن عون کی زیارت کیا کرو۔"
اگر اہل نظر اس نکتے کو سمجھنا چاہیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ زیارت رسول ﷺ کے لئے زندگی بھر شدید اضطراب میں مبتلا رہے۔ یہ ایک غلام کا عشق تھا جو اپنے آقا کے روئے انور کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جاں سے گزر جانا چاہتا تھا۔ جب بارگاہ رسول ﷺ میں غلام کی آرزو قبول ہو گئی تو پھر شہنشاہ کے دربار سے یہ حکم جاری ہوا کہ لوگ "عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کریں۔"
عجیب کرم اور عجیب عطا ہے کہ جس پیکر اقدس کی زیارت کے لئے کائنات کا ایک ایک ذرہ بے تاب ہے' وہ خود اپنے ایک نام لیوا کی ذات کو اتنا معتبر بنا دیتا ہے کہ لوگ اس کی زیارت کریں اور دین و دنیا میں سرفراز ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ رسم زمانہ کے مطابق غلام تھے مگر وقت نے انہیں منصب

شہنشاہیت تک پہنچایا۔ اہل علم کہتے ہیں کہ دولت حدیث وفقہ کی کثرت نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کو درجہ سلطانی تک پہنچایا تھا۔ ان کا یہ زاویہ نظر درست ہے مگر زیادہ روشن حقیقت یہ ہے کہ عشق رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی ذات کی تکمیل کی۔ آپ اپنے علم کی وجہ سے سر بلند ضرور ہوئے لیکن شہنشاہیت کا اعزاز عشق رسول ﷺ کے بغیر ممکن نہ تھا بقول شاعر ؎

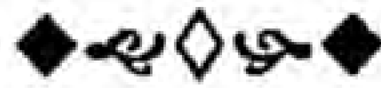
غلام تو ام زین سبب تاجدارم

تیرا غلام ہوں اس لئے شہنشاہ کا درجہ رکھتا ہوں

یہ اسی شہنشاہی کا رعب و جلال تھا کہ حضرت امام سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت یحییٰ القطانی رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم و جلیل محدث' حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی غلامی (شاگردی) پر فخر کرتے تھے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر حکمت و معرفت کی روشنی حاصل کرتے تھے۔ کسی معتبر روایت سے یہ پتا نہیں چلتا کہ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عون رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں کتنا وقت گزارا؟ لیکن یہ امر طے شدہ ہے کہ آپ اس ذات گرامی کی مجلس میں کئی بار دست بستہ بیٹھے تھے اور کردار و عمل کے اس روشن مرقع کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس کی عظمت پر گواہی دیتے ہوئے رسالت مآب ﷺ نے فرمایا تھا۔

''تم لوگ ابن عون کی زیارت کیا کرو۔''



حضرت ربیعہ رائی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت ربیعہ بعض ائمہ کرام کی طرح غلام خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر علم کی وسعت اور کردار کی بلندی نے آپ کو اس مرتبہ تک پہنچایا تھا جہاں دنیا کے کسی شہنشاہ کا گزر ممکن نہیں۔ افق اقتدار پر بے شمار حکمران ابھرے اور پھر یوں ڈوب گئے کہ آج ان کا کوئی نام لیوا بھی موجود نہیں اور اگر تاریخ کا کوئی طالب علم ذکر کرتا ہے تو اس طرح کہ اس کے چہرے پر نفرت و ناپسندیدگی کی علامتیں روشن ہوتی ہیں' لیکن غلام زادہ ہونے کے باوجود جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا نام آتا ہے تو لاتعداد سر عقیدت سے خم ہو جاتے ہیں اور اہل دل پکار اٹھتے ہیں کہ کاش وہ حضرت ربیعہ کے غلام ہوتے۔ دنیا کے بیشتر حکمرانوں نے اپنے بعد زمین پر منہدم مکانات کی طویل قطاریں' جلے ہوئے سبزہ زار' انسانی گردنوں کے مینار' عصمت و آبرو گنوا دینے والی عورتوں کے دریدہ جسم' بوڑھوں اور معصوم بچوں کے جنازوں سے سجے ہوئے مقتل چھوڑے' مگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی شکل میں دو ایسی نشانیاں چھوڑیں جن سے کروڑوں انسانوں نے اپنے دلوں کی کثافت دور کی اور دماغوں کو منور کیا۔ یہ ایک غلام زادے کی عطائے خاص ہے جس نے تاریک زمین کو علم اور کردار کی روشنی سے بھر دیا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی کنیت ابوعثمان تھی اور "رائی" لقب تھا۔ والد گرامی کا نام فروخ تھا اور آپ "آل منکدر" کے غلام تھے۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کے والد گرامی فروخ کو بنوامیہ کے عہد سلطنت میں خراساں کی ایک مہم پر جانا پڑا۔ اس وقت حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ شکم مادر میں تھے۔ کچھ دن بعد آپ کی پیدائش عمل میں آئی تو حضرت فروخ اپنے وطن مدینے سے بہت دور تھے۔

پھر مسلسل ایسے واقعات پیش آئے کہ فروخ اپنے کاموں میں الجھتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ وطن سے دور رہتے ہوئے آپ کو ستائیس سال گزر گئے۔ اس دوران ایسا کوئی موقع بھی فراہم نہ ہو سکا کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی مادر گرامی اپنے شوہر کو بیٹے کی ولادت کی اطلاع دے سکتیں۔ بالآخر تمام اہل خاندان نے سمجھ لیا کہ فروخ کسی حادثے کا شکار ہو کر وفات پا گئے۔ ورنہ زندہ ہوتے تو بیوی کی ضرور خبر لیتے۔

یہ ایک جانگداز مرحلہ تھا مگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ ایک روشن خیال اور جانباز خاتون تھیں۔

انہوں نے شوہر کی موت یا روپوشی کے صدمے کو بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ برداشت کیا اور اپنے کم سن بچے کو مکتب میں داخل کرا دیا۔ فروخ خراساں جاتے وقت اپنی شریک حیات کو ایک کثیر رقم دے چکے تھے۔ اس لئے آپ کو مالی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تاہم عزیز داروں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس سرمائے کو بیٹے کی تعلیم پر خرچ کرنے کے بجائے آڑے وقت کے لئے بچا کے رکھا جائے۔ دنیاداری کے اعتبار سے یہ ایک مفید مشورہ تھا مگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ نے ان باتوں پر ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ جب بھی کوئی اہل خاندان آپ کو اس عمل سے روکنے کی کوشش کرتا تو نہایت بے باکی کے ساتھ فرماتیں۔

"میرا سرمایہ دینار و درم نہیں' میری دولت تو ربیعہ ہے۔ اگر وہ تعلیم حاصل کر لیتا ہے تو میں سمجھوں گی کہ میں نے سب کچھ پا لیا خواہ اس کشمکش میں مجھے فاقہ کشی کی منزل سے گزرنا پڑے۔ یا پھر میں دوسروں کی مزدوری کروں مگر ربیعہ کی تعلیم جاری رہے گی۔"

بالآخر وہی ہوا۔ اس اولوالعزم خاتون نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر نہ صرف ایک ایک درم لٹا دیا' بلکہ اپنے شب و روز کا سکون بھی قربان کر دیا۔

پھر وقت نے کروٹ لی اور ایک نہایت عجیب صورت حال پیش آئی۔ پورے ستائیس سال بعد حضرت فروخ اپنے وطن مدینہ واپس لوٹے۔ جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو اس طرح کہ گھوڑے پر سوار تھے اور ایک ہاتھ میں نیزہ چمک رہا تھا۔

اس طویل مدت میں فروخ کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ محلے کا کوئی ایک شخص بھی نہ پہچان سکا کہ یہ فروخ ہیں اور ستائیس سال بعد اپنے گھر آئے ہیں۔ فروخ نے مکان پر پہنچ کر نیزے کی نوک سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس وقت حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ مکان پر موجود تھے۔ جیسے ہی دروازے پر دستک ہوئی آپ باہر نکل آئے۔ سامنے ایک نیزہ بردار بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے اجنبی کے سراپا کو بغور دیکھا اور پھر انتہائی نرم لہجے میں دریافت کیا۔

"بزرگ! آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

فروخ نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور اپنے نیزے سے نیم وا دروازے کو مکمل طور پر کھولنا چاہا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ ایک اجنبی شخص کے اس جارحانہ طرز عمل کو برداشت نہ کر سکے۔ جوانی کا گرم خون تھا۔ آخر کھول اٹھا اور آپ کی شیریں گفتاری' تلخ کلامی میں تبدیل ہو گئی۔

"اے دشمن خدا! تو کون ہے جو میرے مکان میں ایک حملہ آور کی طرح داخل ہونا چاہتا ہے۔" حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی آواز بلند تھی اور چہرے پر شدید غصے کے آثار نمایاں تھے۔

فروخ بھی ایک اجنبی نوجوان کے طرز گفتگو کو برداشت نہ کر سکے اور نہایت تند و تیز لہجے میں کہنے لگے۔

"دشمن خدا تو تو ہے کہ میرے حرم میں داخل ہو گیا ہے۔"

جواب میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی غضب ناک لہجہ اختیار کیا۔ نتیجتاً نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دونوں باپ بیٹے بے خبری کے عالم میں ایک دوسرے سے بری طرح الجھ گئے۔ اس وقت حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی

والدہ محترمہ گھر پر موجود نہیں تھیں۔ اس لئے فروخ کو کون بتاتا کہ وہ جس نوجوان کو اپنے حرم میں داخل ہونے کا طعنہ دے رہے ہیں وہ ان کا اپنا فرزند ہے اور اسی طرح ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ پر یہ راز کیسے فاش ہوتا کہ یہ بوڑھا شخص کوئی غیر نہیں، خود ان کے والد گرامی ہیں۔

غرض لاعلمی کے سبب مکان کے باہر ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ شور وغل بڑھا تو محلے کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے، مگر بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے مسئلہ اپنی جگہ بدستور قائم رہا۔

بالآخر اڑتے اڑتے یہ خبر حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے طالبان حدیث تک پہنچ گئی کہ ایک اجنبی شخص ان کے استاد گرامی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سے برسر پیکار ہے (واضح رہے کہ اس وقت حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نوجوان ہونے کے باوجود اپنا ایک بڑا حلقہ درس رکھتے تھے۔)

شاگردوں کو اطلاع ہوئی تو وہ لوگ ایک ہجوم کی شکل میں اپنے استاد کی مدد کے لئے حاضر ہوئے۔

جب حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ بن انسؓ وہاں پہنچے تو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ فروخ سے کہہ رہے تھے۔

"خدا کی قسم! میں تمہیں خلیفہ کے پاس لے جائے بغیر نہیں مانوں گا۔"

جواباً فروخ بھی چیخ رہے تھے۔ "ہاں! خدا کی قسم میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ میرا معاملہ خلیفہ کے سامنے پیش ہو۔ پھر اہل مدینہ سمجھ لیں کہ ایک شخص کی عدم موجودگی میں کس طرح اس کے حقوق غصب کئے گئے ہیں۔"

اسی دوران حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ ہجوم سے بچتی ہوئی اپنے مکان میں داخل ہوئیں۔ انہیں شدید حیرت تھی کہ یہ کیا ہنگامہ ہے اور اتنے لوگ ان کے دروازے پر کیوں جمع ہیں؟

ابھی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی مادر گرامی معاملے کی نوعیت کو سمجھنے بھی نہیں پائی تھیں کہ حضرت امام مالک بن انسؒ آگے بڑھے اور نہایت صبر وسکون کے ساتھ فروخ سے مخاطب ہو کے بولے۔

"بزرگ! اگر آپ کو مدینے میں قیام کرنا ہے تو کوئی دوسرا مکان تلاش کر لیجئے مگر اس جگہ پر غیر قانونی دعویٰ نہ کیجئے جو کسی دوسرے کی جاگیر ہے۔"

"تم لوگ غلط کہتے ہو۔" فروخ حسب سابق چیخ کر کہنے لگے۔ "یہ مکان میری ملکیت ہے جس پر اس نوجوان نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی شخص بھی مجھے نہیں پہچانتا کہ میرا نام فروخ ہے اور میں "آل منکدر" کا غلام ہوں۔ کیا کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں تقریباً ستائیس سال پہلے یہاں مقیم تھا اور ایک ضروری کام سے خراسان چلا گیا تھا۔ اب واپس لوٹا ہوں تو ہر آدمی میرے لئے اجنبی ہے اور کوئی بھی میری ملکیت کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں۔"

دوسرے لوگ تو فروخ کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکے، مگر جیسے ہی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ نے ان کی یہ گفتگو سنی تو بے اختیار گھر سے باہر نکل آئیں اور ہجوم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگیں۔

"لوگو! تم اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاؤ۔ یہ میرے شوہر فروخ ہیں جو ایک طویل مدت کے بعد اپنے گھر واپس آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر آپ فروخ کو اندر لے گئیں۔ انسانی مجمع شدید حیرت کے عالم میں واپس چلا گیا اور پھر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بھی بڑے شرمسار سے مکان کے اندر داخل ہوئے۔

والدہ محترمہ نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ "ربیعہ یہ تمہارے والد گرامی فروخ ہیں۔"

اور پھر فروخ سے کہا۔ "یہ تمہارا فرزند ربیعہ ہے۔"
فروخ نے جیسے ہی بیوی کی زبان سے یہ الفاظ سنے' دیوانہ وار آگے بڑھے اور بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بھی باپ کے سینے سے لپٹ گئے اور پھر باپ بیٹے اتنا روئے کہ آنکھوں کے ساتھ دامن بھی بھیگ گئے۔
فروخ بار بار حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے تھے۔
"یہ میرا فرزند ہے! کیسا شجاع' کیسا خوبصورت اور کیسا جوان؟ خدا اس کی جوانی کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔"
جب یہ جذباتی ہنگامہ سرد ہو گیا تو فروخ نے اپنی بیوی کو چار ہزار دینار دیتے ہوئے کہا۔
"میں جاتے وقت تمہیں تیس ہزار دینار دے گیا تھا۔ وہ رقم تم نے کس طرح خرچ کی؟"
"میں نے تمہارا دیا ہوا سارا سرمایہ ایک جگہ دفن کر دیا ہے۔" حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی مادر گرامی نے کہا۔
"کچھ دن بعد وہ ساری رقم تمہارے حوالے کر دوں گی۔ ابھی ایسی کیا جلدی ہے؟ سفر کی تھکن دور کرو۔ یہ حساب پھر ہو جائے گا۔"
فروخ نے بیوی کی بات مان لی اور آرام کرنے کے لئے بستر پر دراز ہو گئے۔
حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نماز ظہر کے بعد مسجد نبوی ﷺ میں درس دیا کرتے تھے۔ جب درس کا وقت آیا اور حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ مسجد چلے گئے تو آپ کی والدہ محترمہ نے شوہر سے کہا۔
"آج تم ظہر کی نماز مسجد نبوی ﷺ میں ادا کرنا۔"
فروخ کو نماز ادا کرنی تھی۔ اس لئے خاموشی سے مسجد نبوی ﷺ چلے گئے۔ وہ ذرا بھی نہ سمجھ سکے کہ بیوی خاص طور پر مسجد نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے کے لئے کیوں کہہ رہی ہیں؟
فروخ نے نماز ادا کی اور پھر مسجد کے ایک گوشے پر نظر ڈالی تو وہاں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ فروخ نے ایک شخص سے پوچھا۔ "یہ لوگ کون ہیں اور یہاں کیوں جمع ہو رہے ہیں؟"
اس شخص نے جواباً کہا۔ "یہاں نماز ظہر کے بعد حدیث کا درس ہوتا ہے۔ یہ لوگ اسی درس میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔"
فروخ کو بھی شوق ہوا کہ وہ سماعت حدیث کریں۔ یہ سوچ کر آگے بڑھے۔ شرکائے درس نے ایک معمر شخص کو آتے ہوئے دیکھا تو آنے کے لئے راستہ دے دیا۔
اس دوران حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے والد محترم کو دیکھا تو درس میں خلل پڑنے کی وجہ سے سر جھکا لیا۔ اس حالت میں فروخ اپنے بیٹے کو نہ پہچان سکے اور ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔
کچھ دیر بعد حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا درس شروع ہوا۔
جب آپ کی پرسوز آواز ابھری تو اہل مجلس اس طرح ساکت ہو گئے' جیسے ان کی سانسیں رک گئی ہوں۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے ادب و احترام کا یہ حال تھا کہ حاضرین سر خم کیے اور نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ فروخ نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی ایک متنفس بھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتا تھا۔ طالبان حدیث کی عجیب کیفیت تھی اور فضا پر عجیب سکوت طاری تھا۔ آج سے پہلے فروخ نے خلیفہ کا دربار بھی دیکھا تھا۔ امراء کی نشستوں میں بھی حاضری

دی تھی۔ مگر ایسی خاموشی اور ایسا جلال کہیں نہیں دیکھا تھا۔ بالآخر وہ گھبرا کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے دریافت کرنے لگے۔

"یہ نوجوان کون ہے؟ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب فروخ اپنے فرزند کو پہچان نہیں سکے تھے۔ دوسرے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو اہل مدینہ کے درمیان اس قدر شرف حاصل ہو سکتا ہے۔

"یہ ربیعہ بن ابوعبدالرحمٰن فروخ ہیں۔" قریب بیٹھے ہوئے شخص نے مختصراً جواب دیا اور حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا درس سننے لگا۔

فروخ، بیٹے کا نام سن کر بے چین ہو گئے اور جب دلی اضطراب نے شدت اختیار کی تو بر سر مجلس ہی بول اٹھے۔

"یہ میرا بیٹا ربیعہ ہے۔ میں نے تو آج تک کسی فرمانروائے سلطنت کی بھی یہ شان نہیں دیکھی۔"

فروخ کے لئے یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ کچھ دیر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا درس سنتے رہے۔ پھر جوش جذبات میں اٹھ کھڑے ہوئے اور گھر پہنچ کے بیوی سے کہنے لگے۔

"میں نے آج ربیعہ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ مسند علم پر جلوہ افروز تھا اور بے شمار افراد اس کے سامنے اس طرح دست بستہ بیٹھے تھے جیسے کسی شہنشاہ کے روبرو اس کے غلام حاضر ہوں۔"

شریک حیات اپنے شوہر کی بے قراری دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ پھر فروخ سے پوچھا۔

"آپ کو ان دونوں چیزوں میں سے کیا پسند ہے؟ وہ تیس ہزار دینار جو آپ میرے حوالے کر کے خراسان چلے گئے تھے یا اپنے بیٹے کی یہ جلالت علمی کہ بڑے سے بڑے عمر رسیدہ شخص کا سر اس کے سامنے نہیں اٹھ سکتا۔"

فروخ نے مضطرب ہو کر کہا۔ خدا کی قسم! میں ربیعہ کے اس جلال پر اپنی زندگی کا سارا سرمایہ قربان کر سکتا ہوں۔"

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ نے فرمایا۔ "میں نے آپ کا دیا ہوا ایک ایک دینار، ایک ایک درم ربیعہ کی تعلیم پر خرچ کر دیا ہے اور میں اسی دن کی منتظر تھی کہ آپ آئیں اور دیکھیں کہ میں نے اپنے ماہ و سال کیسے بسر کئے ہیں۔"

فروخ بیوی کی گفتگو سن کر آب دیدہ ہو گئے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

"تو نے رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو اس طویل دور فراق میں میری خاندانی نشانی کی اس طرح حفاظت کرے گی۔ خدا تجھے جزائے خیر دے کہ تیری جانفشانیوں نے ہماری گردنوں سے آل منکدر کا طوق غلامی اتار پھینکا۔ آج میں اپنے آپ کو ایک شہنشاہ سے بھی زیادہ سربلند محسوس کرتا ہوں اور یہ سب تیری بے پناہ قربانیوں کے طفیل ہے۔"

شوہر کی زبانی یہ اعتراف سن کر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ بھی اشکبار ہو گئیں اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔

"اے خداوند ذوالجلال! مجھ بے سہارا عورت کے سر پر تیری رحمت کے سوا کوئی سائبان نہیں تھا۔ مجھ حقیر و عاجز میں اتنی قوت گویائی نہیں کہ تیرے احسانات مسلسل کا شکر ادا کر سکوں۔ بے شک! تو ہی اپنے بندوں کا محافظ اعلیٰ ہے کہ تیری نگہبانی کے بغیر کوئی شخص اس خارزار حیات سے بہ عافیت نہیں گزر سکتا۔"

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی والدہ کا شمار بھی ان چند محترم ماؤں میں ہوتا ہے جن کے بطن سے مردان جلیل پیدا ہوئے اور جنہوں نے اپنی جوانی کو اس طرح تربیت اولاد کی نذر کر دیا کہ دنیا کی ہر دلکشی سے پیٹھ موڑ لی۔ یہ ظرف حوصلے اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثال ہے جو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی مادر گرامی نے پیش کی جس کے نتیجے میں حدیث وفقہ کا ایسا چراغ روشن ہوا جس کی روانی اس وقت تک ماند نہیں ہوگی جب تک زمین پر قیامت نازل نہ ہو جائے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بظاہر باپ کی محبت اور نگرانی سے محروم تھے لیکن والدہ محترمہ کے زیر سایہ پرورش پا کر آپ ان لوگوں کی صف میں شامل ہو گئے جو علم کی آبرو سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ کارنامہ عین عالم شباب میں سرانجام دیا اور ان بزرگوں کو اس راستے میں بہت پیچھے چھوڑ دیا جن کے سفر کا آغاز حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش سے بھی پہلے ہوا تھا۔ یہ خدا کی عطائے خاص ہے جسے عمر اور زمانے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی جلالت علم پر ہر دور کے علماء نے اپنی گواہی پیش کی ہے۔

حضرت امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ”تمام محدثین حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم وفضل اور فہم و ادراک پر متفق ہیں۔“

حضرت ابن الماجنون رحمتہ اللہ علیہ اعتراف کرتے ہیں۔ ”میں نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بن ابوعبدالرحمٰن سے بڑھ کر حافظ سنت نہیں دیکھا۔“

سوار بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سے بہتر کوئی عالم نہیں دیکھا۔

جب اپنی رائے کا اظہار کرنے کے بعد حضرت سوار بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہوئے تو کسی شخص نے پوچھا۔ ”کیا حسن رحمتہ اللہ علیہ اور ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ بھی نہیں؟“

حضرت سوار بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ نے بلند آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔ ”ہاں حسن رحمتہ اللہ علیہ اور ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ بھی نہیں۔“

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں یہ بات شہرت پا گئی تھی کہ آپ قیاس اور رائے سے کام لیتے ہیں، اسی وجہ سے ”رائی“ کا لفظ آپ کے نام کا حصہ بن گیا۔ یہاں تک کہ اکثر تذکرہ نگار آپ کو ”ربیعۃ الرائی“ کہہ کر پکارتے ہیں۔

یہ لوگوں کا اپنا زاویہ نظر تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بہت بڑے حافظ سنت تھے۔ اس لئے آپ ہمیشہ سنت کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ سطحی علم رکھنے والے لوگ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے افکار کو ان کے ذاتی قیاس سے تعبیر کرتے ہیں۔

جب یہ شور زیادہ بلند ہوا تو ایک بار حضرت عبداللہ بن ابی سلمہ رحمتہ اللہ علیہ نے انسانی ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے عراق والو! تم ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو ”رائی“ کس لئے کہتے ہو؟ یہ تمہاری اپنی سوچ ہے یا تم نے ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کا بغور مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے؟ اگر یہ تمہاری اپنی فکر نہیں تو پھر اچھی طرح سمجھ لو کہ تم حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے علم سے بے خبر ہو۔ میں ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو خوب جانتا ہوں اور میری نظر میں اس وقت

روئے زمین پر ان سے بڑا حافظ سنت کوئی دوسرا موجود نہیں۔"

علم حدیث کے ساتھ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو فقہ میں بھی درجہ کمال حاصل تھا۔ بعض علماء کے خیال میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے فقیہانہ افکار ہی نے آپ کو زیادہ شہرت بخشی۔

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو بیک وقت حدیث وفقہ کا حافظ قرار دیا۔ اس ذیل میں دیگر علماء کا خراج عقیدت اپنی جگہ مگر جب امام ملک بن انسؒ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ علم میں باادب نظر آتے ہیں تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ ہم بھی اس مرد جلیل کی عظمت کے سامنے اپنا سر نیاز خم کر دیں۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو حضرت امام مالک بن انسؒ نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ انتہائی سوگوار لہجے میں فرمایا تھا۔

"حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے کیا گئے کہ فقہ کا مزہ ہی جاتا رہا۔"

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بن ابی عبدالرحمٰن کے فقیہانہ کمالات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ فطری طور پر دنیا کے ذہین ترین انسانوں میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ ذہین انسان کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔"

اس غیر معمولی ذہانت کے باوجود احکام شریعت میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب تک آپ کو کسی مسئلے کے بارے میں مکمل اطمینان حاصل نہیں ہو جاتا تھا' اس وقت تک اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بستر مرگ پر دراز تھے اور آپ کا آخری وقت قریب آ پہنچا تھا۔

اچانک حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے ایک شاگرد خاص حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔
"شیخ محترم! یہ آپ کے علم بیکراں کا فیض ہے کہ ہمارے تاریک دماغ روشن ہو گئے' لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ ہم سے وہ مسائل بھی دریافت کرتے ہیں جن کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ جب ایسی کوئی صورت حال پیش آ جائے تو ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اپنی رائے سے فتویٰ دے سکیں' کیونکہ ہماری رائے ان لوگوں کی رائے سے بہر حال بہتر ہو گی۔"

جیسے ہی عبدالعزیز بن ابی سلمہ رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے زرد چہرے پر آتشیں رنگ ابھر آیا۔ آپ نے فوراً ہی اپنے تیمارداروں کی طرف دیکھا۔ ایسے نازک اور سنگین وقت میں ضعف و ناتوانی کے سبب آدمی کو بات کرنی دشوار ہوتی ہے لیکن چند لمحوں کے لئے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی وہی صدائے پر جلال لوٹ آئی تھی' جسے سن کر حاضرین کے جسموں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ آپ نے تیز آواز میں ان لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا جو بستر علالت کے قریب کھڑے تھے۔

"مجھے کچھ دیر کے لئے بٹھا دو۔" حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی آواز سے ذرا بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہ اس

مسافر کا لہجہ ہے جو تیز رفتاری کے ساتھ موت کی منزل کی طرف گامزن ہے۔

''اس وقت آپ کا اپنے جسم کو حرکت دینا مناسب نہیں ہے۔'' ایک غم گسار نے احترام کے پیش نظر بہت آہستہ لہجے میں کہا۔

''کیا مناسب ہے اور کیا غیر مناسب ہے، یہ میرا خدا بہتر جانتا ہے۔ تم مجھے اٹھا کر بٹھا دو اور میرے اس حکم کی تعمیل میں ایک ساعت کی بھی تاخیر نہ کرو۔'' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا لہجہ یکایک ناخوشگوار ہو گیا تھا اور چہرے پر نظر آنے والے غیظ وغضب میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔

کس کی مجال تھی جو شیخ کے حکم سے سرتابی کر سکتا۔ مجبوراً حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو اٹھا کر بٹھا دیا گیا۔

''ابی سلمہ! تم نے کیا کہا؟'' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت تند و تیز لہجے میں اپنے شاگرد کو مخاطب کر کے فرمایا۔

حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی ظاہری حالت دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ ان سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اس لئے خاموش بیٹھے رہے اور اظہار ندامت کے طور پر اپنے سر کو مزید جھکا لیا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی طویل علالت کے سبب پہلے ہی دیوار و در پر اذیت ناک سناٹا طاری تھا۔ اب شیخ کی یہ کیفیت دیکھ کر جاں نثار اور رنجیدہ ہو گئے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے ابن ابی سلمہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور عجیب درد انگیز لہجے میں فرمایا۔

''عبدالعزیز افسوس ہے کہ میری تمام عمر کی ہدایات تمہارے کسی کام نہیں آئیں خدا کی قسم! تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک جاہل کی حیثیت سے مر جاؤ اور یہ بات انتہائی ناپسندیدہ ہے کہ تمہیں کسی چیز کا علم نہ ہو اور تم بے باکانہ اپنے فیصلے کا اظہار کر ڈالو۔''

اس کے بعد حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے شدید ناتوانی کے باوجود پوری طاقت سے فرمایا۔ ''میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا' ہرگز نہیں دے سکتا۔'' تین بار آپ نے ایک ہی جملے کی تکرار کی اور پھر اپنے خدمت گزاروں سے فرمایا۔ ''مجھے بستر پر لٹا دو۔''

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ مذہبی معاملات میں ذاتی قیاس و رائے کے کس قدر مخالف تھے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ مسجد نبوی ﷺ میں حدیث و فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ویسے تو شہر رسول ﷺ میں جس کو بھی علم سے رغبت تھی' وہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے درس میں شامل ہوتا تھا۔ مگر جب ایک بار شرکائے مجلس کا شمار کیا گیا تو یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ اس وہ چالیس علماء حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے دست بستہ بیٹھے تھے جنہیں خود بھی درجہ امامت حاصل تھا۔ یہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی جلالت علمی پر ایک ایسی گواہی ہے جسے نہ گردش روز و شب مٹا سکتی ہے اور نہ کسی کا تعصب مسترد کر سکتا ہے۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ، حضرت یحییٰ بن سعید انصاری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ، حضرت حماد بن سلمہ رحمتہ اللہ علیہ' اور حضرت لیث بن سعد رحمتہ اللہ علیہ جیسے اکابرین وقت بھی حضرت ربیعہ

رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں شامل تھے۔

اگرچہ حضرت یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ عمر میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سے بڑے تھے لیکن پھر بھی آپ کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ استاد کے ادب واحترام کا یہ عالم تھا کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی غیر موجودگی میں درس حدیث دیا کرتے تھے' لیکن جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ مجلس میں داخل ہوتے تھے تو یحییٰ بن سعید خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔

پھر کوئی شخص اس سکوت کا سبب دریافت کرتا تو حضرت یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے۔

''حضور استاد مجھ میں تاب گفتار نہیں رہتی۔ پھر میں کس طرح بول سکتا ہوں؟''

یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ تو بہر حال شاگرد تھے' خود حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد بھی آپ کی فضیلت کا برملا اعتراف کرتے تھے۔ حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ جن کے زیر سایہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے دولت علم حاصل کی تھی، جب کسی مسئلے میں الجھ جاتے تو سائل سے فرماتے۔

''میں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کیا' مگر مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اب تمہارے مسئلے کا یہی حل ہے کہ تم ربیعہ یا سالم کے پاس چلے جاؤ۔ ان دونوں حضرات میں سے کوئی ایک شخص تمہیں ضرور مطمئن کر دے گا۔''

ابن زید رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ شروع میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ علمی مجالس میں آنے سے گریز کرتے تھے۔ ایک طویل عرصہ تک آپ گوشہ نشین رہے۔ پھر جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ علم کے منبر پر نمودار ہوئے تو دیکھنے اور سننے والے حیران رہ گئے۔ اہل مجلس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے فصاحت و بلاغت کا سمندر موجزن ہے اور آپ کی زبان مبارک سے جو لفظ بھی ادا ہوتا تھا اس سے حکمت و دانائی کی شعاعیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

اس کے برعکس حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے سرزمین عراق پر کسی شخص سے علمی یا مذہبی گفتگو نہیں کی۔ اہل عراق سے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سخت ناراض تھے۔ اس ناراضی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عراق کے لوگ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ قیاس سے کام لیتے ہیں۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس تہمت سے شدید اذیت پہنچی تھی اور یہ اذیت آخری سانس تک برقرار رہی۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے کرب کا کچھ اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ''قیاس ورائے'' کی تہمت کے سلسلے میں آپ نے مرتے دم تک اہل عراق کو معاف نہیں کیا۔

ایک بار حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو عراق کا سفر درپیش تھا۔ جب آپ مدینے سے رخصت ہونے لگے تو حضرت امام مالک بن انسؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''مالک! اگر تم یہ سنو کہ میں نے اہل عراق کے سامنے کوئی حدیث بیان کی ہے یا کسی فقہی مسئلے میں کوئی فتویٰ دیا ہے تو تم مجھے انتہائی ناقابل اعتبار شخص قرار دینا۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا' جب اہل عراق نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی آمد کی خبر سنی تو تقریباً پورا شہر ایک مرکز پر سمٹ آیا۔ اس ہجوم میں طالبان حدیث وفقہ بھی تھے اور مقامی علمائے کرام بھی۔ تمام لوگوں نے بہت کوشش کی کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ درس حدیث کا اہتمام کریں اور اہل عراق آپ کے گرانقدر افکار سے فیض یاب ہوں مگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ خاموش رہے۔ پھر ہر طرف سے اصرار کیا گیا تو آپ بس یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

"تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تم میری خیر و عافیت معلوم کرو اور اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ۔"

جب اہل شہر نے محسوس کر لیا کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ حدیث کے موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوں گے تو لوگوں نے کچھ فقہی مسائل پیش کئے لیکن اہل شہر کا یہ منصوبہ بھی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو لب کشائی پر مجبور نہ کر سکا۔ آپ بدستور خاموش رہے۔ یہاں تک کہ اہل عراق' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے سکوت مسلسل سے اکتا کر واپس چلے گئے۔

بعض اہالیان شہر کو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی خاموشی اور ناراضگی کی وجہ معلوم ہوئی تو ان لوگوں نے معذرت بھی کی' مگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہونٹوں پر مہر سکوت برقرار رہی۔ بس اس قدر فرمایا۔

"میں اس سلسلے میں کوئی بات کہنا پسند نہیں کرتا۔ خدا کی زمین پر علم کا قحط نہیں' بے شمار چشمے بہہ رہے ہیں' جس کا جہاں جی چاہے' پیاس بجھا لے۔ اگر ربیعہ نہیں بولے گا تو کیا قیامت نازل ہو جائے گی؟"

تمام معتبر روایات گواہ ہیں کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے عراق میں طویل قیام کیا مگر آپ اس تمام عرصے میں خانہ نشیں رہے۔ بس ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے آپ مکان سے باہر تشریف لاتے، دنیاوی معاملات پر مختصر گفتگو کرتے اور پھر گوشۂ تنہائی میں چلے جاتے۔

یہ روایت بھی مشہور ہے کہ خلافت عباسیہ کے بانی سفاح نے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو عہدہ قضا کی پیش کش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر آپ اس منصب کو قبول فرما لیں تو لوگ عدل و انصاف کے زیر سایہ آ جائیں گے۔"

جواباً حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔ "جو لوگ مجھ سے یہ حسن ظن رکھتے ہیں انہیں خدا جزائے خیر دے مگر میں اپنے آپ کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے انکار کے بعد بھی سفاح خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ ایک بار اس نے آپ کو کسی بہانے سے شہر انبار بلوا بھی لیا تھا اور دوبارہ عہدہ قضا کے قبول کرنے کی درخواست کی تھی مگر مستند حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوسری بار بھی یہی عذر پیش کرتے ہوئے اس بار گراں کو اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔

بعض مؤرخین نے اس انکار کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سفاح کی بے راہ روی اور سنگ دلی سے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ ناخوش تھے۔ اس لئے ایک جابر اور اسلامی اخلاق سے بے بہرہ حکمراں کی بالادستی کو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ جیسا محدث جلیل تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ سفاح' جس کی حکومت کی بنیاد ہی ظلم و تشدد اور ناانصافی پر تھی، وہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے آزادانہ فیصلوں کو کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ نتیجتاً حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی اس عہدہ و منصب کو ٹھکرا دیا جس کی تمنا میں بہت سے اہل علم قصر خلافت کا طواف کرتے تھے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس شان بے نیازی کے مظاہرے سے سفاح کے اقتدار پر در پردہ ضرب پڑی تھی اس لئے عباسی خلیفہ نے ایک مرد قلندر کے انکار کو فراموش نہیں کیا تھا۔ بالآخر جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ مدینہ منورہ واپس چلے گئے تو سفاح نے آپ کی خدمت میں ایک قیمتی تحفہ بھیجا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس تحفے کو دیکھ کر سفاح کے قاصد سے فرمایا تھا۔
''امیر المومنین کو میرا اسلام کہنا اور یہ بھی کہہ دینا کہ شور دنیا میں آپ نے ایک گوشہ نشیں فقیہ کو یاد رکھا، اس کے لئے بے حد شکر گزار ہوں مگر یہ قیمتی تحفہ میری ذاتی حیثیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لئے قبول کرنے سے عاجز ہوں۔''

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ طرز عمل دیکھ کر قاصد حیران رہ گیا اور پھر جب وہ دربار خلافت میں واپس پہنچا تو اس نے بہ آواز بلند کہا۔

''امیر المومنین! مدینے کا وہ گوشہ نشین انسان بہت خود دار و بے نیاز ہے۔ اسے آپ کا یہ قیمتی تحفہ اتنا بھی متاثر نہ کر سکا جس قدر ایک فاقہ کش آدمی کو سوکھی روٹیاں متاثر کرتی ہیں۔''

جب قاصد حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کی کیفیت بیان کر رہا تھا، اس وقت اہل دربار نے سفاح کے چہرے پر کئی رنگ ابھر کر ڈوبتے دیکھے۔ ماتھے پر کئی شکنیں بھی نمودار ہوئی تھیں، مگر قوت برداشت نے دوسرے ہی لمحے ان لکیروں کو دھندلا ہوتے دیکھا تھا۔

اس واقعے کے بعد بھی سفاح چین سے نہیں بیٹھا۔ اس کی انا تیسری بار مضروب ہوئی تھی۔
اس لئے وہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ اور آزمانا چاہتا تھا۔ اسی منصوبے کے تحت سفاح نے قاصد کو پچاس ہزار درہم دے کر مدینہ منورہ روانہ کیا۔ قاصد کے ہمراہ خلیفہ وقت کی ایک تحریر بھی تھی۔

جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے سفاح کا خط چاک کر کے پڑھا تو یہ عبارت درج تھی۔
''میں آپ کے علم و فضل کا قائل ہوں مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی ستاتا ہے کہ آپ جیسے محدث فقیہ کو ذاتی کاموں کے لئے مسلسل تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اسی خیال کے تحت میں ایک حقیر سی رقم نذر کر رہا ہوں۔ آپ اس سے ایک لونڈی اور زندگی کی دوسری ضروری آسائشیں خرید لیں۔ یہ کوئی تحریص و ترغیب نشاط نہیں۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ آپ مسائل دنیا سے بے نیاز ہو جائیں اور اپنا سارا وقت یکسوئی کے ساتھ علم کے راستے میں خرچ کر دیں۔''

یہ بھی سفاح کی ایک پر فریب چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والا شاہین کسی صورت زیر دام آ جائے۔

خلیفہ وقت کا مکتوب پڑھ کر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر آیا۔ دراصل یہ مسکراہٹ سفاح کے تخریب کار ارادوں کا جواب تھی۔ وہی جواب کہ اقتدار کی حریصانہ پیش کش، اس مرد قلندر کو صراط مستقیم سے نہیں ہٹا سکتی جو اپنے جسم و جاں خدا کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہو۔

پھر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے قاصد کو مخاطب کر کے فرمایا۔
''میری طرف سے امیر المومنین کا شکریہ ادا کر دینا اور یہ بھی عرض کر دینا کہ اس دولت کثیر کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو مجھ سے زیادہ مستحق ہیں۔ میں دیدہ و دانستہ اہل طلب کے حقوق کی پامالی نہیں کر سکتا اور یہ بھی کہہ دینا کہ جب میں نے کسی باندی کے بغیر طویل عمر گزار دی تو زندگی کا باقی حصہ بھی بہ آسانی بسر کر سکتا ہوں اور یہ بھی کہہ دینا کہ.........دنیاوی آسائشوں سے یکسوئی میسر نہیں آتی، ذہنی و قلبی انتشار کچھ اور بڑھ جاتا ہے اور یہ بھی کہہ دینا

کہ تحصیل علم یا تبلیغ کا انحصار محض توفیق الٰہی پر ہے۔ دینار و درہم کا انبار اور کنیزوں کا اجتماع ہمیشہ اس راستے میں خلل انداز ہوتا ہے اور آخر میں یہ عرض کر دینا کہ اگر امیر المومنین آئندہ مجھے نظر انداز کر دیں تو میں اس کرم نوازی کے لئے ہمیشہ ان کا احسان مند رہوں گا۔"

نوازشات کا وہ باب' جسے عباسی حکمراں سفاح کھولنا چاہتا تھا' آج حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے اسے مکمل طور پر بند کرنے کی بڑی جرأت مندانہ کوشش کی تھی۔

جب قاصد نے دربار خلافت میں پہنچ کر تمام تفصیلات بیان کیں تو سفاح کے چہرے پر ندامت و شرمساری کی واضح علامات ابھر آئیں اور پھر اس نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے اہل دربار کے سامنے کہا۔

"اب سب کچھ بیکار ہے ربیعہ کو کسی طرح بھی منصب قضا کی طرف متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اپنی ساری کوششیں تمام کر ڈالیں کہ مسند انصاف پر ایک بہتر انسان جلوہ افروز ہو مگر ربیعہ تو ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔"

ظاہر پرستوں کے لئے عباسی حکمراں سفاح کا بیان بہت دلکشی رکھتا ہے مگر حقیقت صرف اتنی تھی کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے مسلسل انکار نے ایک جابر فرمانروا کو شدید احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس عالم اسباب میں نسل آدم سانس لیتی ہے ...... وہاں منصب وجاہ' سیم و زر اور عورت کا سکون نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ زمانہ قدیم سے تہذیب انسانی انہیں تین عناصر کی زد میں ہے۔ سفاح نے بھی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے گرد آسائشوں کا یہی سنہرا جال بچھانا چاہا تھا' مگر خدا کی براہ راست ہدایت نے آپ کو اس دام زریں کے قریب جانے سے بچالیا۔

پھر چشم فلک نے سفاح کو زیر زمیں جاتے دیکھا۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بھی آسودہ خاک ہو گئے۔

مگر دونوں انسانوں کے سفر کا انداز مختلف تھا۔ سفاح کے دنیوی وسائل موت کے کشادہ دہن کا حقیر لقمہ بن گئے اور شاہی جبروت وقت کی آندھیوں کے غبار میں شامل ہو گیا' لیکن حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازی، تاریخ کے ماتھے کی ایسی شکن بن گئی جسے صدیوں کا انقلاب بھی نوک شمشیر وسناں سے کھرچ نہیں سکا اور نہ روز و شب کی سیاہی اس شکن کو دھندلا کر سکی۔ سفاح کی عنایات و نوازشات کو پیہم ٹھکرانے کے سبب یہ واقعہ دور دراز علاقوں میں بھی شہرت پا گیا تھا۔ خود حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد بھی حیران رہا کرتے تھے کہ آخر استاد گرامی کے اس طرز عمل کا کیا مفہوم ہے؟ اور خلیفہ' وقت کی اس نیاز مندانہ پیش کش کے قبول کرنے میں شرعی اعتبار سے آخر کیا قباحت ہے؟

اپنی اسی ذہنی کش مکش کو دور کرنے کے لئے ایک دن حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد خاص یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ دریافت کیا۔

"شیخ محترم! منصب قضا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

بظاہر یہ ایک عام سا سوال تھا مگر در پردہ حضرت یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ استاد گرامی کے انکار کا سبب معلوم کرنا چاہتے تھے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ' یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ کے اشارے کو سمجھ گئے تھے مگر آپ نے اپنے طرز عمل کی وضاحت کرنے کے بجائے دیگر شاگردوں کے لئے ایک راستہ متعین کر دیا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے یحییٰ بن سعید رحمتہ اللہ علیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر تمہیں مال دنیا کی خواہش ہے تو پھر تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ منصب قضا قبول کر لو۔"

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ عہدہ قضا کو ایک دنیا دارانہ مشغلہ سمجھتے تھے، اس لئے آپ نے اس منصب کو بھی حصول دنیا میں شمار کیا مگر اس طرح کہ دنیا پرستی کے دوسرے مشغلوں سے یہ مشغلہ زیادہ بہتر ہے۔

یہاں انسانی ذہنوں میں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ منصب قضا کو دنیا دارانہ مشغلہ سمجھتے تھے تو پھر اسے دینی مشغلہ کس طرح بنایا جا سکتا تھا؟ مزید یہ کہ جب منصب قضا پر دنیا حاصل کرنے والے افراد فائز تھے تو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے انسان آگے کیوں نہیں بڑھے اور مسند قضا کو انسانی خواہشات کی آلودگیوں سے پاک کیوں نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے سے پہلے ہمیں اس دور کے سیاسی نظام کو سمجھنا ہو گا۔ مختصراً پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ سفاح کی حکومت کی بنیاد محض سیاسی انتقام پر تھی۔ خلافت بنوامیہ کے آخری حکمرانوں نے جس طرح بے راہ روی اختیار کی تھی اسی طرح بنوعباس کے ابتدائی حکمران بھی گمراہی کا شکار ہو گئے تھے۔ انہیں انسانیت کی فلاح اور نوع بشر کی اصلاح سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جب وہ خود ہی فطرتاً انصاف پسند نہیں تھے تو مسند عدل پر اچھے لوگوں کو کس طرح بٹھاتے؟ اب رہی یہ بات کہ سفاح حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے انسانوں کو حکومت میں شامل کرنا چاہتا تھا، تو یہ ایک کھلی ہوئی سیاسی چال تھی۔

اگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سفاح کی پیش کش قبول کر لیتے تو بظاہر لوگوں پر یہ تاثر قائم ہو جاتا کہ اس دور کے پاکباز انسان بھی خلافت عباسیہ کی حمایت کر رہے ہیں اور اس حمایت کا واضح مطلب یہ ہوتا کہ خلافت عباسیہ حق پر ہے۔ اس طرح عام لوگوں کی نظر سے خون کے وہ دریا اوجھل ہو جاتے جو اقتدار حاصل کرنے کیلئے بہائے گئے تھے۔

یہ ایک سیاسی بہانہ تھا اور اس بہانے کے ذریعے عباسی حکمران سفاح مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہی مہلت ہوتی ہے جسے سیاسی تاریخ میں ہر آنے والا حکمران حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس مہلت کا مفہوم صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظریں جبر و تشدد کے ہدف سے ہٹ جائیں اور اقتدار میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے۔ اس ٹھہراؤ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ افق حکومت پر ان شخصیات کو نمایاں کیا جائے جن کے کردار بے داغ اور غیر متنازع ہوں۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اسی بے داغ اور غیر متنازع کردار کے مالک تھے۔ آپ کے منصب قضا پر جلوہ افروز ہوتے ہی انسانوں کی ایک بڑی تعداد مطمئن ہو جاتی کہ جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سفاح کے ساتھ ہیں تو پھر اس کے اقتدار میں بھی کوئی کھوٹ نہیں ہو گا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سفاح کے اس سیاسی حربے کو بخوبی سمجھتے تھے اس لئے آپ نے مختلف مواقع پر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی اور بالآخر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے۔ اگر اس وقت سیاسی فضا ہموار ہوتی اور حکمرانوں کی نیت آئینے کی طرح شفاف ہوتی تو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کبھی انکار نہ کرتے۔ آپ نے علم اسی لئے حاصل کیا تھا کہ بے خبر انسانوں کے ہجوم میں حق و انصاف کو اجاگر کریں۔ جو لوگ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی روش پر اعتراض کرتے ہیں انہیں حقیقت کا ادراک نہیں۔ ہمارے مقابلے میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اس بات کو ہزار درجہ بہتر سمجھتے تھے کہ علم کیا ہے اور اسے کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔

اب دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگوں کے انکار کے بعد مسند قضا خالی تو نہیں رہی۔ اسے بھرنے کے لئے کوئی نہ کوئی اہل علم تو آگے بڑھا ہو گا۔ پھر وہ کیسا عالم تھا اور کیا اسے سیاسی فضا کے غبار آلود

ہونے کی خبر نہیں تھی؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے بزرگوں کے انکار کے بعد جو لوگ دربار خلافت تک پہنچے وہ بھی علم و فضل میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے کردار بھی بے داغ تھے اور ان کی شخصیات بھی شکوک و شبہات سے بالاتر تھیں۔ وہ نیک ارادوں کے ساتھ گھروں سے نکلے تھے اور مسند انصاف پر جلوہ افروز ہونے تک ان کی نیتوں میں کوئی خلل نہیں تھا۔ بعد میں بھی ان کے دلوں میں ذوق ہوس بیدار نہیں ہوا لیکن وہ انصاف کرنے سے عاجز تھے۔ ان کی عین خواہش تھی کہ وہ ہر موقع پر حق کا اظہار کریں مگر اس دستِ جبر کا کیا کرتے جو ان کی پشت پر اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ متحرک تھا۔ اس طاقت کے استعمال کا جواب کس طرح دیتے جو کاغذ پر قلم کی گردش کو روک دیتی تھی اور زبانوں سے ان کی قوت گفتار چھین لیتی تھی۔ اس اذیت ناک صورت حال کو دیکھ کر کچھ لوگ قصر اقتدار سے باہر نکل آتے تھے اور کچھ حضرات جبراً ناگوار فرائض انجام دیتے رہتے تھے۔

یہ اپنی اپنی قوت برداشت کی بات ہے۔ خدا نے ہر انسان کو مختلف صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ایک شخص مسلسل جبر و تشدد برداشت کرتا رہتا ہے لیکن گردش وقت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا' یہاں تک کہ موت آ جاتی ہے اور وہ اسی بلند حوصلگی اور استقامت کے ساتھ آغوش مرگ میں سما جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ایک مخصوص مدت تک آفات و مصائب برداشت کرتے ہیں اور پھر ان کی ہمتیں جواب دے جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی مخلص ہوتے ہیں' لیکن ان میں قوت برداشت زیادہ نہیں ہوتی۔ مجبوراً انہیں حاکم وقت کے آگے سپر انداز ہونا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہوتی ہے جو اپنے فرائض کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے زمانے کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ لوگ کبھی اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں اور کبھی طاقت کے ذریعے مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا شمار ان انسانوں میں ہوتا ہے جو کسی بھی صورت میں اقتدار کے ہاتھوں مجبور ہونا پسند نہیں کرتے۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ منصب قضا قبول کرنا چاہتے تھے' مگر اس شرط کے ساتھ کہ مزاج خلافت آپ کے کسی فیصلے پر اثر انداز نہ ہو۔ پھر جب آپ نے فضا کو ناسازگار پایا تو خلیفہ وقت کی پیش کش کو نہایت جرأت مندی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ دنیا پرست یقیناً ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس کار عظیم کو سمجھنے سے عاجز رہیں گے مگر اہل دل جب بھی اس واقعے پر غور کریں گے انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ معرکہ خیر و شر میں فتح حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ ہی کے ساتھ تھی۔

بظاہر تو اہل دنیا حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی خاموشی اور خانہ نشینی کو شکست سے تعبیر کریں گے لیکن جو لوگ فتح کا حقیقی مفہوم سمجھتے ہیں وہ اس راز کو بھی جانتے ہیں کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے حرف انکار نے ایک طرف عباسی حکمران کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ مسلمان عوام پر اپنے من مانے فیصلے مسلط کرتے وقت اسے کسی نہ کسی حد تک محتاط رہنا پڑے گا اور دوسری طرف وہ علمائے کرام بھی ہوشیار ہو گئے تھے جنہیں حکومت مکمل طور پر اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی تھی۔

اور حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی سب سے بڑی فتح تو یہ ہے کہ آپ نے اپنے جسم ناتواں کو موج ستم و جبر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا کہ وہ جس طرح چاہے آپ کے ساتھ سلوک کرے۔ آپ ظلم کے سیل رواں کو مسلسل احساس

دلاتے رہے کہ

"یہ ایک ایسے مرد قلندر کا جسم ہے' جسے اقتدار کا پر شور پانی غرق تو کر سکتا ہے لیکن اپنی مرضی سے بہا کر ساحل شکست پر نہیں لے جا سکتا۔"

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آپ کا جرأت مندانہ اقدام ہجوم انسانی کے درمیان ایک دلیل ہے۔ جس سے علماء کے وہ قافلے بھی اپنے چراغ روشن کریں گے جو طاقت و اقتدار کی تیز ہواؤں سے ڈرتے ہیں یا جنہیں یہ احساس پریشان کرتا ہے کہ موسم ناسازگار ہے۔

ایک طرف جہاں امرائے وقت سے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازی کا یہ حال تھا وہاں دوسری جانب آپ کی فیاضی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک درہم بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ ہر وقت آپ کو اپنے احباب اور شاگردوں کی ضروریات کا خیال رہتا تھا۔

ابن وہب کا بیان ہے کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بڑے فیاض تھے۔ آپ نے اپنے رشتے کے بھائیوں پر چالیس ہزار دینار خرچ کئے۔

ابن زید کا قول ہے کہ میں نے مدینہ منورہ میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سے بڑا کوئی مرد سخی نہیں دیکھا۔ آپ کے پاس جس قدر بھی مال تھا، وہ دوستوں' دوستوں کے بچوں یا دیگر سوال کرنے والوں کے لئے وقف رہتا تھا۔

اس کے علاوہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے دوستوں سے کسی معاملے میں بھی تکلف کو روا نہیں رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی ضرورت مند دست سوال دراز کرتا اور حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس اسے دینے کے لئے کچھ بھی نہ ہوتا تو آپ بے جھجک ہو کر اپنے دوستوں سے قرض مانگ لیا کرتے تھے۔

مگر جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق تھا تو تلخ ترین اوقات میں بھی دوستوں کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار نہ کرتے۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے گھر فاقہ تھا اور آپ کی مجلس میں ایسے دوست موجود تھے کہ جن کی شخصیات سے شان امارت ظاہر ہوتی تھی لیکن حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے احباب کو احساس نہیں ہونے دیا کہ ان کا امام اور اس کے اہل خانہ بھوک کی اذیت سے دوچار ہیں۔ یہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے کردار کا عجیب پہلو تھا کہ آپ دوسروں کے چہروں کی اڑی ہوئی رنگتیں دیکھتے رہتے مگر اپنے شکستہ دل کی خبر تک نہ لیتے۔

اگر کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی حاجت مند دست طلب دراز کر دیتا اور حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اسے ایک درہم بھی دینے کی حیثیت میں نہ ہوتے تو مجلس میں بیٹھے ہوئے کسی دوست سے قرض لے کر اس اجنبی شخص کی ضرورت پوری کر دیتے۔

آپ کی یہ عادت اتنی عام ہو گئی تھی کہ شہر رسول ﷺ کے رہنے والے بھی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی اس عجیب و غریب فیاضی سے واقف ہو گئے تھے۔ پھر یہ خبریں اڑتے اڑتے آپ کے اہل خاندان تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ نتیجتاً ایک دن کسی خاندانی بزرگ نے نہایت تلخ لہجے میں حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سے کہا۔

"تم نے اپنا سارا مال تو خرچ کر دیا۔ اب ضرورت کے وقت دوستوں سے مانگتے پھرتے ہو۔ کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا کہ اس طرز عمل سے تمہاری عالمانہ وجاہت پر حرف آتا ہے۔ اگر حلقہ احباب ہی میں اپنے ذاتی مسائل بیان کرنے تھے اور ان کے دینار و درہم کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھانا تھا تو پھر خلیفہ وقت کی نوازشات کو کیوں ٹھکرا

دیا؟ فرمانرواؤں کے عطیات' علم کی پذیرائی کے سبب ہوتے، اس سے تمہاری شان میں کوئی فرق نہ آتا بلکہ اہل زمانہ کے نزدیک تمہاری شخصیت مزید تابناک ہو جاتی۔"

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ دیر تک اہالیان خاندان کی یہ استہزائیہ گفتگو سنتے رہے اور پھر بڑے تحمل کے ساتھ فرمایا۔

"خلیفہ کے عطیات قبول کرنا میرے لئے باعث ننگ ہے اور دوستوں سے مانگنا باعث طمانیت۔ اہل دنیا اس فرق کو نہیں سمجھیں گے اور میں انہیں سمجھانا بھی نہیں چاہتا۔"

یہ کہہ کر کچھ دیر کے لئے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ خاموش ہو گئے اور پھر فرمانے لگے۔

"میرا اور میرے دوستوں کا معاملہ جدا نہیں۔ دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کوئی دوست مجھے میری عالمانہ شان کے سبب دیتا ہے۔ ربیعہ کے دوست میری بات اس لئے سنتے ہیں کہ وہ میرے دوست ہیں۔ جب وہ محبت کی نظر سے میری طرف دیکھتے ہیں تو ان کے پیش نگاہ محدث وفقیہ ربیعہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ربیعہ ہوتا ہے جو اول آخر دوست ہے۔" تعلق دنیا کا یہ انداز بھی بڑا انوکھا تھا' جسے حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے مرد قلندر ہی اپنا سکتے تھے۔

خودداری وسخاوت کے علاوہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ غیر معمولی قوت برداشت کے بھی حامل تھے۔

دوران گفتگو اگر کوئی شخص جارحیت اختیار کر لیتا تو آپ اسے بھی ایک شگفتہ تبسم کے ساتھ برداشت کر لیتے۔ حالانکہ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس منطق واستدلال کا وہ بیکراں خزانہ موجود تھا کہ آپ کے سامنے مخاطب کی قوت گویائی سلب ہو جاتی مگر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے علمی مباحث سے ہٹ کر اپنی اس بے پناہ صلاحیت کو کبھی استعمال نہیں کیا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بہت زیادہ کلام کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مسلسل کئی کئی گھنٹے تک اس طرح بولتے کہ نہ آپ کی زبان میں ہلکی سی لغزش پیدا ہوتی اور نہ آپ کے چہرۂ مبارک سے تھکن کے آثار نمایاں ہوتے۔

اسی سلسلے میں ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے کہ خاموش آدمی "خوابیدہ" اور "گونگے" کے درمیان ہوتا ہے۔

اسی ذیل میں ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ آپ کی مجلس علم حاضرین سے بھری ہوئی تھی اور آپ کسی موضوع پر نہایت اثر انگیز تقریر کر رہے تھے۔

اسی دوران ایک اعرابی مجلس میں داخل ہوا اور ایک گوشے میں کھڑے ہو کر حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا درس سننے لگا۔ کہنے کو وہاں علماء اور طالبان حدیث وفقہ کا مجمع تھا اور ہر شخص حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ پر ہمہ تن گوش تھا مگر جب بھی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کی نظر اعرابی کی طرف اٹھ جاتی تو اسے اس طرح کھویا ہوا پاتے جیسے آپ کی تقریر نے اعرابی کو دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دیا ہو۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا درس بہت دیر تک جاری رہا۔ اس اثنا میں آپ نے کئی بار اعرابی کی جانب دیکھا۔ طویل وقت گزرنے کے باوجود وہ ایک زاویے سے کھڑا ہوا تھا۔ دلچسپی اور انہماک کی یہ اعلیٰ مثال تھی جس سے حضرت

ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بالآخر درس ختم ہوا۔ حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ سمجھتے تھے کہ وہ اعرابی ان کی فصاحت و بلاغت سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا ہے۔ اس لئے آپ نے اس سے سوال کیا۔

''اے شخص تمہارے قبائل کے نزدیک بلاغت کی کیا تعریف ہے؟''

اعرابی نے ایک لمحہ سوچے بغیر کہا۔ ''مختصر لفظوں میں پوری بات ادا کرنا۔''

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور کلام میں عاجزی کسے کہتے ہیں؟'' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ دوران گفتگو مجبور ہو جانا کسے کہتے ہیں؟

اعرابی' حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کے مقام بلند سے واقف نہیں تھا اس لئے بے جھجک ہو کر کہنے لگا۔

''کلام کی عاجزی اسے کہتے ہیں جس میں تم مبتلا ہو۔''

اعرابی کی بات سن کر اہل مجلس کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں اور چہرے شدید ناگواری کی کیفیت سے متغیر نظر آنے لگے۔ کچھ لوگ اعرابی کی گستاخانہ حرکت کا سخت جواب دینا چاہتے تھے' مگر اتنی دیر میں وہ بے نیازانہ رفتار سے چلتا ہوا باہر جا چکا تھا۔

جب اعرابی چلا گیا تو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''تم لوگ کس لئے برہم ہوتے ہو۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔''

ایک اعرابی کی تنقید کو بھی ہنس کر وہی شخص برداشت کر سکتا تھا جو ایک جابر وقت کے عطیات کو کھیل سمجھ کر ٹھکرا سکتا تھا۔ بے شک! یہ جراٴت و بیبا کی حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ ہی کو حاصل تھی کہ جب عباسی حکمراں سفاح نے آپ کو آزمائش کے مرحلے سے گزارا تو آپ کی گردن میں اس قدر کجی آ گئی کہ اس خم کو اہل دربار نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور جب ایک جاہل اعرابی نے آپ کے اندازِ تقریر پر اعتراض کیا تو حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ کا سر ندامت سے جھک گیا۔

یہ تھا وہ مردِ حق پرست جو ہمیشہ شاہان وقت سے ناخوش رہا اور آخری سانس تک ان لوگوں سے راضی رہا جو پست کر دیئے گئے تھے۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ 136ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ کو ''ہاشمیہ'' کی سرزمین پر آسودہ خاک کیا گیا۔ یہ وہی علاقہ ہے' جسے انبار میں سب سے پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح نے آباد کیا تھا۔

عباسی حکمراں بھی لقمہ اجل ہو گیا اور حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بن ابو عبدالرحمٰن بھی آغوش فنا میں سما گئے۔ دونوں ایک ہی راستے سے ایک منزل کی جانب روانہ ہوئے مگر دونوں کا انداز سفر مختلف تھا' سامان سفر جدا تھا۔ اسی لئے دونوں کا انجام دنیا میں بھی مختلف تھا اور آخرت میں بھی دونوں کا حشر جداگانہ ہو گا۔

سفاح کو مہلت زیست کے ساتھ بے پناہ سرمایہ و طاقت بھی بخشا گیا۔ اس طرح وہ دنیا میں نیک کاموں کے فروغ پر زیادہ قادر تھا' مگر اس نے اپنی فطرت سیاہ کے باعث خدا کی زمین میں جبر و تشدد کے بیج ڈالے اور ان سے نفرت و ظلم کی فصل اگائی اور پھر جب وقت معلوم سر پر آ پہنچا تو وہ مظالم اور ناانصافیوں کی میراث چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا۔

حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ بن ابوعبدالرحمٰن کو صرف فرصت زندگی عطا کی گئی تھی۔ آپ کے سر پر مسائل کی کڑی دھوپ تھی اور جسم کے نیچے آزمائشوں کا جلتا ہوا بستر۔ آپ جوانی کی منزل میں قدم رکھنے تک باپ کے سائے سے بھی محروم تھے۔ وہ معصوم بچہ جب مکتب میں داخل ہوا تو اسے یہ حقیقت نہیں معلوم تھی کہ وہ یتیم ہے یا بے سہارا ہے۔ ایسے کٹھن مرحلے میں بھی اس نے اپنی بے چارگی کو بہانہ بنا کر محنت و مشقت سے جی نہیں چرایا۔ طویل راتیں اس طرح جاگ کر گزاریں کہ ماں کے سوا کوئی ہمدم و غم خوار نہیں تھا۔ قدرت نے اس بچے کو بھی فصل بونے کے لئے عمل کی زمین بخشی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو زمین کو خالی چھوڑ سکتا تھا اور اس طرح وہ دنیا کی نظروں میں مجرم بھی قرار نہیں پاتا کہ اس کے پاس زمین میں بونے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ پھر ایک طویل کشاکش اور تھکا دینے والی محنت کے بعد اس نے علم کے بیج حاصل کیے اور انہیں خدا کے بھروسے پر زمین کے سپرد کر دیا۔

ایک وقت مقررہ کے بعد وہ بیج پھوٹے اور فصل تیار ہو گئی۔ پھر جب حضرت ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہوئے تو ایسے عظیم و جلیل وارث چھوڑ گئے جو بظاہر بوریا نشیں تھے مگر ان سے بات کرتے وقت سلاطین وقت کی زبانیں بھی لڑکھڑا جاتی تھیں۔



حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ

آپ کا خاندانی نام یوب اور ابوبکر کنیت تھی۔ والد محترم کا نام کیان تھا اور ان کی کنیت ابی تمیمہ تھی۔ نسلی اعتبار سے کوئی آپ کو ''عبری'' لکھتا ہے اور ''جہنی'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اس ذیل میں زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا گیا کہ حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کس قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

بہر حال یہ طے شدہ امر ہے کہ گردش روز وشب نے آپ کے خاندان سے آزادی کی نعمت چھین لی تھی اور ایک قبیح رسم کو زندہ رکھنے کے لئے آپ کی گردن میں طوق غلامی ڈال دیا تھا۔

محققین کی رائے کے مطابق حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ قبیلہ عزہ کے غلام تھے۔ علامہ ابن عبدالبر کے قول کے مطابق آپ سختیانی'' کے لقب سے اس لئے مشہور تھے کہ بصرے میں بکرے کی دباغت دی ہوئی کھالیں فروخت کرتے تھے۔

پھر یہ کھالیں فروخت کرنے والا غلام زادہ' علم کی طرف متوجہ ہوا تو دست قدرت نے اس کی زنجیر غلامی کاٹ دی اور فضل وکمال کا وہ تخت پیش کیا جس پر جلوہ افروز ہو کر وہ علم کا شہنشاہ کہلایا۔

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن سلمہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ، حضرت قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ' نافع بن عاصم رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت عمرو بن دینار رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم وجلیل محدثین سے سماعت حدیث کی۔

پھر جب حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ علم کی تکمیل کر چکے تو آپ نے یہ دولت لازوال ضرورت مندوں میں بے دریغ تقسیم کی۔ آپ کی بارگاہ علم میں حاضر ہونے والے طالبان حدیث وفقہ کی فہرست بہت طویل ہے مگر چند نام ایسے بھی ہیں کہ جن کی موجودگی حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی عظمت وجلال پر نا قابل تردید گواہی پیش کرتی ہے۔

حضرت امام اعمش رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام قتادہ رحمتہ اللہ علیہ، حضرت حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام سفیان رحمتہ اللہ علیہ ثوری' حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابن اسحق رحمتہ اللہ علیہ جیسے اکابرین حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں شامل تھے اور خود حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ آپ کو حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس

علم میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس کے حلقہ درس سے بیک وقت اتنے بڑے لوگ فیضیاب ہو کر اٹھے' اس کے علم کی بلندیوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کو حدیث رسول ﷺ سے عشق تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے روز و شب کا ایک ایک لمحہ رسالت مآب ﷺ کے اقوال مقدسہ کی نذر کر دیا تھا۔ یہی عشق رسول ﷺ تھا جس نے حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کو علماء کا سردار بنا دیا تھا۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی مثل ہو۔''

حضرت حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے۔ ''میں جن اکابر علماء کی مجالس میں بیٹھا ہوں' ایوب رحمتہ اللہ علیہ ان سب میں افضل تھے اور اتباع سنت میں سب سے زیادہ شدید تھے۔''

علامہ نووی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سب لوگ حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی جلالت و امامت اور فہم و فراست پر متفق ہیں۔''

ہشام بن عروہ اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے بصرے میں ایوب رحمتہ اللہ علیہ کا مثل نہیں دیکھا۔

ابو عثمان کی روایت ہے کہ حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کو بصرے کے نوجوانوں کا سردار کہتے تھے۔

ابن عون رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی تو ہم حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی طرف رجوع ہوگئے۔

ابو حاتم رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ ''حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ اس قدر ثقہ ہیں کہ ان کے مثل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ایک بار حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ سے ایک حدیث کے بارے میں استفسار کیا۔

جواباً حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''مجھے اس حدیث میں شک ہے۔''

یہ سن کر امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ بے اختیار ہوگئے اور برسر مجلس فرمانے لگے۔ ''آپ کا شک مجھے دوسروں کے یقین سے زیادہ محبوب ہے۔''

ابو حاتم رحمتہ اللہ علیہ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ایوب رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ ثقہ کوئی دیکھا ہی نہیں گیا۔

جب کسی شخص نے امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ سے حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے نہایت پرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''وہ عالم بھی تھے اور عامل بھی اور اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے۔''

اسی خوف خدا نے حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کو دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں بہت زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔ جہاں تک روایت حدیث کا تعلق ہے تو آپ کی احتیاط حد سے گزر جاتی تھی۔

حضرت حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''میں نے سوالات کا جواب دینے کے سلسلے میں ایوب رحمتہ اللہ

علیہ اور یونس سے زیادہ کسی کو محتاط نہیں دیکھا۔ جواب دینے سے پہلے وہ سائل کے حافظے کا امتحان لیتے تھے کہ کہیں وہ اپنی دماغی کمزوری کے سبب بات کو غلط بیان نہ کر دے۔"

حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ ہی کا بیان ہے کہ اگر کوئی حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کرتا تھا تو آپ جواب دینے سے پہلے فرمایا کرتے تھے۔ "اپنا مقصد دوبارہ بیان کرو۔" وہ شخص سوال دہرا دیا کرتا تھا کبھی کبھی حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ اس شخص سے بار بار اس کا سوال دریافت کرتے۔ اگر وہ ایک مرتبہ بھی اپنے الفاظ میں تبدیلی کر دیتا تو آپ اس کے سوال کا جواب نہ دیتے لیکن پھر بھی اس کی دلجوئی کے لئے چند احادیث رسول ﷺ سنا دیتے۔ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کے اس طرز عمل کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ آپ کا جواب اس شخص کے ذریعے نقل نہ ہو جس کا حافظہ کمزور اور بے اعتبار ہو۔ اس طرح روایات کے مسخ ہونے اور مخلوق میں گمراہی پھیل جانے کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ اپنی احتیاط کے سبب اس دروازے کو بھی بند کر دینا چاہتے تھے۔ انسانی کردار کا یہ عجیب انداز ہے جو تہذیب و تمدن کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔

ایک بار کسی شخص نے حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کیا۔

جواباً حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "اس سلسلے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

وہ شخص دوبارہ بولا۔ "کم سے کم اپنی رائے ہی بتا دیجئے۔"

حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت بے باکی سے فرمایا۔ "اس ذیل میں میری رائے بھی کچھ نہیں ہے۔"

ایک بار حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس درس آراستہ تھی۔ جب آپ کی تقریر ختم ہوگئی تو ایک شخص اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ سے کہنے لگا۔ "آپ اپنی رائے سے کام کیوں نہیں لیتے؟"

حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے اس شخص کے سوال کے جواب میں ایک عجیب و غریب واقعہ سناتے ہوئے فرمایا۔

"کسی شخص نے ایک گدھے سے پوچھا۔ "تو جگالی کیوں نہیں کرتا؟"

گدھے نے اس شخص کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں باطل چیز کو چبانا برا سمجھتا ہوں۔"

اس واقعے کے سنانے سے حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کا مطلب یہ تھا کہ قرآن و حدیث کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا بھی ایسا ہی ہے۔

رسالت مآب ﷺ سے عقیدت و عشق کا یہ عالم تھا کہ سرور کونین ﷺ کا نام سنتے ہی آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔

حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ "ہم لوگ حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور جب آپ کے سامنے رسول کریم ﷺ کی کسی حدیث کا ذکر آتا تھا تو بے اختیار رونے لگتے تھے اور اس قدر روتے تھے کہ حالت غیر ہو جاتی تھی۔ پھر یہ رقت یہاں تک بڑھ جاتی کہ ہمیں آپ پر ترس آنے لگتا تھا۔"

دوسرے موقعے پر حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "جب میں نے رسالت مآب ﷺ کا یہ احترام دیکھا تو حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ احادیث لکھنا شروع کر دیں۔"

حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ، حدیث کی طرح فقہ کے بھی امام تھے۔ حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ آپ کو سید

الفقہا (فقیہوں کے سردار) کے نام سے یاد کرتے تھے۔
علم کے اس مرتبہ بلند پر فائز ہونے کے باوجود حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ آپ ہمیشہ اس سے خائف رہتے تھے کہ کہیں علم کا پندار کسی غرور میں مبتلا نہ کر دے۔
علمائے کرام کے لئے سخت آزمائش کا وقت وہ ہوتا ہے کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جائے اور انہیں اس کا جواب نہ آتا ہو۔ ایسے مواقع پر حقیقت کا اعتراف بہت مشکل کام ہے۔ اس قدر سنگین مرحلے سے گزرتے ہوئے بڑے بڑے اکابرین کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں مگر حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ اسے بھی ایک کار سہل سمجھتے تھے۔
ابن شوذب بیان کرتے ہیں کہ اگر کبھی حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا جاتا جس سے آپ واقف نہ ہوتے تو بے تکلف فرما دیتے۔ "اہل علم سے دریافت کرو۔"
اس انکسار اور تواضع کے سبب حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کو شہرت اور نام و نمود سے شدید نفرت تھی۔
اسی وجہ سے آپ مجمع عام سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے۔ اگر کسی کام سے باہر جانا ہوتا تو لوگوں کی نظروں سے بچ کر ایسے راستوں سے گزرتے تھے کہ جہاں آپ کو کوئی نہ دیکھ سکے۔
حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ ایک تنگ و تاریک گلی میں مڑ گئے۔ مجھے آپ کے اس انداز پر بہت حیرت ہوئی۔ ابھی میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ دوسری پیچیدہ گلی میں داخل ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کو ان راستوں کا کس طرح پتا چل گیا جبکہ طویل قیام کے باوجود میں خود بھی ان راستوں سے واقف نہیں تھا۔ بہت دن بعد یہ راز فاش ہوا کہ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ تنگ اور سنسان کوچوں سے اس لئے گزرتے ہیں کہ آپ کو کوئی شخص پہچان نہ سکے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ یہ مرد جلیل اپنی ذات کی نمائش سے کس قدر بے زار ہے۔
ایک بار میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا کہ حضرت اس خاموش سفر کا آخر مقصد کیا ہے؟
جواب میں حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "میں نہیں چاہتا کہ مجھے دیکھ کر لوگ ہاتھ سے اشارے کریں اور زبان سے پکار کر کہیں کہ ایوب جا رہے ہیں۔"
حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ ہی کا دوسرا بیان ہے کہ اگر اس موقع پر کوئی شخص مل جاتا تو سلام کرنے میں سبقت اختیار کرتے۔ کبھی کسی کو یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ پہلے آپ کو سلام کرے۔ جب حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ سلام کرتے اور آپ کا مخاطب اضافی الفاظ کے ساتھ سلام کا جواب دیتا تو آپ اشکبار ہو جاتے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمانے لگتے۔
"اے اللہ! تو بہتر جانتا ہے کہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ اے اللہ! میں یہ نہیں چاہتا۔" اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ لوگ عزت و احترام کے ساتھ جواب دیتے تھے اور حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کو یہ بات گوارا نہیں تھی۔
حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص آپ کے ہمراہ چلے۔ حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔
"ایک بار میں بازار جا رہا تھا۔ راستے میں حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ ایک

جنازے کے ساتھ جا رہے تھے۔ میں نے آپ کو شریک جنازہ دیکھا تو خود بھی ساتھ ہولیا۔

حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے مجھے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا۔ ''میں قبرستان جا رہا ہوں ...... تم بازار جاؤ اور وہی کام انجام دو جس کے لئے گھر سے باہر نکلے تھے۔''

حضرت امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کے ہمراہ جانا چاہتا تھا' مگر آپ ہمیشہ انکار کر دیا کرتے تھے اور گھر سے نکل کر اِدھر اُدھر گلیوں میں چلے جاتے تھے تا کہ لوگ آپ کو جاتے ہوئے نہ دیکھ سکیں۔

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کے کردار کا ایک خاکہ اس طرح سامنے آتا ہے کہ آپ نہایت منکسر المزاج' خلیق' رحم دل اور نام و نمود سے نفرت کرنے والے انسان تھے۔ اس کے علاوہ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ بڑے عابد و زاہد شخص تھے۔ آپ نے چالیس حج کئے تھے۔

حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ایوب رحمتہ اللہ علیہ بڑے عبادت گزار اور بہترین بزرگ تھے۔

آپ کے زہد و تقویٰ پر بے شمار گواہیاں موجود ہیں مگر خود حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

''جب خدا کے صالح بندوں کا ذکر کیا جائے گا تو میں ان سے الگ ہو جاؤں گا۔''

تاریخ میں معتبر روایات موجود ہیں کہ حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ قائم اللیل تھے۔ تمام رات عبادت کرتے تھے مگر جب صبح کے وقت لوگوں کے سامنے آتے تھے تو چہرے پر شادابی و تازگی کے آثار نمایاں کرنے کی کوشش کرتے تھے اور آواز کو اتنا شگفتہ بنا لیتے تھے جیسے ابھی ابھی سو کر اٹھے ہوں۔

اس زمانے کے عام بزرگوں کا لباس یہ تھا کہ چست قمیض پہنتے تھے مگر حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ میں اپنی ذات کو پوشیدہ رکھنے کا جذبہ اس قدر بیدار ہو گیا تھا کہ آپ نے عابدوں کا وہ لباس ترک کر دیا تھا اور اس قدر ڈھیلی ڈھالی قمیض پہنتے تھے کہ وہ مروّجہ لباس کے مقابلے میں بڑی عجیب لگتی تھی۔

ایک دن حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک شاگرد نے اس نئی روش کے بارے میں دریافت کیا تو فرمانے لگے۔

''پہلے زمانے میں دامن لٹکا کر چلنے میں شہرت تھی اور اب دامن سمیٹ کر چلنے میں۔''

یہاں شہرت سے مراد نام و نمود کا اظہار نہیں۔ یہ ایک در پردہ اشارہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے۔

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی بڑا زاہد ہو' اسے اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور انسان پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے زہد کو لوگوں کے لئے عذاب نہ بنائے۔

اسی ضبط نفس نے حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کو امرائے وقت سے یہاں تک بے نیاز کر دیا تھا کہ آپ اس طبقے کے لوگوں سے ملاقات کرنا تو کجا' ان کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ خلیفہ وقت نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے صریحاً انکار کر دیا۔ پھر جب خلیفہ نے اس بات پر اصرار

کیا کہ وہ خود آپ کے مکان پر حاضر ہو جائے تو حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ امیر المومنین مجھ جیسے انسان کے لئے اتنی زحمت برداشت کریں۔"

ایک دن برسر مجلس کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ خلیفہ وقت کی ملاقات سے گریز کیوں کرتے ہیں؟

حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ نے اس شخص کی بات سنی اور چند لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے پھر عجیب لہجے میں فرمایا۔

"میرے نزدیک یہ دنیا کا سب سے ناپسندیدہ فعل ہے۔"

"دوسرے محدثین اور فقہا بھی فرمانروائے وقت سے ملاقات کرتے رہے ہیں۔" کہنے والے نے دوبارہ کہا۔

"یہ ان کا اپنا ذاتی فعل ہے۔ میں کسی کی روش پر اعتراض نہیں کرتا مگر جب تم لوگ خلیفہ وقت سے ملاقات کرنے کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہو تو سنو کہ مجھے میرا بیٹا بکر سب سے زیادہ محبوب ہے۔ پھر بھی میں یہ گوارا کر لوں گا کہ اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کر دوں مگر مجھے یہ منظور نہیں کہ ہشام یا کوئی دوسرا خلیفہ مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔"

یزید بن ولید، حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کا ذاتی دوست تھا لیکن جب وہ خلافت کے منصب پر فائز ہوا تو آپ نے گریہ وزاری کے ساتھ یہ دعا کی۔

"اے اللہ! میرے ذکر کو چھپا لے اور یزید کو اس بات سے باز رکھ کہ وہ مجھے بار بار یاد کرے۔"

اس قدر غیور ہونے کے باوجود حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ نہایت خوش اخلاق انسان تھے۔ اگر کوئی شخص آپ کے مکان پر آ جاتا تو اپنی حیثیت کے مطابق اس کی خاطر مدارات کرتے اور اتنی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے کہ وہ شخص ہمیشہ ان لمحات کو یاد رکھتا۔

حماد بن زید رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ مسکراتا ہوا چہرہ کسی انسان کا نہیں دیکھا۔ آپ عید الفطر کے موقع پر کھانے کا خاص اہتمام کرتے تھے اور اپنے تمام پڑوسیوں کے یہاں حصے بھیجتے تھے۔

حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بے شمار انسان آتے تھے، جن سے ذاتی طور پر آپ ناواقف ہوتے تھے یا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا مگر جب ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے اور اگر کسی کا انتقال ہو جاتا تو اس کے عزیزوں سے اس قدر جاں سوزی کے ساتھ تعزیت فرماتے جیسے مرنے والا آپ کے بہت قریب تھا اور نہایت معزز و محترم شخص تھا۔

شام میں ثقیف کے ایک غلام یعلی بن حکیم کا انتقال ہو گیا۔ مرنے والے نے اپنے قریبی رشتے داروں میں صرف ایک ماں چھوڑی تھی۔ جب حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کو اس جانگداز سانحے کی خبر ہوئی تو مرنے والے کی ماں کے پاس مسلسل تین دن تک تعزیت کے لئے جاتے رہے۔ آپ بہت دیر تک وہاں قیام کرتے اور یعلی کی سوگوار ماں کو اس طرح تسلیاں دیتے کہ وہ بے چاری وقتی طور پر اپنے غم کو بھول جاتی۔

بعض مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ صاحب کرامت بھی تھے۔

ابوالعمیر کا بیان ہے کہ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ مکے کے راستے میں تھے اہل قافلہ کو سخت پیاس محسوس ہوئی۔

یہاں تک کہ تمام لوگ شدید اضطراب میں مبتلا ہو گئے اور اونٹ جلتی ہوئی ریت پر لڑکھڑانے لگے۔ حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ سے اہل قافلہ کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ مجبوراً آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''اگر تم اس راز کو کسی پر فاش نہ کرو تو میں اپنے رب سے تمہارے لئے پانی کی التجا کرتا ہوں۔''

جب لوگوں نے اقرار کیا کہ وہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اپنے سامنے ایک دائرہ کھینچ دیا۔ پھر دعا فرمائی۔

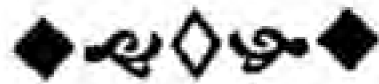
''اے اللہ! تو اس پر قادر ہے کہ تیرے حکم سے صحرا کا دل شق ہو جائے اور اس سے ٹھنڈے پانی کا چشمہ ابل پڑے۔''

ابھی حضرت ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ دائرے سے پانی ابلنے لگا۔ یہاں تک کہ تمام قافلے والوں نے خود بھی پیاس بجھائی اور اپنے اونٹوں کو بھی جی بھر کے پانی پلایا۔

جب دشت میں کوئی بھی پیاسا باقی نہ رہا تو حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ نے اس جگہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کے ساتھ ہی پانی ابلنا بند ہو گیا۔

وہ تو ایک عارضی چشمہ تھا جو کچھ دیر کے لئے پھوٹا اور پھر سطح زمین سے غائب ہو گیا مگر حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ کی عظمت کا آبشار جو علم و کردار کی چوٹیوں سے بہتا ہوا بنجر دلوں کو معرفت کا سبزہ زار بنا رہا ہے' وہ قیامت تک خشک نہیں ہو گا۔

حضرت ایوب رحمتہ اللہ علیہ تریسٹھ سال تک حیات رہے۔ 131ھ میں طاعون کی وباء پھیلی تو آپ نے بھی عالم فانی کو الوداع کہا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ دیگر سربلندیوں کے ساتھ شہر بصرہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس کی خاک میں حضرب ایوب سختیانی رحمتہ اللہ علیہ جیسا مرد جلیل محو خواب ہے۔



حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ

آپ کا خاندانی نام مکحول تھا اور کنیت ابوعبداللہ تھی۔ بعض مورخین نے کنیت کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے اور معتبر روایات کا سہارا لے کر دعویٰ کیا ہے کہ حضرت مکحول شامی کی کنیت ابوایوب تھی۔

جس طرح آپ کی کنیت کے بارے میں اختلاف ہے' اسی طرح آپ کے نسب نامے کے بارے میں بھی مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے کئی روایات بیان کی ہیں۔

ایک روایات کے مطابق حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نسلاً عجمی تھے۔ اس دعوے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت شامی رحمتہ اللہ علیہ کے والد گرامی کا نام سہراب تھا اور یہ لفظ اپنی ساخت کے اعتبار سے ''عجمیت'' کو ظاہر کرتا ہے۔

حافظ ابن حجر ہی کے بیان کے مطابق حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ مصری تھے۔

کچھ روایات کے مطابق آپ کا تعلق قبیلہ ہذیل سے تھا۔ اس طرح حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ نسب نامے کے اعتبار سے ''عرب'' قرار پاتے ہیں۔

خود حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں اس طرح انکشاف فرماتے ہیں۔

''پہلے میں عمرو بن سعید بن العاص کا غلام تھا۔ انہوں نے مجھے مصر میں قبیلہ ہذیل کے ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا۔''

اس طرح دونوں روایتوں میں ربط پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف عمرو بن سعید کی غلامی ثابت ہوتی ہے اور دوسری جانب قبیلہ ہذیل سے غلامانہ تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

زمانے کے رسم و رواج کے مطابق یہ بات اپنی جگہ طے ہو چکی تھی کہ حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ تمام عمر اپنی گردن میں طوق غلامی لئے پھرتے رہیں گے اور آپ کی پوری زندگی محکومانہ انداز میں بسر ہوگی مگر یہ اہل دنیا کا قیاس تھا۔ حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان میں کسی فرد کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ قدرت نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جوان ہو کر یہ غلام زادہ ایسی شاہانہ زیست بسر کرے گا کہ اس کا جاہ و جلال دیکھ کر سلاطین وقت بھی آتش حسد سے جل اٹھیں گے۔ آخر کوئی سوچتا بھی تو کس طرح کہ غلاموں کے جسم بھی اسیر ہوتے ہیں اور ان کے ہوش و خرد پر بھی صاحبان اقتدار کا کڑا پہرہ ہوتا ہے لیکن نظام قدرت انسانی سوچ سے اس قدر مختلف

ہے کہ اس کا احاطہ گروہ جن وانس کی استطاعت سے باہر ہے۔ جب خدا کسی انسان کے پیروں کی زنجیریں کاٹنا چاہتا ہے تو اسے نہ کسی کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ کسی ظاہری وسیلے یا سبب کا پابند ہے' وہ جو کچھ چاہتا ہے' ایک ساعت یا لمحے کی تاخیر کے بغیر ظہور میں آجاتا ہے ۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت آپ کر لیتی ہے لالے کی حنا بندی

آزاد ہونے کے بعد لوگوں کا خیال تھا کہ مکحول رحمتہ اللہ علیہ تلاش معاش میں نکل کھڑے ہوں گے اور عہد غلامی نے آپ کو جن آسائشوں سے محروم کر دیا تھا ان کی پوری توانائی کے ساتھ جستجو کریں گے مگر اس وقت تمام اہالیان خاندان اور دیگر شناسا حیران رہ گئے جب حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ نے تحصیل علم کی خواہش ظاہر کی۔

کسی شخص نے حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا ''تمہیں دولت واقتدار کی کمی نے طوق غلامی پہنایا تھا۔ اس لئے وہی چیزیں حاصل کرو جو معاشرے میں سربلندی بخشیں۔ تمہیں علم کیا دے گا اور تم علم سے کیا طلب کرو گے؟''

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''اگر میں شدید جدوجہد کے بعد ساری دنیا کی دولت بھی جمع کرلوں تو غلامی کی لعنت اسی طرح میرے نام کے ساتھ منسوب رہے گی۔ اگر عرب وعجم کا اقتدار بھی مجھے مل جائے تو کوئی آقا زادہ کہہ کر پکارنے والا نہیں ہوگا۔ بس علم ہی سے میری تمام امیدیں وابستہ ہیں کہ وہ ساری محرومیوں کے داغ دھو ڈالے گا اور شرفاء کی بستی میں مجھے نشست جلالت بخش دے گا۔''

بڑی عجیب باتیں تھیں جنہیں سمجھنے والا کوئی نہ تھا اور بڑے عجیب اندازے تھے کہ جن کی درستگی پر کوئی گواہی پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔

حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کے ارادوں سے باخبر ہونے کے بعد اہل خانہ اور حلقہ یاراں نے بڑے دل شکن کلمات کہے مگر وہ غلام زادہ طے کر چکا تھا کہ علم ہی کے ذریعے اس کی نجات ممکن ہے۔

پھر حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ انتہائی ناسازگار فضاؤں کے باوجود علم کی طلب میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

قیام مصر کے بارے میں خود حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔

''یہاں کونسی درس گاہ تھی جس کے دروازے پر میں نے دستک نہیں دی اور یہاں حدیث وفقہ کا وہ کون سا استاد تھا جس کے سامنے میں باادب ہو کر نہیں بیٹھا۔ فکر وآگہی کا وہ کونسا چشمہ تھا جس تک میرے قدم نہیں پہنچے اور شعور کا وہ کونسا دریا تھا جس سے میں نے اپنی پیاس نہیں بجھائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے تحصیل علم کے سوا کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ میں نے اپنے روز وشب کی ایک ایک ساعت علم کے لئے وقف کر دی تھی۔ دنیوی رشتوں میں مجھے اس سے زیادہ غم خوار کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تھا۔''

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ اپنی اس کیفیت کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ''پھر وہ دن بھی آیا کہ تمام مصر علم سے خالی ہوگیا۔ میں نے شمار کیا تو یہاں کی ساری درس گاہیں میری موجودگی سے باخبر تھیں اور میں ان کے دیوار و در سے آشنا تھا۔ پھر میں نے حدیث وفقہ کے استادان گرامی پر نظر کی تو یہ راز فاش ہوا کہ میں تمام علمائے وقت سے فیضیاب ہو چکا ہوں اور وہ مردان جلیل کسی حرص کے بغیر مجھ پر علم کی بارش کر چکے ہیں۔ پھر بھی میں نے آخری

کوشش کے طور پر مصر کا ایک ایک گوشہ چھان مارا کہ کہیں علم کی کوئی شعاع باقی رہ گئی ہو وہ مجھ تک نہ پہنچی ہو مگر بالآخر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ مصر خالی ہو چکا ہے' یہاں جس قدر بھی علم تھا خدا نے اسے میرے ذہن میں منتقل کر دیا ہے۔"

یہ تحصیل علم کی عجیب مثال تھی۔ اگر تاریخ داں حضرات تحقیق سے کام لیں تو انہیں اندازہ ہوگا کہ قدیم مصر کوئی دیہات یا قصبہ نہیں تھا کہ جہاں علم کی روشنی محدود انداز میں پہنچی ہو۔

تیرہ صدی قبل کا مصر علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں بیشتر اکابرین وقت جمع ہو گئے تھے اور بلا مبالغہ ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی تھی۔ اسی صورت میں حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ بیان ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

"میں مصر میں اس وقت تک مقیم رہا جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو گیا کہ اب اس شہر میں علم باقی نہیں رہا ہے اور جو کچھ موجود ہے' میں اسے حاصل کر چکا ہوں۔"

تحصیل علم کے سلسلے میں مزید واقعات بیان کرتے ہوئے حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"پھر میں مصر سے روانہ ہو کر عراق آیا۔ یہاں بھی میری وہی کیفیت تھی۔ علمی درس گاہیں میری توجہ کا مرکز بن گئی تھیں اور میں علماء کی جماعت کو اپنا محبوب سمجھتا تھا۔ ایک ایک گلی' ایک ایک کوچہ حدیث وفقہ کے ذکر سے روشن تھا۔ جدھر بھی میری نگاہ اٹھتی تھی، روشنی ہی روشنی نظر آتی تھی۔ روشنی کے اتنے مراکز دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ میں علم وفضل کے اس شہر میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ کچھ دن تک میں یہی سوچتا رہا کہ کہاں سے اپنے ذوق طلب کے سفر کا آغاز کروں؟ پہلے کس بزرگ کی مجلس میں حاضری دوں کہ عراق میں تو سبھی بزرگ تھے' سبھی محترم تھے' پھر میں نے اپنی منتشر خواہشات کو یکجا کیا اور ایک ایک کر کے تمام مجالس علم میں حاضری دی۔ یہاں بھی خدا مجھ پر مہربان تھا۔ اہل علم نے مجھے اس طرح نوازا کہ میرے خالی دامن کو سرمایہ شعور و آگہی سے بھر دیا۔"

"پھر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ سرزمین عراق بھی علم سے خالی ہو گئی ہے۔ میں نے بڑی حیرت و تجسس کے ساتھ اپنے آپ سے سوال کیا۔"

"مکحول! اس عظیم الشان شہر کا سارا علم کہاں گیا؟"

"پھر میرے دل سے آواز آئی کہ خداوند ذوالجلال نے عراق کا تمام علم ایک غلام زادے کے ذہن میں منتقل کر دیا۔"

"یہ سن کر میں نے سجدہ شکر ادا کیا اور مزید علم کی تلاش میں سرزمین عراق کو خیر باد کہا۔"

"جب میں عراق کی حدود سے نکل کر آگے بڑھا تو بے اختیار میری زبان پر یہ کلمات جاری ہو گئے۔"

"الفراق اے مرکز فکر و آگہی' الفراق! میں تجھ سے رخصت ہوتے ہوئے بہت اداس ہوں مگر میری منزل ابھی بہت دور ہے۔ میں ایک مسافر نا آسودہ ہوں اور منزل طلب مجھے مسلسل پکار رہی ہے۔"

عراق کے بعد حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نے دیار رسول ﷺ کا قصد کیا۔ بالآخر جب آپ مدینہ منورہ کی حدود میں پہنچے تو وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ رقت کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور سرور کونین ﷺ کے جاہ و جلال کا یہ اثر تھا کہ مکحول رحمتہ اللہ علیہ کا پورا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ سر قدم قدم پر جھکا جاتا تھا۔ ایک اردو شاعر کے بقول ؎

سجدہ طلب ہے راہ کا ہر ذرہ اے نیاز

شاید حدود کوچہ جاناں میں آ گئے!

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے۔ بار بار فرماتے تھے۔

''چند بوندوں کا پیاسا، علم کے سمندر کے کنارے آپہنچا ہے۔ خدا اس کی دستگیری کرے۔''

مدینہ منورہ سرچشمہ علم و معرفت تھا۔ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی پیاس اس طرح بجھائی کہ سیراب ہو گئے۔

اس کے بعد بھی حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کا سفر جاری رہا۔ ایک معتبر روایت کے مطابق حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نے طلب علم میں مملکت اسلامیہ کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا۔

خود آپ رحمتہ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے کہ ''میں نے علم کی طلب میں زمین کا طواف کیا تھا۔''

مدینہ منورہ میں جس دیدہ ریزی اور انہماک کے ساتھ آپ نے علم حاصل کیا تھا، اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''دیار رسول ﷺ اور سرزمین عراق میں ایسا کوئی علم باقی نہیں رہا تھا' جسے میں نے حاصل نہ کیا ہو۔''

یہ کوئی دعویٰ نہیں تھا اور نہ اپنی نمائش ذات تھی۔ اس اظہار کا ایک ہی مقصد تھا کہ آپ نے علم کی خاطر ہر آسائش دنیا کو ٹھکرا دیا تھا اور اہل ثروت کے بخشے ہوئے ہر اعزاز سے پیٹھ موڑ لی تھی۔ حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم کس قدر محبوب شے ہے اور اس محبوب تک پہنچنے کے لئے انسان آفات و مصائب کے کیسے کیسے خارزاروں سے گزرتا ہے۔

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کی اس محنت شاقہ اور جہد مسلسل کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔ جب آپ تکمیل کے مراحل تک پہنچے تو حضرت امام زہری رحمتہ اللہ علیہ جیسے عظیم و جلیل محدث کو بے اختیار کہنا پڑا۔

''اس زمانے میں علماء تو تین ہی ہیں اور ان میں سے ایک مکحول شامی ہیں۔''

حضرت ابن یونس رحمتہ اللہ علیہ بارگاہ مکحول رحمتہ اللہ علیہ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''بے شک مکحول رحمتہ اللہ علیہ بڑے فقیہ و عالم ہیں۔''

ایک بار کسی شخص نے حضرت ابن عمار رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ بلاد شام کا عالم کون ہے؟ حضرت ابن عمار نے بے ساختہ فرمایا۔ ''حضرت مکحول شامی۔''

اس شخص نے دوبارہ کہا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیجئے۔

جواب میں حضرت ابن عمار رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''ہاں' میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ ارض شام کے امام تو مکحول ہی ہیں۔ ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے حضرت ابن عمار رحمتہ اللہ علیہ کا چہرہ جوش جذبات سے سرخ ہو گیا اور دیکھنے والوں کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جس شخص کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں وہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔

عجلی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا۔ ''مکحول رحمتہ اللہ علیہ تابعین میں ثقہ کا درجہ رکھتے ہیں۔''

حضرت سلیمان بن موسیٰ رحمتہ اللہ علیہ علی الاعلان برسر مجلس فرمایا کرتے تھے۔ ''مکحول رحمتہ اللہ علیہ مقامی عالم

نہیں تھے۔ ان کا تعلق شام سے تھا مگر جب مکحول کا علم ہم تک پہنچا تو ہم نے ان کے افکار کو کسی پس و پیش کے بغیر قبول کر لیا۔"

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کو علم حدیث میں بھی بلند مقام حاصل تھا۔ یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ نے مدینہ، عراق اور مصر میں علم حاصل کیا تھا لیکن اس میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ آپ کن صحابہ کرامؓ کی صحبت سے شرف یاب ہوئے۔

اگرچہ یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے لیکن اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نے مشہور خادم رسول ﷺ حضرت انسؓ سے نہ صرف ملاقات کی تھی بلکہ فیضیاب بھی ہوئے تھے۔

اس ذیل میں خود حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔

میں نے صحابی رسول ﷺ حضرت انسؓ کو دمشق کی مسجد میں دیکھا۔ جیسے ہی خادم رسالت ﷺ کی نظر میری طرف اٹھی، میں نے نہایت ہی ادب سے سلام کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے انتہائی شفقت و مہربانی کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔

پہلے تو مجھ پر انجانا سا خوف و جلال طاری تھا مگر جب میں نے اپنی آنکھوں سے صحابی رسول ﷺ کا اخلاق کریمانہ دیکھا اور دریائے محبت کو موجزن پایا تو حضرت انسؓ کے قریب پہنچ کر انتہائی مؤدب لہجے میں درخواست گزار ہوا۔

"اگر آپ اجازت مرحمت کریں تو میں کچھ عرض کروں۔"

حضرت انسؓ کی چشم کرم میں رضامندی کا عکس روشن ہوا تو میں نے ایک فقہی مسئلے کے بارے میں دریافت کیا۔

"جنازہ اٹھانے اور اس میں شریک ہونے کے بعد وضو کرنا چاہئے یا نہیں؟"

(اس سوال سے حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کی مراد یہ تھی کہ اگر کوئی شخص نماز جنازہ میں شریک ہو، یا میت کی تدفین میں شامل ہو پھر اس کے بعد فرض نماز کا وقت آ جائے تو نماز ادا کرنے والوں پر دوبارہ وضو لازم ہوگا یا نہیں؟)

جواباً صحابی رسول ﷺ حضرت انسؓ نے فرمایا۔ "ہم نماز میں تھے اور نماز کی طرف آئے ہیں، پھر اس کے درمیان وضو کی کیا ضرورت ہے؟"

اس ملاقات کے بعد حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ حضرت انسؓ کے درس میں شریک رہے۔ اس طرح نہ صرف آپ ایک صحابی رسول ﷺ کے دیدار سے مشرف ہوئے بلکہ سماعت حدیث بھی کی اور تابعین کے حلقے میں شامل ہو گئے۔

حضرت انسؓ کے علاوہ حضرت ابوامامہ رحمتہ اللہ علیہ، حضرت محمود بن ربیع رحمتہ اللہ علیہ، حضرت جبیر بن نفیر رحمتہ اللہ علیہ، حضرت سلیمان یسار رحمتہ اللہ علیہ، حضرت شرحبیل رحمتہ اللہ علیہ، حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عراک بن مالک رحمتہ اللہ علیہ، حضرت وقاص بن ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ اور امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ بھی آپ کے استادان گرامی میں شامل تھے۔

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نے علم کے بے شمار خرمنوں سے خوشہ چینی کی تھی مگر حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ سے آپ کو ایک تعلق خاص تھا (یہ وہی حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ

علیہ کو راستے میں روک کر کہا تھا کہ میں تمہارے چہرے پر علم کی روشن علامات دیکھ رہا ہوں، اس لئے تم پر لازم ہے کہ علماء کی صحبت اختیار کرو)

ذاتی طور پر حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔

ان محدثین وفقہا کے علاوہ مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت قاضی شریح رحمتہ اللہ علیہ کی مجلسوں میں بھی نہایت ذوق وشوق سے شریک ہوا کرتے تھے...... آپ کے شاگردان خصوصی میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ، حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عبدالرحمٰن بن یزید رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عکرمہ بن عمار رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت محمد بن اسحاق رحمتہ اللہ علیہ شامل تھے۔

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ ایک بار کسی بات کو سن لیتے تو عمر بھر کے لئے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتی اور یادداشت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص بھولے بسرے واقعات کے بارے میں بھی سوال کرتا تو ان واقعات کو پوری جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان فرما دیتے جیسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

اپنی قوت حافظہ کے بارے میں بیان فرماتے ہیں۔ "میں ہر یاد رکھنے والی چیز کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا کرتا تھا اور جب کبھی اسے دہرانے کی ضرورت پیش آتی تو میرا حافظہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اسے زبان تک منتقل کر دیتا تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ نے آگہی کی تلاش میں مختلف ممالک کی خاک چھانی اور بالآخر علم کا خزانہ قرار پائے۔

مشہور مؤرخ علامہ ابن سعد نے حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کو تابعین شام کے تیسرے طبقے میں شمار کیا ہے۔

حضرت ابن یونس رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کے ثقہ ہونے پر سب کو اتفاق ہے۔

حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کو تابعین کے تیسرے طبقے میں شمار کیا ہے لیکن جہاں تک قوت حافظہ اور سرمایہ معلومات کا تعلق ہے تو حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ صف اول میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

جہاں علم حدیث میں حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کو امامت کا درجہ حاصل ہے وہاں فقہ اسلامی میں بھی درجۂ بلند رکھتے ہیں۔

حضرت ابوحاتم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرزمین شام پر حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا۔

سعید بن عبدالعزیز برملا کہا کرتے تھے کہ حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ امام زہری رحمتہ اللہ علیہ سے بڑے فقیہ تھے۔

مروان بن محمد کا مشہور قول ہے کہ کوئی بھی شخص مکحول رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ فتوے میں بصیرت رکھنے والا نہیں تھا۔

اس قدر فضل وکمال کے باوجود مکحول رحمۃ اللہ علیہ فتویٰ دیتے وقت بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔
ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ کو بار ہا فتویٰ دیتے دیکھا ہے۔ جب بھی کوئی شخص آپ کی مجلس علم میں اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوتا آپ اس کے بیان کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔
پھر بہت دیر تک مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ...... اس وقت حاضرین کو ایسا محسوس ہوتا جیسے حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے ہیں اور انہیں سائل کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کے سوا کچھ یاد نہیں ہے۔
یہاں تک کہ ایک ایک جزئیات پر غور کرنے کے بعد آپ لب کشا ہوتے اور پھر مجلس اس کلمہ مقدس سے گونجنے لگتی۔" **لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** "
یہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قوت اور کبریائی کا اظہار ہوتا پھر اس کے بعد حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے کے جواب میں اپنا فتویٰ دیتے۔
جب فتویٰ مکمل ہو جاتا تو آپ نہ صرف سائل کو بلکہ تمام اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرماتے۔
"یہ میری رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے اور درست بھی۔ اگر کسی کو کہیں کوئی صحیح بات نظر آ جائے تو بے دریغ میری رائے کو مسترد کر دے۔"
یہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی ہی تھی کہ جس نے حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ کو زندگی بھر آسودگی کی نیند سونے نہیں دیا اور اللہ کا جبروت ہی تھا جس نے حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ کو ہمیشہ لرزہ براندام رکھا۔
خوف خدا کے سبب آپ پر ہمہ وقت ایک عجیب سا اضطراب طاری رہتا تھا۔
اسی خوف کے سبب حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ نے ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی جس پر یہ عبارت درج تھی۔
"اے رب! تو اپنے بندے مکحول کو دوزخ کی آگ سے دور رکھ۔"
روایت ہے کہ حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ روز و شب میں سیکڑوں بار اس انگوٹھی کو دیکھا کرتے تھے۔
کسی شخص نے ایک دن برسر مجلس حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟
جواباً حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں ہر وقت آتش جہنم کو پیش نظر رکھنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے گناہوں کی کثرت کا اندازہ ہوتا رہے۔
آپ کی تابناک شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ بھی تھا کہ حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ مجاہدین کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جسے دربار خلافت سے وظائف جاری کئے جاتے تھے۔ حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ اس وظیفے سے خود بھی جہاد کی تیاری کرتے تھے اور دوسرے مجاہدین کو بھی مدد دیتے تھے۔ ایک بار آپ کو کہیں سے دس ہزار دینار کی کثیر رقم ملی تو آپ نے پچاس پچاس دینار دوسرے مجاہدین کو گھوڑے خریدنے کے لئے دے دیئے۔
اس تمام پرہیز گاری اور علم وفضل کے باوجود حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ دوسرے ائمہ کرام کی طرح بعض الزامات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ شاید یہ زمانے کی رسم قدیم ہے کہ ہر دور میں اہل کردار ہی ظاہر پرستوں کی تہمتوں کی زد پر رہے ہیں۔

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ پر عام اعتراض یہ تھا کہ آپ قدریہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

مشہور مؤرخ علامہ ابن سعد نے بعض ایسی روایتیں بھی نقل کی ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کا دامن اس الزام سے یکسر پاک تھا۔

ایک دن کسی شخص نے حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کے عقائد کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب دینے سے پہلے حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ نے دریافت کیا کہ اے شخص، حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کے نظریات کے متعلق خود تیری اپنی معلومات کیا ہیں؟

آنے والے نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ فرقہ قدریہ سے وابستہ ہیں۔ میں تو آپ کے پاس صرف اسی لئے آیا ہوں کہ آپ ان باتوں کی تصدیق کر دیں یا پھر تردید سے کام لیں تا کہ اس سلسلے میں پایا جانے والا تردد ختم ہو جائے۔''

حضرت امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ''تابعین میں سے صرف حسن رحمتہ اللہ علیہ اور مکحول رحمتہ اللہ علیہ دو بزرگ تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ قدریہ عقائد رکھتے ہیں مگر جب ہم نے پوری ذمے داری کے ساتھ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ الزام سراسر غلط ہے۔ لوگوں نے اپنی کم عقلی کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی اور حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کو بہت اذیت پہنچائی۔ خدا ان لوگوں کو معاف فرمائے اور مکحول رحمتہ اللہ علیہ کو اس صبر و ضبط پر اجر عظیم دے۔''

حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک شاگرد سعید بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ سے بھی کسی شخص نے یہی سوال کیا تو آپ نے واضح الفاظ میں پکار کر کہا۔ ''لوگ ایک ایسی بات میں الجھ رہے ہیں جن کا تعلق حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ کی ذات سے نہیں تھا۔ وہ نہ صرف صحیح العقیدہ انسان تھے بلکہ علم و کردار کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز تھے۔ لوگ ''فکری اندھیروں'' کو ان کے نام سے منسوب کرتے ہیں مگر وہ خود اپنی ذات میں ایک چراغ رہ گزر تھے کہ جس سے بے شمار مسافران شب منزل کا سراغ پاتے ہیں۔''

جوزجانی رحمتہ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ پر ''قدر'' کا شبہ کیا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ ان پر تہمت ہے۔

حافظ ابن حجر کی روایت کے مطابق مشہور محدث یحییٰ بن معین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مکحول رحمتہ اللہ علیہ ''قدری'' ہیں مگر بعد میں تو لوگوں نے یہ بھی سنا کہ حضرت یحییٰ بن معین رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اس نظریے سے رجوع کر لیا ہے یعنی وہ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کو مذکورہ الزام سے بری سمجھنے لگے تھے۔

علم و عمل کا یہ خورشید ضیا بار دوسری صدی کے آغاز میں بجھ گیا تو بہت دن اہل ہوش اور صاحبان دل کو اپنی دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ حضرت مکحول شامی رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال کی روایات میں نمایاں اختلاف ہے۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ اس برگزیدہ انسان 112ھ میں سفر آخرت اختیار کیا تھا اور کچھ لوگ اپنے اس دعوے پر اصرار کرتے ہیں کہ جب یہ مرد جلیل اپنے خالق حقیقی سے ملنے کے لئے روانہ ہوا تو وہ 114ھ کا آغاز تھا۔



حضرت نافع بن کاؤس رحمتہ اللہ علیہ

حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کے والد محترم کے نام کے سلسلے میں مؤرخین کھلا ہوا اختلاف رکھتے ہیں۔ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ان کا نام کاؤس تھا۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ ہرمز کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ بہر حال حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ دیلم کے رہنے والے تھے۔ جب مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ اپنے عروج پر تھا' اس وقت ایک جنگ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ایسے لڑکے کو دیکھا جس کے چہرے پر ذہانت وتدبر کے پیدائشی آثار روشن تھے۔ جب وہ جنگ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی اور مسلمان فتح عظیم سے ہم کنار ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس لڑکے کو اپنی غلامی میں لے لیا۔ یہ حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ تھے جن پر بظاہر بدبختی کے سیاہ بادل سایہ فگن تھے لیکن درپردہ ایک ایسے شخص سے وابستہ ہو گئے تھے جسے درجہ صحابیت حاصل تھا۔

جس طرح حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو خوش قسمتی سے عبداللہ بن عباسؓ کی غلامی میسر آ گئی تھی، اسی طرح حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کو بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دامن کرم تک رسائی حاصل ہو گئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی نگاہ جوہر شناس نے پہلے دن ہی پہچان لیا تھا کہ گردش وقت نے جس لڑکے کو زنجیر غلام پہنائی ہے ان کا ذہن فطرتاً آزاد ہے اور وہ فکر کی انتہائی بلندیوں میں پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نتیجتاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے روز اول ہی سے حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم وتربیت کا آغاز کر دیا۔ ابن عمرؓ آپ سے اس قدر شفقت فرماتے تھے کہ کوئی بھی دیکھنے والا انہیں غلام زادہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار عبداللہ بن جعفرؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ''میں تمہارے غلام کو خریدنا چاہتا ہوں۔''

''تم کس غلام کی بات کر رہے ہو؟'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حیرت واستعجاب کے ساتھ دریافت کیا۔

''وہی غلام زادہ جو کسی جنگ میں تمہارے ہاتھ لگا تھا اور جسے تم آج کل بہت عزیز رکھتے ہو۔'' عبداللہ بن جعفرؓ نے وضاحت کی۔

''تم نافع کی بات کر رہے ہو؟'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حیرت برقرار تھی۔

''ہاں! میں تمہیں اس کے بارہ ہزار درہم دے سکتا ہوں۔'' عبداللہ بن جعفرؓ نے ایسی پیش کش کی جو اس وقت گراں بہا سمجھی جاتی تھی۔

''وہ تو میرے بچوں کی مانند ہے۔'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا۔ ''یہ ظاہری غلامی تو چار دن کی بات ہے۔ نافع غلامی کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔ عنقریب دنیا اسے علم کی مسند شہنشاہیت پر جلوہ افروز دیکھے گی۔''

عبداللہ بن جعفرؓ ان رموز و نکات کو سمجھنے سے قاصر تھے اور انہیں اپنی پیش کش کے مسترد ہو جانے کا بہت افسوس تھا۔ اس لئے جب وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکان سے ناکام و نامراد واپس لوٹے تو بڑ بڑانے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ''ابن عمرؓ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔''

اس واقعے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم پر مزید توجہ دینا شروع کر دی۔ اس دوران حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ دیگر صحابہ کرامؓ کی خدمت اقدس میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید الخدریؓ اور حضرت رافع بن خدیجؓ سے بھی آپ نے حدیث کی سماعت کی۔

حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ نے تیس سال تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے زیر سایہ تربیت پائی۔ آپ نے ابن عمرؓ سے سماعت حدیث کے علاوہ علم فقہ بھی حاصل کیا۔ جب بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کوئی فتویٰ دیتے' حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ اس کی تمام جزئیات پر نظر کرتے۔ اگر کسی زاویئے سے کوئی بات آپ کی سمجھ میں نہ آتی تو تنہائی کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے رجوع کرتے۔ یہاں تک کہ اس مسئلے کا ایک ایک گوشہ آپ کے ذہن پر روشن ہو جاتا۔

تیس سال گزر جانے کے بعد ایک دن پھر وہی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو آزردہ خاطر کر دیا تھا۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے صاحب زادے ایک روز اپنے حلقہ احباب میں تشریف فرما تھے کہ ابن عامر آئے اور آتے ہی کہنے لگے۔

''عبداللہؓ! میں تمہارے غلام نافع کو خریدنا چاہتا ہوں۔'' ابن عامر کا لہجہ سخت تاجرانہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ابن عامر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ دیکھنے والوں کو صاف محسوس ہوتا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ابن عامر کی یہ گفتگو سخت ناگوار گزری ہے۔

ابن عامرؓ فاروق اعظمؓ کے فرزند کی مزاجی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ کثرت سرمایہ نے انہیں اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ بالآخر پر جوش لہجے میں کہنے لگے۔ ''میں تمہیں نافع کے عوض تیس ہزار درہم دینے کے لئے تیار ہوں۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس بار بھی ابن عامر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک بیٹھے کچھ سوچتے رہے پھر سب لوگوں کے سامنے حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کو طلب کر کے فرمایا۔ ''تم رسم دنیا کے مطابق میرے غلام ہو مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے تمہیں اپنے فرزند سالم کی طرح پرورش کیا۔ فطرتاً ممکن ہے کہ میں نے کبھی تم دونوں میں تفریق کی ہو لیکن قصداً میں نے تمہیں چشم حقارت سے نہیں دیکھا۔ تم میرے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے ہو مگر اہل دنیا اس رشتے کی صداقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ میں کب تک یہ برداشت کرتا رہوں گا کہ لوگ آئیں اور تمہاری بولیاں لگا کر چلے جائیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ ابن عامر کے درہم کہیں مجھے کسی فتنے میں مبتلا نہ کر دیں۔ جاؤ آج سے تم آزاد ہو۔''

حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ معنوی اعتبار سے پہلے بھی غلام نہیں تھے' مگر آج حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ظاہر طور پر بھی آپ کے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیر کاٹ دی اور گردن سے طوق غلام اتار پھینکا۔

حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو تفسیر و حدیث اور فقہ میں امامت کا درجہ حاصل تھا' لیکن اہل مدینہ میں حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ سے بھی زیادہ افضل سمجھے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے حضرت سالم رحمتہ اللہ علیہ اعلیٰ پائے کے محدث وفقیہ تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

''اگر نافع رحمتہ اللہ علیہ اور سالم رحمتہ اللہ علیہ میں اختلاف ہو جائے تو میں نہیں جانتا کہ دونوں میں سے کس کو ترجیح دوں؟''

حضرت امام نووی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت نافع بن کاؤس رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ جلال میں اس طرح نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ''حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ جلیل المرتبت تابعی تھے۔ آپ کی جلالت علم اور فن حدیث میں ثقہ ہونے پر تمام اکابر علماء متفق ہیں۔''

مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ علی الاعلان فرماتے تھے۔ ''نافع رحمتہ اللہ علیہ کی روایت کردہ حدیث سے معتبر کس کی حدیث ہے؟''

حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے جن محدثین کی اسناد کو سب سے زیادہ معتبر قرار دیا ہے' ان میں حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بھی شامل ہیں۔ علمائے احادیث اسے ''طلائی زنجیر'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ بن کاؤس کا نام سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

ایک اور مقام پر حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''سب سے زیادہ صحیح سند وہ ہے جس میں امام مالک رحمتہ اللہ علیہ' حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ سے اور نافع رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں۔''

حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ سے ایک نسبت خاص تھی۔ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے ایک طویل عرصے تک اس مردحق سے علم حدیث حاصل کیا۔ اور پھر جب آپ کو قول رسول ﷺ کا کچھ ادراک ہوا تو بے اختیار فرمایا۔ ''جب میں حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی کوئی روایت سن لیتا ہوں تو پھر مجھے اس کی پروا نہیں رہتی کہ میں اس حدیث کو کسی دوسرے سے سنوں۔''

خود حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے۔ ''اللہ نے نافع کو عطا فرما کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔''

حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ آپ کو ''امام العلم'' قرار دیتے ہیں اور اس امام العلم کی غیرت نفس کا یہ حال تھا کہ اپنے آقا زادے کی موجودگی میں فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ آپ کی عام عادت یہ تھی کہ ایک سیاہ چادر اوڑھتے اور ہر وقت منہ لپیٹے رہتے تھے۔ درس حدیث یا کوئی فقہی مسئلہ بیان کرنے کے علاوہ آپ کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ' حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کے علم و فضل سے اس قدر متاثر تھے کہ برملا آپ کی بزرگی کا اعتراف کرتے تھے۔ خلافت کی ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ سے فرمایا تھا۔

''آپ کا علم سورج کی مثل ہے۔ اسے خاک مدینہ کے علاوہ زمین کے دوسرے گوشوں کو بھی منور کرنا چاہئے۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا حکم سن کر حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ ایک طویل عرصے کے لئے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تھے اور آپ نے تشنگان علم کو بقدر ظرف سیراب کیا تھا۔

حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ' حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ گھنٹوں جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ اپنے مکان سے باہر تشریف لاتے اور پھر نماز ظہر کے بعد حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کو درس حدیث دیتے۔ حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا بھی یہی حال تھا کہ حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے اس طرح دست بستہ بیٹھتے جیسے آقا کے سامنے غلام حاضر ہو...... اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی بہ آواز بلند فرماتے ہوں کہ ''اللہ نے نافع رحمتہ اللہ علیہ کو عطا فرما کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔''

......تو پھر بعد میں آنے والوں کے لئے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ وہ اس غلام زادے کو علم حدیث وفقہ کا شہنشاہ تسلیم کر کے اس کی بارگاہ جلال میں سر نیاز نہ جھکا دیتے۔

حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ نے 117ھ میں وفات پائی اور خاک مدینہ نے آپ کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔



حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ

حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ 56ھ میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت سے پانچ سال پہلے مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ مغل شہزادہ دارالشکوہ نے اپنی کتاب ''سفینتہ الاولیا'' میں مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ کی یہ روایت بھی بیان کی ہے۔

ایک دن حضرت جابرؓ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ سرور کونین ﷺ نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''جابرؓ! تم اس وقت موجود ہو گے جب میری اولاد میں ایک لڑکا پیدا ہو گا جس کا نام محمد ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اسے نور حکمت عطا فرمائے گا۔ تم اس سے ملو تو میرا اسلام کہنا۔''

اس روایت کے بارے میں تحقیق کرنا تو اہل علم کا منصب ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل میں ایک فرزند پیدا ہوا جس نے امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے شہرت پائی مگر آپ کا خاندانی نام محمد بن علی رحمتہ اللہ علیہ ہی تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے 78ھ میں وصال فرمایا۔ اس وقت حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی عمر بائیس سال تھی حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کا حضرت جابرؓ سے ملنا تو ایک الگ موضوع ہے' حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ حدیث رسول ﷺ کے سلسلے میں بھی حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت فرماتے تھے۔ دوسرے بزرگ جن سے امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے کسب فیض کیا' وہ حضرت عبداللہ بن عمر رحمتہ اللہ علیہ تھے۔

احادیث رسول ﷺ میں امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے علم کا دار و مدار حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایات پر ہے۔

بعض اہل علم نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ آپ کا پیدائشی نام محمد بن علی رحمتہ اللہ علیہ تھا مگر باقر رحمتہ اللہ علیہ کا لقب اس لئے اختیار کیا کہ آپ نے علم کو وسعت بخشی تھی۔

عظیم محدث وفقیہ ہونے کے باوجود نہایت اعلیٰ ظرف اور وسیع النظر انسان تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری نے حیات امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے جس سے حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے کردار کی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ اہل بیت میں داخل ہونے کے باوجود خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ ابن الخطاب اور خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں ہمیشہ رطب اللسان رہتے

تھے۔

ایک بار عراق کے کچھ لوگ آپ کی مجلس علم میں داخل ہوئے' حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ حدیث وفقہ کے رموز و نکات سمجھا رہے تھے اور بعض مشکل مسائل کا حل پیش کر رہے تھے۔ اس دوران وہاں اہل عراق کی ایک جماعت بھی موجود تھی۔ جیسے ہی حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کا درس ختم ہوا' وہ عراقی باشندے مجلس میں کھڑے ہو گئے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم اجمعین کا ذکر نامناسب انداز میں کرنے لگے۔ اہل مجلس کو ان کا یہ طرز گفتار پسند نہیں آیا۔ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ خاموشی سے ان لوگوں کی گفتگو سنتے رہے پھر آہستہ آہستہ آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہونے لگا۔

"تم کون لوگ ہو؟" حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے شریک درس ہونے والوں سے پوچھا۔ آپ کی آواز سے تلخی نمایاں تھی۔ اگرچہ شیریں گفتاری حضرت امام باقر کا شیوہ خاص تھی لیکن آج یہ روایت صاف ٹوٹتی نظر آ رہی تھی۔

"ہم عراق کے باشندے ہیں"۔ کہنے والوں نے کہا مگر ان کے ذہنوں کی تنگی اور دلوں کی کجی یہ تھی کہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر بھی صورت حال کی نزاکت کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔

"تم کہیں کے بھی رہنے والے ہو مگر حضرت ابو بکر صدیقؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو نہیں جانتے۔ کیا تم ان صحابہؓ کے جاہ وجلال اور مرتبے سے واقف ہو۔"

عراقی باشندوں نے حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی تنبیہ کا ذرا بھی احساس نہیں کیا اور اسی لہجے میں بولتے رہے جس سے خلفائے راشدین کے حضور گستاخی کا ارتکاب ہوتا تھا۔

آخر حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ آپ نے اہل عراق کو مخاطب کر کے فرمایا۔ " کیا تم مہاجر ہو جو اہل و مال سے نکال دیئے گئے (حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کے اس سوال کا مفہوم یہ تھا کہ مہاجر ہونے کی صورت میں کیا ان لوگوں کی کوئی حق تلفی ہوئی ہے' جس سے متاثر ہو کر ان کی زبانیں دراز ہو گئی ہیں۔)

اہل عراق کہنے لگے۔ " ہرگز ہم مہاجر نہیں ہیں۔"

حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ نے دوبارہ غضب ناک ہو کر پوچھا۔ " کیا تم انصار ہو' جنہوں نے ان لوگوں کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے؟"

(ان دونوں سوالوں سے حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کا مفہوم یہ تھا کہ خلفائے راشدین کے سلسلے میں کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا پھر بھی مہاجرین اور انصار جو اس وقت کفار سے برسر پیکار تھے' یہاں تک کہ جان و مال اور ہر قسم کی قربانی دینے سے گریزاں نہیں تھے۔ اگر ان حضرات کی زبانوں پر کوئی حرف شکایت آتا تو یہ بات کسی حد تک قابل غور ہوتی۔ کیوں کہ یہ دونوں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ اور جو لوگ بعد میں داخل ایمان ہوئے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں سے واقعات و حالات کا مشاہدہ نہیں کیا وہ اس بات کا ذرا بھی استحقاق نہیں رکھتے تھے کہ ان کی زبانوں پر کوئی حرف شکایت آئے۔)

حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ کا دوسرا سوال سن کر اہل عراق نے کہا۔ " ہم جماعت انصار سے بھی کوئی تعلق نہیں

رکھتے۔"

"جب تم مہاجر بھی نہیں ہو انصار بھی نہیں ہو تو پھر یہاں سے چلے جاؤ۔ خدا تمہیں میری نظروں سے دور کر دے۔" حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ اس قدر غضب ناک لہجے میں بول رہے تھے کہ آپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ "چلے جاؤ تم زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہو مگر تمہارا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔"

اس تاریخی واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام باقر رحمتہ اللہ علیہ خلفائے راشدین کے نامناسب ذکر کو کتنا بڑا گناہ سمجھتے تھے۔



حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ

حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ بربر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ شروع میں حصین بن عنبری کے غلام تھے۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بصرے کا گورنر مقرر کیا تو حصین بن عنبری ملاقات کے لئے آئے اور عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو آپ کی غلامی میں دے دیا۔ اس وقت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ بہت کم عمر تھے۔ اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت بھی حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ کے زیر سایہ ہوئی۔ عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ بچپن ہی سے علم و حکمت کی طرف راغب نظر آتے تھے جب حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کا شوق و طلب دیکھا تو بے حد متاثر ہوئے اور قرآن و سنت کی تعلیم دینے لگے۔ یہ عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کی خوش نصیبی تھی کہ غلامی بھی اس شخص کی میسر آئی جسے تفسیر قرآن میں حرف آخر کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے' اس لئے جہاں بھی تشریف لے جاتے' عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے ساتھ رکھتے۔ یہاں تک کہ چالیس سال تک خاندان رسالت کے علم کا نور عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کے سینے میں منتقل ہوتا رہا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ کے فیضان نظر نے عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو تفسیر کا امام بنا دیا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ نے یہ آیت قرآنی تلاوت فرمائی۔

"تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا شدید عذاب دینے والا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ نے یہ آیت مقدسہ پڑھ کر عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا۔ "میں نہیں جانتا کہ وہ لوگ نجات پا گئے یا ہلاک کر دیئے گئے۔"

جواب میں حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ نے تاویلات پیش کیں اور ثابت کر دیا کہ وہ لوگ نجات پا گئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس بحث سے اس قدر خوش ہوئے کہ اپنا ایک قیمتی لباس عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو بطور انعام پیش کیا۔

تفسیر کے علاوہ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے تو اس میں عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ خود حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔

"عکرمہ! اب جاؤ اور لوگوں کے درمیان فتویٰ دو۔ میں تمہارا مددگار ہوں۔"

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے وقت بھی عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ غلام ہی تھے۔ جب حضرت ابن عباسؓ دنیا سے رخصت ہو گئے تو ان کے صاحب زادے علی رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں چار ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔

جب دوسرا آقا' عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے ہمراہ لے جانے لگا تو آپ نے بڑے رقت آمیز لہجے میں علی رحمتہ اللہ علیہ سے کہا۔ "افسوس! تم نے اپنے باپ کا علم چار ہزار دینار میں بیچ ڈالا۔"

عکرمہ کی بات سن کر علی رحمتہ اللہ علیہ اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے اس شخص کی رقم واپس کر دی اور عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کے گلے سے طوق غلامی اتار پھینکا۔

پھر حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ مجلس علم میں نمودار ہوئے تو انسانی ہجوم نے آپ کو گھیر لیا۔ مشہور بزرگ ایوب مصری رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ ہمارے ہاں تشریف لائے تو آپ کی آمد کی خبر عام ہوگئی۔ لوگ قطار در قطار آنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ کے گرد ایک بھیڑ لگ گئی۔ عقیدت مندوں کی کثرت نے حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو پریشان کر دیا اور آپ مجبوراً چھت پر چڑھ گئے۔

تابعین میں حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ تفسیر کے امام مانے جاتے ہیں۔ ان سے کسی شخص نے پوچھا۔

"کیا آپ اپنے سے زیادہ کسی عالم کو جانتے ہیں؟"

حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ نے بے اختیار فرمایا۔ "ہاں! میں ایسے شخص کو جانتا ہوں اور وہ عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔"

حضرت امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ جنہوں نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو علم کی رغبت دلائی تھی' اکثر فرمایا کرتے تھے۔ "اب اللہ کی کتاب کو عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ جاننے والا کوئی دوسرا شخص دنیا میں موجود نہیں ہے۔"

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔ "عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ تم ان کی صحبت میں بیٹھا کرو۔

عظیم محدث وفقیہ ہونے کے باوجود حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ نہایت خوش مزاج انسان تھے۔

حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کو سیر و سفر کا بھی بہت شوق تھا۔ آپ نے یمن' مصر' افریقہ' اصفہان' خراسان اور سمرقند کے علاقوں کی سیاحت کی تھی۔

آخر 80 سال تک قرآن وحدیث کے اسرار و رموز سمجھاتے ہوئے حضرت عکرمہ خاموش ہوگئے۔ 106ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور اس خاک مقدس کا ایک حصہ بن گئے جہاں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم محو خواب ہیں۔

جس روز حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ نے وفات پائی اس دن اتفاق سے عرب کے مشہور غزل گو شاعر کثیر عزہ کا بھی انتقال ہوا۔ بیک وقت دو المناک خبریں سن کر لوگوں نے آہ سرد کھینچی اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"افسوس! آج سب سے بڑے فقیہ (عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ) اور سب سے بڑے شاعر (کثیر) دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ظہر کے بعد دونوں کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھی گئی۔

ابن سعد لکھتے ہیں کہ حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ بے پناہ علم رکھتے تھے اور اپنی ذات میں ایک سمندر تھے۔

حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ سے احتیاج نہ رکھتا ہو اور سند حاصل نہ کرتا ہو۔" مشہور محدث حضرت یحییٰ بن معین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ "عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ معتبر ہیں۔ اگر تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جو ان کی شان میں بے اعتباری ظاہر کرتا ہے تو پھر اس کے اسلام میں شک ہے۔"

یہ تھے حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ جنہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی غلامی نے ایسی شہنشاہیت بخشی کہ آج بے شمار اہل علم حسرت کرتے ہیں کہ کاش وہ خود عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ کے غلام ہوتے۔

اور یہی وہ حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ تھے جن بارگاہ جلال میں حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے کئی بار حاضری دی تھی اور اپنے دل و دماغ کو تفسیر وحدیث کے علم سے روشن کیا تھا۔



حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ

حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ ریسان حمیری کے غلام تھے۔ آپ کے والد فارسی النسل تھے اور آل حمدان سے ترک سکونت کر کے یمن کے مشہور شہر جند میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

اپنے علم وفضل کے اعتبار سے حضرت طاؤس بن کیسانؒ کو علمائے تابعین میں ممتاز ترین مقام حاصل ہے اور اس طرح آپ صالحین کی جماعت میں بھی بہت اونچے درجے پر فائز تھے۔

مشہور فقیہ حضرت عمرو بن دینار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "میں نے طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔"

ابن عماد حنبلی رحمتہ اللہ علیہ کے خیال میں حضرت طاؤس بن کیسان بڑے امام تھے اور آپ سب سے زیادہ حلال وحرام کے جاننے والے تھے۔

حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ حدیث رسول ﷺ کے جلیل القدر حافظ تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے پچاس صحابہؓ کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ حضرت زید بن ارقمؓ، حضرت زید بن ثابتؓ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت صفوان بن امیہؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے صحابہ کرام سے آپ نے اکتساب علم کیا۔

ویسے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد خاص تھے۔ مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "میں نے عبداللہ بن یزید رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ تم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے یہاں کس کے ہمراہ جاتے ہو۔ جواب میں عبداللہ بن یزید رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ جب میں اس مجلس علم میں داخل ہوتا ہوں تو میرے ساتھ حضرت عطا رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر افراد ہوتے ہیں۔" اس کے بعد حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ نے عبداللہ بن یزید رحمتہ اللہ علیہ سے دوبارہ پوچھا کہ طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کس طرح جاتے تھے؟ جواب میں عبداللہ یزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کی کیا بات ہے وہ تو خواص میں شامل تھے۔"

حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ حدیث کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط رہتے تھے۔ حدیث کی قرأت

کے وقت ایک ایک لفظ کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ اس کی ادائیگی کا حق ادا ہو جائے۔

روایت حدیث کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ بر سر مجلس فرمایا کرتے تھے۔ "جب میں تمہارے سامنے کوئی حدیث بیان کروں اور اس کی توثیق بھی کر دوں تو پھر تم اس کے متعلق کسی سے دریافت نہ کرو"۔ ہم حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کے اعتماد ذات کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ پر رحمت ذوالجلال سایہ فگن تھی ورنہ اتنے وثوق سے کون کہہ سکتا ہے؟

حضرت لیث بن ابی سلیم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ تو وہ شخص تھے جو حدیث رسول ﷺ کا ایک ایک حرف شمار کرتے تھے۔" حضرت یحییٰ بن معین رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ابوزرعہ رحمتہ اللہ علیہ نے حدیث میں حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کو ثقہ قرار دیا ہے۔

حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ اہل یمن کے بڑے مفتی اور شیخ تھے۔ اس شہر کے لئے ان کی ذات بہت بابرکت تھی اور بڑی جلالت اور شان کے مالک تھے۔"

حدیث کے علاوہ فقہ میں بھی حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ قیس بن سعد رحمتہ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں طاؤس کی وہی حیثیت ہے جو بصرے میں امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی۔

ابن معین رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں یا سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ کو' جواباً ابن معین رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "میں ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا۔"

اس قدر علم و فضل کے باوجود حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ فتویٰ دینے میں بہت زیادہ احتیاط کرتے تھے ایک بار کسی شخص نے ان سے مسئلہ پوچھا تو فرمانے لگے۔ "اگر میں کچھ کہوں تو ڈر لگتا ہے اور خاموش رہوں تو اس سے بھی زیادہ خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ اگر کلام و سکوت کے درمیان کی راہ اختیار کروں تو پھر کوئی شخص میری دہشت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔"

عظیم محدث و فقیہ ہونے کے علاوہ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ نہایت عابد و زاہد شخص تھے۔ ابن حبان رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ یمن کے بہت بڑے عبادت گزار لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ سجدے کا نشان ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان صاف نظر آتا تھا' یہ بڑی عجیب بات ہے کہ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ بستر مرگ پر بھی کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے۔

آپ نے اپنی ساری زندگی میں چالیس حج کئے تھے۔ طواف کے دوران کسی سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی اس کی وجہ دریافت کرتا تو فرماتے طواف بھی نماز ہے اور نماز میں گفتگو کیسی؟

حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں اپنے والد محترم کے ہمراہ حج کرنے جاتا تھا۔ یمن سے مکہ تک کا راستہ ایک ماہ میں طے ہوتا تھا مگر میرے والد واپسی میں قصداً دور دراز کے راستوں سے گزرتے تھے اور اپنے گھر ایک ماہ کے بجائے دو ماہ میں پہنچتے تھے۔ ہم ان سے اس سست رفتاری کی وجہ دریافت کرتے تو فرماتے۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آدمی جب تک اپنے گھر نہیں پہنچ جاتا' وہ سفر ہی میں رہتا ہے۔" (مقصد یہ ہے کہ گھر پہنچنے تک حج کا ثواب جاری رہتا تھا۔)

حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے یہی وہ اعمال صالح تھے کہ جن کے سبب آپ کی دعائیں قبول بارگاہ حق تھیں۔ عام روایت ہے کہ پہلے تو حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ عام معاملات میں دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے مگر جب بھی ایسا کوئی موقع آ جاتا تو آپ کی دعاؤں کے طفیل خداوند ذوالجلال اس شخص کی بڑی سے بڑی پریشانی دور کر دیتا۔

اپنی اسی پرہیزگاری کے سبب حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ "مستجاب الدعوات" مشہور تھے۔

ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا۔"میں گمان کرتا ہوں کہ طاؤس اہل جنت میں سے ہیں۔"

اور اسی زہد وتقویٰ نے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کو وقت کے تمام حکمرانوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اکثر فرماتے تھے کہ میں نے ارباب دولت واقتدار سے زیادہ کسی کو شرانگیز نہیں دیکھا۔

اسی وجہ سے ابراہیم بن میسرہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا تھا۔"میں نے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے سوا ایسا کوئی شخص نہیں پایا جس کی نگاہ میں امیر وغریب دونوں برابر ہوں۔" حضرت سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔" حکومت وقت سے گریزاں رہنے والے صرف تین بزرگ تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے عہد میں' حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ اپنے دور میں اور حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ اپنے زمانے میں۔"

حضرت عمرو بن دینار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔" اگرچہ ان کے قبضہ اختیار میں بہت کچھ تھا لیکن میں نے ان سے زیادہ بچنے والا اور پاک دامن شخص کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔"

ایک بار حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت وہب رحمتہ اللہ علیہ' حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف کے پاس کسی کام سے تشریف لے گئے۔ محمد بن یوسف گورنر کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ دونوں بزرگ صبح کے وقت پہنچے تھے اس لئے موسم میں معمول سے زیادہ خنکی شامل تھی۔ حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کے جسم پر معمولی کپڑے تھے جو بظاہر سردی سے بچنے کے لئے ناکافی نظر آ رہے تھے۔ محمد بن یوسف نے یہ صورت حال دیکھ کر اپنے ملازم کو حکم دیا۔

" ایک گرم چادر طاؤس کو اوڑھا دو۔" ملازم نے اپنے آقا کے حکم پر عمل کرتے ہوئے قیمتی چادر طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے کاندھوں پر ڈال دی۔ حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ گورنر کے لحاظ کے باعث زبان سے تو کچھ نہیں کہہ سکے کہ وہ ان کا میزبان تھا مگر آپ مسلسل اپنے کاندھوں کو حرکت دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ چادر فرش پر گر پڑی۔ محمد بن یوسف یہ دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ حضرت طاؤس کی شان میں گستاخانہ کلمات تو ادا نہ کر سکا لیکن فوراً ہی اٹھ کر اندر چلا گیا۔

محمد بن یوسف کے جاتے ہی حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کی تقلید میں حضرت وہب رحمتہ اللہ علیہ کو بھی اٹھنا پڑا۔ کچھ دیر بعد راستے میں حضرت وہب رحمتہ اللہ علیہ نے اظہار ناراضگی کرتے ہوئے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ سے کہا۔

" اگر آپ کو محمد بن یوسف کے سامنے ایسا ہی بے نیازانہ عمل جاری رکھنا تھا تو چادر قبول کر لیتے اور بعد میں اسے فروخت کر کے رقم غریبوں میں تقسیم کر دیتے لیکن گورنر کو ناراض کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ چند لمحوں تک حضرت وہب رحمتہ اللہ علیہ کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے

پھر فرمانے لگے۔ "تم بھی مجھ سے دنیاداری کی باتیں کرتے ہو۔" (واضح رہے کہ حضرت وہب بن منبہ رحمتہ اللہ علیہ بھی مشہور تابعی تھے۔)

"یہ دنیاداری کی باتیں نہیں۔ محمد بن یوسف رسم میزبانی ادا کر رہا تھا۔"

"مجھے اندیشہ تھا کہ لوگ میری نیت کو نہیں میرے عمل کو دیکھتے۔ دنیا برملا کہتی کہ میں نے گورنر کا عطیہ دل سے قبول کر لیا۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا تو شاید میں محمد بن یوسف کے سامنے اس طرز عمل کا مظاہرہ نہ کرتا اور اس کی پیش کردہ چادر کو قبول کر لیتا۔"

اسی طرح نعمان بن زبیر صنعانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک بار یمن کے حاکم نے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کو پانچ سو دینار بطور ہدیہ بھیجے مگر آپ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ گرانقدر تحفہ واپس کر دیا۔

گورنر محمد بن یوسف کے کانوں تک اسی قسم کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں کہ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ امراء کی صحبتوں اور عطیات کو لائق التفات نہیں سمجھتے۔ ایک بار ذاتی طور پر وہ خود بھی اس کا تجربہ کر چکا تھا۔ اس لئے موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ کسی طرح حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے سامنے خم ہونے پر مجبور کر دے۔ آخر اس نے آپ کو جبراً ایک علاقے کا تحصیل دار بنا دیا۔ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ محمد یوسف کے ارادوں کو سمجھتے تھے۔ مجبوراً آپ نے وہ عہدہ قبول کر لیا اور بڑی جاں فشانی سے اپنا کام کرتے رہے۔ آخر کچھ دن بعد محمد بن یوسف نے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کو یہ کہہ کر تحصیل داری کے عہدے سے ہٹا دیا کہ تم اس کام کے اہل نہیں ہو۔ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ چپ چاپ اپنے گھر چلے آئے مگر اس طرح کہ آپ کا چہرہ ناقابل بیان خوشی کے احساسات سے روشن تھا۔

اس زمانے کے ایک اور بزرگ حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دن حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا۔ "آپ کچھ عرصے تک تحصیل دار بھی تو رہ چکے ہیں۔ ہمیں بتائیے کہ آپ اپنے فرائض کس طرح انجام دیتے تھے"؟

حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ جواباً فرمانے لگے۔ "میں باقی دار کے پاس جا کر کہتا تھا' خدا تم پر رحم کرے' اس نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے' اس کی زکوٰۃ ادا کر دو۔ اگر وہ میرے کہنے پر زکوٰۃ دے دیتا تو میں حاصل کر لیتا ورنہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہتا"۔ اس واقعے سے ظاہر ہے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ اپنا دامن چھڑانا چاہتے تھے۔ محمد بن یوسف کچھ دن تک آپ کے اس طرز عمل کو برداشت کرتا رہا پھر جھنجلا کر آپ کی ذمے داریاں سلب کر لیں پھر شدید غصے کے عالم میں کہا۔ "طاؤس تم کسی کام کے قابل نہیں ہو"۔

ایک بار آپ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کو خط لکھا۔ "امیر المومنین! اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے سارے کام بخیر و خوبی انجام تک پہنچیں تو اپنے گرد اچھے لوگوں کو جمع کیجئے اور انہی لوگوں کو عہدیدار بنائیے۔"

جواباً حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا۔ "طاؤس رحمتہ اللہ علیہ! میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ میری بھلائی کے لئے تمہاری یہ نصیحت بہت کافی ہے۔"

اسی احتیاط اور بے باکی نے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے کردار میں عجیب شان پیدا کر دی تھی۔ آپ کی پرہیزگاری کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کام میں برائی کا شائبہ بھی محسوس ہو جاتا تو اس سے سختی کے ساتھ گریز کرتے

تھے۔ ایک بار حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ نے ایک جماعت کو قرآن کریم کی تجارت کرتے ہوئے دیکھا تو شدت الم سے روتے ہوئے فرمایا۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

ایک بار حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ بیت اللہ کے طواف میں مصروف تھے کہ اچانک آپ کی نظر قریش کے کچھ لوگوں پر پڑی۔ وہ بھی طواف کر رہے تھے مگر اس طرح کہ ان کی ظاہری وضع اسلاف (بزرگوں) کی وضع کے خلاف تھی۔ اگرچہ حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ دوران طواف کبھی کسی سے بات نہیں کرتے تھے لیکن اس روز قریش کی جماعت کو بدلے ہوئے رنگ میں دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ نہایت برہم لہجے میں فرمانے لگے۔

"لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسے لباس پہنتے ہو جو تمہارے بزرگوں نے نہیں پہنے۔ اور ایسی رفتار سے چلتے ہو کہ ناچنے والے بھی نہیں چلتے۔"

آپ کی اسی جرأت گفتار اور ظاہر و باطن کی یکسانیت سے لوگ ہراساں رہتے تھے اور کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ آپ کے سامنے لب کشائی کر سکے۔

خود اپنی زیبائش کا یہ حال تھا کہ کبھی جسم پر سالم لباس بھی نہیں ہوتا تھا۔ ابن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ "میں نے حضرت طاؤس کو دیکھا ہے۔ آپ بوسیدہ لباس پہنے ہوئے تھے جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کبھی کبھی حنا کا خضاب بھی استعمال کرتے تھے۔"

بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ عموماً اپنے چہرے پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ صرف رات کے وقت نقاب کو الگ کر دیا کرتے تھے۔ عمامہ باندھتے تھے مگر اس روش کو مکروہ سمجھتے تھے کہ اس کے ایک حصے کو ٹھوڑی کے نیچے لے جا کر ڈھاٹے کے طور پر باندھا جائے۔

یہ اسی مرد جلیل کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ آپ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ بھی خلیفہ وقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ علامہ ابن خلکان کی روایت ہے کہ ایک بار خلیفہ منصور نے حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کو دربار میں بلایا۔ جب یہ دونوں ائمہ تشریف لے آئے تو منصور کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر حضرت عبداللہ بن طاؤس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"آپ مجھے اپنے والد محترم کی کوئی روایت سنائیے۔" یہ کہتے وقت منصور کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔

جواباً حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ فرمانے لگے۔ "میرے والد نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص مبتلا ہوگا، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی سلطنت میں شریک کیا (یعنی بادشاہ بنایا) اور اس کے باوجود اس نے ظلم کو اپنے حکم میں جائز رکھا۔"

یہ سنتے ہی خلیفہ منصور کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ایک مطلق العنان حکمران کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت عبداللہ بن طاؤس قتل کر دیئے جائیں گے۔

دربار کی فضا پر کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ منصور بظاہر خاموش تھا مگر اس کی کیفیت غضب میں کوئی کمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر ایک طویل لمحہ سکوت کے بعد منصور دوبارہ حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب ہوا۔

"ذرا وہ دوات اٹھا کر مجھے دے دیجئے۔" یہ کہتے ہوئے منصور نے اس دوات کی طرف اشارہ کیا جو خلیفہ سے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تھی لیکن حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کے زیادہ قریب تھی دربار میں منصور کی پر جلال

آواز گونج رہی تھی مگر حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کی بے نیازی دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے آپ نے خلیفہ وقت کی آواز ہی نہ سنی ہو۔

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ یہ دوات اٹھا کر مجھے دے دیں۔" اب کی بار منصور کی آواز زیادہ بلند تھی۔ اس میں تلخی کا رنگ بھی پہلے سے زیادہ شامل تھا۔

حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی نمایاں نہیں ہوئی اور حاضرین نے صاف محسوس کر لیا کہ آپ خلیفہ کے حکم کو قصداً نظر انداز کر رہے ہیں۔

منصور نے تیسری بار اپنا جملہ دہرایا اور جب حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہ کی تو اس کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن طاؤس سے کہنے لگا۔ "مجھے بتائیں کہ آپ دوات اٹھانے سے گریزاں کیوں ہیں؟ کیا میں آپ کا امیر نہیں ہوں اور کیا ایک امیر کی نافرمانی جرم نہیں ہے۔"

"بے شک! آپ مسلمانوں کے امیر ہیں۔" حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک میرا یہ عمل نافرمانی کے دائرے میں آتا ہو مگر میں اسے حکم عدولی تصور نہیں کرتا۔

اگرچہ حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کی آواز مدھم بھی تھی اور مؤدبانہ بھی لیکن اہل دربار آپ کے الفاظ میں پوشیدہ جلال کو اس طرح محسوس کر رہے تھے کہ اس کے آگے منصور کا دبدبہ ہیچ نظر آ رہا تھا۔

"آخر ایسا کیوں ہے؟" منصور ایک مرد قلندر کے سامنے بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔

"مجھے ڈر ہے کہ تم اس دوات کی روشنائی سے کوئی معصیت آلود یا ظالمانہ بات نہ لکھ دو اور پھر سر محشر میں بھی اس جرم میں پکڑا جاؤں کہ میں نے تمہیں دوات فراہم کر کے اس گناہ میں اعانت کی تھی۔"

منصور' حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کی اس جرأت گفتار کو برداشت نہ کر سکا اور سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ دونوں حضرات اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔"

یہ سنتے ہی حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔ جاتے جاتے حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ نے خلیفہ منصور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "ہم یہی تو چاہتے تھے۔" یہ کہہ کر آپ دربار خلافت سے نکل گئے۔

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ "دراصل اسی دن سے مجھ پر طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادے کا فضل ظاہر ہوا ہے۔"

جب حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ بن انسؒ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادے کی عظمت پر گواہی دیتے ہیں تو خود حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کا مرتبہ کیا ہوگا' اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے۔ "میرے والد اس بات کو بہت برا سمجھتے تھے کہ کوئی شخص اللہ کا واسطہ دے کر سوال کرے۔ اس کے برعکس آپ کی رحم دلی کا یہ حال تھا کہ کچھ لوگ ایک چور کو پکڑ کر لئے جا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن طاؤس رحمتہ اللہ علیہ سے چور کی بے کسی نہ دیکھی گئی۔ نتیجتاً آپ نے ایک دینار فدیہ دے کر چور کو آزاد کرا دیا۔

یہ تھا اس محدث عظیم کا مختصر سوانحی خاکہ جو فقیہ جلیل بھی تھا اور مرد قلندر بھی۔ جس کا دل ضرورت مندوں کے لئے

برگ گل سے بھی زیادہ نرم تھا مگر حکمرانوں کے لئے سنگ و آہن سے بھی زیادہ سخت۔ رسم دنیا نے اسے طوق غلامی پہنایا۔ مگر اسلام نے اس کے پیروں کی ایک ایک زنجیر کاٹ دی اور رسالت مآب ﷺ کی سیرت پاک نے اسے آداب شاہی اس طرح سکھائے کہ وہ خود شہنشاہ بن گیا۔ پھر نوے سال تک عوام و خواص کے دلوں پر حکومت کر کے حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ 106ھ میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے میں لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ میت کا آگے بڑھنا دشوار تھا' مجبوراً امیر مکہ ابراہیم بن ہشام کو فوج طلب کرنی پڑی۔ جنازے میں حضرت عبداللہؓ بن حسنؓ بن علی بن ابی طالب بھی شریک تھے۔ انسانی ہجوم نے دیکھا کہ آپ حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ کے جسد خاکی کو کاندھا دے رہے ہیں۔ مشتاقان دید کی کثرت کے سبب حضرت عبداللہ بن حسن رحمتہ اللہ علیہ کی دستار مبارک نیچے گر گئی اور اس کشاکش میں آپ کی چادر تک پھٹ گئی۔

خلیفہ وقت ہشام بن عبدالملک نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے جسم کی امانت خاک کے سپرد کر دی گئی۔

اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت طاؤس بن کیسان رحمتہ اللہ علیہ کے علم و فضل اور سیرت و کردار نے حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے دل و دماغ پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے۔



حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ

حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے غلام تھے۔ اسی غلامی کی نسبت سے آپ کو حرم نبوی ﷺ میں آنے جانے کا شرف حاصل تھا۔ جب تک آزاد نہیں ہو گئے ازواج مطہرات نے ان سے پردہ نہیں کیا۔

حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ نے امہات المومنین کے علاوہ حضرت جابر بن عبداللہؓ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے صحابہ سے اکتساب علم کیا۔ آپ فطری طور پر خداداد ذہانت اور فہم وادراک کے مالک تھے۔

خاندان نبوت کے زیر سایہ تربیت نے آپ کی تمام صلاحیتوں کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ انہیں انتہائی روشن و تابناک بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ کا شمار مدینہ منورہ کے ممتاز ترین علماء میں ہونے لگا۔ علامہ ابن سعد کے بقول حضرت سلیمان رحمتہ اللہ علیہ مدینے کے سات فقہائے عظیم میں سے ایک تھے۔ آپ کو تمام علوم دینی (قرآن' حدیث اور فقہ) میں کمال حاصل تھا۔ علم وفضل کے علاوہ حضرت سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کی قرأت بھی مجلس کو ساکت کر دیا کرتی تھی۔

حضرت سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ تابعین کی جماعت میں نامور فقیہ تھے مگر جب ان کے پاس کوئی شخص مسئلہ پوچھنے آتا تو آپ اس سے فرماتے۔ "جب تک سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ مدینے میں موجود ہیں تم لوگ میرے پاس کیوں آتے ہو؟"

وہ شخص حیران ہو کر کہنے لگتا۔ "دنیا تو آپ کے پاس آتی ہے۔ کیا سلیمان آپ سے بھی بڑے عالم ہیں۔"

جواب میں حضرت سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے۔ "اے شخص! میں تیری بے خبری کو کیا کہوں؟ تو میری بات کرتا ہے' اس وقت دنیا میں جتنے علما باقی رہ گئے ہیں ان میں سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ سب سے بڑے عالم ہیں۔"

حضرت محمد بن حنفیہ رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادے حضرت حسن رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ "حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سعید میتب رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ فہم والے ہیں۔"

مگر حضرت امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ کو فضیلت دی ہے۔ فرمایا

کرتے تھے" حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کے بعد سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ بڑے عالم ہیں۔"

حضرت سلیمان رحمتہ اللہ علیہ مسائل طلاق کے سب سے زیادہ بہتر جاننے والے تھے۔ مشہور محدث حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔" میں ایک بار مدینے گیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں مسائل طلاق کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ لوگوں نے بیک زبان حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ کا نام لیا۔"

علم کا بحرنا پیدا کنار ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ حسین وجمیل انسان تھے۔ نوجوانی میں ایک عورت آپ کے پاس کوئی مسئلہ دریافت کرنے آئی مگر آپ کی شکل دیکھتے ہی شیطان کے فریب میں مبتلا ہو گئی۔ پھر عورت نے اپنے مسئلے کو فراموش کر کے حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے گمراہ کن گفتگو شروع کی۔ آپ کچھ دیر تک اس نامحرم خاتون کی اس حرکت قبیح کو برداشت کرتے رہے مگر وہ مذموم ارادے سے باز نہیں آئی تو حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ اپنا مکان چھوڑ کر چلے گئے۔ دیکھنے والوں نے سنا کہ آپ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے۔" میں اپنے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔"

پھر خانۂ رسالت کے پروردہ اس عظیم محدث وفقیہ نے 107ھ میں دنیا سے منہ موڑ لیا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت سے اس وقت شرفیاب ہوئے جب یہ مرد جلیل اپنے سفر حیات کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ غالباً 106ھ یا 107ھ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اور اسی زمانے میں آپ نے حضرت سلیمان بن یسار رحمتہ اللہ علیہ کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر اپنی آنکھیں روشن کی تھیں اور شریک درس ہو کر اپنے علم وفضل میں اضافہ کیا تھا۔



حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ پیدائشی طور پر نابینا تھے یا کسی بیماری کے سبب آپ کی آنکھوں کی روشنی زائل ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ بہر حال یہ امر طے شدہ ہے کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ بچپن ہی میں خدا کی اس نعمت عجیب سے محروم ہو گئے تھے۔ اس فطری محرومی کے سبب عام لوگوں کا خیال تھا کہ قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی ساری زندگی اذیت و کرب میں گزرے گی اور وہ دوسرے اندھے بچوں کی طرح در در بھٹکتے رہیں گے مگر یہ سب انسانی قیاس آرائیاں تھیں۔ لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ قدرت نے ان کی قسمت میں کیسی "بینائی" اور کیسی "روشنی" رقم کی ہے' وہ نظر نہ آنے والی بینائی جس کے آگے لاتعداد ظاہری بصارتیں ہیچ تھیں اور وہ پوشیدہ روشنی جس سے اہل دل کے قافلے قیامت تک ہدایت و آگہی کا نور حاصل کرتے رہیں گے۔

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نابینا ہونے کے باوجود ایسی زبردست قوت حافظہ کے مالک تھے کہ پوری تاریخ آدم میں ایسی چند ہی مثالیں تلاش کی جا سکیں گی۔ خود حضرت قتادہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں۔ "قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس کے بارے میں' میں نے کچھ نہ سنا ہو۔"

حضرت امام ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ لوگوں میں سب سے زیادہ حافظ تھے۔"

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ' حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ جلالت میں اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ "میں نے قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ تفسیر کا عالم کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ وہ بہترین حافظ اور بے مثال فقیہ تھے۔ اس کے علاوہ اختلاف علما کے بھی ماہر تھے۔" اس قدر تعریف و توصیف کے بعد حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ "تم لوگ عزت و مرتبے میں قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے آگے بڑھنے والے بہت کم پاؤ گے۔"

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی قوت حافظہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ "بیس سال کا عرصہ ہوا میں نے اپنی رائے سے کوئی فتویٰ نہیں دیا۔" (اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کے ذہن میں اسلاف کے دیئے ہوئے لاتعداد فتاویٰ محفوظ تھے۔ جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا آپ کا ذہن دیگر بزرگوں کی قائم کردہ کوئی نہ کوئی مثال فوراً تلاش کر لیتا۔ یہ حاضر دماغی اور ذہانت کی عجیب مثال ہے)

اس کے علاوہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ عربیت اور لغت کے بھی زبردست ماہر تھے۔ آپ نے مشہور صحابی خادمِ رسول حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ مگر خصوصی طور پر آپ مشہور تابعی حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔

حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ بصرے میں پیدا ہوئے تھے۔ پہلے آپ تمام علمائے بصرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اکتساب علم کیا۔ ایک طویل عرصے تک مشہور بزرگ حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوئے۔ پھر آپ نے مزید علم حاصل کرنے کے لئے مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ دیار رسول ﷺ میں پہنچ کر حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نامور تابعی حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس علم میں حاضر ہوئے۔ اہل مجلس نے ایک نابینا شخص کو آتے ہوئے دیکھا تو یہی سمجھا کہ یہ بھی حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر کا کوئی شائق ہوگا۔ اس صورت میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ روشنی کا ایک سمندر لوگوں کے درمیان سے گزر کر کسی گوشہ مجلس میں سمٹ جائے گا۔ (یہاں مختصراً اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ وہ جلیل والقدر محدث ہیں جنہوں نے صحابہ کرامؓ سے احادیث سنیں اور جاں نثاران رسول ﷺ کے علم سے اپنے دل و دماغ کو روشن کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے۔ "سعید بڑے مفتی ہیں۔" حضرت علی بن مدینی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے۔ "میں نے تابعین میں حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ علم والا کسی کو نہیں پایا۔ میرے نزدیک وہ ایک جلیل القدر انسان ہیں جو کسی خلیفہ یا امیر کے پیش کردہ تحائف قبول نہیں کرتے۔" مشہور محدث حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کو کسی مسئلے میں جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو وہ حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ سے خط کے ذریعے سوال کرتے۔ بالآخر 94ھ میں کردار و عمل کا یہ آفتاب غروب ہو گیا مگر اس طرح کہ وہ قیامت تک اہل علم کی مجلسوں میں زندہ رہے گا اور اہل دل ہمیشہ اس کی روشنی سے زندگی کے تاریک گوشوں کو منور کرتے رہیں گے۔

یہی وہ حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ تھے جن کی بارگاہ علم میں بصرے کا ایک نابینا شخص حاضر ہوا تھا اور حاضرین نے اسے ایک مجہول انسان سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ پورے زور شور سے درس دے رہے تھے اہل مجلس پر سکوت طاری تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ نابینا اجنبی بظاہر خاموش تھا' لیکن اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ پھر جب حضرت سعید رحمتہ اللہ علیہ کا درس ختم ہو گیا تو اس شخص کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی جو آنکھوں کی روشنی سے یکسر محروم تھا۔

"میں قتادہ بن دعامہ ہوں۔ بصرہ میرا وطن ہے۔ میں نے بیشتر فقہا اور محدثین کے حلقہ درس میں شرکت کی ہے۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوا ہوں۔ اب علم کی طلب مجھے آپ کے در تک لے آئی ہے۔" حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ سے مخاطب تھے۔ آپ کی پرسوز آواز سن کر حاضرین مجلس دم بخود رہ گئے۔ وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بینائی سے محروم ایک شخص کا لہجہ و آہنگ اس قدر عجیب ہوگا۔

حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ قتادہ سے واقف نہیں تھے' لیکن آپ نے اپنے جن استادوں کا حوالہ دیا تھا ان میں سے حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے حضرت سعید بن میتب رحمتہ اللہ علیہ کو ایک ربطہ خاص تھا۔ کچھ تو

فقہائے بصرہ سے تعلق کا اظہار اور کچھ حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کی اپنی رواداری غرض اس باعث آپ نے حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی مجلس علم میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔

پہلے ہی دن عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ جب درس کے دوران حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں کو سوالات کی اجازت دی تو مجلس میں جس شخص کی آواز سب سے پہلے ابھری' وہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ آپ نے حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ سے اس قدر سوالات کیے کہ اہل مجلس کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ حاضرین کو حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کا اس طرح بولنا بہت ناگوار گزرا تھا۔

حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ بھی بار بار آپ کی طرف دیکھتے تھے مگر محد ثانہ مروت اور فقیہانہ وضعداری کے باعث اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔

دوسرے دن بھی حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کے سوالات کا یہی عالم رہا۔ حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کے دیگر شاگرد ابھی کچھ کہنے بھی نہیں پاتے تھے کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ بول پڑتے تھے۔ اگرچہ آپ کی یہ اضطراری کیفیت طلب علم کے سبب تھی لیکن اہل مجلس یہی سمجھتے تھے کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ خوامخواہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر کوئی ایک ہفتے تک حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کا یہی عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ اہل مجلس آپ کی موجودگی سے بیزار رہنے لگے مگر حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کی خاموشی کے باعث کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کر سکے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کی قوت برداشت بھی جواب دے گئی۔ جیسے ہی قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے کوئی سوال کیا' حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ نے تلخ لہجے میں فرمایا۔

"جو کچھ تم نے اب تک پوچھا ہے وہ تمہیں یاد بھی ہے یا نہیں"؟ حضرت سعید المسیب رحمتہ اللہ علیہ کو شک ہو گیا تھا کہ قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کو محض بولنے کی عادت ہے اور اپنی اسی عادت سے مجبور ہر کر وہ سر مجلس مسلسل بولتے رہتے ہیں۔ ورنہ جس قدر جوابات دیئے گئے تھے انہیں کوئی شخص بھی اپنے حافظے میں محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔

"جی ہاں' مجھے سب کچھ یاد ہے۔" حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت ادب اور سادگی سے جواب دیا۔

"تو پھر بتاؤ کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا"؟ حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کو قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

"کس مسئلے کے بارے میں عرض کروں"؟" حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح پوچھا کہ اہل مجلس نے آپ کی اس بے باکی کو گستاخی سے تعبیر کیا اور خود حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ بھی ناراض نظر آنے لگے۔

"تم فلاں مسئلے کے متعلق مجھے بتاؤ کہ میں نے کیا کہا تھا؟" حضرت سعید نے قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے کہا۔

استاد گرامی کا حکم سن کر حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور پھر مذکورہ مسئلے کے متعلق حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف من وعن دہرا دیا۔ اہل مجلس حیران رہ گئے۔ آج انہیں پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ خدا نے قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی بینائی کی صلاحیت سلب کر کے تمام روشنی ان کے ذہن میں منتقل کر دی ہے۔

حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ بھی شدید حیرت کے عالم میں قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرف دیکھ رہے تھے

اور آنکھوں کی روشنی سے محروم اس عظیم انسان کو پتا بھی نہیں تھا کہ اس کے بارے میں لوگوں کے کیا احساسات ہیں۔

اس کے بعد حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کہنے لگے۔ ''اس مسئلے میں فلاں بزرگ نے یہ کہا تھا' فلاں محدث کی یہ رائے تھی' فلاں فقیہ کا یہ خیال تھا اور حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے مجھے اس طرح بتایا تھا۔'' حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ ایک ہی مسئلے پر مختلف حوالوں سے بہت دیر تک بولتے رہے۔

یہاں تک کہ حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کو بے اختیار کہنا پڑا۔ ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم جیسے آدمی کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔''

اس واقعے کے بعد تمام اہل مجلس کو اندازہ ہو گیا کہ بصرے کا یہ نابینا کون ہے؟ خود حضرت سعید رحمتہ اللہ علیہ بھی قتادہ رحمتہ اللہ علیہ پر خصوصی توجہ فرمانے لگے۔ آپ کے حافظے کا عالم تھا کہ کسی کی زبان سے کوئی بھی لفظ ادا ہوتا' اگر قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سن رہے ہوتے تو پھر وہ لفظ آپ کی یادداشت کی گرفت سے دور نہ رہتا۔

کسی تاریخ سے یہ اندازہ تو نہیں ہوتا کہ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں کتنا وقت گزارہ لیکن پھر بھی قیاس ہے کہ چھ آٹھ ماہ ضرور بسر کئے ہوں گے۔ اگر ہم اس مدت قیام کو بڑھا کر ایک سال کر دیں تو یہ عرصہ بھی کسی عظیم و جلیل محدث کے علم کے سمجھنے کے لئے سخت ناکافی ہوتا ہے مگر قتادہ رحمتہ اللہ علیہ تو وہ بزرگ ہیں کہ دنوں کے ذہنی سفر کو ساعتوں میں طے کر لیا کرتے تھے۔ آپ کے اسی جوش طلب اور قوت حافظہ کو دیکھ کر ایک دن حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

''اب تم اپنے وطن کی راہ لو تم نے تو مجھے نچوڑ لیا۔'' نچوڑنے سے حضرت سعید کا مطلب یہ تھا کہ تم نے میرے پاس سرمایہ علم میں سے کچھ نہیں چھوڑا۔



حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ

آپ کا خاندانی نام منصور تھا اور والد محترم کا زاذان۔ آپ عراق کے مشہور شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ دیگر اکابرین علم کی طرح گردش وقت نے حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کو بھی طوق غلامی پہنا دیا تھا۔ آپ بنو ثقیف کے غلام تھے اس لئے ثقفی کہلاتے تھے۔

غلامی کی روایت نے بہت دن آپ کا تعاقب کیا مگر حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ فطرتاً آزاد پیدا ہوئے تھے۔ پیدائشی طور پر انتہائی ذہین تھے اس لئے بچپن ہی سے علم کی خاص رغبت رکھتے تھے۔ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے اکتساب فیض کیا۔

آپ کے استادوں میں مشہور خادم رسول حضرت انسؓ کا اسم گرامی بہت زیادہ نمایاں ہے۔

حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہونے کے سبب آپ کو تابعیت کا شرف بھی حاصل تھا۔ حضرت انسؓ کے علاوہ حضرت ابو العالیہ ریاحی رحمتہ اللہ علیہ' حضرت امام محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عطا بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ' حضرت معاویہ بن قرۃ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت حمید بن بلال رحمتہ اللہ علیہ' حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عمرو بن دینار رحمتہ اللہ علیہ' حضرت حکم بن عتیبہ رحمتہ اللہ علیہ' حضرت عبدالرحمٰن بن قاسم رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت ولید رحمتہ اللہ علیہ جیسے لوگوں نے بھی دولت علم تقسیم کی اور حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کے دامن کو شعور آگہی کے سرمائے سے بھر دیا۔

حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایات معتبر ہوتی تھیں۔ مشہور محدث حضرت بن معین رحمتہ اللہ علیہ' حضرت ابو حاتم رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت امام نسائی رحمتہ اللہ علیہ برملا کہا کرتے تھے کہ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ نہایت ثقہ بزرگ تھے۔

حافظ ذہبی ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں۔ ”منصور ابن زاذان رحمتہ اللہ علیہ اس قدر معتبر تھے کہ حق کی دلیل بن گئے تھے۔ وہ صالح' عبادت گزار اور بڑی شان والے تھے۔“

حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے ایک خاص عقیدت تھی اس لئے امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے زہد و تقویٰ اور قلندرانہ مزاج نے آپ کو بھی عبادت و ریاضت کے ایک خاص مقام تک پہنچا دیا تھا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ حدیث وفقہ کے علاوہ عبادت و ریاضت بھی حضرت زاذان رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کا روشن ترین پہلو تھا۔ آپ جس ذوق وشوق سے نماز ادا کرتے تھے' اسے دیکھ کر دوسرے لوگوں پر بھی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کو نماز کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت سے بھی عشق تھا۔ اکثر رات کو قرآن کریم شروع کرتے تھے اور نماز چاشت تک ختم کر دیتے تھے۔ جب حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ "سجدہ تلاوت" ادا کرتے تھے تو معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ نے پورا قرآن کریم ختم کر لیا ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ فجر اور عصر کے درمیان ایک قرآن ختم کر لیتے تھے۔ مختصراً یہ کہ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کثرت تلاوت کے لئے اپنے ہم عصروں میں بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے۔

ہشام بن حسان رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھی تو معلوم ہوا کہ آپ دوسری رکعت میں سورہ "نحل" تک پہنچ گئے ہیں۔

رمضان المبارک میں تلاوت قرآن کا شوق تیز ہو جاتا تھا۔ شب و روز میں کئی قرآن ختم کر لیا کرتے تھے۔

حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ پر ہر وقت خوف خدا طاری رہتا تھا۔ اسی شدت خوف نے آپ کو دنیا کی ہر خوشی سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اگر کوئی شخص جائز عیش ونشاط کا ذکر بھی کرتا تو آپ منہ پھیر لیتے یا گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیتے۔ خال خال ہی کسی نے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی ہوگی اور یہ تو امر محال تھا کہ مجلس میں کسی نے آپ کا قہقہہ سنا ہو۔ اسی وجہ سے حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

"رنج والم سے منہ نہ موڑو' یہ انسان کا حقیقی سرمایہ ہے۔ حزن و ملال ہی ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کی نیکیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ خوشیوں کی آرزو کرنا اور ان کے حصول پر اترانا گناہوں اور برائیوں کا سبب بن جاتا ہے۔

خوف خدا نے حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کو عبادت و ریاضت میں درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ آپ کے شاگرد حضرت ہشیم رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ ایک کامل انسان تھے۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ موت دروازے پر کھڑی ہے تو وہ اپنے عمل میں زیادتی نہیں کر سکتے تھے۔

(ہشیم رحمتہ اللہ علیہ کے اس بیان کا مقصد یہ کہ جب کسی انسان کو موت کا علم ہو جاتا ہے تو وہ پرسش اعمال کے خوف سے اپنی نیکیوں میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ بڑھاپے کی منزل میں داخل ہوتے ہی وہ دنیا سے جی اٹھا لیتے ہیں اور شب و روز یاد خدا میں مشغول ہو جاتے ہیں اور پھر جیسے جیسے موت قریب آتی جاتی ہے وہ خوف زدہ ہو کر نیک کاموں میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت اختیار کر لیتے ہیں' مگر حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ پہلے ہی اس قدر زیادہ عمل کرنے والے تھے کہ اپنے عمل میں مزید اضافہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

اس کا واضح مفہوم یہ کہ حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ نے جتنی زندگی بسر کی تھی' اس کے مطابق روز اول ہی سے موت آپ کے پیش نظر رہتی تھی۔ ہر صبح جب سورج طلوع ہوتا تھا تو آپ سمجھتے تھے کہ شاید شام تک زندہ نہ رہیں۔

اس لئے اپنے تمام فرائض اور سارے کام اس قدر طمانیت کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے آپ کو کچھ دیر بعد دنیا سے چلے جانا ہے۔)

خوف خدا کے سبب حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کی کوئی نماز گریہ وزاری سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو شدت گریہ سے آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور دوسرے نمازی سمجھ لیتے کہ یہ جاں سوختہ عشق الٰہی اپنے رب کے حضور کھڑا رو رہا ہے ورنہ عام طور پر یہ حال ہوتا کہ آنسوؤں سے آپ کی ریش مبارک تر ہو جاتی اور پھر یہی آنسو سینے کو بھگونے کے بعد دامن تک پہنچ جاتے تھے۔

ہر وقت خوف خدا سے اشک ریز رہنے والے اس عظیم وجلیل محدث نے آخری عمر میں ترک سکونت کر کے قصبہ "مبارک" کو اپنی اقامت گاہ بنا لیا تھا۔ یہ مقام "واسط" سے ستائیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پھر 131ھ میں طاعون کی وبا پھیلی۔ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اسی مرض میں وفات پائی۔

جب آپ کا جنازہ اٹھا تو مخلوق خدا کا ایک اژدھام تھا جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ شریک تھے۔

عباد بن عوام کہتے ہیں۔ "میں حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے میں شریک تھا۔ لوگوں کی اس قدر کثرت تھی کہ میرے ماموں نے گم ہو جانے کے خوف سے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ عجیب وغریب منظر دیکھا کہ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کی میت کے ساتھ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ اگرچہ غیر مسلم افراد حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ کے عام عقیدت مندوں کی طرح شدت غم سے بے حال نہیں تھے لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ انسانی کردار کی بلندی کی ایک یہ دلیل بھی ہوتی ہے کہ دوسرے مذہب و ملت کے لوگ اپنے عقیدے اور مسلک کو فراموش کر کے مرنے والے کے غم میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ اس کے حقیقی اخلاق پر عملی شہادت بھی پیش کرتے ہیں۔ حضرت منصور بن زاذان رحمتہ اللہ علیہ کا شمار بھی ان ہی عظیم انسانوں میں ہوتا ہے جن کی سیرت کے اثرات سے یہود ونصاریٰ بھی محروم نہیں رہ سکتے تھے۔ بظاہر تاریخ اس باب میں خاموش ہے لیکن کوئی عجب نہیں کہ حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ کے کردار کی اس اثر انگیزی نے کچھ یہودیوں اور عیسائیوں کو حلقۂ اسلام تک بھی پہنچا دیا ہو۔

(تمت بالخیر)

حوالہ جات

(فقیہ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں کی مدد لی گئی)

قرآن حکیم	احادیث مقدس	تاریخ طبری
(اللہ جل جلالہ)	(سرور کونین ﷺ)	(علامہ ابو جعفر طبری)
تاریخ بغداد	مناقب ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ	طبقات ناصری
(خطیب بغدادی)	(علامہ موفق)	(منہاج سراج)
طبقات ابن سعد	ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی	
(علامہ محمد بن سعد)	(سید مناظر احسن گیلانی)	
سیرت نعمان	غلامان اسلام	
(شبلی نعمانی)	(مولانا سعید احمد)	

(اور دوسری بے شمار تاریخی دستاویزات)

صاحب طرز ادیب
خان آصف کی بہترین تصانیف

- اللہ کے ولی
- اللہ کے سفیر
- دِلوں کے مسیحا
- سفیرانِ حرم
- شمشیر کا قرض
- شعلوں کا کفن
- فاتح اعظم صلاح الدین ایوبی

ISBN: 978-969-602-098-1



القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور۔ فون: 042-37652546, 37668958
Website: www.alquraish.com E-mail: info@alquraish.com